خطباتِ

حکیم الامت

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۱۸

مفاسد گناہ

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

عنوانات

مفتی عبدالرحمٰن خان

تصحیح وتزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

مفاسد گناہ

تاریخ اشاعت............... جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ
ناشر........................ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت.................... سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔
الحمد للہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔
پھر بھی کوئی غلطی نظر آ نے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں
تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ... چوک فوارہ ملتان — مکتبہ رشیدیہ...... راجہ بازار ... راولپنڈی
ادارہ اسلامیات...... انارکلی ... لاہور — یونیورسٹی بک ایجنسی...... خیبر بازار ... پشاور
مکتبہ سید احمد شہید ... اردو بازار ... لاہور — ادارۃ الانور...... نیو ٹاؤن ...... کراچی نمبر 5
مکتبہ رحمانیہ...... اردو بازار ... لاہور — مکتبۃ المنظور الاسلامیہ... جامعہ حسینیہ... علی پور
مکتبۃ المنظور الاسلامیہ...... بلاک نمبر ... مدینہ ٹاؤن...... بھکر موڑ...... فیصل آباد

ادارہ اشاعت الخیر -- حضوری باغ روڈ - ملتان

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE)
119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۱۸ ''مفاسد گناہ''

جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی

عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔

بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو

جائے۔ ادارہ نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد محمود

صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور فارسی

اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام

حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ بمطابق جولائی 2007ء

اجمالی فہرست

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝ (النور آیت نمبر ۱۵ صفحہ ۱۷)

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ط اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ۝ (الانعام آیت نمبر ۱۲۰)

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ط قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۝ (البقرہ آیت نمبر ۲۱۹)

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (سنن ابی داؤد)

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (آل عمران:۱۵۵)

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ (الاعراف آیت نمبر ۲۰۱، ۲۰۲)

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَاُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ
حَسَنٰتٍ ط وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا٥ (الفرقان آیت نمبر ۷۰)

وَمَآاَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ٥ (الشوریٰ آیت نمبر ۳۰)

اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَایَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ. وَاللّٰهُ لَایَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ٥ (التوبہ آیت نمبر ۱۹)

کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ٥ (القیامۃ آیت نمبر ۲۰،۲۱)

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهٖٓ اَوْقَاعِدًا اَوْقَآئِمًا٥فَلَمَّا کَشَفْنَا عَنْهُ
ضُرَّهٗ مَرَّکَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَآ اِلٰی ضُرٍّ مَّسَّهٗ٥ کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلْمُسْرِفِیْنَ مَاکَانُوْا
یَعْمَلُوْنَ٥ (سورہ یونس آیت نمبر ۱۲)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتُلْهِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَمَنْ یَّفْعَلْ
ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ٥ (المنافقون آیت نمبر ۹)

مِنْهَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُکُمْ تَارَةً اُخْرٰی٥ (سورہ طٰہٰ آیت نمبر ۵۵)

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ
الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِکُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَالَا
تَعْلَمُوْنَ٥ (الاعراف آیت نمبر ۳۳)

فہرست عنوانات

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

استخفاف المعاصی

گناہوں کو ہلکا سمجھنے کی مذمت میں یہ وعظ ۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۹ھ کو بعد نماز عشاء قاضی صاحب کے مکان پر رام پور منہاراں میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا جو اڑھائی گھنٹوں میں ختم ہوا۔ مولوی نذر حسین پنجابی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

اِذْتَلَقَّوْنَہٗ بِاَلْسِنَتِکُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاھِکُمْ مَّا لَیْسَ لَکُمْ بِہٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَہٗ ھَیِّنًاوَّھُوَعِنْدَاللّٰہِ عَظِیْمٌ○ (النور آیت نمبر ۱۵ صفحہ ۱۷)

ترجمہ: ’’جب تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو کسی دلیل سے مطلق خبر نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے۔‘‘

تمہید

یہ سورۂ نور کی آیتیں ہیں ان میں ایک خاص گناہ کو ہلکا سمجھنے کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

وَتَحْسَبُوْنَہٗ ھَیِّنًاوَّھُوَعِنْدَاللّٰہِ عَظِیْمٌ. (اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے) اس میں نص ہے کہ یہ قصہ افک کا ہے اس میں تہمت اور بہتان کا بیان ہے اور اس کو ہلکا سمجھنے پر توبیخ ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا خاص اسی گناہ کو جیسا کہ مقتضی سبب نزول کا ہے یا ہر گناہ کا جب کہ وہ کبیرہ ہو ہلکا سمجھنا برا اور مذموم ہے۔

سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تخصیص کسی گناہ کی نہیں کیونکہ سبب نزول سے تو حکم کی تخصیص ہوا نہیں کرتی۔ رہا شبہ تخصیص کا عظیم سے سو ہر گناہ گو وہ صغیرہ ہو اپنی حقیقت کے اعتبار سے عظیم ہی ہے کیونکہ حقیقت گناہ کی نافرمانی ہے اللہ جل جلالہ کی۔

گناہ کی بڑائی

اور ظاہر ہے کہ نافرمانی گو کسی قسم کی ہو زیادہ ہی بری ہے اور گناہوں کے درجات میں جو چھٹائی بڑائی کا تفاوت ہے وہ ایک امر اضافی ہے کہ ایک بہت بڑا گناہ ہے اور دوسرا اس سے چھوٹا ورنہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سب گناہ بڑے ہی ہیں' کسی کو ہلکا نہ سمجھنا چاہیے۔ اس چھوٹے بڑے ہونے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے آسمان و دنیا عرش سے تو چھوٹا ہے مگر در حقیقت کوئی چھوٹی چیز نہیں۔ دوسری مثال ناپاکی اور پلیدی کی ہے کہ پلیدی چاہے تھوڑی ہو یا بہت مگر حقیقت تو دونوں کی پلیدی ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ جتنی کسی کی عظمت اور احسان ہوتا ہے اتنی ہی اس کی نافرمانی کرنا بری بات ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور احسان کے برابر نہ کسی کی عظمت نہ کسی کا احسان۔ تو اس کی نافرمانی سب سے زیادہ بری ہوگی۔ پس وہ اپنی اس حقیقت اور مقتضی کے اعتبار سے عظیم ہی ہوگی اور اس کا مقتضی یہ تھا کہ گناہ کا ارتکاب نہ کیا جاتا مگر اس جزا کے چند اسباب ہیں بعضے گناہ کو تو صغیرہ سمجھ کر ارتکاب کر لیا جاتا ہے حالانکہ اسی راز کی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ استخفاف گناہ کفر ہے گو چھوٹا ہی ہو۔ غرض خدا تعالیٰ کی ہر نافرمانی عظیم ہی ہے اس اعتبار سے توبیخ ہیں سمجھنے کے ہر گناہ کو عام ہوئی۔

گناہ کی چنگاری

گناہ کی مثال تو آگ کی سی ہے۔ ایک چنگاری بھی مکان جلانے کے لیے کافی ہے اور بڑا انگارہ بھی۔ پس صغیرہ چنگاری ہے اور بڑا گناہ انگارہ۔ پس عمل کرنے کے لیے یہ پوچھنا کہ یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ شبہ میں ڈالتا ہے کہ اگر کبیرہ ہوگا تو بچیں گے اور اگر صغیرہ ہوا تو خیر' ہم ایسے شخص سے اجازت لیتے ہیں کہ لاؤ تمہارے چھپر میں چھوٹی سی چنگاری رکھ دیں۔ اگر یہ ناگوار ہے تو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کیسے گوارا ہے وہ چنگاری گو چھوٹی ہو مگر پھیلتے پھیلتے انگارہ ہی ہو جائے گا۔ اسی طرح آدمی اول صغیرہ کرتا ہے اور وہ چھوٹا نہیں اس اصرار سے وہ صغیرہ' کبیرہ ہو جاتا ہے اور زیادہ مدت تک کرتے رہنے سے اس کو ہلکا ہی سمجھنے لگ جاتا ہے اور وہ اس جہت سے کبیرہ ہو جاتا ہے۔

توبہ بر لب

یعنی بعضے توبہ کے بھروسہ گناہ کرتے ہیں اور یہ سخت غلطی ہے کیونکہ گناہ کی جب عادت ہو جاتی ہے پھر توبہ بھی مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ جتنے گناہ سے جن کی ابھی لذت نہیں رچی تو یہ کرنا آسان ہے اور عادت والے گناہ سے توبہ بہت مشکل ہے۔ علاوہ اس کے جب چھوٹے گناہوں

سے اجتناب نہیں کیا جاتا ہے تو طبیعت بے باک ہو جاتی ہے اور دل کھل جاتا ہے پھر رفتہ رفتہ کبیرہ بھی ہونے لگتے ہیں جیسے صاف کپڑے کو بارش میں کیچڑ وغیرہ سے بچایا جاتا ہے اور جب بہت چھینٹے پڑ جاتے ہیں تو پھر دامن کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ کپڑا بالکل خراب ہو جاتا ہے ایسا ہی گناہ کا معاملہ ہے کہ جس گناہ کی طبیعت عادی ہو جاتی ہے وہ پرانا ہو جاتا ہے اور چھوٹتا نہیں۔ مثلاً زمینداروں' کاشتکاروں وغیرہ میں یہ گناہ بمنزلہ عادت ہو گئے۔ غصب' ظلم' بیع' باطل جیسے آم اور بیر کی بیع متعارف اور یتیموں نابالغوں کے مال میں تصرف دیکھ لیجئے' یہ گناہ کس طرح سب بے کھٹکے کرتے ہیں اور خیال میں بھی نہیں لاتے۔ البتہ شراب نہیں پئیں گے تو یہ تفاوت اسی عادت کے ہونے نہ ہونے سے ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ عادت ہو جانے سے اصرار استخفاف بلکہ استحسان کی نوبت آ جاتی ہے اس لیے توبہ مشکل ہو جاتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو زبانی جیسے کسی نے کہا ہے:

سبحہ در کف توبہ برلب دل پر از ذوق گناہ ۔ معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

(ہاتھ میں تسبیح' زبان پر توبہ' دل ذوق گناہ سے بھرپور ہے' ہمارے گناہ کو بھی ہمارے استغفار پر ہنسی آتی ہے)

چنانچہ ان امور متذکرہ بالا سے توبہ تو کیسی اور الٹے ان امور کے ترک کو خلاف ریاست اور ذلت سمجھتے ہیں اور گناہ سے دل برا نہیں ہوتا حالانکہ ایمان کی نشانی یہ ہے: "إِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ"[1] (جبکہ تیری نیکی تجھ کو خوش کرے اور تجھ کو اپنی برائی بری معلوم ہو) غرض توبہ ان وجوہ سے مشکل ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کے بھروسہ گناہ کرنا نہایت حماقت ہے مگر بعض نادان پھر بھی دھوکے میں ہیں اور توبہ کے توقع پر گناہوں پر دلیری کرتے ہیں۔ اس شخص کی ایسی مثال ہے کہ اس کے پاس مرہم ہو اور اس کے بھروسے وہ اپنی انگلیاں آگ میں جلا لیتا ہو۔ کیا یہ شخص پورا احمق نہیں ہوگا' کیا کسی اہل عقل نے کبھی ایسا کیا ہے جب سے آگ پر دلیری نہیں کی جا سکتی تو دوزخ کی آگ تو اس آگ سے ستر حصہ زیادہ تیز ہے بلکہ مرہم تو پھر بھی من کل الوجوہ اختیاری ہے۔

حقیقت توبہ

اور توبہ گو بظاہر اختیاری ہے مگر مرہم کی طرح من کل الوجوہ اختیار نہیں کیونکہ توبہ کی حقیقت یہ ہے "التوبة ندم" (توبہ شرمندگی ہے) جس کو یوں بھی تعبیر کیا ہے۔ "وهو تحرق الحشاء على الخطاء وتالم القلب على الاثم" (وہ خطا پر اندرونی اعضاء کو جلا دیتی ہے اور دل گناہ پر

---

[1] (المستدرک للحاکم ۱: ۱۴' مسند احمد ۵: ۲۵۲' مشکوۃ المصابیح: ۴۵)

متالم ہوتا ہے) پس توبہ اس سوزش اور جلن کو کہتے ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ تالم مقولہ انفعال سے ہے اور وہ اختیار سے خارج ہے۔ البتہ اس پر ایک طالبعلمانہ شبہ ہوتا ہے کہ جب توبہ امر اختیاری نہیں اور حسب الارشاد "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (اللہ تعالیٰ وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے) کے غیر اختیاری کی تکلیف دی نہیں گئی تو پھر توبہ کا امر کیوں کیا گیا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اختیاری کی دو قسم ہیں ایک وہ جو خود اختیار میں ہو۔ ایک وہ جس کے اسباب اختیار میں ہوں۔ سو توبہ بایں معنی اختیاری ہے کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کا مراقبہ سو اس کے کرنے سے عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ ندامت اور تالم قلب جو حقیقت میں توبہ ہے پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا توبہ کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ۝ -

"وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے یا اپنے نفس پر ظلم ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور عذاب کو یاد کر کے اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔"

مطلب یہ کہ اگر ان سے گناہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کو یاد کرتے ہیں۔ یہاں پر ذکر اللہ میں مضاف محذوف ہے یعنی ذکروا عذاب اللّٰہ او عظمتہ اللّٰہ اور واقعی اللہ تعالیٰ کی عظمت ایسی ہی چیز ہے کہ اس کے یاد رکھنے سے نافرمانی نہیں ہو سکتی اور وہ ہے بھی قابل یاد رکھنے کے پس اس کو دل سے بھلا کر اس کی نافرمانی پر کمر باندھ لینا بڑی بے باکی کی بات ہے۔

فراغت کی قدر

بعضے منتظر رہتے ہیں کہ فلاں کام کر کے توبہ اور تدارک کر لیں گے حالانکہ ممکن ہے کہ اس کو موانع کے ہجوم سے اتنی مہلت ہی نہ ملے اس لیے اس وقت کے امکان اور فراغت کو غنیمت سمجھو اور جب یہ معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کے مراقبہ کرنے سے توبہ نصیب ہوتی ہے تو اب دوسری بات قابل غور ہے کہ اس مراقبہ کے لیے بھی فرصت اور فراغ کی ضرورت ہے۔ بعض لوگ اس فراغ کی بھی قدر نہیں کرتے حالانکہ وہ بہت بڑی غنیمت کی چیز ہے۔ حدیث میں ہے: "اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ"[1] (پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو) اور ان میں سے ایک یہ ہے: "فراغک قبل شغلک" (تیری فراغت تیرے مشغول ہونے سے پہلے)

---

[1] (مستدرک حاکم ۴: ۳۰۶، الترغیب والترھیب ۴: ۲۵۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۱۷۴)

مشغول آدمیوں کی حالت میں غور کرنے سے فراغ کی قدر معلوم ہوتی ہے وہ بیچارے ہر وقت بلا میں مبتلا ہیں ان کو کوئی وقت فرصت کا اور ایسے سوچ کا نہیں ملتا بس یہ حالت ہے کہ چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد۔ فراغ کی قدر کے بارے میں خوب کہا گیا ہے:

خوشا روزگارے کہ دارد کسے ۔ کہ بازار حرصش نباشد بسے

بقدر ضرورت یسارے بود ۔ کند کارے اومرد کارے بود

(فراغت عجیب چیز ہے۔ اگر کسی کو حاصل ہو زیادہ کی اس کو طمع نہ ہو ضرورت کے موافق اس کے پاس مال بھی ہو تو اس کو کچھ کرنا چاہیے اپنے اوقات کو ضائع نہ کرے)

اور اسی حدیث شریف میں دوسری چیز ہے کہ "صِحَّتَکَ قَبْلَ سُقْمِکَ" (تیری صحت تیری بیماری سے پہلے) تیسری "شَبَابَکَ قَبْلَ هَرَمِکَ" (تیری جوانی تیرے بڑھاپے سے پہلے)۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ

مَنْ اَصْبَحَ اٰمِنًا فِي سَرْبِهٖ مُعَافًا فِي جَسَدِهٖ وَعِنْدَهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا ۝[1]

"جو شخص اپنے بستر پر خیر و عافیت کے ساتھ بیدار ہوا کہ اس کا بدن بھی سلامت ہے اور اس کے پاس ایک روز کا کھانا بھی موجود ہے تو گویا اس کو پوری دنیا مل گئی۔"

واقع میں یہی بات ہے کیونکہ اگر زیادہ بھی ہوا تب بھی اس کی تو ہر روز ایک ہی روز کی قوت آئے گی پس اس میں یہ اور قلیل والا بس برابر ہوا۔

گر بریزی بحر را در کوزۂ ۔ چند گنجد قسمت یک روزۂ

چوں تراتائی و خرقانی بود ۔ ہر بن موئے تو سلطانی بود

(اگر دریا کو کوزہ میں ڈالے کتنا سمائے مگر ایک دن کی قسمت کا جب تو ایک روٹی اور ایک کپڑا مل جائے تو ہر بن مو تیرا بادشاہ ہے)

چنانچہ اسی زمانے کے ایک متمول کی حکایت ہے کہ وہ ایک روز اپنے خزانہ کو دیکھنے گیا جو زیر زمین بڑے مکان میں تھا اور وہ مکان گاہ گاہ کھلتا تھا اتفاق سے اس کو وہاں دیر لگ گئی اور کسی کو خبر تھی نہیں ملازموں نے دروازہ بند کر لیا اور وہ بہت بڑا مکان تھا اور دروازوں کا سلسلہ بڑی دور تک تھا اور یہ اتنی دور تھا کہ وہاں سے آواز باہر نہیں آسکتی تھی۔ الغرض وہ یہودی وہاں جواہرات کے ڈھیروں میں

---

[1] (اتحاف السادۃ المتقین ۸: ۱۵۰، تفسیر القرطبی ۶: ۱۳۴)

بھوکا پیاسا مر گیا۔ اس وقت کوئی اس سے پوچھتا تو اس کے نزدیک ایک بسکٹ اور پانی کے سامنے سارا خزانہ ہیچ تھا۔ ایسی ہی حکایت ہے کہ کسی بھوکے کو ایک تھیلی ملی کھول کر دیکھا تو اشرفیاں' پھینک کر زمین پر ماری اور افسوس کیا اور کہا کہ اگر یہ گیہوں کے دانے ہوتے تو کچھ کام آتے۔

توبہ میں جلدی

الغرض فراغ اور صحت اور ضروری سامان خرچ یہ بہت غنیمت چیزیں ہیں۔ یہ ہر وقت میسر نہیں آتیں۔ اس لیے اس کو غنیمت سمجھئے۔ اس وقت کی فرصت کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور توبہ بہت جلدی کر لے۔ بعضے لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کے ناز پر توبہ نہیں کرتے حالانکہ رحمت اور مغفرت کی خبریں اس لیے دی گئی ہیں کہ تائب کو یاس نہ ہو۔ کہا گیا ہے:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ   گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

این درگہ ما درگہ نومیدی نیست   صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(واپس آ واپس آ جو کچھ بھی تو ہے واپس آ جا' اگر کافر آتش پرست اور بت پرست ہے تو بھی واپس آ۔ یہ ہمارا در بار نا امیدی کا دربار نہیں ہے اگر سو بار تو نے توبہ توڑی ہے تو واپس آ جا)

اور جرأت اور دلیری کے واسطے نہیں کہ اور دلیر ہو کر گناہ کرو بلکہ احسان اور رحمت خداوندی کی اطلاع کا مقتضاء یہ تھا کہ متاثر ہو کر اور بھی طاعت اور فرمانبرداری کرتے نہ کہ اور جرأت اور گستاخی اور نافرمانی کی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی کسی کے ساتھ احسان کرتا ہے تو وہ اور زیادہ محبت و اطاعت کرتا ہے نہ کہ مخالفت و سرکشی۔

لذت گناہ

رہا یہ اشکال کہ واقعی اس کا مقتضاء تو یہی تھا مگر ایک دوسرا مقتضاء کہ لذت ہے وہ غالب ہو گیا۔ چنانچہ گناہ میں ظاہر ہے کہ کیسا مزہ اور لذت ہے اس کو چھوڑنا اس لیے مشکل ہے سو اگر ادراک صحیح ہو تو یہ اشکال بالکل ٹھیک نہیں کیونکہ گناہ میں جو لذت ہے اس کی مثال کھجلی جیسی ہے کہ خود اس میں کوئی لذت نہیں محض مرض کی وجہ سے لذت معلوم ہوتی ہے پھر فوراً ہی سوزش پیدا ہوتی ہے۔ سو یہ دراصل مرض ہے جیسا سانپ کے کٹے ہوئے کو کڑوا بھی میٹھا معلوم ہونے لگتا ہے سو کسی عاقل کو ایسی لذت علاج سے نافع نہیں ہوتی۔

لذت طاعت

البتہ حقیقی لذت طاعت میں ہے چونکہ ان لوگوں نے ابھی اعمال آخرت اور پرہیزگاری اور طاعت کی لذت چکھی نہیں اس لیے گناہ اور نفسانی لذات ان کو مرغوب معلوم ہوتے ہیں۔

آخرت اور پرہیزگاری کی لذت حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھئے کہ کس طرح اس کے پیچھے سلطنت کی لذت ترک کردی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس لذت کے پیچھے لباس شاہانہ ترک کر کے غریبانہ کپڑوں پر کفایت کی اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو سلطان سنجر نے ملک نیمروز دینا چاہا اس کے جواب میں یہ شعر تحریر فرمائے:

چو چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد   در دل بود اگر ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبراز ملک نیم شب   من ملک نیم روز بیک جو نمی خرم
بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے   بہ ازانکہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے
پس ازسی سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی   کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملک سلیمانی

(چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو مجھے نیم شب کی سلطنت ملی ہے، نیمروز کی سلطنت میرے نزدیک ایک جو کے برابر نہیں، خاقانی تیس سال کے بعد ثابت ہوا کہ ایک گھڑی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہوا سلطنت سلیمانی سے بہتر ہے)

چونکہ یہ لذت و تمتعات درحقیقت جان کے لیے عذاب ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

"سو ان کے اموال اور اولاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعجب میں نہ ڈالیں اللہ کو یہ منظور ہے کہ ان لوگوں کی وجہ سے ان کو گرفتار رکھے۔"

نافرمانی کا اثر

اول تو ان سب چیزوں کا مرضی کے موافق حاصل ہونا غیراختیاری اور اگر حاصل بھی ہوگئیں تو ان سب مشغولی اور تعلق کی پریشانی اور بے آرامی یہ دوسرا عذاب۔ حقیقت میں آرام تو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں ہے۔ "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب" (خبردار! اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے) یہ کلفتیں تو گناہ انفسی ہیں اور بعض کلفتیں آفاقی بھی مرتب ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان نافرمانیوں کی بدولت طرح طرح کی بیماریاں طاعون وغیرہ، وبائی امراض آپس کی نااتفاقیاں وغیرہ ظہور میں آتی ہیں اور ان بیماریوں سے ظاہری اسباب گوامور طبعیہ ہوں مگر ذنوب ان کے اسباب حقیقیہ اور اصلیہ ہیں اور دونوں میں تعارض نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ سزا تو ہو گناہ کی وجہ سے مگر ظہور اس سزا کا اسباب طبعیہ کے ذریعے سے ہوا ہو اور

چونکہ لوگ ذنوب کو ان امراض کا سبب نہیں قرار دیتے' صرف طبی علاج کہ استغفار ہے وہ نہیں کرتے وہ بھی کرنا چاہیے۔

چند خوانی حکمت یونانیاں حکمت ایمانیاں راہم بخواں
صحت ایں حس بجوئید از طبیب صحت آں حس بجوئید از حبیب
صحت ایں حس زمعموری تن صحت آں حس ز تخریب بدن

(یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے' کچھ دن حکمت ایمانی یعنی معرفت کی بھی پڑھو' حس جسمانی کو درست کرنا چاہتے ہو تو طبیب سے رجوع کرو' حس جسمانی سے تو بدن کی درستی ہے اور حس روحانی سے بدن کی تخریب ہوتی ہے)

اور ذنوب سے مصائب کا آنا نصوص سے ثابت ہے۔ "مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ" (اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے) ایک بزرگ گھوڑے پر سوار تھے وہ شوخی کرنے لگا' فرمانے لگے ہم سے آج کوئی گناہ ہو گیا ہے اس کی وجہ سے یہ ہماری نافرمانی کرتا ہے۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ کہ گردن نہ پیچد زحکم تو ہیچ
(تو بھی تو حق تعالیٰ کے حکم سے گردن نہ پھیر کہ تیرے حکم سے کوئی گردن نہ پھیرے)

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید
(جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے اس سے جن وانس اور جو شخص دیکھتا ہے ڈرتا ہے)

طاعت کا اثر

اس کے مناسب جناب پیرو مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ ایک دن پیران پیر سے واپس ہوتے ہوئے سہارنپور تشریف لائے' لوگوں نے آپ کو ایک ایسے مکان میں اتروایا کہ وہاں ایک جن نے سخت آزار پہنچا رکھا تھا۔ حتیٰ کہ وہ مکان بالکل معطل چھوڑ دیا گیا تھا۔ جب حضرت رات کو اٹھے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک آدمی آیا اور سلام کیا اور مصافحہ کر کے بیٹھ گیا۔ حضرت نے تعجب سے پوچھا کہ تم کون ہو کیونکہ مکان بند تھا اس نے عرض کیا میں ایک جن ہوں اور میری ہی وجہ سے یہ مکان خالی پڑا ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تم کو خدا کا خوف نہیں کہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہو اس نے عہد کیا کہ میں اب تکلیف نہ دوں گا اس کے بعد وہ جن اس مکان سے چلا گیا اور وہ مکان آباد ہو گیا تو یہ اثر جن پر حضرت کی طاعت ہی کا تھا۔ ایک میر کی روایت ہے

کہ حضرت عمرو بن العاص نے جب مصر فتح کیا تو ایک بار دریائے نیل خشک ہو گیا' لوگوں نے عرض کیا آپ نے فرمایا کہ کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے اور لوگ ایسے وقت کیا کرتے ہیں؟ عرض کیا کہ یہاں یہ رسم ہے کہ جب دریائے نیل خشک ہو جاتا ہے تو لوگ ایک کنواری لڑکی کو بناؤ سنگھار کر کے اس میں ڈال دیتے ہیں' دریائے نیل پھر جوش مار کر جاری ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا ایسا کبھی نہ ہوگا اور یہ سب مضمون حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا ایک رقعہ دریائے نیل کے نام لکھ کر بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ "اگر تو اپنی خوشی سے چلتا ہے تو ہم کو تیری حاجت نہیں' اللہ تعالیٰ کفیل رزق ہے اور اگر خدا کے حکم سے چلتا ہے تو شیطان کے تصرف سے کیوں بند ہوتا ہے اس کے ڈالتے ہی دریا کو جوش ہوا اور ہمیشہ کے لیے جاری ہو گیا اور وہ بد رسم موقوف ہو گئی۔ یہ برکت صرف اطاعت کی ہے۔ حقیقت میں جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتا ہے اس کے لیے سب باتیں آسان ہو جاتی ہیں۔ غرض طاقت کا سبب راحت اور معصیت کا سبب کلفت ہونا ثابت ہو گیا۔

اعمال کا دھوکہ

آج کل اول تو گناہ کو مصیبت کا سبب ہی نہیں سمجھتے اور اگر کوئی سمجھا بھی ہے تو اپنے گناہ کو مصیبت کا سبب ہی نہیں سمجھتا۔ دوسرے کے گناہ کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ ایسے موقع پر اپنے گناہ کو نہیں دیکھتے" پہلے بزرگوں کی حالت اس کے برعکس تھی۔ حضرت ذوالنون مصریؒ سے لوگوں نے درخواست کی کہ حضرت بارش نہیں ہوتی' فرمایا میں سب سے زیادہ گنہگار ہوں' شاید بارش میری وجہ سے نہیں ہوتی' میں یہاں سے چلا جاتا ہوں' اس کے بعد چلے گئے اور بارش بھی ہوئی۔ پس ہم لوگوں کو اپنے گناہوں پر نظر کرنا چاہیے مگر آج کل بجائے گناہ کے اپنی خوبیوں پر نظر ہوتی ہے حالانکہ وہ خوبیاں ہی کیا ہیں اور اس کی خبر نہیں کہ ہمارے ناقص اعمال درگاہ خداوندی کے قابل ہرگز نہیں ہو سکتے تو بس یہ سب محض دعویٰ اور پندار ہے۔

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے ‏ ‏ حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(خواجہ کا گمان ہے کہ اس کو کچھ حاصل ہوا۔ خواجہ کو سوائے غرور کے کچھ حاصل نہیں ہوا)

از دست و زباں کہ برآید ‏ ‏ کز عہدہ شکرش بدر آید

(ہاتھ اور زبان سے کس کو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے شکر سے عہدہ برآ ہو سکے)

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی ‏ ‏ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

(تو یہ احسان مت جتا کہ بادشاہ کی خدمت کرتا ہے بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ تم جیسے کو خدمت پر لگا لیا ہے)

یہ لوگ اپنے جن اعمال خیر پر نازاں ہوتے ہیں وہ خیر صرف ان کے گمان ہی کے موافق ہے ورنہ حقیقت میں بوجہ خلاف طریق اور بے ضابطہ ہونے کے وہ قابل قبول بھی نہیں۔ مثال کے طور پر یاد آیا کہ ایک شخص بطور رجھ کو پنکھا جھلنے لگے مجھ کو ناگوار ہوا اب وہ صاحب تو سمجھتے ہوں گے کہ ہم خدمت کر رہے ہیں اور آرام دے رہے ہیں مگر یہاں اس کے خلاف کلفت اور کدورت ہو رہی ہے اور بعض لوگ اپنے ہی گناہوں کو سبب مصائب کا سمجھ کر طاعت و استغفار میں مشغول ہوتے ہیں مگر اس استغفار اور عبادت میں ابتداء سے یہ نیت ہوتی ہے کہ جب یہ مراد حاصل ہو جائے گی تو اس کو چھوڑ دیں گے۔ مثلاً طاعون کے زمانے میں نماز پڑھتے ہیں مگر اس کے ختم ہونے کے ساتھ ہی اس کو بھی چھوڑ دیتے ہیں یہ تو بالکل دھوکہ کی صورت ہوگئی۔

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند   حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے

اسی بات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو "دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا" (ہم کو پکارتے ہیں لیٹے بھی بیٹھے بھی اور کھڑے بھی) اور جب اس کی تکلیف جاتی رہتی ہے اور سزا تو اس طرز عمل کی سخت ہونا چاہیے تھی مگر اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ "كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ" (جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کو ہٹانے کے لیے ہم کو پکارا ہی نہیں) یہ ان کی رحمت و عنایت ہے کہ باوجود اتنی خطاؤں اور شوخیوں اور گستاخیوں کے روزی و عافیت ویسی ہی برقرار رکھتے ہیں۔

خدائے راست مسلم بزرگواری و حلم   کہ جرم بیند و نان برقرارے دارد

(اللہ تعالیٰ ہی کی بزرگواری اور بردباری مسلم ہے کہ گناہ دیکھتے ہیں اور رزق بند نہیں کرتے)

لیکن فی نفسہ گناہ کا مقتضاء کلفت ہی ہے فی الحال فی المال بھی تو ایسی چیز میں لذت ہی کیا ہوئی تو وہ اشکال دفع ہو گیا اور کوئی عذر گناہ کرنے کا معقول نہ رہا ثابت ہو گیا کہ گناہ ہلکا سمجھنے کی چیز نہیں نہ اعتقاداً کہ کفر ہے اور نہ عملاً و حالاً کہ خلاف دین اور خلاف عقل ہے۔ حدیث میں ہے کہ مومن گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے کسی پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہو کہ وہ گرا چاہتا ہے اس لیے اس سے بچتا ہے اور ڈرتا ہے اور منافق گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے ایک مکھی آ کر بیٹھ گئی اور اس کو ہاتھ سے اڑا دیا اس لیے بے دھڑک گناہ کرتا ہے اور ڈرتا نہیں' گناہ کا خوفناک ہونا تو بیان ہو چکا اب اس کے تدارک کے لیے ایک طریقہ بیان کیا جاتا ہے جس سے توبہ کرنے کا طریقہ معلوم ہو اور گناہ سے خوف ہو وہ طریقہ یہ ہے کہ روزانہ ایک وقت مقرر کر کے اس میں ان مضامین کا مراقبہ کرے اور پھر نفس سے محاسبہ کرے۔ چنانچہ اول گناہ

کے مفاسد اور مضار کو سوچے اور پھر اس کے اوپر عذاب ہونے والا ہے اس کا خیال کرے پھر یہ دیکھے کہ میں کس کی نافرمانی کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچے اور پھر اپنے معاملے کو سوچے جو اللہ تعالیٰ سے کر رہا ہے پھر نفس سے خطاب کر کے اس کو تنبیہ اور تہدید کرے اس کے بعد موت اور مابعد الموت کے تمام امور کو سوچے اس سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ دنیا کی محبت کم ہوگی جو سبب اکثری ہے گناہوں کا۔ حدیث شریف میں ہے "اکثروا ذکر ھاذم اللذات" (لذتوں کو توڑنے والی یعنی موت کو اکثر یاد رکھو) مراقبہ کے لیے یہ اشعار نہایت مناسب ہیں۔

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — خوب ملک روس ہے اور سرزمین طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی — اس طرف آواز طبل ادھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہے مئے گلگوں کا دور — شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی ایک تماشا میں تجھے — چل دکھاؤں تو تو قید آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گور غریباں کی طرف — جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ وحشمت دنیا سے آج — کچھ بھی انکے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

اس مراقبہ کے بعد دنیا کی بھی محبت کم ہوگئی اور توبہ بھی ہوگئی اور مرض گناہ کا بفضلہ تعالیٰ دور ہوجائے گا۔ سبحان اللہ شریعت نے کیا علاج تجویز فرمایا ہے۔ اگر امر تکوین سے مبتلائے مرض ہوا تھا تو امر تشریعی سے صحت یاب ہوا۔

درد از یار است و درماں نیز ہم — دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم
(درد محبوب کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی جانب سے ہے۔ اس پر دل بھی قربان ہوا اور جان بھی قربان ہو)

ترک المعاصی

۲۵ ذی قعدہ سنہ ۱۳۲۹ھ کراچی کی بندر مسجد میں جو کہ گاڑی احاطہ میں واقع ہے ترک معاصی کے موضوع پر ایک گھنٹہ تک بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً چار سو تھی۔ مولوی سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم نے اسے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ ط اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا کَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ○ (الانعام آیت نمبر ۱۲۰)

ترجمہ: ’’اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو‘ بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے کیے کی عنقریب سزا ملے گی۔‘‘

تمہید

یہ ایک مختصر آیت ہے اس میں خدا تعالیٰ نے اپنے ایمان والے بندوں کو ایک نہایت عظیم الشان اور بڑے ضرر کی چیز سے بچایا ہے جس سے خدا تعالیٰ کی رحمت کاملہ اپنے بندوں پر معلوم ہوتی ہے۔

بے غرض شفقت

یہ بات ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ محتاج نہیں ہیں۔ خدا تعالیٰ کا کوئی کام بندوں کی اصلاح پر موقوف نہیں ہے اس کی سلطنت مثل سلاطین کے نہیں ہے کہ اگر رعایا مطیع اور فرمانبردار رہے تو وہ بادشاہ ہیں اور اگر نافرمان یا باغی ہو جائے تو کچھ بھی نہیں۔ دنیا کے سلاطین کی سلطنت کا مدار ہی اطاعت رعایا پر ہے اس لیے اگر کوئی بادشاہ دنیا کا رعایا کو کچھ مصلحت کی بات بتلائے تو اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اپنی مصلحت کے لیے بتلا رہا ہے تاکہ بغاوت نہ ہو اور ہمارے ملک میں ضعف نہ آئے لیکن خدا تعالیٰ کی وہ سلطنت ہے اگر سب کے سب مل کر بھی بغاوت کریں تو اس میں ذرہ برابر کمی نہیں آ سکتی اس لیے کہ اس کی تمام صفات قدیم ہیں جن پر زوال ممتنع ہے۔ مسئلہ مسلمہ ہے

کہ "ما ثبت قدمہ امتنع عدمہ" یعنی جو چیز قدیم ہوگی اس کا عدم ممتنع ہوگا تو چونکہ خدا تعالیٰ کی صفت سلطنت اور ملک و حکومت کی قدیم ہے اس لیے اس کو زوال ہو ہی نہیں سکتا نہ اس میں کوئی تغیر آ سکتا ہے تو اس حالت میں اگر خدا تعالیٰ کوئی بات مصلحت کی بتلائیں گے تو وہ سراسر ہماری مصلحت کے لیے ہوگی اس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ اپنی منفعت کے لیے بتلایا ہوگا۔ بس اس سے زیادہ کیا رحمت ہوگی کہ بلا غرض نفع رسانی ہو دنیا میں اگر کوئی نفع پہنچاتا ہے تو اس میں اپنا بھی نفع ملحوظ رکھتا ہے جیسا مسائل مذکور سے معلوم ہوا اور بعض کی نفع رسانی میں اگرچہ کوئی ظاہری مصلحت اس شخص کو معلوم نہ ہو جیسے طبیب کا نسخہ تجویز کرنا لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس میں بھی اپنی کوئی غرض مخفی ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اس شخص سے ہم کو مال حاصل ہوگا یا اس کے ذریعے سے ہماری شہرت ہوگی یا کم از کم اگر کچھ بھی توقع نہ ہو اور کوئی بہت ہی بڑا دیندار ہو تو اس کو ثواب کی توقع تو ضرور ہی ہوگی اور یہ بہت ہی بڑی غرض ہے کہ دوسری تمام اغراض اس کے سامنے گرد ہیں۔ اگرچہ یہ غرض مذموم نہیں بلکہ محمود و مطلوب ہے لیکن غرض تو ضرور ہے اور غرض بھی بہت بڑی ہے طالب ثواب کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے بے غرض نفع رسانی کی اور اگر کوئی شخص ایسا رحم دل ہے کہ اس کی نیت حصول ثواب کی بھی نہ ہو جیسے ماں باپ کی پرورش کہ بلا نیت ثواب ہوتی ہے گو اس پر ثواب بھی مرتب ہو جائے یا مثلاً طبیب کا اپنے بچے کو دوا پلانا کہ بلا قصد ثواب ہوتا ہے وہ بھی غرض سے خالی نہیں کم سے کم اپنے نفس کی راحت رسانی تو ضرور مقصود ہے یعنی بچے کی تکلیف دیکھ کر جو اپنے کو تکلیف ہوتی ہے اس علاج اور تجویز نسخہ سے اپنی اس تکلیف کا دفع کرنا اور اپنے کو راحت پہنچانا ہی مقصود ہے۔ اسی طرح اگر اجنبی کے ساتھ ہمدردی کی تو وہاں بھی ازالہ رقت جنسیت کا مقصود ہے غرض کوئی عاقل صدہا برس تک بھی سوچے تو وہ ایسی مثال نہیں بتلا سکتا جس میں کسی شخص نے دوسرے کو بلا اپنی کسی غرض کے نفع پہنچایا ہو۔ بہ خلاف خدا تعالیٰ کے کہ ان کو کسی کی احتیاج نہیں نہ مال کی ضرورت نہ جاہ کی طلب نہ جوش طبیعت مثل مادر و پدر کے کیونکہ انفعال سے خدا تعالیٰ بالکل پاک ہیں ان پر کوئی چیز مؤثر نہیں اور اس کی رحمت اختیاری ہے اس کا غصہ بھی مثل غصہ اہل دنیا کے نہیں کہ وہ بے چین ہو جاتے ہوں بلکہ انتقام عن ارادۃ اس کے غصے کا حاصل ہے اور انفعال کے امتناع کی وجہ یہ ہے کہ اس پر کوئی حاکم نہیں نہ اس پر کوئی قادر اور مؤثر سے زوردار ہوتا ہے تو اگر خدا تعالیٰ پر کوئی چیز متاثر ہو سکے تو خدا خدا نہ رہے گا۔ غرض یہ اہل اسلام کا عقیدہ اور مسلمہ مسئلہ ہے کہ خدا تعالیٰ پر کوئی چیز قادر و مؤثر نہیں تو رحمت کے بھی یہ معنی ہیں کہ اس کو جوش ہوتا ہے جیسے مادر شفیق کو بلکہ وہ صرف ارادے سے کرتے ہیں اور جب ایسا ہے تو وہاں یہ نفع بھی مطلوب نہیں کہ ہم کو راحت ہوگی۔

مقتضیٔ رحمت

پس وہ جو شفقت کریں گے تو بالکل بے غرض شفقت ہوگی وہ ہر طرح بے نیاز اور ہم ہر طرح محتاج ہیں۔ اب دیکھئے کہ اگر دنیا میں دو شخصوں میں ایسا علاقہ ہو کہ زید کو عمرو کی حاجت نہ ہو اور عمرو کو زید کی حاجت ہو تو حالت یہ ہوتی ہے کہ محتاج الیہ منہ بھی نہیں لگایا کرتا اور محتاج اس کے پیچھے پیچھے پھرا کرتا ہے تو اگر خدا تعالیٰ بھی اپنے استغناء اور مخلوق کی احتیاج کے اس مقتضائے مذکور پر عمل کرتے تو وہ بھی توجہ نہ کرتے۔ اللہ اکبر اتنی مستغنی ذات اور پھر اتنی بڑی رحمت کہ ہم کو ہمارے ضرر سے مطلع فرماتے ہیں اس سے زیادہ کیا رحمت ہوگی ایسی رحمت کے مقتضاء پر اس آیت میں ہم کو ہماری ایک ضرورت پر مطلع کیا ہے جس سے ہم کو اس کی رحمت کا ممنون ہونا چاہیے کیونکہ قاعدہ شریف طبائع کا یہ ہوتا ہے کہ جس قدر کسی کی عنایت دیکھتے ہیں اسی قدر اس کے سامنے پگھل جاتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے "الانسان عبد الاحسان" (انسان احسان کا غلام ہے) مگر عجب بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت کو سن کر ہماری اور زیادہ سرکشی بڑھتی ہے اور لوگ اور زیادہ جری ہو جاتے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ رحمت اور مغفرت کی آیتوں کو سن کر اور زیادہ اطاعت کرتے اور معاصی پر جرأت نہ کرتے کیونکہ یہ آیات اس لیے نہیں فرمائی گئیں کہ سب بے فکر ہو جائیں بلکہ سبب اس کا یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو تمام عالم جہل سے پر تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طریقہ نجات ارشاد فرمایا تو سلیم الطبع لوگوں نے اس کو سمجھا اور مانا لیکن ان کو یہ شبہ ہوا جس کو بعض نے خود آ کر عرض بھی کیا کہ تمام عمر تو نافرمانی میں گزری ہے اب توبہ کر لینے سے اور اطاعت کرنے سے وہ نافرمانی کیونکر دھل جائے گی اور اس کا اثر کیسے جاتا رہے گا تو پھر اپنے آبائی مذہب کو بھی کیوں چھوڑا' ان حضرات نے خدا تعالیٰ کے معاملے کو دنیا کے لوگوں کے معاملے پر قیاس کیا کیونکہ خدا تعالیٰ کی رحمت کا علم ان کو نہ تھا وہ خدا کو پورا پہچانتے نہ تھے اور یہی وجہ تھی ان کے شرک میں مبتلا ہونے کی کہ وہ یوں سمجھتے تھے کہ خدا تعالیٰ مثل ایک شاہان دنیا کے ہوں گے کہ جس طرح شاہان دنیا تن تنہا سلطنت کے کام کو نہیں سنبھال سکتی بلکہ ہر کام کا عملہ الگ ہوتا ہے اور ہر کام کے لیے کارکن جدا مقرر ہوتے ہیں ایسے ہی وہ سمجھے کہ خدا تو ایک ہے وہ سارے کام کیسے کرے گا تو ایک عملہ گھڑا اور نائب مقرر کر لیے کہ چھوٹے چھوٹے کام ان سے نکالیں گے اور بڑے بڑے کام خدا تعالیٰ سے چنانچہ ان کے اس خیال کو قرآن مجید کی اس آیت میں ظاہر کیا گیا ہے۔ "اِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" (جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں خلوص دل کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں) نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے پوچھا کہ

تمہارے کتنے خدا ہیں اس نے کہا کہ سات ہیں' ایک آسمان میں اور چھ زمین میں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا بڑے کاموں کے لیے کس کو تجویز کیا ہے کہا کہ آسمان والے کو' غرض وہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا تعالیٰ ایسے ہی ہیں جیسے شاہان دنیا۔

ناامیدی کی ممانعت

اس قیاس فاسد سے ان کو یہ بھی شبہ ہوا کہ اسلام لانے پر بھی شاید پچھلے جرائم باقی رہیں جیسے مثلاً فرض کرو اگر کوئی کسی کے باپ کو قتل کردے اور پھر بیٹے سے معاف کرائے تو گو وہ معاف بھی کردے مگر دل کا میل نہیں جا سکتا تو انہوں نے بھی یہی سمجھا کہ جب معاف یا خوش ہونے کی امید نہیں پھر ماں باپ اور قدیم مذہب کو بھی کیوں چھوڑا اور یہی شبہ آکر پیش کیا کہ اگر ہم مسلمان ہوں تو ہمارے گناہ کیسے معاف ہوں گے اور اگر نہ معاف ہوئے تو مسلمان ہونے سے فائدہ کیا' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ "قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ خدا کی رحمت سے ناامیدی نہ ہو وہ سب معاف کردے گا تم توبہ کرلو اس میں خاصیت یہ ہے کہ سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں گو ہر گناہ کے معافی کے قوانین الگ الگ ہیں جس کی تفصیل کتب شرعیہ میں ہے تو آیات رحمت سے مقصود یہ ہوا کہ شکستہ دل لوگوں کو تسکین ہو نہ یہ کہ عام لوگوں کو اور جری کردیا جائے غرض رحمت کے ذکر سے زیادہ متاثر اور مطیع ہونا چاہیے۔

اس آیت سے بھی ایک بڑی رحمت ثابت ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو مضرت سے بچنے کی تعلیم دی ہے پس ہم کو چاہیے کہ اور زیادہ مطیع ہو جائیں اور اس مضرت سے بچنے کی کوشش کریں۔ اب سمجھئے کہ وہ مضرت کیا ہے۔ سو اس کی تعیین آیت کے ترجمہ ہی سے ہو جائے گی۔ ترجمہ یہ ہے کہ: "اے مسلمانو! چھوڑ دو ظاہر گناہ کو اور باطن گناہ کو تو وہ مضرت گناہ ہے اور ظاہر اور باطن فرمانا اشارہ ہے تعمیم کی طرف یعنی ہر قسم کے گناہ کو چھوڑ دو"۔ یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ امر کا صیغہ وجوب کے لیے ہوتا ہے اور یہاں خدا تعالیٰ نے بصیغہ امر فرمایا ہے تو ہر قسم کے گناہ کا ترک واجب ہوا پھر لفظ اثم فرما کر اس وجوب کو اور بھی مؤکد کردیا ہے۔ یعنی اگر کسی فعل کے ترک کو واجب کہا جائے پس واجب کہنا اس فعل کے گناہ ہونے پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہے اور جو اسکے ساتھ اس فعل کو گناہ بھی کہا جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے اور زیادہ تاکید ہو جائے گی۔ غرض معلوم ہوا ہوگا کہ وہ مضرت گناہ کرنا ہے۔ رہا یہ شبہ کہ ہم کو تو گناہ کے کرنے سے کوئی مضرت نہیں معلوم ہوتی نہ کبھی کوئی

سزا ہوتی ہے۔ تو سمجھئے کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جن کا وجدان صحیح نہیں ہے اور ان کو کسی قسم کی مضرت محسوس نہیں ہوتی ان کے لیے تو یہ جواب ہے کہ نصوص میں دیکھو گناہ میں آخرت کیا کیا سزائیں مقرر ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ" یعنی ان کو آخرت میں بہت جلد سزا ہوگی تو کیا یہ سزا کوئی چھوٹی مضرت ہے؟ ہرگز نہیں۔ دیکھئے دنیا کی مضرت اگر آپ کی سمجھ میں آ جاتی تو اس کو آپ بھی مضرت سمجھتے تو آخرت کی سزا تو اس سے زیادہ ہی ہے۔ چنانچہ دنیا کی مضرت میں اور آخرت کی مضرت میں فرق یہ ہے کہ دنیا کی کیسی ہی مضرت ہو اس میں منفعت کا شائبہ ضرور ہوتا ہے اگر سر میں درد ہے تو یہ کتنی بڑی بات ہے کہ پیٹ میں نہیں۔ اگر مال جاتا رہا تو یہ کتنی بڑی منفعت ہے کہ آبرو نہیں گئی۔ نیز ایک درد کے ساتھ دس درد مند ہیں باپ بیٹے احباب وغیرہ تو کیا اس سے تسلی نہیں ہوتی؟ ضرور ہوتی ہے اور دکھ درد میں بہت تخفیف ہو جاتی ہے پس دنیا میں ہر مضرت کے ساتھ ایک منفعت ضرور ہوتی ہے اور ایک بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں اسی تکلیف کے بہت سے مبتلا بھی نظر آتے ہیں اور مشہور ہے: "البلیة اذا عمت خفت سهلت" اور طبعی امر بھی ہے کہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ بعض اوقات درد اور تکلیف میں لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ خوب کہا ہے:

پای در زنجیر پیش دوستاں   بہ کی بابیگانگاں در بوستاں

پھر بعض اوقات اس کے ازالے کے اسباب بھی اختیار میں ہوتے ہیں اور اگر ان سے زوال نہیں ہوتا تو بعض اوقات کچھ سکون ہی ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اگر شدت ہوتی ہے تو اتنی کہ سہار ہو سکے۔ چنانچہ شدت تکلیف میں نیند کا آ جانا اس کی دلیل ہے کہ تکلیف قابل برداشت ہے۔ اکثر اوقات دل بھی بٹ جاتا ہے غرض دنیا کی تکلیف کی تو یہ کیفیت ہے اب آخرت کے عذاب کو دیکھئے کہ اس میں راحت کا نام بھی نہیں ہے سر سے پاؤں تک تکلیف ہی میں غرق ہوگا کہ نہ سر کو چین نہ پیر کو نہ ہاتھ کو۔ ایک شخص جس کو سب سے کم عذاب ہوگا اس کی بابت حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس کو آگ کی جوتیاں پیر میں پہنا دی جائیں گی مگر شدت کی یہ حالت ہوگی کہ اس کا سر مثل دیگ کے پکتا ہوگا اور وہ یہ سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ کوئی عذاب میں نہیں۔ صاحبو! کیا یہ کچھ کم مضرت ہے اور اگر اب بھی اس کا احساس نہیں ہوا تو امتحان کے لیے اپنی انگلی آگ کے اندر رکھ کر دیکھ لیجئے اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ اس عذاب کی کیا کیفیت ہوگی جو دنیا کی آگ سے ستر درجے زیادہ ہے کیونکہ جب اس آگ میں ایک منٹ بھی انگلی نہیں رکھی جاتی تو اس آگ کا برسوں تحمل کیسے ہوگا

بلکہ اگر بہت ہی کم مثلاً ایک ہی دن کی اس میں قید ہوگی تو اس کا بھی تحمل کیسے کیا جائے گا بالخصوص جبکہ وہ دن بھی ہزار برس کے برابر ہو۔ چنانچہ خود ارشاد ہے: "وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ" (تحقیق وہ دن تیرے رب کے نزدیک تمہاری شمار کے حساب سے ہزار برس کے برابر ہوگا) اس پر شاید لوگوں کو تعجب ہو بلکہ عجب نہیں کہ ہمارے نوجوان جدید تعلیم یافتہ جماعت کو اس پر ہنسی آئے کہ ایک دن ہزار برس کا کیسا ہوگا لیکن واقع میں یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے۔ دیکھو دنیا میں بھی عرض تعین میں چھ ماہ کا ایک دن ہوتا ہے تو جیسا دنیا میں اتنا بڑا دن موجود ہے تو اگر اس عالم کا ایک دن ایک ہزار برس کے برابر ہو تو کیا تعجب ہے کیونکہ معظم معمورہ اور عرض تعین تو پھر بھی اس عالم کے اجزاء ہیں۔ جب ایک عالم کے اجزاء اس کے خواص میں اس قدر تفاوت ہے تو جہاں عالم بدل گیا وہاں اگر اس سے زیادہ تفاوت ہو جائے تو تعجب کیا ہے۔ تو اگر وہاں ایک دن کی سزا بھی ہوگی تو کمیتہ یہاں کے ہزار برس کی سزا کے برابر ہے اور کیفا اس سے بھی زیادہ۔ دوسرے دنیا میں یہ راحت تھی کہ ہمدرد غم خوار موجود تھے وہاں یہ حالت ہوگی کہ کوئی بھی نہ پوچھے گا پھر یہ کہ یہاں تو اپنے سے زیادہ تکلیف میں دوسرے کو مبتلا دیکھ کر تسلی بھی کر لیتا ہے اور وہاں ہر شخص کو یہ خیال ہوگا کہ مجھ سے زیادہ کوئی تکلیف میں مبتلا نہیں ہے اور اگر خدانخواستہ عذاب ابدی ہوا تو غضب ہی ہے کیونکہ وہاں کبھی موت بھی نہ آئے گی بلکہ یہ حالت ہوگی کہ "کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَیْرَھَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ" (جب ان کی کھال جل کر راکھ ہو جاتی ہے تو ہم ان کو دوسری کھال بدل دیتے ہیں تا کہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں)

تو تعجب ہے مسلمان پر کہ دنیا کی اتنی ہلکی تکلیف کو تو تکلیف سمجھے اور اتنی بڑی مضرت پر نظر نہ کرے یہ تو جواب ان لوگوں کے لیے تھا کہ ان کا وجدان صحیح نہیں ہے کہ ان کو گناہ کی مضرت عاجلہ محسوس نہیں ہوتی۔

عقل پر گناہ کا اثر

اور وجدان کے بطلان کی اکثر وجہ یہ ہوتی ہے کہ گناہ کا یہ بھی خاصہ ہے کہ انسان کی عقل اور سلامت فطرت اس سے بالکل برباد ہو جاتی ہے لیکن جن لوگوں کا ادراک صحیح ہے ان کے لیے اس سوال کا کہ گناہ میں کیا مضرت ہے علاوہ جواب مضرت آخرت کے یہ بھی جواب ہے کہ گناہ میں مضرت عاجلہ بھی ہے لیکن ہم اپنی بے تمیزی سے اس مضرت کو لذت سمجھتے ہیں۔ میں ابھی اس کو عرض کروں گا لیکن اول ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ مشہور ہے کہ ایک غیر ملکی وحشی ہندوستان میں

آیا' اتفاق سے ایک حلوائی کی دکان سے گزرے وہاں گرم گرم حلوا رکھا ہوا تھا' خوشبو سونگھ کر طبیعت للچائی۔ درہم و دام کچھ پاس نہ تھے آپ نے اس میں سے ایک لپ بھر کر حلوہ اٹھایا اور کھا گئے۔ حلوائی نے رپٹ لکھوائی' افسر نے چالان کو غلجان سمجھ کر تنبیہ کے لیے حکم دیا کہ اس کو گدھے پر سوار کر کے اس کے پیچھے لڑکے ڈفلی خنجری بجاتے ہوئے تشہیر کرتے ہوئے شہر بدر کر دیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا جب یہ اپنے ملک کو واپس ہوا لوگوں نے ہندوستان کا حال پوچھا' آپ فرماتے ہیں ہندوستان خوب ملک ست حلوہ خوردن مفت ست سواری خر مفت ست فوج طفلان مفت ست ڈم ڈم مفت ست ہندوستان خوب ملک ست۔ تو جیسا اس وحشی نے غایت غباوت سے اس سامان ذلت کو سامان عزت قرار دیا تھا ایسا ہی ہم بھی اپنے سامان کلفت کو سامان لذت سمجھتے ہیں۔

ادراک نورانیت

یہ تو مثال تھی مگر میں مثال پر اکتفا نہ کروں گا بلکہ اس کی حقیقت بتلاتا ہوں۔ غور کیجئے اور غور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو آپ نے سامان لذت سمجھ رکھا ہے کبھی اس سے گزر کر اس کے متضاد حالت پر بھی نظر کیجئے۔ تب آپ کو اس لذت ظاہری کے کلفت حقیقیہ ہونے کا احساس ہو کیونکہ ادراک کے غلط ہو جانے کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے اس سامان کے مقابل کو نہیں دیکھا' قاعدہ مقررہ ہے کہ "الاشیاء تعرف باضدادھا" دیکھو جو مینڈک کیچڑ میں رہتا ہو اور اسی میں پیدا ہوا ہو وہ چونکہ شفاف پانی سے واقف نہیں اس لیے اس کے نزدیک وہ سڑا ہوا کیچڑ ہی شفاف پانی ہے لیکن اگر کسی شفاف شیریں خوش ذائقہ خوش رنگ چشمہ پر اس کا گزر ہو تو اس کو حقیقت اس کیچڑ کی معلوم ہو سکتی ہے تو ہم نے چونکہ ہوش کدورات ہی میں سنبھالا ہے اس لیے ہم کو اس کی برائی یا اچھائی کی اطلاع نہیں۔ امتحان کے لیے یہ کیجئے کہ ایک ہفتہ بھر کے لیے گناہ کو چھوڑ دیجئے اور اپنے دنیوی کاموں کا کوئی بندوبست کر کے اور ان ایام میں تلاوت اور ذکر اللہ میں مشغول رہیے اور کسی قسم کی نافرمانی اس زمانے میں نہ کیجئے۔ صرف ایک ہفتہ بھر ایسا کر لیجئے اس کے بعد اپنے قلب کو دیکھئے کہ کیا حالت ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ اپنے قلب میں ایک بہار اور شگفتگی پائیں گے اور اس کے بعد پہلی حالت معصیت پر تو آپ خود بہ خود آ ہی جائیں گے اس کے بعد جب ایک دو دن معصیت میں گزر چکیں' پھر دیکھئے قلب کو کہ کیا حالت ہے اور پہلی حالت سے موازنہ کیجئے۔ واللہ آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ جمعیت تھی اور یہ تشویش ہے' وہ راحت تھی یہ کلفت ہے وہ لذت تھی یہ مصیبت ہے اس وقت آپ کو گناہ کر کے ایسی تکلیف ہوگی جیسے کسی کانٹے کے لگ جانے سے ہوتی ہے۔ بخدا

جو لوگ گناہ سے بچتے ہیں ان کو گناہ سے ایسا ہی صدمہ ہوتا ہے بلکہ اگر بلا ضرورت نافرمان کے پاس بھی بیٹھتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی کم ہمتی سے یہ امتحان بھی نہ کرنا چاہے کہ اس میں چندے فارغ للطاعات ہونا پڑتا ہے تو میں اس سے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ بحالت موجودہ ہی غور کر لیجئے کہ آپ کو کبھی سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے یا ہر وقت تکلیف اور پریشانی ہی میں گزرتی ہے اگر اسکا بھی اندازہ ہو تو اور آسان بتلاتا ہوں کہ اہل اللہ کے پاس جائیے اور اہل اللہ سے مراد خاص وہ لوگ نہیں ہیں کہ ان کے بیوی بچے کچھ بھی نہ ہوں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن کو اصلی محبت صرف خدا سے ہے اگرچہ بیوی بچے بھی ان کے ہیں تو ایسوں کے پاس جائیے اور دیکھئے کہ مصیبت میں ان کی کیا حالت ہوتی ہے اور راحت میں کیا حالت ہوتی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ مصیبت و راحت دونوں میں ان کی یہ حالت ہے کہ ہر چہ از دوست میرسد نیکوست۔ ایک بزرگ کی خدمت میں کسی نے ایک نہایت قیمتی موتی بھیجا جب ان کے پاس پہنچا تو فرمایا کہ الحمد للہ اس کے بعد وہ موتی گم ہو گیا' آپ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ الحمد للہ۔ خادم نے عرض کیا کہ حضرت یہ اجتماع المتضادین کیسا؟ کہ آنے پر بھی خوشی اور گم ہونے پر بھی خوشی۔ فرمایا کہ اصلی خوشی آنے جانے پر نہیں ہوئی بلکہ ایک دوسری بات پر ہوئی وہ یہ کہ جب یہ موتی آیا تھا تو میں نے اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھا تھا کہ اس کے ساتھ قلب کو زیادہ تعلق تو نہیں ہوا مگر معلوم ہوا کہ نہیں میں نے خدا کا شکر کیا اس کے بعد جب یہ گم ہو گیا تو میں نے قلب کو دیکھا کہ اس میں غم کا اثر تو نہیں ہوا' معلوم ہوا کہ نہیں۔ اس پر میں نے پھر خدا کا شکر کیا تو الحمد للہ اس پر تھا کہ نہ آنے سے خوشی ہوئی نہ جانے سے غم ہوا۔ اسی طرح حضرت غوث الاعظمؒ کے پاس ایک آئینہ چینی لایا گیا' آپ نے خادم کے سپرد کر دیا اور فرمایا کہ جب ہم طلب کیا کریں تو لایا کرو۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وہ آئینہ خادم سے ٹوٹ گیا' وہ نہایت خوف زدہ ہوا اور سہم گیا اور عرض کیا کہ از قضا آئینہ چینی شکست۔ آپ نے فرمایا کہ خوب شد اسباب خود بینی شکست۔ گویا محض مزاح میں اس کو اڑا دیا اور کچھ بھی اثر یا تغیر مزاج مبارک پر نہ ہوا۔

تجویز کی پریشانی

سبب اس کا یہ ہے کہ جتنی پریشانی ہوتی ہے تعلق ماسوی اللہ سے ہوتی ہے اور جن لوگوں کو خدا تعالیٰ سے تعلق نہیں وہ ہمیشہ پریشان رہتے ہیں اور وجہ ان کی اس پریشانی کی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر امر کے متعلق ایک خاص تجویز اپنے ذہنوں میں تراش لیتے ہیں جیسے شیخ چلی کا تجویز کردہ خاندان تھا۔ تو ہم سب اس بلا میں مبتلا ہیں کہ ہر وقت بیٹھ کر یہ دھن لگایا کرتے ہیں کہ یوں تجارت ہوگی' اتنا نفع

اس میں ہوگا یوں ہم بینک میں روپیہ داخل کریں گے اور یہ تجربہ کی بات ہے کہ ہر تمنا پوری ہوتی نہیں تو سارے رنج کی بات یہ ہے کہ آرزو کرتا ہے اور وہ پوری نہیں ہوتی کوئی دنیا دار کسی وقت آرزو سے خالی نہیں ہے تو ہر وقت کسی نہ کسی تمنا میں رہتا ہے اور تمنا پوری ہونا ضرور نہیں اس سے پریشانی ہوتی ہے تو کوئی دنیا دار پریشانی سے خالی نہیں۔

تفویض کی راحت

اور اہل اللہ کی راحت کا راز یہ ہے کہ ہر کام انہوں نے مفوض بحق کر دیا ہے اپنی کچھ تجویز نہیں کرتے تو جو کچھ ہوتا ہے ان کے لیے ایذا دہ نہیں ہوتا۔ حضرت بہلول نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے؟ کہنے لگے کہ اس شخص کے مزاج کی کیا کیفیت پوچھتے ہو کہ دنیا کا ہر کام اس کی خواہش کے موافق ہوتا ہو۔ حضرت بہلول نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ کہنے لگے کہ یہ تو عقیدہ ہی ہے کہ کوئی کام خدا کی خواہش کے خلاف نہیں ہوتا تو جس نے اپنی خواہش کو بالکل خدا تعالیٰ کی خواہش میں فنا کر دیا ہو تو جس طرح ہر کام خدا کی خواہش کے موافق ہوگا اس طرح اس شخص کی خواہش کے موافق بھی ہوگا' کوئی بات اس کی خواہش کے خلاف نہ ہوگی اور جب یہ نہیں تو اس کو رنج کیوں ہوگا۔ یہ راز ہے اس کا کہ اہل دنیا کو کبھی راحت نصیب نہیں ہوتی اور اہل اللہ کو کبھی رنج نہیں ہوتا۔ اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو اہل اللہ کو مریض ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے ان پر مختلف انواع کے صدمات بھی پڑتے ہیں تو صاحبو! میں نے الم یعنی دکھ کی نفی نہیں کی' ان کو الم ہوتا ہے لیکن پریشانی و کوفت نہیں ہوتی اس الم کی ایسی مثال ہے جیسے فرض کرو کہ ایک شخص کسی پر عاشق ہے اور ایک مدت کے بعد محبوب کی زیارت اس کو نصیب ہوئی اور اس کو دیکھ کر بالکل از خود رفتہ ہو گیا۔ اسی حالت میں محبوب کو سلام کیا اس نے بجائے جواب دینے کے دوڑ کر اس کو گلے سے لگا لیا اور خوب زور سے دبایا کہ اس کا ارمان پورا ہو جائے۔ عاشق چونکہ فراق کی تکالیف میں بالکل ہی گھل چکا تھا اس کے دبانے پر لگیں ہڈیاں پسلیاں ٹوٹنے۔ عین اس دبانے کی حالت میں اتفاقاً ایک رقیب آ گیا' اس کو دیکھ کر محبوب نے کہا کہ اگر میرے دبانے سے تم کو تکلیف ہوتی ہو تو تم کو چھوڑ کر اس کو دبا لوں۔ اب غور کیجئے! کہ وہ عاشق اس کا کیا جواب دے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت	سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا نصیبہ ایسا نہ ہو کہ وہ تیری تلوار کا مقتول ہو خدا کرے یہ سعادت تیرے عشاق کی قسمت میں ہی آئے اور دوستوں کا سر سلامت چاہیے کہ اپنے خنجر کو آزماتا رہے)

اور یہ کہے گا کہ؟

اسیرت نہ خواہد رہائی زبند　　شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی تیری قید سے رہائی کی خواہش نہ کرے گا' تیرا شکار پھندے سے نکلنا پسند نہ کرے گا)

گردو صد زنجیر آری بگسلم　　غیر زلف آں نگار دلبرم

(اگر تو دو سو زنجیریں بھی لگائے گا تو میں ان کو توڑ دوں گا' سوائے اس معشوق کے)

کیا اس قید کو وہ گراں سمجھے گا؟ ہرگز نہیں' ہاں تکلیف جسمانی ضرور ہوگی مگر قلب کی یہ کیفیت ہوگی کہ اس میں راحت بھری ہوئی ہوگی بلکہ زبان سے یہ نکلتا ہوگا۔

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے　　یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

اسی طرح اہل اللہ کو اگر تکلیف پہنچتی ہے تو جسمی مگر قلب ان کا ہر وقت راحت میں ہے۔ اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ گناہ کرنے والے کیسی تکلیف میں ہیں کہ کسی وقت راحت نصیب نہیں تو گناہ سے یہ فوری مضرت ہوتی ہے۔

آفاقی مصیبت

نیز اس کے سوا ایک اور بھی تکلیف ہوتی ہے اور ہے وہ بھی عاجل مگر فعل کے بعد ہوتی ہے اور یہ مذکورہ بالا فعل کے ساتھ تھی۔ وہ یہ ہے کہ جتنے گناہ کرنے والے ہیں وہ ہمیشہ کسی نہ کسی آفاقی مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں جیسے یہ مذکورہ کلفت مصیبت انفسی تھی۔ ارشاد خداوندی ہے:

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ○

''اور کیا ان کو نہیں دکھلائی دیتا کہ یہ لوگ ہر سال میں ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنستے رہتے ہیں مگر پھر بھی باز نہیں آتے اور نہ سمجھتے ہیں۔''

مگر لوگ اس قسم کے مصائب کو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ فلاں گناہ کی سزا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسے وقت کہا کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کونسا گناہ ہوا تھا جس کے سبب یہ تکلیف جھیلنی پڑی۔ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ تکلیف گناہ کے سبب ہوا کرتی ہے مگر تعجب صرف اس پر ہے کہ کونسا گناہ ہم سے ہو گیا تھا۔ مجھے لوگوں کے اس تعجب ہی پر تعجب ہے کیونکہ ہم میں وہ ایسا کون ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا نہیں رہتا اور جب ہر وقت گناہ میں مبتلا رہیں تو تعجب تو آفات میں مبتلا نہ ہونے پر کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال یہ ثابت ہو گیا کہ گناہ کرنے سے دنیا کی بھی پریشانی ہوتی ہے اور

آخرت کی الگ رہی۔ اب خدا تعالیٰ کی رحمت کو دیکھئے کہ فرماتے ہیں کہ اس مضرت سے بچو۔ "ذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ" آپ نے دیکھا کہ کتنی بڑی مضرت سے خدا تعالیٰ نے بچایا ہے اور میں نے اس کے بیان کو اس لیے اختیار کیا ہے کہ اس کے متعلق ہم میں چند طرح کی کوتاہیاں ہیں۔

فکر عاقبت

ایک تو یہ کہ ہم میں اکثر تو دین ہی کی خبر نہیں ان کا تو یہ مذہب ہے کہ

اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

کیوں صاحب اگر کوئی شخص آپ کو زہر بھرا لڈو لا کر دے تو کیا اسی اپنے قول کے موافق وہاں بھی عمل کرو گے کہ کل کے دن کیا خبر کیا گزرے اب تو لڈو کھانے کو ملتا ہے یا کہ اس کے انجام بد پر نظر کر کے اس کو ترک کر دو گے۔ تو کیا قیامت آپ کے نزدیک کل سے کچھ زیادہ دور ہے۔ صاحبو! کل کے چار بجے تک تو ۲۴ گھنٹے یقین ہیں اور قیامت کے متعلق تو ۲۴ منٹ کی بھی خبر نہیں۔ اس لیے کہ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔ موت کا کوئی مقرر اور معین وقت نہیں۔ لوگ اس دھوکے میں ہیں کہ ابھی تو ہم جوان ہیں۔ صاحبو! لوگوں کو اس طرح موت آ گئی ہے کہ خود ان کو بھی خبر نہیں ہوئی کہ اب ہم مر جائیں گے۔ کانپور میں ایک صاحب گھر میں آئے کھانا مانگا' ماما کھانا اتار کر لائی' دیکھا تو آقا صاحب ختم ہو چکے۔ غرض موت کا کوئی قاعدہ اور وقت مقرر نہیں ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض آپ سو برس کے بھی ہو گئے تو کیا ہوگا۔ وہ سو برس بھی جب گزر جائیں گے تو ایک دن کے برابر بھی نہیں معلوم ہوں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے جن کی عمر قریب ڈیڑھ ہزار برس کے ہوئی۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے پوچھا کہ آپ نے دنیا کو کیسا پایا' فرمایا جیسا دو دروازے والا ایک گھر ہو کہ ایک دروازے سے داخل ہوا اور گزرتا ہوا دوسرے دروازے سے نکل جائے اور اگر یہ سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھو کہ آپ کی عمر کے مثلاً چالیس چالیس پچاس پچاس برس گزر گئے ہیں مگر غور کر کے دیکھو کہ یہ اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا جیسے آئندہ کل کا دن' تو موت کو مدید اور بعید سمجھنا بڑی غلطی کی بات ہے۔ جب وہ آئے گی تو یہ حالت ہوگی جیسے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ۝ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ ۝

"ارشاد ہوگا اچھا یہ بتلاؤ تم برسوں کے شمار سے کس قدر زمین پر رہے ہو گے' وہ جواب دیں گے کہ ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم رہے اور سچ یہ ہے کہ ہم کو یاد نہیں سو گننے والوں سے پوچھ لیجئے۔"

خیال تو کیجئے اتنی بڑی بڑی مریں اور جب پوچھا جائے گا تو ایک دن سے بھی کم معلوم ہوں گی۔ تو جب یہ حالت ہے تو پھر کاہے پر ادھار کھائے ہوئے بیٹھے ہو۔ صاحبو! جس وقت ڈاکو ڈاکہ ڈالتا ہے تو جیل خانہ کو بہت بعید سمجھتا ہے لیکن جب سزا کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قریب تھا۔ تو یہ کہنا کہ اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے کتنی بڑی غلطی کی بات ہے۔ حضرت خدا تعالیٰ تو جانتا ہی ہے عاقبت کی خبر لیکن جس کو خدا بتلا دے وہ بھی جانتا ہے اگر کوئی مریض کہے کہ طبیب جانے کہ اس غذا میں کیا نقصان ہے تو اس سے کیا کہو گے یہی کہ بھائی طبیب تو بیشک جانتا ہے لیکن جب اس نے تمہیں بتلا دیا تو اب تو تم بھی جانتے ہو۔ اسی طرح عاقبت کی حالت جب خدا تعالیٰ نے تم کو بتلا دی تو تم بھی تو جان گئے پھر غفلت اور جرأت کیسی۔

مراقبہ موت

اور بہت لوگ جو دنیا کے پیچھے پڑے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ موت اور عاقبت کو بھول گئے ہیں اسی لیے حدیث میں آیا ہے: "اَکْثِرُوا ذِکْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتَ"[1] (دنیا کی لذات کو ختم کرنے والی یعنی موت کو زیادہ سے زیادہ یاد رکھو) ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس مراقبہ کا دوام کرلے اور سوتے وقت اس طرح غور کرے کہ مرنے کے بعد یہ خدم و حشم سب چھوٹ جائے گا اور میں اکیلا رہ جاؤں گا اور صرف باز پرس رہ جائے گی اور سوچے کہ حضرت سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر ہزار تلوار لگیں تو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی جان کے نکلنے میں ہوتی ہے اور ظاہر بھی ہے کہ ذرا بدن کا ایک رواں توڑ کر دیکھے تو کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ تو جب فرشتہ پوری جان نکالے گا اس وقت کیا عالم ہوگا۔ اسی طرح سوچو کہ حشر و نشر کے وقت کیا حالت ہوگی۔ جب اس طرح سوچو گے تو دنیا سے دل سرد ہو جائے گا۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم تجارت' زراعت کو چھوڑ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے کسی کام میں دل نہ لگاؤ۔ ایک قطعہ مجھے اس مضمون کے مناسب ایک ناصح کا یاد آیا۔ فرماتے ہیں:

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے	خوب ملک روس اور کیا سرزمین طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی	اس طرف آواز طبل ادھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہو مئے گلگوں کا دور	شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے

[1] (سنن الترمذي: ۲۳۰۷، سنن النسائي: ۴: ۴، سنن ابن ماجه: ۴۲۵۸)

یہ تو ہوس کا فتویٰ تھا آگے کہتے ہیں:

سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے — چل دکھاؤں تو جو قید آز کا محبوس ہے

اور کیا تماشا دکھلایا کہ:

لے گئی یکبارگی گور غریباں کی طرف — جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے

مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمت دنیا سے آج — کچھ بھی انکے ساتھ غیر از حسرت وافسوس ہے

موازنہ طلب

خیال فرمایئے بڑے بڑے ملوک اور سلاطین گزر گئے مگر ان کا کہیں نشان بھی باقی نہیں ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ بادشاہوں کا تو کہیں تاج بھی باقی نہیں لیکن بزرگوں کی جوتیاں تک بھی تبرکاً باقی ہیں اس سے موازنہ کرنا چاہیے طلب دنیا اور طلب حق کے اثر میں۔ غرض ایک کوتاہی تو ہم میں یہ تھی کہ دین کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور دوسری کوتاہی یہ ہے کہ اگر توجہ کرتے ہیں تو بے ترتیبی سے کرتے ہیں۔

ترتیب اصلاح

ترتیب موافق عقل اور شرع کے یہ ہے کہ جلب منفعت سے دفع مضرت اہم ہے۔ چنانچہ اطباء کا اتفاق ہے کہ علاج سے زیادہ ضروری پرہیز ہے تو اس وقت اگر توجہ بھی ہوتی ہے تو وظائف کی طرف اور اس کی طرف جو کہ جالب منفعت ثواب ہے اور آج کل اسی کا نام لوگوں نے بزرگی رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا دیندار ہے کہ ایک قرآن روز پڑھتا ہے رات بھر جاگتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ یہ دین نہیں اپنے مرتبے میں یہ بھی دین ہے مگر اس سے بھی زیادہ ضروری کوئی چیز ہے اور وہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ گناہ کی چیزوں سے بچے جو کہ دفع مضرت ہے اس وقت اس کا مطلقاً خیال نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ایک تسبیح بھی نہ پڑھے مگر گناہ چھوڑ دے غیبت نہ کرے جھوٹ نہ بولے اور غیر خدا کی محبت سے دل کو خالی کر دے اور ایک نفل بھی نہ پڑھے ایک تو ایسا ہو اور دوسرا ایسا ہو کہ ساری رات جاگے عبادت کرے قرآن پڑھے لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو حقیر سمجھے ان کو تکلیف پہنچائے اور بھی گناہ کرے تو خوب سمجھ لو کہ پہلا ناجی ہے اور دوسرا ناری ہے۔ خدا تعالیٰ نفلوں کو نہیں دیکھتے۔ حدیث میں ہے: "لَا تَعْدِلُ بِالرِّعَةِ" یعنی ورع کے برابر کسی عمل کو نہ سمجھو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے ذکر

کیا کہ فلاں عورت بہت روزے رکھتی ہے: "لٰكِنْ تُؤْذِيْ جِيْرَانَهَا" (لیکن وہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف دیتی ہے) فرمایا: "هِيَ فِي النَّارِ"[1] (وہ دوزخی ہے) پھر ایک دوسری عورت کے بارے میں پوچھا کہ وہ بہت زیادہ عبادت (یعنی نفل وغیرہ) نہیں کرتی "لٰكِنْ لَا تُؤْذِيْ جِيْرَانَهَا" (وہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف نہیں دیتی) فرمایا: "هِيَ فِي الْجَنَّةِ" (وہ جنت میں ہے)۔

ترک گناہ میں مکاری

آج کل ہمارے دیندار بھی دین کی وہ چیزیں لیتے ہیں جن کی کوئی صورت محسوس ہے یعنی وجودی عبادت اور جس کی کوئی صورت محسوس نہ ہو جیسے ترک معصیت کا اس کا اہتمام کم کرتے ہیں حالانکہ اس میں نفس کا کید ہے کہ وجودی عبادت میں لوگوں کی نظروں میں عزت و وقعت ہوتی ہے اور ترک میں کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ مثلاً ایک شخص ساری عمر کسی کی غیبت نہ کرے تو دوسروں کو پتہ بھی نہیں چل سکتا کیونکہ وہ تو ترک ہے اور ترک فعل نظر میں نہیں آیا کرتا' نظر میں تو کسی فعل کا ارتکاب واخذ آتا ہے یہی وجہ ہے کہ وجودی عبادت تو کرتے ہیں مگر گناہ کو نہیں چھوڑتے اور اگر چھوڑا بھی تو بعض کو اور یہ بعض کا چھوڑنا بعض کا نہ چھوڑنا تو نہ چھوڑنے ہی کے حکم میں ہے۔ مثلاً اگر ہم نے غیبت کو نہ چھوڑا اور گالی کو چھوڑ دیا تو من وجہ نہ چھوڑنا ہی ہے کیونکہ گالی وغیرہ کو ہم نے اس لیے چھوڑا ہے کہ اس میں بدنامی کا اندیشہ ہے تو راز اس میں بھی وہی ہے کہ ایک گناہ مضر جاہ ہے اور دوسرا نہیں ورنہ اگر خدا کے خوف سے چھوڑا جاتا تو سب گناہ چھوڑ دینے چاہئیں تھے۔ تیسری کوتاہی یہ ہے کہ اگر گناہ کو چھوڑتے ہیں تو بعض کو اور بعض کو نہیں جیسا پہلے ضمناً عرض کیا اور اگر کوئی بزعم خود سارے گناہوں کو بھی چھوڑے تو اس میں کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ ظاہری گناہوں کو جو کہ ہاتھ پھیر کے ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ گناہ انہی کو سمجھتے ہیں اگر کسی سے پوچھا جائے کہ گناہ کیا کیا ہیں تو وہ انہی کو گنوائے گا۔ کبھی ریا اور کینہ وغیرہ کا نام بھی نہ لے گا۔ وجہ یہی ہے کہ ان کو گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ خدا تعالیٰ نے ان سب کوتاہیوں کا علاج اس میں فرمایا ہے کہ: وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (تم ظاہری گناہ بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ بھی چھوڑو)۔

اعضاء کے گناہ

پس اس میں یہ بات بھی بتلا دی کہ بڑی بات یہ ہے کہ گناہ کو چھوڑا جائے اور سب کو چھوڑا جائے اور یہ بھی بتلا دیا کہ گناہ دو قسم کے ہیں ظاہری اور باطنی یعنی جوارح کے متعلق بھی اور قلب کے متعلق بھی' گناہ کی فہرست تو بہت بڑی ہے مگر میں مثال کے طور پر مختصراً کہتا ہوں کہ مثلاً آنکھ کا

---

[1] (مسند احمد ۲: ۴۴۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۹۹۲، کنز العمال: ۲۵۶۱۸)

گناہ ہے کسی نامحرم کو دیکھنا' امرد کو دیکھنا یا اجنبی کا ایسا بدن دیکھنا کہ اسکا دیکھنا شرعاً ناجائز ہے جیسے عورت کے سر کے بال اور یہ مسئلہ عورتوں کو بھی بتلانا چاہیے کیونکہ وہ اس میں بہت مبتلا ہیں۔ایک گناہ آنکھ کا یہ ہے کہ کسی کی چیز دیکھ کر حرص کرے' خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَاتَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَامَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا.

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی آنکھوں کو اس چیز کی طرف جو ہم نے کفار کو ان کی آزمائش کے لیے نفع کے واسطے دی ہیں ہرگز نہ اٹھائیں۔''

اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ مال حاصل نہ کرو بلکہ مطلب یہی ہے کہ مال کو قبلہ و کعبہ نہ بناؤ کہ اس کی بدولت دین ہی ہاتھ سے جاتا رہے۔اسی طرح زبان کا گناہ چغلخوری ہے' غیبت ہے' جھوٹ بولنا ہے۔آج کل کوئی بھی اس سے بچا ہوا نہیں۔الا ماشاءاللہ اس کا علاج یہ ہے کہ جو کچھ بولو سوچ کر بولو کہ میں کیا کہوں گا اور وہ بات خلاف مرضی حق تو نہ ہوگی پھر انشاءاللہ تعالیٰ زبان کا کوئی گناہ نہ ہوگا۔کان کا گناہ یہ ہے کہ چھپ چھپ کر کسی کی بات سنے گانا سنے' ہاتھ کا گناہ یہ ہے کہ کسی نامحرم کو چھوئے' کوئی ناجائز مضمون لکھے۔پیر کا گناہ یہ ہے کہ کسی ناجائز موقع پر چلا جائے اور ایک پیٹ کا گناہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے بچے ہوئے ہوں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ روزی حلال مل ہی نہیں سکتی' جب حلال نہیں مل سکتی تو حرام حلال سب برابر پھر کہاں تک بچیں۔صاحبو! یہ گمان بالکل غلط ہے جس کو فقہ حلال کہہ دے وہ بلاشبہ حلال ہے لوگ علماء سے پوچھتے نہیں ورنہ بہت سی حلال صورتیں نکل آئیں۔افسوس ہے معاملات میں وکلاء سے مشورہ کیا جاتا ہے مگر اہل علم سے کبھی مشورہ نہ کریں گے اور یہ نہ پوچھیں گے کہ یہ ناجائز ہے یا جائز۔صاحبو! اگر عمل کی بھی توفیق نہ ہو تب بھی ہر معاملے کو پوچھ تو ضرور ہی لو! اگر آتشک ہو تو اس کا نسخہ تو ضروری یاد کر لو اگرچہ اس کو برتو نہیں کیونکہ معلوم ہوگا تو کبھی تو توفیق ہو ہی جائے گی۔اسی طرح بدن کے متعلق ایک گناہ ہے کہ لباس کفار کے مشابہ پہنا جائے۔

غیرت اسلامی

صاحبو! اگر تمہارے نزدیک مذہبی حکم کوئی چیز نہیں تو اسلامی غیرت تو ہونی چاہیے۔کیا یہ غیرت کی بات نہیں' آخر قومی امتیاز بھی کوئی چیز ہے اور اگر ہے تو اس کا کیا طریقہ ہے غضب ہے کہ اکثر ہندو تو ایسی وضع اختیار کرنے لگے ہیں جیسے مسلمان کی ہونی چاہیے اور مسلمان ہندوؤں کی وضع اختیار کرنے لگے ہیں۔میرے بھائی کے پاس ایک تحصیلدار اور ایک سب انسپکٹر آئے۔تحصیلدار

ہندو مگر ریش بروت مسلمانوں کا سا اور سب انسپکٹر صاحب مسلمان مگر چہرہ ہندوؤں کا۔ خدمت گار نے پان تحصیلدار صاحب کے سامنے رکھ دیئے تو سب انسپکٹر ہنسے، تحصیلدار بھی ہنسے نوکر سمجھ گیا اور پان سب انسپکٹر کے سامنے رکھ دیئے بھائی نے کہا کہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک نوکر آپ کو ہندو سمجھے۔ صاحبو! غیرت کرنی چاہیے اور ہماری یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس تبدل ہیئت میں مصلحت کیا ہے بجز اس کے کہ یہ ایک غیر مسلم قوم کا لباس ہے تو گویا نعوذ باللہ یہ مطلب ہوا کہ لاؤ ہم بھی کافر بنیں اگر چہ صورت ہی ہوں مجھے ایک ظریف کا قول یاد آیا کہنے لگے کہ اس وقت نوجوانوں کی یہ حالت ہے کہ اگر اہل یورپ کسی مصلحت سے اپنی ناک کٹوانے لگیں تو یہ نوجوان بغیر سوچے سمجھے اپنی ناک بھی کٹوانے لگیں گے اور دراصل وجہ یہ ہے کہ اس تبدل ہیئت کو باعث شوکت سمجھتے ہیں کیونکہ یہ وضع اہل حکومت کی ہے لیکن صاحبو! اگر شوکت بھی ہوئی تو نتیجہ کیا شوکت تو اس لیے حاصل کی جاتی ہے کہ اغیار کے مقابلے میں اس سے کام لیا جائے نہ اس لیے کہ اپنوں ہی پر رعب جماویں پھر اوپر سے یہ لوگ ہمدردی قومی کے بھی مدعی ہیں۔ یاد رکھو ہمدردی اور نفع رسانی اس شخص سے ممکن ہے کہ وہ قوم سے اختلاط و مناسبت پیدا کرے نہ کہ ان سے نفور ہو اور ان کو اپنے سے متوحش بنا دے۔ بعض لوگ اس مسئلے میں یہ جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم اس لباس سے کافر ہو جائیں گے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر آپ عورت کا لباس پہن لیں تو کیا آپ عورت ہو جائیں گے اور جب نہ ہو جائیں گے تو اس کو بھی کیوں اختیار نہیں کیا جاتا اور

گناہ بے لذت

بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ ان کو شوکت سے بھی کوئی تعلق نہیں مثلاً تصویر رکھنا، کتا پالنا، داڑھی منڈانا، مجھے ایک اپنی اور ایک دوسرے صاحب کی حکایت یاد آئی اپنی تو یہ کہ میں ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہا تھا کہ ایک جنٹلمین جو کتا لیے ہوئے تھے مجھ سے فرمانے لگے کہ کتے میں ایسے ایسے اوصاف ہیں پھر اس کا پالنا کیوں منع کیا گیا میں نے کہا کہ صاحب اس کا ایک تو عام جواب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور یہ جواب ہزاروں شبہات کا ہے۔ دوسرا جواب خاص جواب ہے جو اس باب کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ کہ اس میں باوجود ان صفات کے ایک ایسا عیب ہے کہ جس نے سب اوصاف کو گرد کر دیا اور وہ یہ ہے کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں اس لیے اس کا پالنا منع ہے۔ بس چپ ہی تو ہو گئے اور خوش ہو کر تسلیم کیا اور دوسرے کی حکایت یہ ہے کہ ایک صاحب کتا بغل میں دبائے بیٹھے تھے کسی نے کہا کہ اس میں کیا مصلحت ہے، کہنے لگے تا کہ فرشتہ موت کا نہ آسکے۔

انہوں نے کہا یہ تو کوئی بات نہیں آخر دنیا میں کیسے بھی تو مرتے ہیں جو فرشتہ ان کی جان نکالتا ہے وہی تمہاری بھی نکالے گا اور پہلی حکایت میں جو میں نے دوسرا جواب دیا تھا جس سے وہ بہت خوش ہوئے تھے واقع میں وہ کوئی بڑی بات نہیں بات اصلی تو وہی تھی کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ غرض بعضے گناہ میں تو بالکل ہی ضرورت و مصلحت کا کوئی درجہ نہیں گو جن کو ضروری سمجھا جاتا ہے بایں معنی کہ ان کے نہ کرنے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے اور ان کے لیے نفس کچھ حیلہ نکال لیتا ہے عقل صحیح کے سامنے وہ بھی لغو ہیں لیکن اس وضع کے بدلنے میں تو کسی درجے کا بھی نفع نہیں اور اس کے چھوڑنے میں کونسی تکلیف ہے تو یہ گناہ بالکل گناہ بے لذت ہوا اور اگر بالفرض کوئی لذت و ضرورت ہو تو بھی تو خدا کے حکم کے سامنے اپنی مصلحت کیا چیز ہے یہ تو ظاہری گناہ تھے۔

باطنی گناہ

اور باطنی گناہ یہ ہیں کہ مثلاً اہل دنیا تو دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور دیندار اس پیرایہ میں تو نہیں لیکن وہ اپنے کو بزرگ سمجھ کر دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں خوب کہا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ کہاں کی بزرگی یہ کہا ہے:

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد راہ　　　در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش　　　ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل مت رہ کہ جو لوگ منزلوں کو طے کرنے والے ہیں ان کے گھوڑے پتھریلے راستوں کو بھی میدان کی طرح طے کر لیتے ہیں۔ ناامید بھی مت ہو جاؤ کہ شراب عشق سے مست لوگ ایک آواز میں منزل پر پہنچ جاتے ہیں)

یہ گناہوں کی مختصری تفصیل ہے اب اس کا طریقہ سمجھئے کہ یہ کس طرح چھوٹیں۔ سو طریقہ یہ ہے کہ سوچا کرو کم از کم سونے کے وقت کہ آج ہم نے کیا کیا شرارتیں کی ہیں اس کے بعد سوچو کہ ان پر کیا سزا ہونے والی ہے اس کے بعد سوچو کہ ہم نے اس سزا سے بچنے کی کیا تدبیر کی ہے جب کچھ سمجھ میں نہ آئے تو توبہ کرو اور خوب روؤ اسی طرح روزانہ کیجئے پھر ایک چلہ کے بعد دیکھئے کہ کتنی کایا پلٹ جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی بھی کوشش کیجئے کہ آپ کو گناہوں کی مفصل فہرست معلوم ہو جائے۔ آپ نے آج تک شاید سنا بھی نہ ہو کہ اگر ریل کے تیسرے درجے میں سفر کرے اور بیس سیر اسباب ہو تو بغیر محصول دیئے لے جانا حرام ہے تو آپ کو ضروری ہے کہ علم دین حاصل کریں خواہ اردو ہی کی کتابیں ہوں مگر ہر رطب و یابس دیکھنے کے قابل نہیں بلکہ محقق

علماء سے انتخاب کرا کے کتابیں دیکھو۔ ہر قسم کی کتابیں نہ دیکھو بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ تو صاحبو! حرج یہ ہے کہ آدمی ڈانواڈول ہو جاتا ہے اور یہی راز ہے تقلید کا کہ اس تذبذب سے محفوظ رہے تو ہر قسم کی کتابیں نہ دیکھو بلکہ جو علماء محقق بے غرض ہیں ان کی کتابیں دیکھو۔ دوسرے یہ کہ ان کو کسی عالم سے پڑھ لو اور اگر پڑھنے کی فرصت نہ ہو تو خود دیکھو لو مگر اس طرح کہ جہاں ذرا بھی شبہ رہے فوراً اس پر نشان بنا دو اور کسی عالم سے اس کو پوچھ کر حل کر لو اور جیسے کھانے کی روزانہ ضرورت ہے اسی طرح اس کو بھی ساری عمر کے لیے ایک ضرورت کی چیز سمجھو اور مطالعہ کرو اور جو پڑھ نہیں سکتے وہ پڑھتے ہوؤں سے سن لیا کریں۔ اس طریقے سے انشاء اللہ تعالیٰ چند روز میں تمام امت محمدیہؐ کے افراد باخبر ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ وہ مراقبہ مفید ہوگا جو اوپر مذکور ہوا۔ اس ترتیب کے ساتھ اگر کریں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد سب گناہ چھوٹ جائیں گے۔ خدا تعالیٰ نے تھوڑے سے لفظوں میں ان سب کو بتلا دیا ہے کہ:

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ط اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ۝

"تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے کیے کی عنقریب سزا ملے گی۔"

اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو! وہ توفیق عمل عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین

ترجیح المفسدہ علی المصلحہ

گناہ کسی عقلی یا حالی مصلحت سے جائز نہیں ہوسکتا۔ اس بارے میں یہ وعظ ۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۰ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں ارشاد فرمایا۔ مولانا محمد عبداللہ نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ.اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ط قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا○ (البقرہ آیت نمبر ۲۱۹)

ترجمہ: ’’یعنی لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں‘ لوگوں کو بعضے فائدے بھی ہیں اور وہ گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔‘‘

تمہید

یہ آیت کا ٹکڑا ہے لیکن محل خاص اسی جزو کی تفسیر کرنا اور جس بارے میں یہ جزو آیت ہے خصوصیت سے اسی کو بیان کرنا مقصود ہے اور مجھ کو اس سے ایک غلطی کے رفع کا استنباط کرنا منظور ہے جس کو میں عرض کروں گا‘ اول بطور تمہید کے اس جزو آیت کا خلاصہ عرض کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے خمر اور قمار کا حکم پوچھا تھا اس کے جواب میں ارشاد ہے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے ان میں منافع بھی ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت تحریم خمر و میسر سے پہلے کی ہے اور اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے لیکن لفظوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ تسامح ہوا ہے اس لیے کہ باوجود لفظ اثم کبیر کے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ پس بظاہر یہ آیت بھی تحریم کے بعد ہی کی ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے بعد والی آیت یعنی ’’یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ......الخ‘‘ (یعنی اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت

وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں) اس کی زیادہ تاکید ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس آیت کوسن کر بعض لوگوں نے لفظ منافع پر نظر کر کے شراب کے ترک میں سستی کی ہو اور "فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ" (ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں) میں کچھ تاویل کرلی ہو۔ مثلاً یہ کہ ان کو خود اثم نہیں فرمایا بلکہ متضمن اثم فرمایا ہے اس طرح سے کہ کبھی یہ مفضی الی المعاصی ہو جاتے ہیں تو جب ایسا انتظام کرلیا جائے کہ یہ احتمال نہ رہے تو جائز ہوگا جیسے قبیح لغیرہ کی شان ہوتی ہے مگر یہ تاویل بہت بعید ہے اس لیے نہایت شدومد سے "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ ...... الخ" نازل ہوئی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے قبل تحریم نہیں ہوئی تھی اور منافع للناس سے جواز پر تمسک نہیں ہوسکتا اس لیے کہ کسی محرم شے میں منافع کے وجود سے اس کی اباحت پر استدلال نہیں ہوسکتا بلکہ منافع کا ذکر منشاء شبہ کو رفع کرنے کے واسطے یعنی اگرچہ ان دونوں میں منافع بھی ہیں۔ چنانچہ خمر میں قوۃ غریزیہ اور میسر میں تکثیر مال بہ سہولت ہے لیکن مفاسد ان کے منافع سے زیادہ ہیں اس لیے حرام ہیں۔ یہ حاصل ہے آیت کا مجھ کو مقصود خاص خمر و میسر کا بیان کرنا نہیں۔ اگرچہ بیان کرنا ان کا اب بھی بیکار نہیں ہے لیکن مجھ کو اس سے ایک مسئلہ کا استنباط منظور ہے اور اس سے ایک ایسی سخت غلطی اور اشتباہ کا رفع کرنا ہے جس میں اکثر سالک مبتلا ہوتے ہیں چنانچہ مجھ سے ایسے لوگ ملے ہیں جو اس غلطی میں مبتلا تھے اور ممکن ہے کہ جن کے کانوں میں اس مضمون کا غلط ہونا نہیں پڑا ہے وہ بعد میں اس غلطی میں واقع ہو جائیں اس لیے اس کو بیان کرنا ضروری ہے۔ اول میں اس غلطی کو بیان کرتا ہوں کہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ گناہ کا چھوڑنا ضروری ہے اور نیز اس کے چھوڑنے کی تدبیر کرنا بھی ضروری ہے اور تدبیر کا حاصل اسباب کو مہیا کرنا اور موانع کو رفع کرنا ہوتا ہے۔

حسن نیت سے گناہ

سمجھئے کہ اس تدبیر میں بعض اہل سلوک کو ایک دقیق غلطی ہوگئی۔ وہ غلطی اگر واقع نہ ہوتی تو ضرورت بیان کی بھی نہ تھی وہ یہ ہے کہ گناہ کے ترک کرنے کی تدابیر میں سے ایک یہ تدبیر انہوں نے تجویز کی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شیطان نے ان کو سکھلائی ہے اس لیے کہ یہ شیطان بہت بڑھا ہوا ہے ہر شخص کو اس کے طریق کے موافق بہکاتا ہے اور ایسی غامض اور گہری چالوں سے بری بات کو دل میں ڈالتا ہے کہ بظاہر وہ مصلحت جو معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی سالک گناہ میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ اس سے دل تنگ ہوتا ہے اور اگر نفس کو روکتا ہے تو اور زیادہ ہیجان بڑھتا ہے تو اس وقت شیطان یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ تمام پریشانی تم کو اس لیے ہے کہ اس گناہ

میں جو لذت ہے اس کو تم نے نہیں چکھا اس لیے بار بار اس کا اشتیاق ہوتا ہے اور اگر خوب سیر ہو کر اس گناہ کو کر لو تو پھر اس کی سب خواہش نکل جائے گی اور دل ہلکا ہو جائے گا پھر اس گناہ کی طرف رغبت نہ رہے گی۔ مثلاً زنا کرنے یا شراب پینے کو جی چاہا تو شیطان بہکاتا ہے کہ ایک دفعہ خوب پیٹ بھر کر کر لو تو ارمان نکل جائے گا اور ہوس ختم ہو جائے گی پھر خواہش گناہ کی نہ ہوگی اور توبہ خالص ہو جائے گی۔ پس دیکھئے کہ یہ کتنا بڑا دھوکہ ہے کہ گناہ کراتا ہے گناہ کے ترک کے لیے تو چونکہ اکثر مقدمہ امر محمود کا محمود ہوتا ہے اس لیے وہ گناہ اس کی نظر میں بہت خفیف ہو جاتا ہے کہ گویا وہ اچھی نیت سے ہوتا ہے اول تو انسان ہے ہی ضعیف العقل کہ مصلحت غیر واقعیہ کو بھی واقعیہ سمجھتا ہے۔ چہ جائیکہ کوئی امر مصلحت واقعیہ کا رنگ لیے ہوئے بھی ہو ایسے مقام پر تو ضرور اس کو لغزش ہو جائے گی۔ پس معلوم ہوا کہ جو عام لوگ گناہوں میں مبتلا ہیں وہ تو ہیں ہی بعض اچھے لوگوں پر بھی شیطان کا داؤ چل جاتا ہے کہ شیطان ان کو اس طور سے قابو میں کرتا ہے کہ اگر یہ گناہ نہ کرو گے تو تمام عمر نزلہ سا بہتا رہے گا۔ ایک دفعہ جی بھر کر کر لو پھر توبہ کر کے بے فکر ہو جائیں گے۔ ایک مولوی صاحب مجھ کو ملے کہ وہ گناہ میں مبتلا تھے خیر گناہ تو انسان سے ہوتا ہی ہے لیکن زیادہ افسوسناک امر یہ تھا کہ انہوں نے مجھ سے بھی پوچھا کہ اگر اس نیت سے گناہ کر لیں تو کیا حرج ہے میں نے کہا کہ توبہ کرو توبہ کرو اور میں نے ان کو سمجھایا کہ اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے گناہ کیا جاتا ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ حرام چیزوں پر بسم اللہ کہے تو کافر ہو جاتا ہے اس لیے کہ اس نے شریعت کا مقابلہ کیا' مسئلہ مجوشہ میں یہ تو نہ کہوں گا کہ کفر ہے لیکن ہاں اشد درجہ کا گناہ قریب بکفر اور بڑی شدید غلطی ہے جب ان کی سمجھ میں آیا اور توبہ کی اس روز سے معلوم ہوا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اس غلطی میں مبتلا ہیں اور کاوش کی جائے گی تو ممکن ہے کہ اس غلطی میں ابتلاء اکثر لوگوں کو ہو۔ یہ ہے وہ مضمون اور غلطی جس کا رفع میں اس آیت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

منافع پر مشتمل گناہ

حاصل اس بیان کا یہ ہے کہ خمر و میسر کے باب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا" (ان دونوں یعنی شراب اور جوئے کا گناہ ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے) حق تعالیٰ نے اس میں تسلیم فرمالیا ہے کہ ہر گناہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں کوئی بھی نفع نہ ہو لیکن اس نفع کے وجود سے وہ جائز نہ ہوگا۔ اس لیے مفاسد اور مصالح کا جب اقتران ہوتا ہے تو مفاسد کو غلبہ رہتا ہے۔ اگرچہ مفسدہ قلیل ہی کیوں نہ ہو اور اس میں تو مفاسد بھی زیادہ ہیں۔ غرض گناہ خواہ کتنے ہی منافع پر مشتمل ہو لیکن وہ گناہ اور منہی عنہ و حرام اور غیر جائز الارتکاب ہی ہے اس قاعدہ

کلیہ میں یہ مسئلہ مبحوث فیہا بھی داخل ہے۔ غرض مصلحت کی تحصیل کی غرض سے کوئی گناہ جائز نہیں ہوسکتا۔ آج کل بہت سے نوتعلیم یافتہ جب دیکھتے ہیں کہ علماء بیوع فاسدہ و معاملات ربوا کو منع کرتے ہیں تو اعتراض کرتے ہیں ان مولویوں کو مصلحت زمانہ کی تو خبر ہے نہیں بس ہانک دیتے ہیں یہ بھی حرام وہ بھی حرام۔ آج کل مصلحت یہ ہے کہ ربوا کو حلال کہا جائے' دیکھو دوسری قوموں نے اسکی وجہ سے کس قدر ترقی کی ہے۔ میاں مولویوں کو کیا خبر یہ تو اپنے مدرسے میں بیٹھ کر جو چاہیں فتویٰ جاری کر دیتے ہیں۔ خبر نہیں کہ قوم پر کیا کیا مصائب نازل ہو رہے ہیں سو ان معاملات میں چونکہ مصلحت ہے اس لیے ان معاملات کو گناہ نہ کہنا چاہیے یہ بھی اسی قسم کی غلطی ہے۔

گناہ میں مصلحت

میں کہتا ہوں کہ آج کل عقل پرستی کا بہت زور ہے لیکن افسوس ہے کہ اس عقل کو دین کے اندر صرف نہیں کیا جاتا۔ آپ مصلحت کی وجہ سے ایک شے کو جائز کہتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ چونکہ اس میں یہ مصلحت مضمر تھی اسی واسطے تو ضرورت ممانعت کی ہوئی کیونکہ جس میں کوئی مصلحت نہ ہو اس کے منع کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ منع ہمیشہ اسی امر کو کیا جاتا ہے کہ جس میں کچھ مصلحت بھی ہو جس کے سبب سے اس کے کرنے کی رغبت ہو مگر اس میں مفاسد دقیق ہوتے ہیں کہ ان مفاسد تک ہماری عقل نہیں پہنچتی۔ پس گناہ ایسا ہی ہے کہ جس میں کوئی مصلحت باعث علی الفعل ہوتی ہے اور وقوع اس کا ہمیشہ اسی مصلحت کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر یہ نہ ہوتا تو منع کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ اس کو تو ہر ذی ہوش شخص واجب الترک سمجھتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مصلحت گناہ کی منافی نہیں ہے چنانچہ "وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا" (ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے) میں اول بیان ہو چکا ہے کہ یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اس میں نفع ضرور ہے لیکن نقصان زیادہ ہے۔ باقی یہ کہ وہ نقصان کیا ہے تو اس کو اگر ہم نہ جانتے تب بھی ماننا جاننے پر موقوف نہ تھا۔ دیکھو حکام جو قوانین مقرر کرتے ہیں تو قوانین کا علم تو ہر شخص کو ضروری ہے لیکن اس کی لم اور مصالح کا جاننا ہر شخص کے لیے ضروری نہیں۔ پس حق تعالیٰ کا اجمالاً یہ فرما دینا کافی ہے کہ اس میں نقصان ہے' باپ کا بیٹے کو یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ہم کو تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ فلاں شے مضر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس مضرت کی وہ تفصیل بھی بیان کیا کرے۔ پس خداوند جل جلالہ کو بطریق اولیٰ یہ حق حاصل ہے لیکن باوجود اس حق کے حاصل ہونے کے پھر بھی کچھ دینی و دنیوی مضرتیں خمر و میسر کی بیان فرما دیں۔ چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ؕ

''یعنی شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے آپس میں بغض اور عداوت واقع کر دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے۔''

بہرحال ''وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا'' (ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے) سے یہ معلوم ہو گیا کہ گناہ میں مصلحت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ شراب کے اندر قوت اور یہ کہ شرابی سیر چشم ہو جاتا ہے، بخل جاتا رہتا ہے چنانچہ شعراء جاہلیت نے اپنے اشعار میں اس کا ذکر بھی کیا ہے اور میسر میں اگر جیت ہو تب تو حصول مال اور اگر ہار ہو تو مال سے بے رغبتی ہو جانا پس گناہ میں بعض اوقات امر محمود کا منتظم ہو جانا بعید نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گناہ گناہ نہ رہے۔ اسی طرح جی بھر کر گناہ کرنا اگر اس میں یہ مصلحت ہو بھی کہ وہ سبب توبہ اور اطاعت کا ہو جائے تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گناہ حرام نہ ہو بلکہ گناہ حرام رہے گا۔

حاصل جواب کا یہ ہوا کہ اگرچہ ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس میں مصلحت ہے لیکن چونکہ مفاسد بھی ہیں اسی لیے حرام ہے۔

مفاسد گناہ

اب سمجھنا چاہیے کہ مفاسد اس میں کیا ہیں، مفاسد اس میں کئی طرح سے ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ جس وقت یہ گناہ کر رہا ہے اس کو یہ کیا خبر ہے کہ میری عمر اتنی ممتد ہو گی کہ میں بعد اس گناہ کے زندہ رہوں گا اور جو مصلحت توبہ و خلوص کی میں نے سوچی ہے وہ مرتب ہی ہو جائے گی۔ بعض مرتبہ آدمی دفعۃً مر جاتا ہے۔ کان پور میں ایک شخص اپنے گھر آئے اور کھانا مانگا چنانچہ ان کی ماما کھانا لائی، دیکھا تو مرے پڑے ہیں، ایسے واقعات ہزاروں ہیں کہ آدمی فوراً مر جاتا ہے کوئی سبب ظاہری بھی موت کا نہیں ہوتا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استنجے سے فارغ ہو کر فوراً تیمم فرما لیتے تھے، کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پانی موجود ہے، فرمایا کہ کیا خبر ہے کہ پانی ملنے تک میں زندہ رہوں گا یا نہیں حالانکہ انبیاء علیہم السلام کی موت دفعۃً نہیں آتی بلکہ ان سے اول پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے پاس آنا چاہتے ہو یا دنیا میں رہنا پسند کرتے ہو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس جب یہ اطلاع آئی تو فرمایا کہ جناب باری تعالیٰ سے عرض کرو کہ کوئی دوست اپنے دوست کو مارا بھی کرتا ہے۔ وہاں سے حکم ہوا کہ کوئی دوست اپنے دوست کے ملنے سے

عذر بھی کیا کرتا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پوچھا گیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے جب مشورہ کیا انہوں نے فرمایا کہ تشریف لے چلئے، حق تعالیٰ مشتاق ہیں۔ چنانچہ آپ نے اپنا اشتیاق ظاہر کیا اور تشریف لے گئے تو باوجود یہ کہ آپ کی وفات اس اطلاع کے بعد ہوئی۔ تب بھی خدائے تعالیٰ کی عظمت کے غلبہ کا یہ اثر تھا کہ موت کو ہر وقت حاضر سمجھتے تھے اور ہمارے پاس تو کوئی نوشتہ بھی نہیں کہ ہم دس برس یا دس ماہ یا ہفتہ یا دو ہفتہ بلکہ پانچ منٹ تک بھی زندہ رہیں گے، پھر یہ دھوکہ کس بنا پر کہ گناہ کر کے توبہ کر لوں گا اور بعض اوقات تو وہ گناہ بھی نصیب نہیں ہوتا خواہ مخواہ نیت بگاڑ کر ہی گناہ گار ہوتے ہیں۔ ایک عورت کے یہاں ایک شادی تھی اس احمق نے باوجود سب کی فرمائش کے رسوم شادی پوری کرنے کے لیے اپنی جائیداد فروخت کر دی اور روپیہ نقد لا کر گھر میں رکھا، رات کو تمام روپیہ چور لے گئے، گناہ بھی ہوا اور مقصود بھی حاصل نہ ہوا اس لیے کہ جب آدمی پکا ارادہ گناہ کا کر لیتا ہے تو وہ گناہ تو لکھا ہی جاتا ہے بڑا سخت دھوکہ ہے۔

سلب توفیق

دوسرے یہ کہ ہم نے مانا کہ عمر اس کی ممتد ہو لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ پھر توبہ کی بھی توفیق ہو جائے۔ ممکن ہے بلکہ واقع ہے کہ اکثر ایسے شخص کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اس لیے کہ پہلے تو جب تک یہ گناہ نہ کیا تھا اس سے ایک رکاوٹ طبیعت میں تھی بھی اب جبکہ کر لیا تو وہ بھی نہ رہی تو گناہ کا وقوع آئندہ اور زیادہ ہوگا کم نہ ہوگا اور بالفرض اگر توبہ بھی کر لی تو اکثر احوال میں وہ توبہ کامل نہ ہوگی۔ محض صورت توبہ ہوگی اور وہ گناہ کے ترک کے لیے کافی نہ ہوگی، پس جو غایت تھی جی بھرنے کی کہ پھر گناہ نہ ہوگا وہ غایت مرتب نہ ہوگی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم لوگ جو طاعت کرتے ہیں نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور کبھی ناغہ نہیں ہوتی۔ اس کی کیا وجہ ہے آیا اس کے لیے صرف ارادہ ہی کافی ہے یا علاوہ اس کے کوئی اور شے بھی ہے جو محرک ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نرا ارادہ کافی نہیں اگر نرا ارادہ کافی ہوتا تو بہت لوگ ایسے ہیں کہ بہت سے نیک کاموں کا ارادہ کرتے ہیں اور بعض مرتبہ کرتے بھی ہیں لیکن نباہ نہیں ہو سکتی۔ پس معلوم ہوا کہ کوئی اور ہی شے ہے جو اس مشین کو چلا رہی ہے وہ کیا ہے طبیعت کا تقاضا، یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ دل میں ایسی بے چینی اور چلبلاہٹ لگا دی ہے کہ جب تک وہ کام نہیں کر لیتے چین نہیں آتا، عراقی اس بے چینی کی تمنا میں کہتے ہیں:

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی ۔۔۔ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(یعنی تیری پارسائی بدون محبت اور چلبلاہٹ بڑی دور کا رستہ ہے، عشق کا رستہ مجھے بتا دیجئے)

چنانچہ جو لوگ نمازی ہیں وہ اپنی حالت دیکھ لیں کہ اگر کبھی نماز میں تاخیر ہو جاتی ہے تو ان کو کیسی بے چینی ہوتی ہے جب پڑھ لیتے ہیں اس وقت کیسی راحت ہوتی ہے اور جس شے کا تقاضا نہیں اس میں یہ کیفیت نہیں۔ چنانچہ جو لوگ تہجد کے پابند نہیں ہیں ہر چند ارادہ کرتے ہیں کہ ہم تہجد التزام سے پڑھا کریں لیکن نہیں ہو سکتا' فرض نماز کے لیے جس مستعدی کے ساتھ اٹھ جاتے ہیں اس طرح تہجد کے لیے نہیں اٹھا جاتا ہے۔ وہ بات کیا ہے کہ فرائض کا تقاضا پیدا ہو گیا ہے تہجد کا نہیں ہوا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ صرف ارادے سے کام مکمل نہیں ہوتا بلکہ شرط اس میں طبیعت کا تقاضا ہے کہ تمام طاعات میں یہی حال ہے اب سمجھو کہ توبہ بھی ایک طاعت ہے اور توبہ کی حقیقت ہے ندامت اور خجلت۔ تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ گناہ کا صدور جب زیادہ ہوتا ہے تو پھر توبہ کی جو حقیقت ہے یعنی ندامت و خجلت' وہ میسر نہیں ہوتی بلکہ وہ توبہ صرف زبان تک ہی محدود ہوتی ہے' قلب کے اندر گناہ سے احتراز کاف اور انفعال نہیں ہوتا' خاص کر جبکہ اس گناہ کو سبب قرب سمجھے اور جب ندامت نہ ہوئی تو تقاضا ترک گناہ کا نہ ہوگا بلکہ گناہ کا داعی بدستور قائم رہے گا اور وہ توبہ صرف ارادے کے درجے تک ہوگی اور اول ثابت ہو چکا ہے کہ جب تک ارادے کے ساتھ تقاضا طبع میں نہ ہو کسی طاعت پر نباہ نہیں ہو سکتا۔ پس یہ توبہ قابل اعتماد نہ ہوگی اور اس کا ٹوٹ جانا بہت سہل ہوگا۔ گویا نفس کے اندر گناہ سے مانع ایک مستحکم قلعہ تھا۔ اس ظالم نے اس کو توڑ دیا' اب قلعہ کے اندر غنیم کا گھس آنا مستبعد نہیں ہے۔

ضرر یقینی

سب سے اخیر میں میں کہتا ہوں کہ بالفرض دل میں سے ارمان نکل گیا اور توبہ بھی نہیں ٹوٹی لیکن تقویٰ کا اجر تو نہ ملے گا' ایک تو وہ شخص ہے کہ جس کو گناہ کرنے کی ہوس ہے اور وہ اپنے نفس کو روکتا ہے اور گھونٹتا ہے اس کو جو اجر حاصل ہوگا وہ اس شخص کو نہ ہوگا جو بے باک ہو کر پیٹ بھر کر گناہ کرتا ہے۔ گو پھر توبہ کر لیتا ہے پس شیطان نے اسکو ایک اجر عظیم سے محروم کیا اور بہت بڑا مفسدہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی جو یقینی ضرر ہے اس شخص نے اس کا ارتکاب ایک موہوم نفع کی تحصیل کے لیے کیا' یقینی ضرر کا التزام بامید نفع موہوم عقلاً بھی جائز نہیں ہے۔ یہ ہے وہ غلطی جس کے رفع کرنے کے واسطے میں نے اس وقت بیان کیا ہے۔

کشف سے دھوکہ

اسی پر قیاس کرنے سے یہاں ایک اور غلطی کی تصحیح اور ایک اشتباہ کا حل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بعض اہل کشف کو ایک سخت دھوکہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی گناہ کی نسبت یہ منکشف ہو جائے کہ یہ

میری قسمت میں لکھا ہے تو اس کو جلدی سے کر لینا چاہیے اس کا غلط ہونا بھی اسی تقریر سے واضح ہو گیا اس لیے پہلی صورت میں تو ایک مصلحت بھی تھی اور یہاں تو کوئی مصلحت بھی نہیں۔ رہا کشف تو اول کشف ہمیشہ صحیح نہیں ہوتا اور اگر صحیح بھی ہو تو جب یہ مکشوف ہوا تھا کہ میری تقدیر میں یہ گناہ ہے آخر یہ بھی قطعی وحی کے ذریعے سے مکشوف ہو چکا ہے کہ اس سے گناہ ہو گا اور ندامت اور توبہ واجب ہو گی۔ پھر اس کے کیا معنی کہ جلدی کرنی چاہیے نیز یہ بھی وحی کے ذریعے سے پہلے سے مکشوف کرا دیا گیا ہے کہ باوجود اس کشف صدور کے رُکنے کی کوشش کرنا فرض ہے گو ناکامی ہی ہو۔

دست از طلب ندارم تا کام من برآید   یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(ہاتھ طلب سے کوتاہ نہ کروں گا جب تک کہ میرا مقصد حاصل نہ ہو جائے وہ مقصد یہ ہے کہ یا تو تن محبوب کے پاس پہنچ جائے یا جان تن سے نکل جائے)

ہم نے دیکھا ہے کہ بعض مریضوں کی نسبت یقین ہو جاتا ہے کہ اب یہ بچے گا نہیں لیکن اخیر وقت تک دوا اس کے منہ میں چھوڑتے رہتے ہیں اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کشف بعض کے لیے مضر ہو جاتا ہے۔ جیسے اس شخص کو کشف سے گناہ کی جرأت ہو گئی اسی واسطے بعض بزرگوں نے فرمایا ہے: کشف را بر کفش زنیم (ہم کشف کو جوتی پر مارتے ہیں) حکم تو یہ ہے کہ رکو بچو بچنے کی کوشش کرو اپنی سی کر لو خواہ بچ سکو یا نہ بچ سکو۔ اگر کوئی کہے کہ پھر اس کوشش سے کیا فائدہ ہے۔ سو فائدہ یہ ہے کہ کوشش کا ثواب ملے گا اور یہ کہ عقیدہ خراب نہ ہو گا۔ عقیدہ کی صحت بڑی شے ہے اگر کوئی کہے کہ آخر اس گناہ سے پھر نجات کی کیا صورت ہے میں کہتا ہوں کہ نجات کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں ایک تو یہ کہ گناہ ہی واقع نہ ہو دوسرے یہ کہ گناہ واقع ہوا اور توبہ سے معاف ہو جائے تو یہاں دوسری صورت سے نجات ہو گئی۔ دیکھیے اگر کسی شخص کو پہلے سے معلوم ہو جائے کہ مجھ کو بخار آئے گا' کیا وہ دوا نہ کرے گا۔ ضرور کرے گا اور کرتا ہے۔ پھر یہاں کیا وجہ ہے کہ توبہ نہیں کرتے اور بچنے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ الٹا اس کو جلدی سے کر لینے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

اجازت گناہ کا دھوکہ

اسی کی نظیر ایک اور دھوکہ بھی ہے اور وہ سب سے بڑھ کر ہے اس لیے کہ پہلی صورتوں میں گناہ کو گناہ تو سمجھتے تھے اور یہ دھوکہ ایسا ہے کہ گناہ کو جائز سمجھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی حق تعالیٰ کی طاعت کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کے لیے گناہ گناہ ہی نہیں رہتا۔ جب وہ مقرب و مقبول ہو جاتا ہے نعوذ باللہ اس کو گناہ کی اجازت ہو جاتی ہے۔ سو یہ

محض باطل ہے اور بعض ذہین لوگوں نے اس کی ایک اصل نکالی ہے وہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں اہل بدر کے باب میں آیا ہے:

وَلَعَلَّ اللّٰهَ اِطَّلَعَ عَلٰی اَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ[1]

''شاید اہل بدر پر اللہ تعالیٰ مطلع ہو گئے ہیں، سو فرما دیا جو چاہے تم عمل کرو میں نے تمہاری مغفرت کر دی۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا علم بھی ہے کہ گناہ گناہ نہیں رہتا حالانکہ خود اس حدیث سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ گناہ ہوتا ہے اس لیے کہ گناہ نہیں تھا تو "قد غفرت لکم" (میں نے تمہاری مغفرت کر دی) کیونکہ فرمایا بلکہ "ابحت لکم احللت لکم" (میں نے تمہارے لیے مباح کر دیا میں نے تمہارے لیے حلال کر دیا) فرماتے اور اس سے بڑھ کر دلیل لیجیے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے: "لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ" (اللہ تعالیٰ نے تمہارے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے) ذنبک کے معنی دیکھ لیجئے یہ بحث تو دوسری ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے تو پھر اس آیت کے کیا معنی؟ لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کوئی مقام ایسا نہیں ہے کہ جہاں پہنچ کر گناہ گناہ نہ رہے بلکہ مقربین سے تو خلاف اولیٰ بھی ہو جائے تو اس پر بھی عتاب ہوتا ہے اور منشاء اس غلطی کا ایک قیاس فاسد ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے مجنونوں کو دیکھا ہے کہ ان کی بری باتیں بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ پس اسی پر حق تعالیٰ کے مقبول بندوں کو بھی قیاس کر لیا ہے حالانکہ یہ قیاس مع الفارق ہے۔ اس لیے کہ بری بات کا بھلا معلوم ہونا عقل کے خلاف ہے۔ صرف طبیعت کا اقتضاء ہے اور آدمی چونکہ طبیعت کا مغلوب ہو جاتا ہے اور محبت کا اس پر غلبہ ہوتا ہے اس لیے محبوب کی بری بات بھی اس کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ عقل کا اقتضاء اس کے برعکس ہے وہ یہ ہے کہ محبوب کی چھوٹی سی برائی بھی کھٹک جائے کہ یہ برائی بھی اس میں کیوں ہے چنانچہ دیکھ لو جب تم اپنے لڑکے کو کوئی حرکت کرتے دیکھتے ہو تو اتنا غصہ آتا ہے کہ غیر کے لڑکے پر اس قدر نہیں آتا۔ لیکن یہ جب ہی ہوتا ہے کہ باپ پر عقل کا غلبہ ہو اور اگر حب غالب ہوگی تو پھر بمصداق "حبک الشیٔ یعمی ویصم"[2] (کسی چیز کی محبت تم کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے) بچے کی برائی بھی اچھی معلوم ہوگی۔ پس آدمی چونکہ مغلوب ہوتا ہے طبیعت کا اس لیے آدمی میں ایسا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ طبیعت سے پاک ہیں ان پر کوئی شے غالب نہیں وہ سب پر غالب ہیں اس لیے ان کو آدمی پر قیاس نہیں کر سکتے بلکہ وہاں وہی ہوتا ہے جو حکمت کا مقتضاء تھا کہ محبوب سے ادنیٰ ناپسندیدہ فعل بھی برا معلوم ہو۔

---

[1] (مجمع الزوائد للهيثمي ۹: ۱٦۰)

[2] (سنن ابي داؤد: ۵۱۳۰، مسند احمد ۵: ۱۹۴، مشكوة المصابيح ۴۹۰۸)

مقربین کی حیرانی

چنانچہ مقربین پر ذرا ذرا سی حرکات میں عتاب ہوا ہے لوگ اسی فکر میں ہیں کہ مقبول ہو کر جو چاہیں گے کریں گے۔ یہاں مقبول ہو کر اور زیادہ حق بڑھ جاتا ہے۔ اسی واسطے تو کہتے ہیں نزدیکاں را بیش بود حیرانی (مقربین کو حیرانی زیادہ ہوتی ہے) ایک بزرگ ایک صحرا میں گوشہ نشین تھے ایک روز بارش ہوئی' فرمانے لگے آج کیا موقع سے بارش ہوئی ہے۔ حکم ہوا کہ او بے ادب! اور بے موقع کس دن ہوئی تھی؟ ہوش اڑ گئے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ پاؤں پھیلا کر نہ سوتے تھے کسی خادم نے کہا کہ حضرت آپ پاؤں کیوں نہیں پھیلاتے؟ فرمایا کہ کوئی اپنے بادشاہ کے سامنے بھی پیر پھیلایا کرتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ کو بعد انتقال کے کسی نے خواب میں دیکھا' پوچھا کیا گزری؟ فرمایا کہ جب میں پیش کیا گیا تو پوچھا گیا کہ کیا لائے' میں نے عرض کیا اے اللہ تعالیٰ اعمال تو میرے کچھ ہیں نہیں ہاں شرک نہیں کیا توحید کا اقرار کرتا رہا۔ فرمایا "اما تذکر لیلۃ اللبن" یعنی دودھ کی رات تم کو یاد نہیں ہے؟ قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک رات حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے دودھ پی لیا تھا' پیٹ میں درد ہوا تو منہ سے یہ نکل گیا کہ دودھ سے درد ہوا ہے تو اس کی نسبت ارشاد ہے کہ کیا توحید یہی ہے کہ پیٹ کے درد کے اندر دودھ کو مؤثر سمجھو اور وہ درد بھی تو ہمارا ہی پیدا کیا ہوا تھا۔

درد از یارست درمان نیز ہم　　　دل فدائے اوشد وجاں نیز ہم

(درد یار کی جانب سے اور درماں بھی اس کی طرف سے' اس پر دل فدا ہے اور جان بھی)

دریں نوعے از شرک پوشیدہ ہست　　　کہ زیدم بیازرد و عمر بخست

(اس بات میں شرک کی ایک خفی نوع ہے کہ زید نے مجھ کو ستایا اور عمر نے مجھ کو رنجیدہ کیا کیونکہ مؤثر حقیقی سوائے خدا کے کوئی نہیں)

لیکن یہاں ایک بات نازک ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب خواص کے لیے ہے عوام کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ ہر بات کو اس کے اسباب ہی کی طرف نسبت کیا کریں' اعتقاد کے درجے میں تو یہ سمجھیں کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے مگر اس کا مراقبہ نہ کریں اس طرح سے کہ اسباب پر نظر نہ رہے اور مابہ الفرق یہ ہے کہ خواص کو تو ذات باری کے ساتھ عشق ہوتا ہے اس لیے جو کچھ پیش آئے گا وہ اس میں راضی رہیں گے اور کسی حال میں حق تعالیٰ سے مکدر نہ ہوں گے ان کا مذہب تو یہ ہے:

دل شدہ مبتلائے تو' ہرچہ کنی رضائے تو

(دل آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے' آپ جو کچھ تصرف کریں تو ہم آپ سے راضی ہیں)

اوران کا مشرب یہ ہوتا ہے:

اسیرت نخواہد رہائی زبند

(تیرا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا)

بخلاف عوام کے کہ وہ عشق سے عاری ہیں اس لیے اگر وہ ہر جزئی کو حالاً اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب سمجھیں گے اور اسباب سے بالکلیہ ان کی نظر اٹھ جائے گی اور کوئی امر ناگوار طبع پیش آئے گا تو اس کو منجانب اللہ سمجھنے کے سبب ان کے لیے اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کو اعراض و تکدر ہو جائے اس لیے ان کو اعتقاد کے درجے میں تو خالق ہر شے کا اللہ تعالیٰ کو سمجھنا چاہیے۔ باقی اسباب پر نظر رہے تو ان کے لیے سلامتی کا طریق ہے ان کے ذہن میں تو یہی ہونا چاہیے کہ ابا جان دق یا سل کی بیماری سے بحکم الٰہی مر گئے۔ اسی واسطے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ نے اس زمانے کے سالکین کو مراقبہ توحید سے ضیاء القلوب میں منع فرمایا ہے۔ یہ درمیان میں اس بات کی تحقیق ہوگئی۔ اس کے قبل اس کا بیان تھا کہ مقرب ہو کر حرام افعال حلال نہیں ہو جاتے بلکہ خود حلال میں بھی کچھ تنگی ہو جاتی ہے اور گناہ کا گناہ نہ ہونا اور مباحات میں توسع نہ کر سکنا تو بمراحل دور ہے۔ وہ حضرات تو اپنی طاعات کو بھی طاعت نہیں سمجھتے اور اپنے کو طاعت سے تہی دست سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ مرنے کے وقت کہتے تھے:

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو شیئاً للہ از جمال روئے تو

(یعنی ہم آپ کے دربار میں مفلس ہو کر آئے ہیں اپنے جمال کے صدقے میں کچھ عنایت کیجئے)

دست بکشا جانب زنبیل ما آفریں بردست و بربازوئے تو

(ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھائیے آپ کی دست و بازو پر آفریں ہے)

اور فرماتے ہیں:

وفدت علی الکریم بغیر زاد من الحسنات والقلب السلم

(میں محبوب وکریم کے پاس اس حالت سے جا رہا ہوں کہ نیکیوں اور قلب سلیم کی زادراہ میرے پاس نہیں ہے)

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ چلے جا رہے تھے ندا آئی کہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کیا یہ قدم اس قابل ہے کہ ہمارا راستہ اس سے طے کرو؟ کھڑے ہو گئے‘ پھر ندا آئی کہ کیا ہم سے صبر آ گیا‘ چیخ مار کے بیہوش ہو گئے‘ ان حضرات کی تو یہ حالت تھی جناب! خالہ جی کا گھر نہیں بڑی کشاکشی ہوتی ہے لیکن اس میں ان کو ایسا لطف ہوتا ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت میں وہ حلاوت نہیں ہے۔

گدایانے از پادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور
(ایسے فقیر کہ بادشاہی سے متنفر ہیں اور محبوب کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں)
دمادم شراب الم درکشند وگر تلخ بینند دم در کشند
(ہردم رنج والم کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش رہتے ہیں)
اگر ان سے پوچھا جائے کہ تم سلطنت زیادہ پسند کرتے ہو یا اس طریق کے اندر جو تم کو مشقت اور تعب لاحق ہے وہ پسند کرتے ہو تو وہ زبان سے یہ کہیں گے:
نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی
(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تیغ کا کشتہ ہو عاشقوں کا سر سلامت رہے کہ اسی پر آپ خنجر آزمائی فرمائیں)

معیار مواخذہ

یہاں ایک بات یاد آئی وہ یہ ہے کہ بزرگوں سے جو ظاہراً چھوٹی چھوٹی باتوں پر مواخذہ ہوتا ہے سو وہ بالنظر الی عظمت الحق (عظمت خداوندی کی طرف نظر کرکے) واقع میں چھوٹی نہیں اور مواخذہ ہونا ان پر عجیب نہیں ہے وہ قابل مواخذہ ہوتی ہیں اوروں سے جو مواخذہ نہیں ہوتا یہ البتہ عجیب ہے اور ان سے مواخذہ نہ ہونے کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ حکام کے سامنے گنوار بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ واقع میں وہ خلاف ادب اور قابل مواخذہ ہیں اگر وہی باتیں رشتہ دار کہے تو ابھی معتوب ہونے لگے جس کی وجہ یہی ہے کہ گنواروں کو خبر نہیں اور یہ باخبر ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ وہ باتیں فی نفسہ چھوٹی نہیں لیکن چونکہ عوام کم عقل ہیں اس لیے حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ معاف فرما دیتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک عابد جنگل میں رہتا تھا اور اس کے پاس ایک گدھا تھا' بارش کی کمی سے گھاس جل گئی تھی' دفعۃً بارش ہوئی اور گھاس سے تمام جنگل ہرا ہو گیا تھا' وہ گدھا گھاس پر چرتا پھرتا تھا' عابد کی نظر اس پر پڑی تو محبت کے جوش میں آکر حماقت سے کہنے لگا کہ (توبہ توبہ) اے اللہ تعالیٰ اگر آپ کے پاس کوئی گدھا ہوتا اور وہ اس جنگل میں چرنے آتا تو میں کبھی اس کو نہ روکتا' یہ خبر اس زمانے کے نبی کو ہوئی ان کو بہت برا معلوم ہوا اور اس عابد پر بددعا کرنے کا ارادہ کیا' ارشاد ہوا کہ ہم ہر شخص سے اس کی عقل کے موافق معاملہ کرتے ہیں اس کو اتنی ہی عقل ہے تم بددعا مت کرنا۔ شبان موسیٰ کا قصہ مشہور ہے۔ غرض جس قدر ادب اور تہذیب ہوتی ہے اسی قدر تکلیف ہوتی ہے۔ پس عام لوگوں کو یہ غلطی ہے کہ

اللہ تعالیٰ کو دنیا کے عشاق پر اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو دنیا کے محبوبوں پر قیاس کر کے یہ سمجھا جائے کہ ان کے لیے سب کچھ مباح ہو جاتا ہے اس لیے کہ دنیا کے عاشق طبیعت کے مغلوب ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں طبیعت نہیں حکمت و علم ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی کے محبوب ہونے کے وہ معنی نہیں جیسے دنیا کے محبوب کے معنی ہیں یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بغیر ان کے بیقراری ہوتی ہے بس صرف مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جاتا ہے' دوسرے کسی میں کون سا جمال و کمال ہے جس سے اللہ تعالیٰ کو کسی سے بالمعنی الحقیقی محبت ہو جائے۔

محبوبیت کے لیے ذکر

بہت لوگ براہ ہوس اس لیے ذکر و شغل کرتے ہیں کہ ہم خدا کے ایسے ہی محبوب ہو جائیں۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص گنجا' اندھا' لنجا' بدصورت ہو اور وہ یوں چاہے کہ فلاں محبوب جو حور تمثال ہے مجھ پر عاشق ہو جائے' ایسے شخص کو عاقل لوگ تو احمق کہیں گے ایسے ہی جو ذاکر یہ چاہے کہ میں بالمعنی المتعارف محبوب بن جاؤں ذرا وہ اپنے کو یہ تو دیکھے کہ مجھ میں اور حق تعالیٰ میں کیا نسبت ہے۔ بخدا اگر اپنی حالت منکشف ہو جائے تو اسی پر تعجب ہو کہ مجھ کو کس طرح اس کی اجازت ہو گی کہ میں اس کو نظر محبت سے دیکھوں' جب محب ہونے کی بھی صلاحیت نہیں تو محبوب کے ہونے کے لیے ذرا منہ دھو رکھے' اپنے محبوب ہونے کے قابل بھی نہ ہونے کے باب میں خوب کہا گیا ہے:

بخدا کہ رشکم آید زدو چشم روشن خود | کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روئے

(بخدا مجھ کو اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ افسوس وہ محبوب کے پاکیزہ چہرہ کی طرف دیکھتی ہیں) اور

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم | گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)

اس بدصورت کو تو محبوب اگر ایک نظر دیکھنے کی بھی اجازت دے دے تو اسی پر تعجب ہونا چاہیے کہ مجھ میں کون سی بات ہے کہ محبوب نے مجھ کو اپنے دیکھنے کی اجازت دے دی۔

جاہ عند الحق

اس مقام پر بطور تفریح کے ایک مسئلے کا بیان کر دینا ضروری ہے جو حضرت حاجی صاحب قبلہ قدس سرہ کی بدولت حل ہوا۔ وہ یہ ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ جیسے جاہ عند الخلق مذموم ہے محققین کے

نزدیک جاہ عندالحق بھی اسی درجے میں ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جیسے نیک کام اس لیے کرنا کہ میں خلق کے نزدیک بزرگ اور بڑا بن جاؤں یہ برا ہے۔ اسی طرح اطاعت اس لیے اختیار کرنا کہ میں خالق کی نظر میں صاحب جاہ بنوں یہ بھی اہل بصیرت کے نزدیک امر منکر ہے، برا ہے اس لیے کہ کبریائی تو خاصہ خاص باری تعالیٰ کا ہے حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے جاہ کے کسی مرتبے کی بھی ہوس زیبا نہیں۔ الحاصل حق تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اس کے حاصل پر متوجہ ہوگیا ہے۔ یہاں پر ایک اور غلطی کا ازالہ کرنا بھی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا معشوق کہتے ہیں۔ چنانچہ شعراء اشعار نعتیہ میں اس مضمون کو باندھتے ہیں سو عشق کا خاصہ ہے عاشق کو مضطرب کر دینا اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہے مگر غضب یہ ہے کہ بعض بیباکوں نے اس اضطراب کو بھی نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے لیے مان لیا۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

پئے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسف محمد کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو دنیا میں بھیج دیا اور چونکہ وہ معشوق تھے اور عاشق کو بدون معشوق کے قرار نہیں ہوتا اس لیے تسلی کے واسطے سایہ ان کا وہاں رکھ لیا کہ اسی سے مجھ کو تسلیم رہے گی۔ جیسے یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کے کرتے سے تسلی ہوگئی تھی یہ نعت نہیں یہ حد درجے کی بے ادبی ہے۔ باری عزاسمہ کی جناب میں اور نیز حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی ایسے اشعار سننا اور پڑھنا گناہ ہیں احتراز ضروری ہے بعض دینداروں کو بھی خبط ہوتا ہے کہ اشعار نعتیہ خواہ ان کا مضمون شریعت پر منطبق ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو ذوق وشوق میں پڑھتے ہیں۔ بعض اشعار نعت کے ایسے ہیں کہ ان میں دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام کی بے ادبی ہوتی ہے۔ الحاصل معشوق کہنا یہ سخت بے ادبی ہے۔ اس لیے کہ عشق خاصہ آدمی کا ہے اس لیے کہ عشق نام ہے نفس کے ایک خاص انفعال کا اور اللہ تعالیٰ انفعال اور تاثر سے پاک ہے ہاں یہ کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول ہیں۔ اگر کوئی عشق کو معنی مجازی میں لینے لگے تو حق تعالیٰ کی جناب میں ایسا اطلاق اذن شرعی کا محتاج ہے۔ البتہ اگر کسی مغلوب الحال کے کلام میں ہو اس کو معذور سمجھیں گے بدون غلبہ حال کے کسی کو اجازت نہ ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ مقربان الٰہی کو محبوبان مجازی پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ پس جبکہ یہ مبنی ہی منہدم ہوگیا تو مبنی یعنی آدمی کا ایسے مرتبے پر پہنچنا کہ گناہ گناہ نہ رہے غلط ہوا اور بعضوں کو بزرگوں کے اس قول سے شبہ ہوگیا ہے کہ بندہ ایسے موقع پر پہنچ جاتا ہے کہ تکالیف شرعیہ اس سے اٹھ جاتی ہیں یہ قول صحیح ہے لیکن اس کے یہ معنی سمجھنا

کہ طاعات کا وجوب نہیں رہتا یہ غلط ہے۔ معنی اس قول کے یہ ہیں کہ طاعات اس کے لیے طبعی بن جاتے ہیں۔ جیسے افعال طبعیہ میں طبیعت ان کے ارتکاب کی طرف مضطر ہوتی ہے اسی طرح طاعات کی اس کو رغبت ہو جاتی ہے۔ تکالیف اس کو تکالیف نہیں رہتیں۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ تمام بیان کا ان غلطیوں کا ارتفاع ہوا کہ جی بھر کر گناہ اس لیے کرنا کہ گناہ کی ہوس نہ رہے اور گناہ کو کسی مصلحت کی وجہ سے کرنا اور خدا کا مقرب ہو جانے سے اور کسی گناہ کے مکشوف ہونے سے کسی گناہ کا حلال ہونا۔ بعض اغلاط قصداً رفع کیے گئے بعض تبعاً مذکور ہوئے اب اس سے قرآن شریف کی جامعیت کا بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مختصر الفاظ کتنے معانی کو مشتمل ہیں اس کے بعد سمجھیے! کہ! ایسی غلطیوں کی اصلاح علم اور صحبت محققین سے ہوتی ہے اس لیے ان دونوں کو اختیار کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمام غلطیوں سے محفوظ رکھیں۔ آمین

(برحمتک یا ارحم الراحمین)

مضار المعصیۃ

معصیت سے طاعت کی برکت کم ہو جانے کے بارے میں یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں ۱۸ شعبان سنہ ۱۳۳۰ھ یوم جمعہ کو ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۱۵۰ تھی۔ مولوی سعید احمد صاحب مرحوم نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. فقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی حق الصائم.

مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِہٖ فَلَیْسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ[1]

ترجمہ: "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے دار کے حق میں ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص نے قول باطل اور اس پر عمل کرنا ترک نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ کو اسکے بھوکے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

تمہید

یہ عبادت ایک حدیث کا جزو یاد پڑتا ہے یا یہ پوری حدیث ہو یا اس کے قریب لفظ ہوں۔ بہر حال یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: روزے کے بارے میں اور ہر چند کہ رمضان سے قبل ایک اور جمعہ بھی آنے والا ہے مگر چونکہ وہ جمعہ غالباً سفر میں ہوگا اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ آج ہی رمضان کے متعلق کچھ مختصر بیان کر دیا جائے اور اتفاق سے اس کے ساتھ ہی ایک مضمون موعود بھی بیان ہوگا جس کا خیال بہت دنوں سے تھا مگر خدا تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ چونکہ وہ مضمون علمی مضمون ہے عوام کی سمجھ میں نہ آ سکتا تھا اس لیے ایک ایسے مضمون کے ساتھ جو کہ عام فہم بھی ہے اور دلچسپ بھی ہے بیان ہو جائے اور وہ مضمون یہ ہے کہ میں نے یہ بیان کیا تھا اور اجمالی دعویٰ کیا تھا کہ ہر چند کہ طاعات کا صحیح ہونا اس پر موقوف نہیں کہ گناہ کو بالکل چھوڑا جائے اور یہ بات نہیں کہ گناہ کے رہتے ہوئے طاعات صحیح نہ ہو لیکن طاعات کی برکت ضرور کم ہو جاتی ہے یعنی اگر کوئی نماز بھی پڑھتا ہو اور غیبت بھی کرتا ہو تو یہ نہ کہیں گے کہ غیبت کی وجہ سے نماز صحیح نہیں ہوئی جیسا بعض

[1] (سنن ابی داؤد: ۲۳۶۲، سنن الترمذی: ۷۰۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۹۹)

لوگوں کا یہ خیال ہو جاتا ہے کہ جب گناہ نہ چھوڑے تو طاعت ہی کو ترک کر دیتے ہیں اس لیے اس مضمون کے بیان کرنے کی ضرورت ہوئی کہ اگر گناہ بھی کرے اور طاعت بھی تو دونوں کی جزا و سزا الگ الگ ہے دونوں ملے ہوئے نہیں ہیں اس لیے طاعت ہی کے ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے ورنہ ظاہراً اس مضمون کا بیان کرنا بھی لوگوں کی حالت کو دیکھ کر مناسب نہ تھا کیونکہ اگر وہ اعتقاد رہتا کہ گناہ کرنے سے طاعت صحیح نہ ہوگی تو شاید اس کی بدولت گناہ چھوڑنے کی کوشش کرتے اور اس سے بچ جاتے اور بیان کرنے میں اندیشہ ہے بے فکر ہو جانے کا لیکن مایوسی کی مضرت چونکہ بہت بڑی ہے یعنی اگر یہ خیال ہو گیا کہ میری سب طاعات بیکار ہیں تو اس میں زیادہ مفسدہ ہے اور بے فکری میں ایسا زیادہ اندیشہ نہیں کیونکہ اس میں شعائر دین پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا اور مایوسی کی حالت میں نماز روزہ وغیرہ پر اثر پڑتا ہے کہ اس کو چھوڑ بیٹھے گا یہ تو عملی اثر ہے کہ اسلام کی رونق جاتی رہے گی اور اعتقادی اثر یہ ہوگا کہ رحمت خداوندی اور بخشش سے مایوسی ہو جائے گی کیونکہ گناہوں کی پوٹ ہر وقت نظر کے سامنے ہوگی اور نیکی کوئی بھی پیش نظر نہ ہوگی اس لیے شیطان مایوس کر دے گا اور ایسی مایوسی کی حالت میں اگر خاتمہ ہو گیا تو کفر پر خاتمہ ہوگا اور یہ شخص اپنے گناہوں سے توبہ بھی نہ کرے گا کیونکہ بالکل ناامید ہو چکا ہے تو تلافی کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ چنانچہ بعض لوگوں کو یہ بات پیش آئی ہے الجواب الکافی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص سے مرتے وقت کہا گیا کہ کلمہ پڑھ لے مگر اس نے کہا کہ ایک کلمہ سے کیا ہوگا' میرے گناہوں کی پوٹ اتنی ہے کہ ایک کلمہ اس کو میرے سر سے اتار نہیں سکتا' آخر اس میں خاتمہ ہو گیا تو چونکہ اس اعتقاد کا یہ مفسدہ سخت تھا اس لیے اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہوئی اور یہیں سے ان واعظین کی غلطی بھی معلوم ہو گئی ہوگی جو بے حد متشدد ہیں اور اپنے تشدد کی وجہ سے صرف سخت مضامین سناتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سامعین کو بالکل ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور کچھ کہا ہی نہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ سختی کی بھی ایک حد ہونی چاہیے اس وقت قلوب علی العموم ضعیف ہیں ان کو اگر خوش کر کے ابھارا جائے تو ان سے عمل دین کی زیادہ توقع ہے اور مایوس کر کے کوئی کام ان سے نہیں لیا جا سکتا اور اس لیے بھی ضروری ہے اس خیال کی تغلیط کر دیں کہ گناہ کرنے سے نیکی کا ثواب نہیں ملتا اور ہر چند کہ یہ مضمون مستقل بیان کرنے کے قابل تھا مگر آج کے مضمون کے ساتھ مل جانا حسن اتفاق ہے اور آج کا مضمون یہ ہے کہ جو شخص روزے کے درمیان میں جھوٹ اور برے کاموں کو نہ چھوڑے تو خدا تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے یعنی جب کام گناہ کا اور بات گناہ کی نہ چھوڑے تو کیا فائدہ روزے کا ہوا۔

اجمالی مضامین

تو میرے اس بیان کے تین جزو ہوں گے۔ ایک یہ کہ گناہ کرنے سے نیک کاموں کا ثواب ضائع نہیں ہوتا۔ دوسرا دعویٰ (اور یہی مقصود تھا) یہ کہ ہر چند کہ ثواب ملتا ہے مگر نیک کاموں کی برکت کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً غیبت کی اور پھر نماز بھی پڑھی تو یہ نہیں کیا جائے گا کہ نماز کا ثواب نہیں ملا لیکن نماز کی برکت ضرور کم ہو جائے گی۔ یعنی جو نورانیت غیبت کے ترک کی حالت میں نماز کے اندر ہوتی ہے وہ نورانیت اب ارتکاب غیبت کے وقت نہ ہوگی اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے غذا اگر قوی تندرست کھائے تب بھی نافع اور مقوی اور بدل ما یتحلل ہوگی اور مریض کھائے تب بھی لیکن تندرست کو زیادہ نافع ہوگی اور بیمار کو کم مثلاً اگر خمیرہ گاؤ زبان عنبری کسی ایسے شخص کو کھلایا جائے جس کا معدہ خراب ہو اور ہنوز تنقیہ نہ ہوا ہو تو زیادہ مفید نہ ہوگا۔ اگرچہ کم وبیش اثر ضرور ہوگا اور اگر تنقیہ کرانے کے بعد کھایا جائے تو بے حد مفید ہوگا' تو گناہوں کو چھوڑنے کے بعد جو نیک کام ہوں گے ان میں زیادہ برکت ہوگی۔ تیسرا جزو بیان کا یہ ہے کہ جس کے متعلق حدیث پڑھی ہے اور مسئلہ جو کہ حدیث میں مصرح ہے کہ جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بولنا نہ چھوڑے تو اس کو روزہ رکھنے سے فائدہ کیا ہوا۔ حاصل یہ ہے کہ روزہ کے آداب ضرور یہ میں سے یہ ہے کہ جیسے منہ کھانے پینے سے بند رکھتے ہیں اسی طرح دوسرے گناہوں کو بھی بالکل ترک کر دیں۔ عجیب بات ہے کہ لوگ روزے میں کھانے پینے اور صحبت کے ترک کو ضروری سمجھتے ہیں اور گناہ کے ترک کو ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ وہ تینوں کام ایسے ہیں کہ دوسرے اوقات میں حلال بھی تھے اور رمضان میں بھی رات کے وقت جائز ہیں تو جب روزے کی وجہ سے بعض حلال کام بھی حرام ہو گئے تو جو اعمال ہر وقت حرام ہیں ان کا ترک روزے میں کیوں ضروری نہ ہوگا۔ پس اگر کسی نے روزے میں غیبت کی اور بری نگاہ سے کسی کو دیکھا تو یہ تو نہ کہیں گے کہ اس کا روزہ نہیں ہوا مگر یہ کہیں گے کہ روزہ کی برکت جاتی رہی اور یہ مضمون دوسرے مسئلہ کی فرع بھی ہے اور دلیل بھی۔ اب صرف پہلے مسئلہ کی دلیل کی ضرورت رہی۔ تو پہلا مسئلہ یہ تھا کہ باوجود گناہ کے بھی نیک کاموں کا ثواب ملے گا۔ دلیل اس کی یہ آیت: "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ" (جو شخص ایک ذرے کے برابر بھی کوئی بھلائی کرے گا اس (کے فائدے) کو دیکھے گا اور جو شخص ایک ذرہ بھی برائی کرے گا وہ اس کے سامنے آئے گی) لفظ من عام ہے مطیعین کو بھی اور عاصیین کو بھی تو جب یہ فرمایا کہ جو شخص کرے گا تو اس کے عموم میں گنہگار اور فرمانبردار اور دونوں داخل ہو گئے۔ اس سے صاف طور سے معلوم ہوا کہ نیک کام کرنے پر ہر حالت میں ثواب ملے گا کسی

وقت میں اس کا ثواب ضائع نہ ہوگا۔ اسی طرح دوسرے جملے میں بھی من عام ہے اور اس سے ناز کا علاج بھی ہوگیا جیسے پہلے من سے مایوسی کا علاج ہوگیا تھا' دوسرے من میں فرمانبردار بھی داخل ہوں گے یعنی اگر کوئی بڑا ولی کامل بھی گناہ کرے تو اس کو بھی گناہ ہوگا۔

ضرر گناہ

بعض لوگ اعتقاداً بعض حالاً یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ بھی کریں ہم کو گناہ نہیں ہوتا جن کو اس کا اعتقاد ہے وہ تو کفر میں مبتلا ہیں وہ اپنی مثال ایسی سمجھتے ہیں کہ جیسے ایک دریا ہو کہ اس میں اگر پیشاب کے قطرات گریں تو وہ ناپاک نہیں ہوتا بلکہ وہ پیشاب ہی اس میں فنا ہوجاتا ہے ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ تم نے جو اپنے کو دریا سے تشبیہ دی یہ تشبیہ تمہاری تراشی ہوئی ہے یا قرآن وحدیث میں کہیں یہ تشبیہ ہے۔ اگر تراشی ہوئی ہے اور تمہارے نزدیک ٹھیک ہے تو یہ بھی کرو کہ گورنمنٹ جس کی اب تک اطاعت کی ہے اب اس کی عملداری میں ڈکیتی ڈالو اور جب گرفتار ہوکر آؤ تو کہو کہ اب ہم دریا ہوگئے ہیں اگر اس عذر کو سن کر سرکار چھوڑ دے تو خدا سے بھی امید رکھو اور جیسے خدا سے امید باندھے بیٹھے ہو کہ وہ ہم کو دریا سمجھ کر چھوڑ دے گا ایسے ہی ڈکیتی ڈالنے میں سرکار سے بھی امید رکھنی چاہیے یہ سب نفس کی شرارتیں ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ واقع میں دریا تھے چنانچہ ارشاد ہے: "لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ" (اللہ تعالیٰ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف فرمادیں گے) آپ نے تو کبھی یہ دعویٰ کیا ہی نہیں تو آج کس کا منہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دریا کہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقبولیت پر یہ فرماتے تھے کہ "اِنِّیْ اَخْشَاکُمْ اللّٰہُ وَاَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ"[1] (میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جاننے والا ہوں) تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا اور اس بناء پر کبھی کسی کا حق نہیں دبایا۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ آپ نے ایک صحابی کو کوکھ میں انگلی چبھودی تھی انہوں نے کہا میں بدلہ لوں گا۔ آپ نے فوراً فرمادیا کہ بدلہ لے لو اور اپنی کوکھ ان کے سامنے کردی۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا بدن تو کھلا تھا اور آپ تو کپڑا پہنے ہوئے ہیں' آپ نے فوراً کرتہ اتار دیا وہ صحابی آپ کے پہلوئے مبارک سے چمٹ گئے اور بوسے دینے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا تو یہ مقصود تھا۔ لوگوں نے جو وفات نامہ میں حضرت عکاشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکایت

---

[1] (موارد الظمآن للهيثمي: ۱۲۸۸)

گھڑلی ہے وہ صحیح نہیں۔ حکایت یہ ہے کہ جو میں نے اس وقت بیان کی ہمارے اطراف میں جتنی کتابیں عورتوں میں رائج ہیں سب گھڑی ہوئی ہیں جیسے ساپن نامہ' معجزہ آل نبی' وفات نامہ' البتہ معجزہ ہرنی صحیح ہے اس کے علاوہ جتنی کتابیں قصوں کی ہیں بالخصوص جن کا میں نے نام گنوایا ہے سب لغو ہیں اور چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ ایک وہ مسدس ہے جس کا ٹیپ کا مصرع یہ ہے کہ مری بار کیوں دیر اتنی کری۔ یہ مسدس بھی نہایت لغو ہے اس کو ہرگز نہ پڑھنا چاہیے اس ظالم نے ابتداء سے انتہا تک خدا تعالیٰ سے لڑائی کی ہے کہیں انبیاء کے نبوت مل جانے پر حسد ہے کہیں سلاطین کی بادشاہت پر رشک ہے اور پھر ہر حسد کے بعد یہ شکایت کہ مجھے کیوں نہیں ملا یہ کتاب ہرگز اپنے پاس یا اپنے گھر میں رکھنے کے قابل نہیں۔ یہ اس قابل ہے کہ اس کو بلا تامل آگ میں رکھ دینا چاہیے۔ معجزہ آل نبیؐ جس میں یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے اپنے صاحبزادے کو کسی سائل کو دیدیا اور اس نے بیچ ڈالا' بالکل غلط اور لغو ہے۔ اسی طرح حضرت عکاشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکایت مشہور ہے بالکل غلط ہے' اصل میں اس کی صرف یہ ہے جو مذکور ہوئی۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کا حق نہیں رکھا۔

اسی طرح حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کبھی اپنے کو اتنا بڑا نہیں سمجھا' کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اتفاقاً اگر کسی پر سختی ہوگئی ہو تو بدلہ نہ دیا ہو۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملک شام میں ایک لشکر کے سپہ سالار تھے۔ وہاں کسی عیسائی بادشاہ کی تصویر کھڑی تھی' بعض مسلمانوں نے جوش میں اس تصویر کی ایک آنکھ پھوڑ دی' حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب خبر ہوئی تو آپ نے کہلا بھیجا کہ میں راضی ہوں کہ وہ لوگ اس تصویر کے بدلے میں میری ایک آنکھ پھوڑ ڈالیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا گیا کہ آپ اپنی زبان کو پکڑ کر کھینچ رہے اور فرما رہے ہیں "ھذا اوردنی الوارد" (اس نے مجھ کو مصیبت میں ڈالا) اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا گیا کہ مشکیزے میں پانی لے کر محلے میں بھرتے پھرتے ہیں پوچھا گیا تو فرمایا کہ ایک شخص نے آکر تعریف کی تھی۔ میں نے غور کر کے دیکھا کہ نفس اس سے خوش ہوا اس لیے اس کا علاج کر رہا ہوں۔ غور کیجئے ان دونوں صاحبوں نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم تو دریا ہیں ہمیں سب معاف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کرتا پہنا اور اس کی آستینیں تراش دیں' پوچھا گیا تو فرمایا کہ جب میں نے اس کو پہنا تو مجھے یہ اچھا معلوم ہوا اور طبیعت اس میں مشغول ہوئی اس لیے میں نے اس کی آستینیں پھاڑ دیں تاکہ یہ بدنما ہو جائے۔ اب یہ حالت ہے کہ اگر کہیں

بخئے میں بھی کمی رہ جائے تو درزی کے سر پر مارتے ہیں۔ وہ حضرات اچھے کپڑے کو بھی خراب کر لیتے تھے۔ غرض یہ کہ کسی کا یہ خیال کہ ہم دریا ہو گئے ہیں اور ہمیں گناہ سے ضرر نہ ہوگا بالکل غلط خیال ہے۔ اس قسم کے لوگ اب بھی موجود ہیں اور پہلے بھی ہوئے ہیں۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ بعض لوگ اپنی نسبت یہ کہتے ہیں کہ "نحن وصلنا فلا حاجة الى الصلوٰة والصوم" یعنی اب ہم پہنچ گئے ہیں اس لیے ہم کو نماز روزے وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ "صدقوا فی الوصول ولکن الی السقر" (پہنچے ہیں تو وہ سچے ہیں لیکن جہنم میں پہنچے ہیں) اور فرمایا کہ اگر ہزار برس کی میری عمر ہو تو اخیر عمر میں ایک وظیفہ بھی نہ چھوڑوں۔ غرض یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس آیت میں "وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ" (جو شخص ذرا برابر برائی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا) خدا تعالیٰ اس کا ابطال فرماتے ہیں۔

معصیت کا وبال

غرض اس جملے سے نار اور دلال کی جڑ کاٹ دی ہے لیکن اس وقت مقصود پہلا جملہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر گنہگار بھی نیک کام کرے تو اس پر اجر ملے گا اور معصیت کا وبال معصیت پر اگر وہ معاف نہ ہو تو الگ ہوگا جیسے کوئی حاکم اپنے عہدے کے کام کو بھی انجام دے اور رشوت بھی لے تو اگر حکام بالا کو اطلاع ہو جائے تو رشوت ستانی پر سزا ملے گی لیکن جس وقت تک عدالت کا کام کیا ہے اس وقت تک کی تنخواہ بھی ضرور ملے گی۔ تو پہلا دعویٰ اس آیت سے ثابت ہو گیا۔ رہا دوسرا دعویٰ کہ گو نفس عمل ضائع نہیں ہوا لیکن اس کی برکت اور نورانیت جاتی رہی۔ اس کی دلیل کے متعلق میں پہلے بھی اشارہ کر آیا ہوں کہ یہی حدیث اس کی دلیل ہے۔ اگرچہ اس کے سوا اور بھی دلائل ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر گناہ نہ چھوڑے تو خدا تعالیٰ کو کچھ ضرورت نہیں۔ اس پر تو سب کا اجماع ہے کہ گناہ کرنے سے روزہ باطل نہ ہوگا اور اس کی قضا کرنا نہ پڑے گی تو معلوم ہوا کہ اس حدیث کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ روزہ نہ ہوگا کوئی اور معنی ہیں سو وہ یہی ہیں کہ خدا تعالیٰ کو زیادہ توجہ اس ترک طعام پر نہ ہوگی اور یہی حاصل ہے اس کہنے کا کہ روزے کی نورانیت کم ہوگی اور یہ امر شاہد بھی ہے کہ اگر نیک کام کیا جائے اور گناہوں سے بچتا نہ رہے تو اس وقت طاعت کی بدولت جو نور ہوگا وہ گناہوں کے ساتھ ہرگز نہ ہوگا اور وہ رونق اور شگفتگی اور مسرت جو کہ طاعت کے کرنے سے ہوتی ہے وہ نہ ہوگی بلکہ ایسا ہوگا جیسا کہ بہت لذیذ کھانا پکایا اور اس میں تھوڑی راکھ بھی جھونک دی تو راکھ جھونکنے کے بعد بھی وہ کھانا تو رہا لیکن کرکرا ہو گیا۔ اسی طرح گنہگار آدمی نماز

تو پڑھتا ہے لیکن طبیعت پھیکی پھیکی رہتی ہے وہ نشاط اور انبساط جو نماز سے ہوتا ہے وہ اسکو نہیں ہوتا۔ اگر چہ دلیل سے گھیر چیپ کر یہ سمجھے کہ ثواب ملے گا لیکن قلب بالکل کورا ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس قدر بے برکتی ہوتی ہے کہ جو ثواب ملتا ہے وہ نظر بھی نہیں آتا بلکہ گناہوں کے حجاب میں چھپ جاتا ہے اس کی ایسی مثال سمجھئے کہ جیسے کسی آئینے میں چراغ کو رکھ کر اوپر سے سیاہ کپڑا لپیٹ دو اس صورت میں چراغ کی روشنی تو باقی رہے گی لیکن اس قدر دھیمی ہو جائے گی کہ بعض اوقات رستہ بھی نظر نہ آئے گا۔ البتہ بہت ہی کوئی دقیق النظر ہو تو وہ دیکھ لے گا یا کوئی دیکھ کر بتلا دے تو مان لیں گے باقی خود کچھ نظر نہ آئے گا تو چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ثواب ملے گا اس لیے ہم مانیں گے کہ اندر روشنی ہے مگر اس قدر مٹی پڑی ہے کہ وہ بالکل نظر نہیں آتی یہ تو اجمالاً دعویٰ تھا اور دلیل۔

گناہ کا نیکی پر اثر

مگر دوسری نصوص میں غور کرنے سے اس کی تفصیل کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اس تفصیل میں ان شقوں کا ذکر ہوگا جو کہ اس میں مسکوت عنہ ہیں یعنی گناہ کو طاعات سے دو قسم کا علاقہ ہے بعض تو وہ گناہ ہیں کہ نصوص سے ثابت ہے کہ وہ طاعات کو حبط کر دیتے ہیں آسان لفظوں میں اس کا حاصل یہ ہے (یہ عنوان طلبہ کے لیے سہل ہے) کہ بعض گناہ تو ایسے ہیں کہ قبولیت طاعات کے لیے ان کا نہ ہونا شرط ہے اور بعض ایسے ہیں کہ ان کو کوئی دخل نہیں ہے اور جن کو دخل ہے ان کی دو قسمیں ہیں بعض کا نہ کرنا صحت کی شرط ہے اور بعض کا نہ ہونا بقاء کی شرط ہے۔ اول جیسے کفر کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی عمل نیک صحیح نہیں ہے اور نہ باقی رہتا ہے یعنی اگر کوئی کافر نماز پڑھے تو صحیح نہیں اور اگر کوئی نماز پڑھ کر کافر ہو جائے تو وہ نماز باقی نہ رہے گی۔ یہاں سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ جو کلمات کفر کی پرواہ ہی نہیں کرتے چنانچہ دیکھا ہوگا کہ بعض لوگوں کو جب روزہ رکھنے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ روزہ وہ رکھے جس کے گھر کھانے کو نہ ہو۔ اگر کسی کے منہ سے یہ کلمہ نکلے گا تو وہ کافر ہو گیا اور اس کو نکاح پھر کرنا چاہیے حج پھر کرنا چاہیے پہلے سب عمل اس کے حبط ہو گئے جب تک اس سے توبہ نہ کرے تب تک اگر یہ کوئی نیک عمل آئندہ کو کرے گا تو وہ بھی مقبول نہ ہوگا۔ دوسرے علاوہ اس کے ایک اور عمل بھی ہے کہ نص قطعی سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس کا اثر بھی مثل کفر ہی کے ہے یعنی اس سے بھی حبط عمل ہو جاتا ہے اور وہ عمل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچائی جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کی جائے اگرچہ بلا مقصد ہو مگر قلت مبالات سے ہو اور اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ معلوم ہوگا کہ آپ کتنے جلیل القدر ہیں۔ وہ نص قطعی یہ ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ O

''اے ایمان والو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز بلند مت کرو اور نہ اس سے اتنی زور سے بات چیت کرو جتنی زور سے تم آپس میں کرتے ہو (اس سے) تمہارے اعمال بیکار ہو جائیں گے اور تم کو احساس بھی نہ ہوگا۔''

اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ بے ادبی سے حبط عمل ہوگا اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شریعت اسلامی نے سلیقہ اور ادب بھی سکھلایا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شریعت میں سوائے نماز روزے کے اور رکھا کیا ہے۔ واللہ العظیم لوگوں نے اسلام کی حقیقت دیکھی ہی نہیں اور جو کچھ دیکھا وہ ایسا ہے جیسا کہ کسی نے محبوب کا صرف ایک ناخن دیکھا ہو اور صورت چہرہ بالکل نہ دیکھا ہو۔

اسلام فہمی حقیقت

ایک بہت اچھی مثال یاد آئی۔ اس سے ہماری حقیقت فہمی اور اصل واقفیت کی پوری حقیقت کھل جائے گی۔ مشہور ہے کہ اندھوں کے شہر میں ایک ہاتھی آ گیا تھا جب سنا تو اس کے دیکھنے کا شوق ہوا لیکن آنکھیں تو تھیں نہیں دیکھتے کیونکر آخر سب اکٹھے ہو کر پہنچے اور اس کے قریب جا کر سب نے ہاتھ سے چھو کر اس کو دیکھا کسی کا ہاتھ تو سونڈ پر پڑا کسی کا پیر پر پڑا کسی کے ہاتھ میں کان آ گیا کسی نے دم پکڑ لی۔ دیکھ بھال کر آپس میں اس کی ہیئت کے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔ ایک نے کہا کہ ایسا تھا جیسا کھمبا ہوتا ہے دوسرے نے کہا نہیں بلکہ جیسا سانپ تیسرے نے کہا نہیں بلکہ جیسے چھاج چوتھے نے کہا نہیں بلکہ جیسے مورچھل۔ مولانا رومی اس حکایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ اگر کوئی بینا ہوتا تو کہتا کہ تم سب سچے ہو اور سب جھوٹے ہو سچے تو اس لیے کہ جس نے جو کچھ دیکھا وہی آ کر بیان کر دیا اور جھوٹے اس لیے کہ اصل حقیقت کی خبر ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں ہوئی۔ اس وقت مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے کہ انہوں نے اسلام کو عموماً پورا نہیں دیکھا سمجھتے ہیں کہ صرف وضو نماز ہی کا نام اسلام ہے وبس۔ میں ایک مقام پر گیا وہاں ایک سکول بھی تھا اور اس میں دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ نصاب دینیات کو دیکھا تو اسے میں صرف راہ نجات اور غضب یہ کہ اس کو کافی سمجھتے تھے میں نے کہا کہ صاحبو! اگر راہ نجات تمام ضروریات دین کے لیے کافی ہے تو بتلایئے اگر ایک شخص کے پاس تیل ہو اور ایک کے پاس سرسوں ہو اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بدلنا چاہیں تو اس کی کیا صورت ہوگی اور کیسے یہ بدلا جائے گا؟ سن کر کہنے لگے کہ کیا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ افسوس ہے کہ معاملات کو اور معاشرت کو علی العموم لوگوں

کے دین سے خارج سمجھ رکھا ہے لیکن تعجب ہے کہ قانون خداوندی سے تو اپنے معاملات اور معاشرت کو مستثنیٰ سمجھ لیا اور گورنمنٹ کے قانون سے مستثنیٰ نہ سمجھا۔ کبھی کسی نے گورنمنٹ سے نہ کہا ہوگا کہ تجارت وغیرہ میں آپ کو کیا دخل ہے؟ آپ صرف امور انتظام سلطنت میں ہم سے باز پرس کیجئے؟ باقی یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں ہم کو لیسنس وغیرہ کا مقید کیوں کیا ہے کیا کوئی شخص ایسا کہہ سکتا ہے؟ اور اگر کہے تو پھر دیکھئے گردن ناپی جاتی ہے یا نہیں یقیناً گردن ناپی جائے گی اور کہا جائے گا کہ جب ہم حاکم ہیں تو ہم کو ہر امر میں قانون مقرر کرنے کا حق ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ گورنمنٹ کو تو اس کہنے کا حق دار سمجھا جائے اور خدا تعالیٰ کے قانون کو صرف وضو اور نماز وغیرہ میں منحصر کر دیا جائے تو خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے ایک قانون مقرر فرمایا ہے اور ہر چیز کا ایک قاعدہ بتلایا ہے مگر چونکہ لوگ دین کو ناتمام طور پر دیکھتے ہیں اس لیے صرف نماز روزہ یا زیادہ سے زیادہ معاملات تک شریعت کے احکام کو وسعت دی جاتی ہے اور وضع اور معاشرت و اخلاق کو اس سے خارج سمجھتے ہیں۔

تہذیب اسلام

نیز بعضے لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں اور شریعت اسلام کو تہذیب سے معریٰ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک یک چشم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ دہلی گیا' سیر کے لیے چاندنی چوک میں نکلا' اتفاق سے آپ کی گردن نہ مڑ سکتی تھی اس لیے جاتے وقت صرف ایک طرف کی دکانیں نظر آئیں' دوسری جانب کی نظر نہ آئیں۔ جب وہاں سے واپس ہونے لگا تو دوسری جانب کی دکانیں نظر آئیں ان کو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں کہ دہلی کے لوگ بھی کیا ستم کے لوگ ہیں ابھی یہ دکانیں داہنی جانب تھیں' ابھی ہمارے لوٹنے سے پہلے ان کو بائیں جانب اٹھا کر رکھ دیا تو ہمارے بھائیوں نے بھی شریعت کو صرف ایک طرف دیکھا وہ محتاج سمجھتے ہیں ورنہ شریعت اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ دنیا میں کسی قوم کے اندر بھی اتنی تہذیب نہیں ہے۔ چند روز آکر ہمارے پاس رہو اور پھر دیکھو کہ وہ شریعت جس کو آج خونخوار بتلایا جارہا ہے وہ کیسی دل فریب ہے جب اس کی حقیقت سے واقف ہوگے تو اس پر عاشق ہو جاؤ گے اور یہ کہو گے کہ

زفرق تابقدم ہر کجا کہ مے نگرم   کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

(کہ سر سے پیر تک جہاں نظر کرو دل کھنچا چلا جاتا ہے)

آداب بزرگان

تو ان ہی تہذیبوں میں سے ایک تہذیب یہ بھی ہے کہ "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ" (اے ایمان والو! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز

بلند مت کرو) اور اس سے معلوم ہوا کہ بڑوں کے سامنے جھجک کر بولنا چاہیے۔ البتہ بات جو کہو نہایت صاف کہو کہ اس میں کسی قسم کی پیچیدگی اور تخلک نہ ہو جائے اب ہم میں یہ منحوس حالت ہے کہ ہم دونوں میں فرق نہیں کرتے اب یا تو تکلف ہوتا ہے کہ اپنی حالت بھی صاف بیان نہیں کرتے جیسا کہ آج کل مدعیان محبت کی یہ حالت ہے کہ اگر ادب کریں گے تو یہ کہ چار دن تک رہیں گے لیکن یہ نہ بتلائیں گے کہ کس ضرورت کے لیے آئے تھے اور جب عین چلنے کا وقت ہوگا تو کہیں گے کہ میرے بارے میں کیا ارشاد ہے اور اگر کہو کہ بھائی تم نے اپنی حالت تو کہی ہوتی پھر رائے لی ہوتی تو اسکا یہ جواب کہ حضور کو تو سب روشن ہے۔ حضور کو اپنی تو خبر ہی نہیں ان کی حالت حضور پر روشن ہوگئی۔ میں کشف کا انکار نہیں کرتا لیکن کشف اختیاری نہیں ہوتا وہ بالکل خارج از اختیار ہے۔ دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کو مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر نہ ہوئی اگر کشف امر اختیاری تھا تو کیوں حضرت یعقوب علیہ السلام مطلع نہیں ہوئے اور جب خبر ہوئی تو اس طرح کہ مبشر کرتہ لے کر چلا تو آپ نے فرمایا کہ "اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ" (بلا شبہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو محسوس کرتا ہوں) لیکن یہ کہہ کر ڈرے کہ لوگ کہیں گے کہ اب تک تو آپ کو پتہ چلا نہیں اب یوسف علیہ السلام کی خوشبو آنے لگی اس لیے میرے کلام کو ہذیان پر محمول کریں گے۔ اس لیے فرمایا: "لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنَ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّکَ لَفِیْ ضَلٰلِکَ الْقَدِیْمِ" (خوشبو آ رہی ہے وہ (پاس آنے والے) کہنے لگے کہ بخدا آپ تو اپنے اس پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں) وہ حالت ہے کہ:

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

(کبھی تو نہایت ہی بلند مقام پر بیٹھتا ہوں اور کبھی اپنے پیچھے بھی نہیں دیکھتا)

تو یہ کیا ضرور ہے کہ ہر وقت کشف ہوا ہی کرے اور وہ تمہارا حال خود بخود جان جایا کرے۔

اس کی تعلیم فرماتے ہیں عارف شیرازی:

چند انکہ گفتم درد از طبیباں درماں نہ کردند مسکین غریباں

مادر دل را بایار گفتیم نتواں نہفتن درد از حبیباں

(میں نے ہر چند طبیبوں سے اپنا درد بیان کیا لیکن کسی نے مجھ مسکین کا علاج نہیں کیا' ہم نے درد دل اپنے محبوب سے کہہ دیا اور محبوب سے درد کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتے)

مصرع ثالث میں بتلا دیا کہ اپنا حال دل پوشیدہ نہ کرے۔

ممانعت اخفاء

یہاں تک تعلیم ہے کہ اگر عیب بھی ہو تو مرشد سے صاف کہہ دے کہ میرے اندر یہ مرض ہے بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ لڑکوں کی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے اس مرض کو بلی کے گو کی طرح چھپا لیتے ہیں اس سے کچھ نتیجہ نہیں ہوتا اور چھپانے کا حکم اس موقع پر ہے کہ جہاں اظہار میں کوئی مصلحت نہ ہو اور طبیب کو دکھلانے کی ممانعت نہیں ہے اظہار کی ممانعت ایسے موقع پر ہے جیسے کہ ایک شخص کی نسبت سنا ہے کہ جب حج کو گیا تو رمی جمار کے وقت ایک لمبا جوتہ لے کر ان تین پتھروں میں سے ایک پتھر کو خوب پیٹ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ کم بخت فلاں دن تو نے مجھ سے یہ گناہ کرایا تھا اور فلاں رات کو تو نے مجھے زنا میں مبتلا کیا تھا' ایسے موقع پر کسی ضرورت اور مصلحت کے اظہار کرنا یہ تو حماقت ہے مگر طبیب سے ہرگز نہ چھپاؤ اور اگر یہ خیال ہے کہ ہم ان کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں گے تو ایسے شخص کو پیر نہ بناؤ جس پر یہ احتمال ہو کہ وہ تم کو ذلیل سمجھے گا یا رسوا کرے گا اور جو سچے لوگ ہوتے ہیں وہ کسی کو ذلیل نہیں سمجھتے کیونکہ جانتے ہیں کہ:

تا یار کرا خواہد میلش بکہ باشد

(اس وجہ سے کہ پھر وہ دوست کس کو بنائے گا اور کس کی طرف مائل ہوگا)

وہ تو کتے کو بھی ذلیل نہیں سمجھتے وہ کسی کی نسبت یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ مقبول نہ ہوگا ان کا مذہب یہ ہے کہ:

غافل مرد کہ مرکب مردان زہد را	در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
تو مید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش	تا گہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل ہو کے مت چل اس وجہ سے کہ اہل زہد کی سواریوں نے صحرا کی پتھریلی زمین میں ٹھوکریں کھائیں اور ان کے پاؤں کٹ گئے)

تو جن کا یہ مذہب ہو تو وہ کسی کو حقیر سمجھیں گے؟ ہرگز نہیں اور اگر کہے کہ وہ کسی سے کہہ دیں گے اور وہ ہم کو ذلیل سمجھے گا تو یاد رکھو کہ وہ کسی سے نہ کہیں گے وہ خدا کا راز تو کہتے نہیں جس کے ظاہر کرنے سے خدا تعالیٰ کا کوئی ضرر نہیں۔ تمہارا راز کیا کسی سے کہیں گے جس کا اظہار تمہارے لیے مضر ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق رودلوی رحمۃ اللہ علیہ خود اسرار اللہ کے باب میں فرماتے ہیں کہ منصور بچہ بود از یک قطرہ بغیر یاد آمد اینجا مرد آنند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نزنند (منصور بچہ تھا کہ ایک ہی قطرے میں فریاد کرنے لگا' یہاں تو مرد ہیں کہ دریا کا دریا پی جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں

لیتے) غرض جب یہ بھی اندیشہ نہیں تو ویسی ہی عزت سب کی نظر میں رہے گی جیسے کہ اب ہے اور ویسی ہی ان کی نظر میں بھی رہے گی۔

اور اس لیے حدیث میں آیا ہے کہ اگر ضرورت کی وجہ سے کچھ مانگو تو صلحاء یعنی بزرگوں سے مانگو کیونکہ بھیک بوجہ اپنی ذلت اور دوسرے کی نگرانی کے حرام ہے اور بزرگوں میں یہ دونوں باتیں نہ پائی جائیں گی' ذلت تو اس لیے کہ وہ کسی کو ذلیل نہیں سمجھتے اور گرانی اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ بوجہ آزادی کے پابند نہیں کہ ضرور ہی دیں اگر نہ ہوگا تو بے تکلف عذر کر دیں گے اور اگر کبھی غفلت سے ایسا ہوا بھی کہ وہ ذلیل سمجھیں تو ان کو فوراً تنبیہ کی جاتی ہے اس لیے پھر آئندہ اس کا احتمال نہیں رہتا۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد میں ایک شخص کو دیکھا کہ خوب قوی اور تندرست موٹا تازہ ہے اور بھیک مانگتا ہے۔ انہوں نے اپنے دل میں اس پر طعن اور اعتراض کیا' رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی مردے کا گوشت کھانے کو کہتا ہے اور ان کے انکار پر کہتا ہے کہ تم نے آخر اس فقیر کی غیبت کر کے مردے کا گوشت کھایا نہیں تھا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے تو اس کو کچھ نہیں کہا' جواب ملا کہ کیا غیبت دل میں نہیں ہوتی؟ بلکہ اول تو دل ہی میں پیدا ہوتی ہے۔

ان الکلام لفی الفواد وانما جعل اللسان علی الفواد دلیلا

(کلام دل میں ہوتا ہے اور زبان صرف دل کی ترجمان بنائی گئی ہے)

آپ بیدار ہو کر چلے' معاف کرانے کے لیے اس شخص نے آپ کو آتے دیکھ کر دور ہی سے یہ آیت پڑھی "هُوَالَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِہٖ" (وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں) اور پھر فرمایا کہ پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔ تو یہ شخص بہت بڑا کامل تھا۔ غرض بزرگوں کی اس طرح اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ کسی کو حقیر نہیں سمجھتے بلکہ دنیا بھر سے اپنے ہی کو اذل و ارذل سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ کوئی شخص مومن کامل نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے کو کافر فرنگ سے بھی بدتر نہ سمجھے تو چونکہ وہ لوگ اپنے کو بہت ہی حقیر سمجھتے ہیں اس لیے ان کے سامنے اپنے عیب کا ظاہر کر دینا کچھ مضائقہ نہیں اور اگر کہو کہ کسی بزرگ کا کلام ہے کہ:

چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن کہ حال خستہ دلاں را تو خوب میدانی

(تیرے سامنے حال دل کہنے کی کیا ضرورت ہے تو خستہ دلوں کی حالت کو خوب جانتا ہے)

تو سمجھو کہ یہ خطاب خدا تعالیٰ کو ہے نہ کہ کسی ولی یا بزرگ کو لیکن کہو خدا تعالیٰ سے بھی ضرور تاکہ تمہاری عاجزی اور احتیاج ظاہر ہو اور پیر سے اس لیے ضرور کہو کہ اس کو کشف ہونا ضروری نہیں ہے۔

دوسرے اگر کبھی ہوا بھی ہو تو تم کو کیا خبر؟ کیا تم کو بھی اس کے کشف کا کشف ہوا ہے؟ تو یہ تو تکلف ہے بزرگوں کے پاس جا کر کچھ نہ کہیے اور یہ بے ادبی کہ وہاں جا کر پتھر توڑنے لگے۔ اسی کو فرماتے ہیں کہ: "لَاتَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَاتَجْهَرُوْالَه بِالْقَوْلِ" (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز بلند مت کرو اور نہ ان سے اتنی زور سے بات کرو جتنی زور سے آپس میں بات کرتے ہو)

تعلیم ادب

عرب میں بے تکلفی بہت زیادہ تھی بڑے بڑے لوگوں کے نام لیتے تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی بعض نے لیا' خدا تعالیٰ نے اس تعلیم میں اس کی ممانعت فرمائی اور یہ فرمایا کہ ہم اس لیے کہتے ہیں کہ تمہارے اعمال حبط نہ ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ "انتم لاتشعرون" (تم کو احساس بھی نہ ہوگا) کے معنی میں یہ سمجھا ہوں کہ حبط ہوتا ہے ایذاء سے اور ایذاء ہوتی ہے ایسے شخص کی بے ادبی سے جو مؤدب سمجھا جاتا ہو اور یہ فطری قاعدہ ہے۔ چنانچہ حکام کو دیکھو کہ دیہاتیوں سے بہت سی باتیں گوارا کر لیتے ہیں جو کہ شہریوں سے ہرگز گوارا نہیں ہو سکتیں۔ ایک دیہاتی کی حکایت ہے کہ اس نے ایک درخواست پیش کی تو کاغذ پر ٹکٹ نہیں لگایا اور جب حاکم نے اس سے کہا کہ اس پر ٹکٹ لگاؤ تو روپیہ جیب سے نکال کر کہتا ہے لے روپیہ بس تیری صاحبی معلوم ہوگئی اس میں سے ٹکٹ لگا لیجو جو بچے رکھ لیجو' حاکم ہنس کر خاموش ہو گیا اور درخواست مفت لے لی' بھلا کوئی شہری تو ایسا کر کے دیکھے کہ اس کی کیا گت بنتی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں:

سنت عاشق زملتہا جداست — عاشقاں را مذہب و ملت جداست

(عاشق کا مذہب سارے مذہبوں سے جدا ہے اور ان کی ملت سب سے الگ ہے)

گر خطا گوید ورا خاطی مگو — ورشود پرخوں شہیداں رامشو

(اگر وہ غلط ہے تو ان سے غلط کو مت کہو اور اگر وہ شہید ہو جائے تو اس کا خون مت دھو)

موسیا آداب دانا دیگر اند — سوختہ جاں و رو اما دیگر اند

(اے موسیٰ آداب سے واقف دوسرے ہیں اور سوختہ جان اور روح والے دوسرے ہیں)

تو دیکھیے خود فرماتے ہیں کہ موسیا آداب دانا دیگرند۔ اس لیے مولانا فرماتے ہیں کہ

بااداب ترنیست زوکس درجہاں — بے ادب ترنیست زوکس درجہاں

(اس سے زیادہ باادب دنیا میں کوئی نہیں اس سے زیادہ بے ادب دنیا میں کوئی نہیں)

اس کی کئی توجیہیں ہو سکتی ہیں۔ من جملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض عشاق بہت باادب

ہوتے ہیں اور بعض مغلوب الحال ہوتے ہیں اور پہلوں کو فوراً تنبیہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ بارش پر یہ فرمایا کہ آج کیسے موقع سے بارش ہوئی ہے فوراً تنبیہ کی گئی کہ او بے ادب! اور بے موقع کس روز ہوئی تھی؟ سن کر ہوش اڑ گئے اور مواخذہ بالکل سچا ہے کیونکہ بے موقع کبھی بھی نہیں ہوتی تو باادب جب بے تمیزی کرتا ہے تو بہت ناگواری ہوتی اس کی اصلاح اس آیت میں فرماتے ہیں اور اس کی متعدد جگہ اصلاح فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

"يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِى النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَايَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ○

ترجمہ کا حاصل یہ ہے کہ اے مومنو! تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں بجز دعوت کے ویسے مت جاؤ اور اس میں بھی پہلے سے جا کر انتظار تیاری میں مت بیٹھو بلکہ جب بلایا جائے جاؤ اور کھاتے ہی منتشر ہو جاؤ اور باتوں میں مشغول ہو کر مت بیٹھ جاؤ اس سے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایذا ہوتی ہے اور وہ لحاظ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کیوں شرمائے وہ تو خدا تعالیٰ ہیں۔ دیکھئے اس انداز سے کیا صرف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے کیسا ہے بے دھڑک فرمایا کہ "وَاللّٰهُ لَايَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ" (اور حق تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتے) ایک جگہ ارشاد ہے: "لَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا" (ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی تھی بس اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قول سے بری کر دیا) غرض اس کا بہت اہتمام فرمایا گیا ہے کہ ایذا نہ ہو تو ایذاء رسول حرام ہے۔

اثر ایذاء رسول

اس کا وہ اثر ہے جو کہ کفر کا ہے اور بعض اوقات یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ ایذاء ہوئی ہے یا نہیں اور اعمال حبط ہو جاتے ہیں اس لیے ارشاد ہوا کہ وہ کام بھی نہ کرو جس میں ایذاء کا احتمال بھی ہو اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچانے سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ ثابت ہو جائے کہ حبط کے کچھ اور معنی ہیں تو خیر۔ لیکن اس وقت تک مجھے یہی معلوم ہے کہ حبط کے یہی معنی ہیں تو معاصی میں صرف یہ معصیت ایسی ہے۔ البتہ کفر تو ایسی چیز ہے کہ طاعت کی بقاء اور صحت دونوں اس کے ترک پر موقوف ہیں اور بعض معاصی ایسے ہیں کہ ان کا ترک ہی شرط بقاء عمل ہے یعنی

عمل تو صحیح ہوگیا تھا لیکن وہ معلق رہا کہ اگر وہ عمل نہ ہوتا تو باقی رہتا ورنہ باطل ہوجاتا چنانچہ قرآن شریف میں ہے: "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی" (اے مومنو! اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل مت کرو) لاتبطلوا کے معنی یہ ہیں کہ قبل من واذی ثواب تو ہوا تھا وہ من واذی سے پھر جاتا رہا۔ غرض بعض معاصی کو یہ دخل ہوا۔ پس ہمارے اس دعوے میں کہ معاصی سے طاعات کا ثواب زائل نہیں ہوتا۔ معاصی سے مراد ایسے معاصی مذکورہ نہیں ہیں بلکہ وہ معاصی مراد ہیں جن کے وجود کو طاعت کے وجود یا بقاء میں دخل نہ ہو ایسے گناہوں میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ان سے نیکیاں ضائع نہیں ہوتیں اور اس کی ایک اور بھی دلیل ہے فرماتے ہیں: "اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّئَاتِ" (درحقیقت نیکیاں برائیوں کو ختم کرتی ہیں) تو گناہ کرنے سے اگر نیکیوں کا ثواب نہ ملے تو نیکیوں میں یہ اثر جو مصرح ہے کہاں سے آئے گا اور اس سے ایک بڑی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ گناہوں سے تو نیکیاں نہیں مٹتیں لیکن نیکیوں سے گناہ دھل جاتے ہیں تو یہ نہایت قوی دلیل ہے۔ البتہ اس کے متعلق یہ مستقل تحقیق ہے کہ سیئات سے مراد یہاں صغائر ہیں یعنی نیکیوں سے جو گناہ معاف ہوتے ہیں وہ صغیرہ ہیں اور کبائر صرف توبہ سے یا فضل بلا وعدہ سے معاف ہوتے ہیں۔ البتہ ایک روایت سے شبہ ہوتا ہے کہ صغیرہ بھی جب معاف ہوتا ہے کہ جب کبیرہ سے بچار ہے کیونکہ حدیث میں ہے: "ماجتنب الکبائر" نیز ایک آیت سے بھی یہ شبہ ہوتا ہے آیت یہ ہے: "اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَاتُنْھَوْنَ عَنْهُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ" (اگر تم کبیرہ گناہوں سے جس سے کہ تمہیں روکا جاتا ہے بچتے رہو ہم اسے تمہارے صغیرہ گناہوں کا کفارہ بنادیں گے)

بے برکت نیکی

اب ضرورت ہے اس حدیث اور آیت کے معنی سمجھنے کی تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ "کفارات لما بینھن ماجتنب الکبائر" اور ما عام ہے تو ترجمہ یہ ہوا کہ سارے گناہوں کا کفارہ تو جب ہی ہے کہ کبائر سے بچے ورنہ سب کا نہیں بلکہ صرف صغائر کا ہوگا۔ یہ لازم نہیں آتا کہ صغیرہ بھی معاف نہ ہو اور آیت کے معنی اس سے بھی زیادہ صاف ہیں یعنی "اِنْ تَجْتَنِبُوْا" میں ایک شرط کی دو جزائیں ہیں نُکَفِّرْ اور نُدْخِلْکُمْ مُّدْخَلًا کَرِیْمًا (ہم تمہیں بہترین جگہ داخل کریں گے) پس اس مجموعہ کے لیے جزا میں بیشک یہی شرط ہے کہ کبائر سے بھی بچے اور اگر کبائر صادر ہوئے تو مجموعہ مرتب نہ ہوگا یعنی مُدْخَلًا کَرِیْمًا بمعنی دخول جنت بلاعقاب وعتاب توبہ یا فضل پر موقوف ہوگا۔ پس اب وہ شبہ نہ رہا اور یہ ثابت رہا کہ گناہ معاف ہوتے ہیں حسنات سے تو

اگر نیکیاں قبول نہ ہوتیں تو اس میں یہ اثر کہاں سے ہوا؟ پس معلوم ہوا کہ قبول تو ہوئیں لیکن ان میں برکت نہیں ہوئی اور یہ برکت نہ ہونا اس حدیث سے ثابت ہے جس کو میں نے روزے کے باب میں پڑھا ہے۔ چنانچہ اب میں اس حدیث سے اس کو ثابت کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اگر گناہوں سے نہ بچے تو کھانا پینا چھوڑنے سے کیا فائدہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فائدہ کی نفی فرما رہے ہیں اور یہ میں پہلے بدلیل کہہ چکا ہوں کہ روزہ ہوجاتا ہے باوجود گناہوں کے بھی تو جو فائدہ منتفی رہا وہ روزے کی برکت ہے اور اس سے وہ مقصود بھی ثابت ہوا جس کے لیے مقصوداً اس حدیث کو پڑھا ہے یعنی گناہ کے ترک کا اہتمام بالخصوص روزے میں ضروری ہے۔

نفس سے کام لینے کا طریقہ

اب میں زیادہ تطویل کرنا نہیں چاہتا ہر مسلمان جانتا ہے کہ گناہ برا ہے تو کم از کم مہینے بھر کے لیے تو گناہ چھوڑ دو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس مہینہ کے بعد گناہ کرنے کی اجازت ہے بلکہ نفس سے وعدہ لینا چونکہ مشکل ہے اس واسطے میں نے یہ کہا کہ ایک مہینے کے لیے گناہ نہ کرنے کا عہد کرلو اس میں آسانی ہوتی ہے اور ہمیشہ کے لیے تنبیہ ہوجاتا ہے۔ بعض نے اپنے نفس کو اسی طرح ایک ایک گھنٹہ دو دو گھنٹہ کا وعدہ لے کر بہلایا اور ذکر میں مشغول کیا ہے' نفس جتنا شریر ہے اتنا ہی بھولا ہے اس کو شیطان نے شریر بنا رکھا ہے۔ گو بزرگوں کے سامنے شیطان بھی بہت عاجز و پریشان ہوتا ہے اور اس کی عقل بھی چرخ ہوجاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے پاس ایک شخص آیا نہایت ہی پریشان اور کہا کہ میں نے اپنا خزانہ ایک جگہ دفن کردیا تھا اور اب مجھے یاد نہیں رہا کہ میں نے کہاں دفن کیا تھا' آپ نے فرمایا کہ تو گھر جا کر نفلیں شروع کردے اور پکا ارادہ کرلے کہ جب تک یاد نہ آئے گا برابر نفلوں میں مشغول رہوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ مل جائے گا۔ امام صاحب کا ذہن اس طرف گیا کہ شیطان نے اس کو بھلایا ہے اور جب یہ نفلیں شروع کرے گا تو شیطان کو اس طاعت میں مشغول ہونے سے سخت رنج ہوگا اور وہ زیادہ دیر تک اس میں مشغول نہ رہنے دے گا اس لیے وہ فوراً یاد دلا دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا تو اہل اللہ کے سامنے اس کی عقل بالکل چرخ ہے۔ البتہ ہم جیسوں پر اس کا بہت زور ہے اور یہ ایسا گھاگ ہے کہ جب یہ مردود ہوا ہے تو لَاُغْوِیَنَّ کے ساتھ "اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ" (سوائے ان میں تیرے خاص بندوں کے) بھی کہہ دیا تاکہ بات جھوٹی نہ ہو۔ حاصل یہ کہ شیطان کو بھی دھوکہ ہوجاتا ہے لیکن نفس کو بہت ہی زیادہ ہوتا ہے کیونکہ نفس ہر ایک کا علیحدہ ہے اور کم عمر ہے تو گویا وہ بچہ ہے کہ شریر بھی اور بھولا بھی کیونکہ بچوں میں

یہی دو صفتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ شریر بچوں کی حکایت یاد آئی ایک مرتبہ ایک میاں جی کے بتاشے آئے اس کو خیال ہوا کہ کھلے رکھوں گا تو لڑکے کھا جائیں گے اس لیے بدھنے میں بھر کر اس کا منہ آنٹے سے بند کر دیا۔ ایک وقت جو میاں جی کہیں گئے تو لڑکوں نے مشورہ کر کے بدھنے کی ٹونٹی میں پانی بھرا اور خوب شربت بنا کر پیا کسی نے خوب کہا ہے:

والنفس كالطفل ان تهمله شب على حب الرضاع وان تفطمه ينفطم

کہ نفس کی حالت بچے کی سی ہے کہ اگر دودھ نہ چھڑاؤ تو دس برس کی عمر تک بھی دودھ مانگے گا اور اگر چھڑا دو تو چھوڑ دے گا۔ اس لیے ایک بزرگ نے اس سے یہ صلح کر لی تھی کہ ایک گھنٹہ ذکر کر لو اس کے بعد پھر ایک گھنٹہ کے لیے اسی طرح مدتوں مشغول رہے ایک اور بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کو حلوا بہت مرغوب تھا تو اپنے نفس سے کہتے کہ دس رکعتیں پڑھ لو تو پھر حلوا کھا لینا۔ چنانچہ پھر حلوا کھلا دیتے، ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو خوب کھلاؤ پلاؤ۔ اس سے خوب کام لو کہ ع کہ مزدور خوشدل کند کار بیش۔ (جس مزدور کا دل خوش ہو وہ زیادہ کام کرتا ہے) واللہ یہ حکمت آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور حضرت کی ان حکمتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبیب کامل تھے کیونکہ ہماری حالت یہ ہے کہ اگر کچھ دیتے رہو تو کام کرتا رہے گا ورنہ نہیں۔ ہاں!! اتنا بھی نہ دو کہ شریر ہو جائے۔ غرض شا اتنا کم دو کہ ضعیف ہو کر کام کرنے کے قابل بھی نہ رہے اور نہ اس قدر زیادہ دو کہ وہ بالکل ہی شریر ہو جائے۔ ہمارے تمام حضرات کا طریقہ یہی ہے کہ سہولت سے کام ہو جائے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ ذکر میں نیند بہت آتی ہے۔ فرمایا علاج یہ ہے کہ تکیہ رکھ کر سو رہا کرو جب نیند بھر جائے پھر اٹھ کر کام میں لگ جاؤ، اللہ اکبر کس قدر آسانی ہے اور پھر یہ کہ مقصد میں کامیابی بھی ہوتی ہے۔ یہ محض اس کی بدولت ہے کہ ان حضرات کا سلسلہ بالکل سنت کے موافق اور یہ سب حضرات نہایت درجہ سنت کے متبع ہیں تو چونکہ اس سلسلے میں اتباع سنت ہے اس لیے اس میں لوگوں کو کامیابی تھوڑی سی توجہ میں ہو جاتی ہے تو یہ بزرگ جن کی حکایت بیان کی ان کی عادت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ توسع کرنے دیتے۔ ہاں معاصی سے سخت روکنا چاہیے اب بعض تو یہاں تک وسعت کرتے ہیں کہ معاصی سے بھی نہیں روکتے اور بعض اس قدر تنگی کرتے ہیں کہ مباحات کو بھی ترک کر دیتے ہیں حالانکہ حال دونوں کا خراب ہے۔

رمضان کے اثرات

تو نفس سے یہ کہہ دو کہ رمضان تک کوئی گناہ نہ کرے اور صرف ایک مہینہ کا عہد اس سے لو پھر اس کے بعد میرا یقین ہے کہ رمضان تقویٰ کی حالت میں گزر گیا تو پھر یہ تقویٰ ان شاء اللہ تعالیٰ نہ ٹوٹے گا۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ رمضان جس حالت پر گزرتا ہے بقیہ گیارہ مہینے بھی نہایت آسانی سے اسی حالت پر گزر جاتے ہیں اور آسانی سے اس لیے کہا کہ تم یہ نہ کہو کہ گناہ سے گیارہ مہینہ تک بچا رہنا یہ تو ہمارا فعل اختیاری ہے۔ اگر ہم قصد کریں گے تو بچے ہی رہیں گے اس میں رمضان کو کیا فضل ہوا۔ تو صاحبو! فرق یہ ہے کہ ویسے دشواری سے بچتے اور رمضان کی برکت سے با آسانی بچ سکو گے اور قصد کی ضرورت تو ہر حال میں ہے غرض اس ماہ کے لیے سب گناہ چھوڑ دو زبان کے گناہ بھی جیسے گالیاں' غیبت' شکایت کرنا کسی ناجائز مضمون کا پڑھنا' کان کے گناہ بھی جیسے گالیاں سننا' گانا سننا' ہاتھ کے گناہ بھی جیسے کسی پر ظلم کر کے اس کو مارنا پیٹنا' سودی مضمون کا لکھنا وغیرہ۔ اسی طرح پیر کے گناہ بھی جیسے ناچ کی مجلس میں جانا' جھوٹے مقدمے کی پیروی کے لیے جانا' جھوٹی شہادت کے لیے جانا۔

پیٹ کا گناہ

اور سب سے بڑھ کر ایک گناہ ہے کہ اس کو تو ضرور چھوڑ دینا چاہیے یعنی پیٹ کا گناہ کیونکہ اگر اس کو نہ چھوڑا تو دوسرے گناہوں کا چھوڑنا نہایت دشوار ہوگا اس لیے کہ پیٹ تمام بدن کا حوض ہے۔ یہ ایک حدیث ہے پس اگر اس میں گندا پانی ہوگا تو تمام نالیوں میں گندا ہی پہنچے گا اور یہ حدیث صحت ظاہر و باطن دونوں کے لیے عام ہے یعنی ظاہری بیماریاں بھی جتنی پیدا ہوتی ہیں اکثر ان کا سبب پیٹ ہی کی خرابی ہوتی ہے۔ اسی طرح باطن کے امراض بھی جس قدر پیدا ہوتے ہیں ان کا منبع بھی بطن ہے تو جس طرح ظاہری امراض کے واسطے طبیب کے قول پر عمل کر کے پیٹ کی اصلاح کرتے ہو اسی طرح باطنی امراض کے ازالے کے لیے اطباء باطن کے قول پر عمل کر کے حرام کھانا چھوڑ دو۔

صحت ایں حس بجوئید از طبیب ۔ صحت آں حس بجوئید از حبیب

(حس جسمانی کو درست کرنا چاہتے تو طبیب سے رجوع کرو اور حس روحانی کو درست کرنا چاہتے تو شیخ کامل سے رجوع کرو)

تو ایک صحت روحانی ہے اور ایک صحت جسمانی۔ جسمانی تو یہ کہ جیسی غذا معدے میں ہوگی اسی کے مناسب سب جگہ تقسیم ہوگی اور روحانی یہ کہ اگر حلال غذا معدے میں پہنچی تو تمام اعضاء کو

توفیق نیک اعمال کی ہوگی اور اگر حرام غذا پہنچی تو تمام اعضاء کو معاصی کی طرف میلان ہوگا تو کم از کم اتنا کرو کہ رمضان بھر کے لیے تو رشوت کا' سود کا' غصب کا' موروثی کا اناج نہ کھاؤ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ رمضان کے بعد مثلاً موروثی کا کھانا حلال ہو جائے گا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر رمضان بھر اس سے بچے رہے تو پھر امید ہے کہ ہمیشہ بچے رہو گے اور جو لوگ ایسے ہیں کہ ان کے پاس تمام آمدنی موروثی ہی کی ہے وہ کم سے کم اتنا کریں کہ کسی سے بے سودی سے ادھار لے لیں۔ اگرچہ اس کو اگلے ہی دن ادا کر دیں اور جس جگہ سے بھی ادا کریں گے مگر وہ اناج حلال ہو جائے گا۔ اگرچہ یہ مسئلہ کہنے کے قابل نہ تھا کیونکہ اس سے لوگوں کی جرأت بڑھنے کا اندیشہ ہے لیکن شفقت کے غلبے نے کہلا دیا کہ ایک دس روپیہ کا اناج ادھار لے لو اور اگر روپیہ نہ ہو تو اناج ہی ادھار لے لو اور اس میں ایک مسئلہ بھی سمجھ لو یعنی اناج ادھار لینے کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ ہم تم کو اس کے عوض میں فلاں اناج دے دیں گے یہ تو ناجائز ہے اور اس میں بہت تفصیل ہے۔ دوسرا طریق وہ ہے کہ جس طرح علی العموم گھروں میں ادھار لیا جاتا ہے کہ ایک سیر بھر آٹا دے دو جب ہمارے پاس ہوگا تو تم کو دے دیں گے تو تم اسی طرح بنئے سے اناج قرض لے لو اور پھر اس کا قرض چاہے موروثی اناج میں سے ادا کر دینا اور بنئے کے لیے موروثی اناج لینا حرام نہیں بلکہ اور بھی بہت سی باتیں اس کو حرام نہیں ہیں کیونکہ وہ خدا کا باغی ہے اس کے جرم بغاوت کے سامنے کہ وہ بہت بڑا جرم ہے ان چھوٹے چھوٹے جرموں پر مقدم نہیں ہوتا۔ غرض بنئے سے یوں کہو کہ ہم کو اناج ادھار دے دو پھر ہم ادا کر دیں گے اس کے بعد چاہے ایک گھنٹہ میں ہی ادا کر دینا اور اگر بے سودی نہ ملے تو ہرگز نہ لو مگر انشاء اللہ تعالیٰ مل جائے گا مگر یہ نہ سمجھنا کہ یہ تو بہت اچھی ترکیب معلوم ہو گئی۔ اب جب کبھی حرام چیز آیا کرے گی اس کے بدلے میں حلال چیز لے لیا کریں گے۔ سو یاد رکھو کہ میں نے جو بتلایا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کچھ بھی گناہ نہ ہوگا' کئی گناہ اس میں بھی جمع ہیں' اول حرام اناج یا مال لینا' دوسرے کسی کو حرام دینا' میرا مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں حرام کھانے سے بچ جائے گا گو دوسرے گناہ رہیں کہ ان کا ترک بھی واجب ہے اور حرام دینا یا کھلانا کسی کو ایسا گناہ ہے کہ کتے کو بھی کھلانا درست نہیں اور اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اکثر لوگ جو ناپاک چیز گائے یا بھینس کو کھلا دیتے ہیں یا بھنگن کو دے دیتے ہیں یہ جائز نہیں' البتہ یہ جائز ہے کہ کسی جگہ رکھ دیا جائے اور وہ حرص کے مارے بغیر تمہارے ایماء کے خود ہی اٹھا کر لے جائے یا کتا خود کھالے لیکن اگر تم سے کوئی پوچھے کہ میں اٹھا لوں یا نہیں تو تم صاف کہہ دو کہ ہم سے کیوں پوچھتے ہو۔

غرض رمضان میں ہر قسم کے گناہ بالکل چھوڑ دو پھر انشاء اللہ تعالیٰ وہ روزہ مبارک روزہ ہوگا اور پھر وہ روزہ تمہاری شفاعت کرے گا اور وہ روزہ ہوگا جس کی بابت فرماتے ہیں انا اجزی بہ اور اگر گناہ نہ چھوڑے تو روزہ تو ہوگا لیکن ایسا ہوگا کہ جیسے تم کسی اپنے دوست سے کہو کہ ہم کو ایک آدمی لا دو اور وہ کسی ایسے آدمی کو لا دے کہ اس کے کان بھی نہ ہوں آنکھ بھی نہ ہو لنگڑا بھی ہو لنجا بھی ہو بات بھی نہ کرسکتا ہو تو یہ شخص آدمی تو ضرور ہے لیکن محض بیکار۔ صرف ایک سانس کے چلنے کی وجہ سے اس کو حیوان ناطق کہیں گے تو جیسے یہ شخص آدمی ہے بھی اور نہیں بھی ایسا ہی یہ روزہ ہے اور نہیں ہے اور یہ روزہ اس قابل ہے کہ اس کو روضہ میں دفن کر دیا جائے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں ترغیب دے رہے ہیں کہ روزہ میں گناہ کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔

اب ختم کرتا ہوں مجھے جو کچھ کہنا تھا میں کہہ چکا ہوں۔ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

الجناح

۶ صفر سنہ ۱۳۳۲ھ کو مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں بعض اہل علم مہمانوں کی درخواست پر ۲ گھنٹہ بیس منٹ تک کھڑے ہوکر بیان فرمایا۔ مولانا عبداللہ صاحب مرحوم نے اسے قلم بند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ساٹھ تھی۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّھُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَاکَسَبُوْا وَلَقَدْعَفَا اللّٰہُ عَنْھُمْ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ○

(آل عمران آیت نمبر ۱۵۵)

ترجمہ: ''یقیناً تم میں سے جن لوگوں نے پشت پھیردی تھی جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دے دی ان کے بعض اعمال کے سبب اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا' واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں بڑے حلم والے ہیں۔''

تمہید

قبل بیان کہ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس وقت موقع تو بیان کا نہ تھا اس لیے کہ مخاطب سب اہل علم ہیں ایسے حضرات کے سامنے کچھ عرض کرنے سے خود طبیعت رکتی ہے لیکن چونکہ یہ حضرات اہل محبت بھی ہیں اور ان کی طرف سے فرمائش کی گئی ہے اس لیے اس جرأت کو گوارا کیا اور کچھ تکلف نہیں کیا گیا۔

جو مضمون میں اس وقت عرض کروں گا گو مختصر ہو گا لیکن مفید بہت ہو گا۔ اس لیے اس کے اختصار کو بے وقعتی کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے اور وہ اگر چہ مکررات و ملحقات کے ملانے سے طویل ہو گا لیکن بعد حذف زوائد کے اصل مضمون مختصر ہی رہے گا مگر انشاء اللہ تعالیٰ نافع ہو گا۔

مقصود وعظ

جو آیت میں نے پڑھی ہے مجھ کو اس وقت اس کی تفسیر کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے اپنا مضمون موعود مستنبط کرنا منظور ہے اور وہ مضمون مفید ہونے کے علاوہ ضروری بھی ہے اس کی عملی

ضرورت ہے وہ صرف کوئی لذیذ مضمون یا علمی ہی نہیں ہے اس لیے کہ لذیذ اور علمی مضامین تو بہت سے ہیں اور ان سے سوائے اس کے کہ لذت اور فرحت ہو بالذات کوئی نفع نہیں ہے۔ اگر چہ بواسطہ کسی نفع کی طرف مفضی ہو جاویں میری نظر ہمیشہ اس پر رہتی ہے کہ مضمون وعظ کا ضروری ہو لذیذ ہو یا پھیکا اور طلبہ کو خالی علمی نفع ہو یا نہ ہو اور وعظ کو میں معالجہ امراض ظاہرہ پر قیاس کیا کرتا ہوں تو مریض کو بجائے اس کے کہ گانا سنایا جائے یا کوئی غزل سنائی جائے یا اقلیدس کے اشکال اس کے سامنے حل کی جائیں اس کے لیے تو مفید حکیم محمود خان کا تلخ نسخہ ہے حضرات ہم سب مریض ہی نہیں سر تا سر مرض ہیں اگر ایک مرض ہوتا تو خیر اسی کی فکر ہوتی ہماری حالت تو یہ ہے: ''تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم'' ہماری یہ حالت کہ ہمارے کان' آنکھ' قلب' شکم ہاتھ پاؤں سب ہی مریض ہیں۔

قصد معتبر

اور پھر ان سب امراض کا معدن قلب ہے فصل مرض اسی میں ہے اسی واسطے حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ آدمی کے بدن میں ایک ٹکڑا گوشت کا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام بدن درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے اور وہ قلب ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مدار گناہ اور ثواب کا قصد پر ہے اور یہ فعل قلب کا ہے اور چونکہ مدار قصد پر ہے تو اگر افعال میں اتحاد بھی ہو لیکن قصد میں اختلاف ہو تو ان کے آثار بھی مختلف ہو جاویں گے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلٰثٍ عَنِ النَّائِمِ حَتّٰی یَسْتَیْقِظَ وعَنِ الصَّبِیِّ حَتّٰی یَحْتَلِمَ وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰی یَفِیْقَ او کما قالO[1]

''تین اشخاص مرفوع القلم ہیں سو جانے والا جب تک بیدار نہ ہو جائے' بچہ جب تک جوان نہ ہو جائے اور مجنوں جب تک اسے افاقہ نہ ہو جائے۔''

دیکھئے! یہ تینوں جو مرفوع القلم ہیں حالانکہ افعال کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مکلفین سے جیسے بعض جرائم صادر ہوتے ہیں ان سے بھی ہوتے ہیں۔ تو وجہ اس کی یہی ہے کہ ان میں قصد معتبر جرم کا نہیں ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ اگر آدمی سے معصیت کے افعال بھی صادر ہوں لیکن ان سے قلب کا تعلق نہ ہو تو وہ گناہ نہیں ہوں گے۔ معصیت کا لکھا جانا صرف قلب کی مشارکت سے ہوگا۔ اسی طرح طاعت کا بھی اگر قصد نہ ہو تو وہ بھی نہیں لکھی جاتی۔ چنانچہ نائم اور مجنون کی طاعت کا تو بالکل اعتبار نہیں ہے باقی نابالغ جبکہ وہ ممیز ہو اس کی اطاعت میں گو اختلاف ہے کہ ثواب کس

---

[1] (سنن ابی داؤد: ۴۳۹۸' مجمع الزوائد للہیثمی: ۶: ۲۵۱)

کو ملتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ماں باپ کو ملتا ہے اور صحیح یہ ہے کہ اسی کو ملتا ہے لیکن خود یہ اختلاف ہی اس کا مشعر ہے کہ اس کی طاعت اس درجہ کی نہیں ہے جیسی مکلف کی ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے قصد میں بھی اختلال ہے اسی لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب پوچھا گیا کہ آپ اگر نابالغی کی حالت میں انتقال کر جاتے اور (جمہور کے مذہب کے موافق) بلامواخذہ جنت میں داخل ہوتے۔ آپ اس حالت کو پسند فرماتے ہیں یا بالغ ہو کر خطرہ اور تردد میں پڑنے کو پسند فرماتے ہیں؟ فرمایا کہ میں بالغ ہو کر تردد میں واقع ہونے کو پسند کرتا ہوں اس لیے کہ گو یہ خطرہ اور تردد کی حالت ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی معرفت کی دولت تو نصیب ہوئی اور بچپن میں اس دولت سے محروم رہتا حالانکہ تمیز کے بعد نفس معرفت تو ہوتی ہے لیکن چونکہ اس میں ایک گونہ کمی ضرور ہے اس لیے اس کو معتد بہ نہیں سمجھا اور زمان صبا کو اس سے خالی قرار دیا۔ غرض صبی کے افعال اس درجہ کے معتد بہ نہیں ہوئے کہ قانون کی رو سے وہ اجر یا وزر کا مستحق ہوتا باقی بلاقصد کوئی انعام سرکاری مل جاوے وہ دوسری بات ہے اور وزر تو بالکل ہی نہیں۔

اقتداء مریض

یہی راز ہے اس میں کہ صبی کی اقتداء محققین کے نزدیک تراویح میں بھی درست نہیں ہے اس لیے کہ نوافل صبی ضعیف ہیں چنانچہ اگر شروع کر کے فاسد کر دے تو قضا نہیں ہے اور بالغ کے ذمہ قضا ہے۔ بہرحال مقصود میرا یہ ہے کہ بدون قصد کے کوئی فعل معتبر نہیں ہے اور قصد قلب کے متعلق ہے اور وہ ہے مریض۔ اس لیے ہمارے تمام افعال فریق اور قابل اصلاح ہیں اور سرتا سر مرض ہوئے تو مریض کو بجائے اس کے مفرحات تلذذات دیے جاویں اس کو تو مسہلات اور محرّجات اور رادعات دینی چاہئیں اس لیے میں علمی اور لذیذ مضمون کو قصداً کبھی بیان نہیں کرتا' امراض کے معالجہ کو مقدم سمجھا کرتا ہوں' اس وقت بھی ایسا ہی ایک ضروری مضمون خیال میں آیا ہے اس کو عرض کیا جاتا ہے۔

مضرت گناہ

وہ یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ جیسے ہر وقت خطا ہوتی رہتی ہے' کوئی وقت اس سے خالی نہیں گزرتا۔ چنانچہ اس حدیث میں آیا ہے: "كُلُّكُمْ خَطَّاؤُوْنَ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ"[1]، یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ تم سب بہت خطا کار ہو اور بہتر خطا کرنے والے توبہ کرنے والے ہیں۔ اس حدیث سے دو امر معلوم ہوئے' اول تو یہ کہ ہم بہت خطا کرنے

---

[1] (سنن الترمذی: ۲۴۹۹، الدر المنثور ۳: ۹۱، بلفظ کل ابن آدم خطاء الخ)

والے ہیں دوسرے یہ کہ ہمارا معاملہ معصیت کے ساتھ یہ ہونا چاہیے کہ جب ہو جائے تو فوراً توبہ کرلیں۔ پس خطا ہونا عجیب نہیں لیکن ساتھ ساتھ توبہ بھی ہوتی رہی تو معافی بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہے تو اگرچہ اس معاملہ میں بھی ہم سے کوتاہی ہوتی ہے اور یہ بھی قابل اصلاح ہے کہ جب گناہ ہوتا ہے توبہ نہیں کرتے لیکن تاہم اس کی طرف التفات تو ہے اور گناہ کو مضر اور توبہ کو ضروری تو جانتے ہیں۔ اگرچہ تفصیلاً گناہ کے مضرتوں کا استحضار نہیں ہے لیکن تاہم اتنا تو ضرور اجمالاً اعتقاد ہے کہ گناہ مضر ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری اور مہتم بالشان اور قابل توجہ گناہ کے ساتھ وہ معاملہ ہے جس کی طرف عوام تو کیا خواص کا بھی ذہن نہیں منتقل ہوتا مجھ کو اس وقت وہی بیان کرنا ہے۔

مباح میں غلطی

مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ میں نے ایک وعظ مباح کے متعلق بیان کیا ہے اور اس کا محکوم علیہ مباح تھا۔ یہ آج کا مضمون جناح کے متعلق ہے اور اس کا مقابل ہے مباح۔ مباح کے متعلق میں نے یہ بیان کیا تھا کہ مباح کے ساتھ جو معاملہ کیا جاتا ہے اس میں دو غلطیاں ہوتی ہیں ایک افراطی دوسری تفریطی، افراطی غلطی تو یہ ہے کہ مباح کے ہر درجہ کو مباح سمجھ کر تمام درجات طے کر جاتے ہیں کسی درجہ پر جا کر رکتے نہیں حالانکہ بعض درجے مباح کے ایسے ہیں کہ وہاں پہنچ کر آدمی محرم سے بچ نہیں سکتا۔ جیسے کھیت کے چاروں طرف کی ڈول بھی مباح المشی ہے لیکن اس پر مویشی کو نہ چلانا چاہیے اس لیے کہ اس کے قریب کھیت ہے اس میں چرنے لگنے کا قوی احتمال ہے اور کسی کے کھیت میں مویشی کا چرانا حرام ہے ایسے مباحات کا ایک درجہ وہ ہے کہ محرم سے ملا ہوا ہے تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں جا کر پھر محرم سے بچنے کی سعی کرنے میں آدمی ناکام رہتا ہے اس لیے اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ بس مباح میں اس قدر توسع کرنا کہ کسی درجہ میں نہ رکے یہ مناسب نہیں ہے۔

استنباط رحمت

اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آدم وحوا علیہما السلام کو حکم ہوا تھا کہ "لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" یعنی اس درخت کے قریب مت جاؤ حالانکہ منہی عنہ اکل شجرہ ہے لیکن منع کیا گیا اس کے پاس جانے سے۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ نہایت رحیم و کریم ہیں۔

انہوں نے دیکھا کہ جب پاس جاویں گے تو پھر رکنا دشوار ہے اس لیے پاس جانے سے ہی روک دیا جیسے بچے کو شفیق باپ کہتا ہے کہ دیکھو بیٹا چولہے کے پاس نہ جانا حالانکہ جانتا ہے کہ چولہے کے پاس جانا کچھ مضر نہیں لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی جانتا ہے کہ پاس جا کر بچنا مشکل ہے اس لیے

روکتا ہے اس سے بندوں کے ساتھ حق تعالیٰ کی شفقت اور رحمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اکثر لوگ آیات رحمت میں سے مثل "لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ" (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو) اور "اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ" (بے شک وہ بڑا بخشنے والا بے حد مہربان ہے) سے حق تعالیٰ کی رحمت کا استنباط کرتے ہیں حالانکہ حق تعالیٰ کا ہر امر اور ہر نہی رحمت ہے اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ تقلیداً کہتا ہوں۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ رحمت کی آیت "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ" ہے۔ (اے ایمان والو! جب تم مقررہ میعاد کے لیے قرض دیا کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ دیکھیے بظاہر اس میں کہیں رحمت کا مضمون نہیں ہے لیکن بقول ان بزرگ کے اس سے بڑی رحمت نکلتی ہے۔ بات یہ ہے کہ قاعدہ ہے کہ جس شان کا کوئی شخص ہوتا ہے طبعاً اس شان کے امور کی طرف اس کی توجہ ہوتی ہے اپنی شان سے کم امور کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور اسی طرح جس درجہ کا حاکم ہوتا ہے رعایا کے اسی درجہ کے امور اس کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ یعنی بادشاہ کی نظر امور عظام کی طرف ہوگی اور امور جزئیہ کی طرف نہ ہوگی۔ وعلیٰ ہذا جب یہ بات سمجھ میں آ گئی اب دیکھیے کہ خدائے تعالیٰ کا باوجود اتنے بڑے غنی الذات اور علی الصفات ہونے کے پھر ہمارے ایک جزئی معاملہ کی طرف توجہ فرمانا یہ کس قدر ان کی غایت رحمت ورافت پر دال ہے۔ اس لیے اس کو آیت رحمت ان بزرگ نے قرار دیا۔ پس اسی طرح "لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" سے اندازہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی اپنے بندوں پر غایت درجہ کی رحمت ہے اور آدم علیہ السلام کی تخصیص نہیں۔ بہت جگہ تمام بندوں کو خطاب کر کے ایسا ہی ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا" (یہ اللہ کی حدود ہیں پس ان کے قریب نہ پھٹکنا) اور کہیں یہ بھی اصل کے موافق فرما دیا "فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ" کہ مباح میں توسع کرنا یہ تو افراط ہے اور ایک درجہ مباح کے اندر تفریط کا ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کے اندر تنگی کرنے لگے اور اس سے متمتع نہ ہو۔ یہ زہد خشک ہے یہ بھی برا ہے۔ یہ مضمون میں نے مباح کے متعلق بیان کیا تھا۔

مدار کمال تقویٰ

اب میں اسی تفصیل کے ساتھ اس کے مقابل جناح کے اندر یہی مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں۔ پس جاننا چاہیے کہ مباح کی طرح جناح کے ساتھ بھی ہمارا معاملہ دو قسم کا ہے ایک کو افراط کہہ سکتے ہیں گو یہاں افراط اس رنگ کا نہیں جیسا مباح میں تھا یعنی وہاں تو افراط سے مراد یہ تھی کہ اس کے ارتکاب میں توسع کرنا اور یہاں یہ مراد ہے کہ صدور معصیت سے جتنا متاثر ہونا چاہیے اس سے زیادہ متاثر ہو

مغموم ہونا اور ایک کو تفریط کہنا چاہیے اور اس وقت بیان کرنا افراط ہی کے درجہ کا ظہور ہے۔ تفریط کا بیان کرنا مقصود نہیں اگرچہ تفریط میں بھی ہم لوگ مبتلا ہیں کہ بعض کو فعلاً ہی گناہ سے بچنے کا اہتمام نہیں ہے اور بعض کو فعلاً تو اہتمام ہے لیکن حالاً گناہ سے نہیں بچتے یعنی جس درجہ گناہ سے مسلمان کو اہتمام ہونا چاہیے اس درجہ کا نہیں۔ چنانچہ جیسے نفرت طبعی پیشاب و پاخانہ سے ہے ایسی نفرت گناہ سے نہیں ہے۔ گو اعتقاداً تو نفرت ہے لیکن طبعاً نہیں ہے حالانکہ کمال تقویٰ کا دارومدار طبیعت پر ہے یعنی اگر طبعی نفرت نہیں ہے تو کسی نہ کسی وقت گناہ ہو ہی جاتا ہے اور طبعی نفرت کے ہوتے ہوئے گناہ کا ہونا بہت مستبعد ہے اور یہ حق تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ دارومدار سزا کا صرف طبیعت پر نہیں رکھا' اس کا طبیعت پر مدار ہوتا اس طرح سے کہ اگر شر سے طبعی نفرت ہو تو مسلمان ہے ورنہ کافر ہے تو سخت دقت ہوتی اور بہت کم مسلمان نکلتے یہ حق تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس کا مدار عقل پر رکھا۔ چنانچہ ایسے امور میں جس موقع پر عقل اور طبع میں تعارض ہوتا ہے عقل کو ترجیح ہوتی ہے پس اگر کسی کو گناہ سے عقل و اعتقادی نفرت ہو اور طبعی نہ ہو تو وہ مسلمان ہے گو کمال تقویٰ کے بیشک منافی ہو۔

ترجیح عقل

اس مضمون میں بعضے غیر محقق واعظ ایسی چھری پھیرتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بناتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ نماز میں سستی کرتے ہیں ان کو منافق کہہ دیتے ہیں اور آیت پڑھ دیتے ہیں: "وَاِذَا قَامُوْآ اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی" یہ آیت منافقین کی شکایت میں ہے کہ جب وہ نماز کے واسطے کھڑے ہوتے ہیں تو اس حالت میں کھڑے ہوتے ہیں کہ کاہل ہوتے ہیں۔ خوب سمجھ لو کسل اعتقادی اور شے ہے اور کسل طبعی جدا۔ منافقین میں کسل اعتقادی تھا۔ یعنی ان کو نماز کے فرض نہ سمجھنے کے سبب کسل تھا اور مسلمانوں میں کسل طبعی ہے فرض ہونے میں تردد نہیں اس کو دوسرے عنوان سے سمجھئے کہ بعض مرتبہ لازم اعم ہوتا ہے اس کا تعلق ملزومات متعددہ سے ہوتا ہے۔ کسل ایک لازم ہے۔ منافقین میں اس کا ملزوم اعتقاد کی سستی ہے اور مسلمانوں میں طبعی ہے۔ مسلمان کیسا ہی ضعیف الایمان ہے اس کو کسل اعتقادی کبھی نہ ہوگا تو یہاں مطلق کسل مراد نہیں ہے لیکن ہمارے واعظین سب کو ایک لکڑی سے ہانک دیتے ہیں اور اسی طرح بعض واعظین کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے وعدہ رزق کا فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے: "وَمَامِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا" (اور کوئی جانور روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ ہو) تو پھر لوگ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا اس آیت پر ایمان نہیں ہے۔ سو یاد رکھو کہ یہ الزام بھی محض غلط ہے کہ اس آیت پر مسلمانوں کا ایمان نہیں ہے نہیں ضرور سب کا ایمان ہے اور باوجود

ایمان ہونے کے پریشانی بھی اس کے ساتھ جمع ہوسکتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وعدے دو قسم کے ہیں ایک مبہم اور ایک معین۔ اللہ تعالیٰ نے مبہم وعدہ فرمایا ہے کہ رزق ملے گا لیکن یہ نہیں فرمایا کہ کب ملے گا اور کہاں سے ملے گا اور کس طریق سے ملے گا اور کتنا ملے گا تو پریشانی بوجہ ابہام کے ہے اور ساتھ ہی اس مبہم وعدے پر پورا یقین ہے کہ وقت مقدر پر ضرور ملے گا۔ بعض واعظین اسی الزام کے مؤکد کرنے کے لیے مثال دیا کرتے ہیں کہ اگر کوئی دوست دعوت کر دے تو اطمینان ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اطمینان نہیں! یہ بھی غلط اور قیاس مع الفارق ہے اور خواہ مخواہ مسلمانوں کو کافر بنانا ہے واللہ العظیم اگر حق تعالیٰ کے کلام مجید میں معین وعدہ ہوتا تو ہرگز ہرگز کسی کو بھی پریشانی نہ ہوتی اور اگر دعوت میں وقت معین نہ کیا جاوے مبہماً کہہ دیا جاوے کہ کسی وقت کی دعوت ہے تو وہاں بھی اطمینان نہ ہوتا۔ جتنی بات فرمائی ہے کہ رزق ملے گا اس پر ایمان ہے۔ شریعت میں غلو نہ کرنا چاہیے جس قدر جو بات ثابت ہو اس پر رہنا چاہیے اہل کتاب کو ارشاد ہے: "یَآاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ" یعنی اے اہل کتاب دین میں غلو نہ کرو باوجود ان کے غیر مکلف بالفروع ہونے کے ان کو خطاب کیا گیا تو ہم بطریق اولیٰ اس مامور بہ کے مکلف ہوں گے اور لیجئے کئی روز ہوئے ایک دوست نے پوچھا تھا کہ حق تعالیٰ نے کفار کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ

"اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے لیٹے بھی بیٹھے بھی کھڑے بھی اور پھر ہم جب اس کی وہ تکلیف اس سے ہٹا لیتے ہیں تو پھر اپنی حالت پر آجاتا ہے کہ گویا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کو مٹانے کے لیے ہم کو اس نے کبھی پکارا بھی نہ تھا"

تو یہی حالت بعینہٖ مسلمانوں کی ہے کہ جب کوئی مصیبت ہوتی ہے تو خدا کو پکارتے ہیں اور جب وہ مصیبت جاتی رہتی ہے پھر غفلت میں پڑ جاتے ہیں تو کیا مسلمان بھی اس آیت میں داخل ہیں؟ اگر داخل ہیں تو مفسرین الانسان کی تفسیر کفار کے ساتھ کیوں کرتے ہیں۔ میں نے اس کا یہی جواب دیا کہ مسلمان کے اندر اس کا منشاء اور ہے کافر کے اندر اور۔ کافرین کا منشاء تو اس اعراض اور غفلت کا انکار اور کفر ہے اور مسلمین طبیعت ہے اگرچہ یہ بھی کمی اور قابل اصلاح لیکن کلام اس میں ہے کہ اس غفلت سے کفر لازم نہیں آتا۔ غرض احکام عقلیہ اور طبعیہ میں جب تعارض ہوگا تو جزائے شرعی میں ترجیح عقل کو ہوگی اس لیے اشتراک حالت سے جو آیتیں منافقین و کفار کے بارے میں ہیں وہ مسلمانوں پر جاری نہ کی جاویں گی اور اس سے کفر و نفاق کا حکم نہ کیا جائے گا۔

جزا میں تشبہ

لیکن یہ معاملہ تفریط کا چونکہ بیسا کی کی صورت ہے گو حقیقت نہیں اور اس میں کفار کے ساتھ تشبہ ہے کہ جو وہ کرتے ہیں وہی ہم بھی کرتے ہیں اس لیے اس تشبہ کیوجہ سے جزا میں بھی تشبہ اختیار کیا گیا ہے کہ مومنین بھی جہنم میں جاویں گے لیکن چونکہ مشبہ ومشبہ بہ میں بہت فرق ہے اس لیے ایسا عذاب نہ ہوگا جیسا کہ کفار کو۔ مگر یہ سن کر مسلمان جری نہ ہو جائیں اس لیے کہ وہ خفیف عذاب بھی فی نفسہ نہایت سخت اور ناقابل برداشت ہوگا۔ پس عذاب کامل تو واقع میں کفار ہی کو ہوگا لیکن مومنین کو بھی بوجہ اس کے کہ انہوں نے کفار کے مثل جرائم کا ارتکاب کیا تھا ایک شائبہ عذاب کا اور نمونہ سزا کا چکھایا جاوے گا۔ اسی واسطے جہنم کی صفت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ" یعنی جہنم کفار کے لیے تیار کی گئی ہے جیسے جیل خانہ کہ اصل میں تو بدمعاشوں اور باغیوں کے لیے ہوتا ہے مگر بعض مرتبہ نیک چلن اور مطیع بھی کسی جرم کی وجہ سے اس میں رکھے جاتے ہیں۔ پس اس درجہ کو میں تفریط کہتا ہوں اور چونکہ اس کے متعلق اعتقاد ہے کہ یہ بری بات ہے اور اس سے بچنے کا اہتمام بھی کم وبیش ہے اس لیے اس وقت اس کے متعلق بھی بیان نہیں کیا جاتا اس وقت اس سے زیادہ اہم افراط کا درجہ ہے۔

رہزن طریق

اور اہمیت اس کی اس اعتبار سے ہے کہ اس کی طرف عوام تو عوام خواص اتقیا کا بھی ذہن منتقل نہیں ہوتا بلکہ میری یہ تقریر سن کر حیرت ہوگی کہ کیا گناہ سے متاثر مغموم ہونے میں بھی افراط ہوتا ہے لیکن سننے سے اس کی حقیقت معلوم ہوگی وہ یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمان کو گناہ ناگوار اور مکروہ وگراں معلوم ہوتا ہے جس درجہ میں بھی ہو اور یہ ناگواری مقصود بھی ہے اس لیے ہونا بھی چاہیے لیکن ہر شے اپنی اصل ہی کے اعتبار سے مقصود ہوتی ہے اور جب وہ اثر اس پر مرتب نہ ہوگا تو وہ شے پھر مقصود نہ رہے گی۔ سو اس گرانی وناگواری کا اصل مقصود یہ ہے کہ اس گناہ کو چھوڑ دیں۔ چنانچہ یہ اثر اس پر مرتب بھی ہوتا ہے لیکن بعض مرتبہ جب اس میں افراط ہوتا ہے اور زیادہ گرانی ہوتی ہے تو اس کا ایک عجیب اثر ہوتا ہے اور شیطان ایک نئی بات اس میں نکالتا ہے اس لیے کہ اس کی رہزنی کے طریقے مختلف ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ شیطان یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ گناہ جب اس قدر بری شے ہے تو اے شخص تو مردود ہو گیا اور اب تیری کوئی طاعت قبول نہیں اور زیادہ تر اس میں سالکین وذاکرین اور جو لوگ اپنے قلب کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں جو اللہ والے کہلاتے ہیں وہ اس میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں ایسے موقع پر شیخ کامل کی ضرورت ہے۔ شیخ عطارؒ فرماتے ہیں:

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق ۔۔۔ عمر بگذشت و نہ شد آگاہ عشق

مولانا فرماتے ہیں:

یار باید راہ را تنہا مرو ۔۔۔ بے قلاو زاندریں صحرا مرو

اگر شیخ کامل رہبر نہ ہو تو یہ بڑی مضر غلطی ہے اور سالکین سے جو غلطی ہوتی ہے وہ بڑی ہی سخت غلطی ہوتی ہے۔ ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ تم لوگ گناہوں سے ڈرتے ہو اور ہم کفر سے ڈرتے ہیں جس قدر کوئی شے عمدہ ہوگی وہ اگر خراب بھی ہوگی تو بہت زیادہ خراب بھی ہوگی کھانا جس قدر زیادہ لطیف ہوگا وہی زیادہ سڑے گا۔ دیکھو یونانی دواؤں میں اگر غلطی ہوگی کہ بجائے گل بنفشہ کے کاسنی لکھی گئی تو وہ اس قدر سخت نہیں ہے اور نیز تدارک اس کا ہوسکتا ہے لیکن اگر کسی دوا کے روح اور جوہر کے استعمال میں غلطی ہو کہ بجائے ایک جوہر و روح دوسرا جوہر و روح استعمال کر لیا جاوے گا تو ہلاک ہی ہو جائے گا۔ چنانچہ ان سالکین کی یہ غلطی مذکور چونکہ برنگ طاعت ہے اس لیے سخت غلطی ہے اور اسی غلطی کا منشاء ان کی خودرائی ہوتی ہے اور یہ خودرائی ہی اس رستہ کا رہزن ہے بس بدست شیخ ہو کر خودرائی چھوڑ دے۔ شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ اسی مضمون کو فرماتے ہیں:

اگر مرد عشقے کم خویش گیر ۔۔۔ وگرنہ رہ عافیت پیش گیر

یہاں لکھنے پڑھنے سے کام نہیں چلتا اس کے بھروسہ نہ رہنا چاہیے کہ ہم تو عالم ہیں۔ یہاں تو اس علم ہی کے بھلانے کی ضرورت ہے یہ مطلب نہیں کہ علم دین کو بھلا دے بلکہ مقصود یہ ہے کہ علم کی وجہ سے جو ناز اور فخر دماغ میں ہے اس کو نکالنا منظور ہے یہاں دوسرے لکھنے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا نیاز اسی معنی میں فرماتے ہیں جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا اور اس دوسرے پڑھنے لکھنے کی نسبت حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق ۔۔۔ ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

اور خودرائی کے متعلق فرماتے ہیں:

فکر خود رائی عالم رندی نیست ۔۔۔ کفر ست دریں مذہب خود بینی خودرائی

چنانچہ یہاں خودرائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان نے یہ دل میں ڈالا کہ اسی گناہ کی وجہ سے تو اتنا مردود بارگاہ ہو گیا ہے کہ تیری کوئی طاعت مقبول نہیں ہے۔

تجاوز عن الحدود

اور پھر اس سے کبھی تھوڑا یاس ہو کر دل شکستگی اور عبادت میں بددلی ہو جاتی ہے اور یہ بھی مضر ہے کیونکہ اس سے قلب کا ضعف بڑھ جاتا ہے اور عبادت بے حد ثقیل ہو کر احتمال متروک ہونے کا

ہوجاتا ہے اور کبھی زیادہ یاس ہو کر محض معطل ہو جاتا ہے اور کبھی یہ یاس حال سے متجاوز ہو کر درجہ اعتقاد میں پہنچ کر کفر ہو جاتا ہے اور یہ کتنا خسارہ عظیم ہے۔ حالانکہ یہ سمجھنا کہ تیری مردودیت اسی درجہ پر پہنچ گئی کہ کوئی طاعت قبول نہیں' یہ سمجھنا ہی خود خلاف شریعت اور غلط ہے اور یہ بہت برا خیال ہے اور یہ شخص اس کو اچھا سمجھتا ہے کہ میں گناہ سے بہت متاثر ہوا' اس کو علامت ایمان جانتا ہے کہ میرے نزدیک گناہ اتنا بھاری ہے اور ہم یوں کہتے ہیں:

بہرچہ از دوست دامانی چہ کفر آں حرف و چہ ایماں

بہرچہ از یار دو رافتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

اور ہم یوں کہتے ہیں کہ اگر اسی کا نام ایمان ہے جس کے مضار اوپر مذکور ہوئے تو "قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ" اگر ہم تسلیم کرلیں کہ یہ خیر ہے تو یہ بظاہر خیر ہے لیکن اس کے اندر ایک شر عظیم مبطن ہے جیسے کوئی لڈو کے اندر زہر ملا کر کسی کو کھلا دے تو ہمارا یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ لڈو مہلک ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڈو فی نفسہ مہلک ہے۔ مقصود یہ ہے کہ زہر جو اس کے اندر بھرا ہوا ہے وہ مہلک ہے اسی طرح گناہ کو بھاری سمجھنا بیشک ایمان کی بات ہے لیکن اس قدر بھاری سمجھنا جس پر مضار مذکورہ مترتب ہونے لگیں بیشک ممنوع عنہ وتعدی حدود شرعیہ ہوگا۔ بہرحال جس سے یہ شر پیدا ہوا وہ خیر ہی نہیں بلکہ شر ہی سے شر پیدا ہوا۔ پس اس پر یہ شبہ نہیں ہوسکتا تھا کہ خیر سے شر کیونکر پیدا ہوا خیر سے کبھی شر نہیں ہوتا۔ گو ظاہراً متوہم ہو۔

حدود خوف وشوق

سبحان اللہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے باریک بین ہیں بلکہ باریک بین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہنا بھی بے ادبی معلوم ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب کچھ بدیہی ہی تھا' کوئی معلوم باریک ہی نہ تھا اور وہ باریک بینی یہ ہے کہ دیکھئے خوف بہت اچھی شے ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں بھی ایک حد لگائی ہے۔ فرماتے ہیں: "اَسْئَلُکَ مِنْ خَشْيَتِکَ مَاتَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْکَ"[1] یعنی اے اللہ میں آپ کے خوف میں سے بس اس قدر مانگتا ہوں جس سے آپ اور ہمارے گناہوں کے درمیان حائل ہو جاوے یعنی گناہوں کو روک دے۔ سو حد اس لیے لگائی کہ خوف سے بعض لوگ جسماً یا دنیاً ہلاک ہو گئے ہیں۔ ایک شخص کو کان

---

[1] (لم اجد الحديث في "موسوعة اطراف الحديث النبوي الشريف")

پور میں، میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ شدت خوف کی وجہ سے مایوس ہو کر قریب تھا کہ نماز روزہ ہی چھوڑ دے اور لیجئے دیکھئے شوق ذوق بہت محبوب ومطلوب چیز ہے مگر اس کی نسبت بھی ارشاد ہے:
"واسئلک شوقا الی لقائک فی غیر ضراء مضرة ولا فتنة مضلة"[۱] (یعنی اے اللہ مجھے ایسا شوق عطا ہو جس میں مصیبت آزار دینے والی اور بلا گمراہ کرنے والی نہ ہو) یعنی شدت شوق کے بعض اوقات میں دو اثر ہوتے ہیں یا تو اہل شوق ہی پگھل جاتے ہیں نہ کھانے کے رہتے ہیں نہ سونے کے ہر وقت اسی طرف مشغول رہتے ہیں اور بیمار ہو کر بعض اوقات جان تک نوبت آجاتی ہے۔ من غیر ضراء مضرة (بلا آزار دینے والی سے) میں اس سے احتراز ہے اور یا یہ اثر ہے کہ گستاخ و بےادب ہو کر گمراہی اور کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے اس کے متعلق ارشاد فرمایا و لا فتنة مضلة (بلا آزار دینے والی سے) دنیا میں بھی اس دوسرے اثر کا نمونہ موجود ہے اگر کسی نوکر چاکر کو زیادہ منہ لگاؤ تو اگر وہ بھلا مانس ہے تو اس پر تو زیادہ عنایت کرنا اس کو مسخر کر لیتا ہے اگر وہ پہلے ایک گھنٹہ خدمت کرتا ہوگا تو اب چار گھنٹہ کرے گا اور اس کے اندر خباثت ہے تو اور زیادہ منہ چڑھے گا۔ حتیٰ کہ نوبت اس کی پہنچے گی کہ آقا اس کو نکال کر باہر کرے گا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خشیت میں حد لگائی شوق میں حد لگائی اسی طرح معصیت کے استقال کی بھی حد ہوگی۔ قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کوئی شے حد سے بڑھے گی ضرور خرابی ہوگی۔ اسی طرح گناہ کی نسبت یہ خیال کر لینا کہ یہ اتنا بڑا ہے کہ اب میری کوئی طاعت بھی قبول نہ ہوگی یہ افراط کا درجہ ہے۔

فساد اعتقاد

اور منشاء اس کا قیاس الغائب علی الشاہد ہے اس لیے کہ دنیا میں دیکھتے ہیں کہ نوکر اگر کوئی بڑی خطا کرتا ہے تو آقا اس سے اس قدر خفا ہوتا ہے کہ پھر اس کی کوئی خدمت ہی مقبول نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ کو بھی اس شخص نے ایسا ہی سمجھا حالانکہ اسکا یہ خیال غلط ہے اللہ تعالیٰ واجب ہیں اور ہم ممکن۔ ممکن اور واجب میں بڑا فرق ہے ہماری اس حالت کی وجہ تو یہ ہے کہ غصہ میں ہم بےاختیار ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف نظر بالکل نہیں رہتی اسی لیے مجرم کے حسنات ہمارے نزدیک کالعدم ہو جاتے ہیں اور حق تعالیٰ کا غضب اور عتاب ان کو بےاختیار نہیں بناتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم منفعل اور متاثر ہیں اور حق تعالیٰ فاعل اور مؤثر جو کچھ وہ کرتے ہیں اختیار سے کرتے ہیں پس ان کا یہاں کا قانون یہ ہے: "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ" یعنی

---

[۱] (لم احد الحدیث فی "موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف")

جوشخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ بھی اس کو دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرا برابر برائی کرے گا وہ بھی اس کو دیکھے گا پس اگر کوئی شخص ایک طاعت کرے اور بعد اس کے پھر معصیت کرے اور پھر ایک طاعت کرے گا اور ایک معصیت۔ اسی طرح کرتا جائے تو ہر طاعت کا ثواب ملے گا اور ہر معصیت پر استحقاق عذاب ہوگا پس یہ سخت غلطی ہے کہ گناہ کے بعد یہ سمجھے کہ میں ایسا مردود ہو گیا کہ اب میری کوئی طاعت بھی قابل قبول نہیں اور در حقیقت منشاء اس کا کبر اور عجب ہے یہ اپنے کو بڑے رتبہ والا سمجھتا ہے کہ معصیت سے کم رتبہ ہو گیا اور وہ ضابطہ سے اپنی نجات کی کوشش کرتا ہے اور اس کی نظر حق تعالیٰ کے لطف و رحم اور حمدیت پر نہیں ہے اور نیز یہ خیال بتلا رہا ہے کہ قبل گناہ کرنے کے وہ اپنے کو مقبول اور اپنی اطاعت کو قابل قبول سمجھتا تھا۔ جواب گناہ کے بعد نا قابل سمجھا حالانکہ فی الواقع کوئی بھی ہماری طاعت کسی وقت میں قابل قبول نہیں ہوتی۔ پس جیسا کہ پہلے سے طاعت کرتے تھے اب بھی ویسا ہی کرنا چاہیے ورنہ صریح کبر ہے جو اصل ہے تمام امراض کی پس ایک خرابی تو اس غلطی میں یہ ہوئی جس کا ذکر ہوا جس کا حاصل فساد اعتقاد ہے اور غلو فی الدین ہے۔

استحضار معاصی کا اثر بد

اور ایک اثر اس کے علاوہ اس غلطی کا یہ ہوتا ہے کہ بعض تو نماز روزہ ہی ترک کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ سمجھتے ہیں کہ اب ہم مردود ہو گئے۔ اب ہمارا روزہ نماز مردود ہے تو کیا فائدہ ہے ایسی نماز سے اور بعض پر یہ اثر ہوتا ہے کہ طاعت میں اس کو حلاوت نہیں آتی اور بعض اوقات اس کے استحضار کے سبب۔ اس لیے طاعت سے شرماتا ہے جیسا کہ کسی نے اسی مضمون کو اس طرح کہا ہے:

احب مناجات الحبیب باوجه ولکن لسان المذنبین کلیل

(محبوب کے ساتھ مناجات میں مشغول ہونا پسندیدہ ہے لیکن گناہگاروں کی زبان لڑکھڑاتی ہے)

کبھی شدت شرم کی وجہ سے یہ حالت ہوتی ہے کہ آدمی دعا نہیں کرتا جیسے غلبہ تفویض بھی دعا سے مانع ہوتا ہے اسی طرح استحضار معاصی بھی کبھی مانع ہو جاتا ہے۔ ایک شخص میرے پاس آئے اور کہا کہ میرے ذمہ قرض ہے میں نے کہا کہ دعا کرو کہنے لگے اجی میری زبان دعا کے قابل کہاں۔ میں نے کہا کہ تمہاری زبان الحمد اور قل ھو اللہ پڑھنے کے بھی قابل نہیں اس لیے کہ جس زبان سے گناہ کرتے ہو وہ زبان اس قابل نہیں رہی کہ اس سے قرآن پڑھو۔ تو بس آج سے نماز بھی چھوڑ دو۔ تم بڑی خطرناک حالت میں ہو۔ آج شیطان نے دعا سے (جو ایک عبادت ہے) کل کو وہ نماز سے روک دے گا اللہ تعالیٰ نے عام خطاب فرمایا ہے: "اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ" (تم مجھ سے دعا کرو میں

تمہاری دعا کو قبول کروں گا) کسی کی تخصیص نہیں فرمائی۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرمادیں کہ دعا قبول کروں گا' دعا کرو اور تم کہتے ہو کہ ہم اس قابل کہاں ہیں۔ یہ تو اچھا خاصا اللہ تعالیٰ کا مقابلہ ہے۔ بعض تواضع کے طور پر بھی کہا کرتے ہیں حالانکہ تواضع یہ نہیں کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو کہے کہ میں تو گدھا ہوں اور اسی غلطی مذکور کی فرع میں ایک اور غلطی بھی ہے اور اس سے سخت پریشانی ہوتی ہے اس وقت محقق کی قدر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض ذاکرین کو قبض واقع ہوتا ہے۔ اگر اس وقت شیخ کامل دستگیری نہ کرے تو وہ اللہ کا نام لینا چھوڑ دیتا ہے۔ اگرچہ فرض و نفل ترک نہ کرے لیکن ذکر شروع کر کے چھوڑ دینا بھی تو سخت نقصان کی بات ہے بالکل نہ کرنا ویسا نہیں دیکھو اگر کسی کے ہاں بالکل نہ جاؤ تو شکایت نہیں ہے اور اگر ایک دوروز جا کر جانا چھوڑ دو تو سخت شکایت اور بعد کا باعث ہو جائے گا' سو اگر ایسے وقت میں کسی محقق کامل کی دستگیری نہ ہو تو سخت غلطی میں مبتلا رہے اور تحقیق اس کے متعلق یہ ہے کہ مقصود حلاوت ولذت نہیں ہے بلکہ مقصود عمل ہے اور اس کی دلیل یہ ہے: "لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (اللہ تعالیٰ کسی کو اس کا مکلف نہیں بناتا مگر اس کی طبیعت اس کے طاقت اور اختیار میں ہو) اور وسع میں عمل ہی ہے لذت نہیں۔ لذت ہو یا نہ ہو' ہر حال میں طالب کی تو یہ شان ہونا چاہیے:

یابم اور ایا نیابم جستجوئے میکنم　　　حاصل آید یا نہ آید آرزوئے میکنم

(اس کو پاؤں یا نہ پاؤں اس کی جستجو کرتا ہوں وہ ملے یا نہ ملے اس کے ملنے کی آرزو کرتا ہوں)

طالب کا مذہب

اور اس سے بڑھ کر مولانا فرماتے ہیں:

ناخوش تو خوش بود برجان من　　　دل فدائے یار دل اے جان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے میں اپنے دل کو اس پر قربان کرتا ہوں)

اور شیخ شیرازی فرماتے ہیں:

خوشا وقت شوریدگان غمش　　　دگر ریش بینند و گر مرہمش

(اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے خواہ اپنے زخموں پر نظر پڑے یا اس کے زخموں پر مرہم)

اور حافظ شیرازی ایسی ہی حالت کی نسبت فرماتے ہیں:

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش　　　کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

(درد و صاف یعنی قبض و بسط تجویز کرنے کا تم کو کچھ حق نہیں ہے جو کچھ عطا ہو جائے تربیت باطنی کے لیے مصلحت اور وہی عین الطاف ہے)

اور اس حالت میں ایک اور خرابی مضمر ہے وہ یہ ہے کہ جب عمل کر کے لذت و کیفیت نہ ہونے پر دلگیر ہوا تو گویا یہ شخص در پردہ خدائے تعالیٰ پر اپنا حق سمجھتا ہے کہ یہ کام ہم کرتے ہیں اس پر یہ ثمرہ مرتب ہونا چاہیے اور مرتب نہ ہونے سے تکدر ہوتا ہے حالانکہ خدا پر کسی کا بھی حق نہیں ہے۔ اگر یہ مضمون پختہ کر لے کہ جو کچھ عنایت ہوتا ہے یہ اس کی عطا ہے ہم پر جو قیمت ہے اس کے ہم کسی درجہ میں بھی مستحق نہیں ہیں تو کبھی یہ حالت ہی پیش نہ آئے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں:

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن   کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تو بندگی فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط سے مت کر کہ آقائے حقیقی بندہ پروری کا طریقہ خود جانتے ہیں)

اور طالب کا مذہب تو یہ ہونا چاہیے:

زندہ کنی عطائے تو   ور بکشی فدائے تو

دل شدہ مبتلائے تو   ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں، دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں)

حضرت سرمد فرماتے ہیں:

سرمد گلہ اختصاری باید کرد   یک کار ازیں دو کاری باید کرد

یا تن برضائے دوست می باید داد   یا قطع نظر زیاری باید کرد

(سرمدؔ شکایت کو مختصر کرو اور دو کاموں میں سے ایک کام کرو یا تو تن کو محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وقف کر دو یا محبوب سے قطع نظر کر دو)

یعنی وہ تو ایسے ہی خدا ہیں کہ تمہاری فرمائشیں پوری نہ کریں گے جو مصلحت اور حکمت ہوگی اس کے موافق کریں گے۔ اگر تم کو پسند ہو کوئی اور خدا ڈھونڈ لو اور غور تو کرو کہ تم تو اپنے نوکر کا کہا مانتے ہی نہیں حالانکہ وہ تمہاری ذاتیات اور بہت سی عرضیات میں شریک ہے مثلاً تم اپنے بیٹے کی شادی مثلاً ربیع الاول میں تجویز کرو اور نوکر بلا ضرورت اتنا پوچھ لے کہ حضور یہ مہینہ آپ نے کیوں تجویز کیا ہے تو اس کے منہ پر ایک جوتہ مارو گے اور یہ کہو گے کہ تو ہماری تجویزوں میں دخل دینے والا کون ہوتا ہے پس

اگر خدائے تعالیٰ اپنی مصلحتیں اور حکمتیں تم کو بتلادیں تو وہ اس کے زیادہ احق ہیں پس یاد رکھو حلاوت اور مزہ کوئی شے مطلوب نہیں ہے اصل شے بندگی اور غلامی ہے ہاں اگر وہ بھی عطا ہو جائے تو ایک نعمت ہے اور محمود ہے لیکن محمود ہونا دوسری شے ہے اور مقصود ہونا اور شے۔ اگر تم حلاوت اور لذت کے طالب ہو تو تم اللہ کے طالب نہیں ہو بلکہ نفس کی خواہش کے طالب ہوئے۔ اللہ کے طالب تو بجز ایک ذات کے کوئی شے مطلوب نہیں وہ کسی حالت میں رکھیں ہر حالت میں راضی رہتا ہے نہ اس کی کوئی مصلحت ہوتی ہے نہ اس کی کوئی غرض درمیان میں رہتی ہے بس اس کی مصلحت تو صرف یہ ہے کہ

مصلحت دید من آن است کہ یاران ہمہ کار   بگذارند و خم طرہ یاری گیرند

طالب حلاوت مدعی کاذب ہے اب حق نہیں ہے جو طالب ہیں ان کے نزدیک تو جیسے ناسوت غیر مقصود بے قدر شئے ہے ایسے ہی ملکوت بھی الحاصل محض اس وجہ سے عمل چھوڑ دینا کہ حلاوت نہیں مزہ نہیں ہے سخت غلطی ہے۔

محققین کے علوم

کبھی اس سے بھی سخت تر ضرر اس غلطی کا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب یہ شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں بالکل مردود ہو گیا ہوں اور میری اطاعت قابل قبول نہیں ہے تو ساتھ ہی اس کے شیطان یہ بھی وسوسہ ڈالتا ہے کہ پھر کیا ضرورت ہے کہ دوسرے گناہوں سے بچو۔ اس لیے کہ گناہوں سے بچنے کا مقصود تو عتاب سے بچنا تھا اور عتاب مجھ کو بوجہ مردودیت کے ضرور ہوگا۔ پھر مشقت و مصیبت سے کیا فائدہ؟ بس اس طور سے اس کو اور گناہوں میں بھی مبتلا کر دیتا ہے حالانکہ جس قدر بھی گناہوں سے بچتا رہتا' اچھا ہی تھا۔ اب یہ پہلے سے بھی بدتر ہو گیا۔ دیکھئے یہ حالت جس کو یہ بزرگی اور مقدس جانتا تھا کس قدر خرابیوں کی طرف مفضی ہوئے اور ہر قسم کی غلطیاں اس سے پیدا ہوئیں' عملی بھی اور علمی بھی اور یہ ساری خرابی جہل اور شیخ کامل کے نہ ہونے سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے محققین کو کہ انہوں نے قلب کے احوال کی تحقیق و تدقیق میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ حقیقت میں ان حضرات کی تحقیقات کے سامنے فلسفہ کے علوم گرد ہیں۔ ان کے علوم تو صرف جواہر و اعراض خارجیہ تک محدود ہیں اور ان حضرات نے قلب کے احوال اور علم معاملہ کو پورے طور پر سمجھا ہے۔ فلاسفہ نے بھی کتاب الاخلاق لکھی ہے لیکن ان حضرات کی تحقیقات کو کہاں پہنچتی ہے۔ شیخ بوعلی سینا کے وقت میں ایک بزرگ تھے شیخ کے بارے میں کسی نے ان سے پوچھا کہ کیسا شخص ہے؟ فرمایا: بوعلی اخلاق ندارد شیخ نے جب سنا کہ میرے متعلق ایسا کہا گیا ہے شیخ نے اخلاق میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کر کے بھیج

دی۔ ان بزرگ نے ایک جملہ میں اس کورد کردیا۔ چنانچہ فرمایا کہ من گفتہ بودم کہ اخلاق ندارد کے گفتہ بودم کہ اخلاق نداند نداند اور چیز ہے۔ حقیقت میں بغیر تزکیہ وتصفیہ قلب کے عقل بھی درست نہیں ہوتی۔ شیخ باوجود اس کے کہ اتنا بڑا عاقل تھا مگر ایک موٹی بات نہیں سمجھا۔

تدبیر ترک معاصی

اسی طرح گناہ کا اس قدر اثر لینا کہ جب یہ چھوٹ جاوے گا اس وقت دوسرے گناہ چھوڑوں گا اور یہ چھوٹے گا تو اس کو چھوڑوں گا۔ اسی طرح طاعت کے کرنے کے لیے گناہوں کو چھوٹنے کا انتظار مت کرو تم تو طاعت کا موقوف علیہ ترک معاصی کو سمجھتے ہو حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔ معاصی جب ہی چھوٹیں گے جب طاعت کا غلبہ ہوگا' بہت لوگ خدا کی راہ میں اس لیے نہیں آتے کہ کہتے ہیں کہ ہم تو گنہگار ہیں کہ کس منہ سے اللہ کا نام لیں حالانکہ ان گناہوں کے چھوٹنے کا اگر کوئی طریقہ ہے تو یہی ہے کہ اللہ کا نام لینا شروع کردو جس قدر طاعت ہوسکے کرو' گو دوام بھی نہ ہو' گاہ گاہ ہو جایا کرے ہمارے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے یہ بھی ایک دوام ہے کہ کبھی ہوا گرچہ دوام ناقص ہی سہی سبحان اللہ کیا دلجوئی ان حضرات میں تھی۔

حسن تربیت

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ میں من جملہ دیگر کمالات کے یہ بھی ایک خاص بات دیکھی کہ جیسی حسن تربیت خاص حضرت اور حضرت کے لوگوں میں تھی ساری دنیا میں نہیں دیکھی' مشائخ اطراف کی جانب بھی میں نے رجوع کر کے دیکھا ہے لیکن سوائے وظیفوں اور تسبیح گھوٹنے کے کچھ نہ پایا اور ان حضرات کے یہاں ظاہر میں چند باتیں اور مختصر جملے ہیں مگر ان باتوں کی قدر وہ جانتا ہے جو کسی بلا میں مبتلا ہو۔ میں خود اپنا قصہ بیان کرتا ہوں: کہ مجھ کو وساوس کا غلبہ ہوا اور ایک سخت حالت واقع ہوئی۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ سے عرض کیا' فرمایا: کہ اس کا علاج یہ ہے کہ التفات نہ کرو' ظاہر میں تو ایک مختصر سی بات ہے لیکن اس کا نفع اس سے پوچھئے جو اس مصیبت میں مبتلا ہو چکا ہو۔ اگر کسی اور بزرگ سے رجوع کیا جاتا تو کوئی وظیفہ بتلا دیتے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ حدیث میں وساوس کے لیے تعوذ آیا ہے اور یہ وظیفہ ہے۔ بات یہ ہے کہ اعوذ بھی دافع وساوس اسی واسطے ہے کہ نفس کو ذکر کی طرف التفات ہوگا اور اس طرف سے توجہ ہٹ جاوے گی۔ چنانچہ اس حدیث میں بھی "فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" (پس اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ) کے بعد "وَلْيَنْتَهِ" آیا ہے اور حضرت کے فرمانے کا حاصل بھی یہی ہے۔ خطرات و وساوس کی مثال تار بجلی کی سی ہے کہ اس کو ذرا ہاتھ لگاؤ پھر دیکھو کیا

ہوتا ہے۔ ایسے ہی وساوس ہیں کہ مستقلاً دفع کرنے سے یہ رفع نہیں ہوتے اور نہ وظیفہ پڑھنے سے دفع ہوں گے۔ ان کا علاج بس یہی ہے کہ ان کی کچھ پروا نہ کرے۔ اس طرح خود ہی چھوٹ جائیں گے۔ چنانچہ میں نے اس تدبیر پر عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی۔ ان حضرات اور ان کے اقوال کی قدر اسی وقت ہوتی ہے جب کسی بلا میں مبتلا ہو ورنہ ظاہر بینوں کے نزدیک یہ معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور ان کی نظر میں قدر ہوتی ہے نئی بات کی۔ مثلاً کوئی چلہ بتلادیں یا ٹانگیں اوپر سر نیچے کر کے کوئی وظیفہ پڑھوائیں۔ ایک شیخ مجھ سے کہنے لگے کہ اسماء عظام کی اجازت دے دو۔ میں نے کہا جناب ہم نے سیکھے ہی نہیں، میں نے ایک دوست کے سوالات کے جواب میں ایک رسالہ لکھا ہے اس میں میں نے حضرت حاجی صاحبؒ کے مسلک کا خلاصہ لکھ دیا ہے اس کو اس حیثیت سے نہ دیکھئے کہ میرا لکھا ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے ملاحظہ فرمایئے کہ اس کے مضامین ایک مجدد فن یعنی حضرت حاجی صاحبؒ سے منقول ہیں۔ مغز اور خلاصہ اس کا مولانا کا یہ شعر ہے:

اندریں رہ می تراش خراش   تادم آخر دم فارغ مباش
تادمے آخر دمے آخر بود   کہ عنایت باتو صاحب سربود

(اس راہ سلوک میں ادھیڑ بن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو آخر دم تک بے کار نہ رہو آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی)

کسی غشی کا انتظار مت کرو بس کام شروع کر دو چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے جس قدر ہو سکے لو لگائے رکھو اگر چلتے رہو گے تو انشاء اللہ ایک دن منزل پر پہنچ جاؤ گے۔ ایک بالشت زمین اگر کوئی روزانہ کھودے۔ تو ایک نہ ایک دن پانی ضرور نکل آوے گا۔

دفع ہجوم گناہ

الحاصل گناہ کے اندر لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں مجھ کو ان آیتوں سے بھی مضمون مستنبط کرنا ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعَانِ" (یقیناً تم لوگوں میں سے جن لوگوں نے پشت پھیر دی تھی جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم بالمقابل ہوئیں) شان نزول ان آیتوں کا یہ ہوا تھا کہ واقعہ احد میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایک غلطی اجتہادی ہوئی تھی لیکن یہ غلطی ایسی تھی کہ ہزار صوابوں سے بڑھ کر تھی۔

خوں شہیداں رازآب اولیٰ تراست   ایں خطا از صد صواب اولیٰ تراست
(شہیدوں کا خون آب حیات سے افضل ہے یہ خطا صد صواب سے بہتر ہے)

واقعہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مورچہ پر پچاسی آدمیوں کو بٹھلا کر یہ فرمادیا تھا کہ خواہ ہم کو فتح ہو یا شکست تم لوگ یہاں سے نہ ہلنا۔ اس کے بعد لڑائی شروع ہوئی تو مسلمان غالب آئے اور مال غنیمت لوٹنے لگے اب ان پچاسی آدمیوں میں اختلاف ہوا ایک فریق کی رائے ہوئی کہ ہم کو بھی غنیمت میں شریک ہونا چاہیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس مورچہ کی حفاظت فتح ہی تک تھی۔ دوسرے فریق نے اسی رائے کے خلاف کیا' آخر کار کچھ ان سے چلے گئے۔ خالد بن الولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسوقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ جب مورچہ خالی پایا تو وہ مع ایک جمعیت کے اس طرف کو آ گئے اور مسلمانوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ یہ ہے وہ غلطی جو حضرات صحابہ سے ہوئی لیکن یہ بالکل بدیہی ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم دنیادار تو تھے نہیں اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دنیا کے واسطے حکم نبوی کو ترک کر دیا بلکہ وجہ اس کی صرف اجتہاد میں غلطی اور کفار کی ہزیمت سے ایک نشاط ہے کہ جس نے شوق پیدا ہوا' غنائم کے جمع کرنے کے اجر حاصل کرنے کا ورنہ غنائم تو ان کو قانوناً یوں ہی ملتیں' اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں سے پہلے دور سے یہ قصہ بیان فرمایا ہے اور اس میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو تنبیہ بھی فرمائی ہے اور کہیں کہیں دلجوئی بھی ہے ایک عجیب اور نرالے طرز سے صحابہ کی تربیت ہے چونکہ صحابہ کو اپنے اس فعل صادر ہونے پر سخت رنج تھا۔ گو خطا اجتہادی ہی تھی لیکن بمقتضائے مقربان رابیش بود حیرانی۔ صحابہؓ اس خطا کے بعد چین سے کیسے بیٹھ سکتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آگے چل کر دلجوئی فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں: ''وَمَآ اَصَابَکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعَانِ فَبِاِذْنِ اللّٰہِ'' حقیقتاً صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس سے زیادہ تسلی دینے والا کوئی مضمون نہیں ہوسکتا۔ ترجمہ یہ ہے کہ جس دن دو جماعتیں (مسلمان و کافر) آپس میں ملی ہیں اس دن تم کو جو مصیبت پہنچی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے پہنچی ہے آگے اور بہت حکمتیں ارشاد ہیں' کہنے کی بات تو نہیں تھی لیکن چونکہ نافع ہے اس لیے کہتا ہوں تا کہ بعض سالکین کی جو یہ حالت پیش آتی ہے کہ جب ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ ہائے ہم سے یہ کیوں ہوا اور اسی غم میں اپنا شب و روز صرف کرتے ہیں اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ پسندیدہ نہیں بس نادم ہو کر اس سے توبہ کر کے دل کو خالی کر لے۔ اگر یہ اس مطالعہ میں رہا تو خدائے تعالیٰ کا مطالعہ کب کرے گا اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی یہ بھی رحمت ہے کہ گناہ بعد توبہ کے اس قدر ہجوم کے ساتھ یاد نہ آئیں ورنہ سخت مصیبت ہوتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ سخت مجاہدہ ہے کہ گناہ یاد آویں اور اس سے انقباض بھی ہو اور پھر بھی طاعت میں مشغول رہے۔ پس علاج اس کا

یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کر کے پھر اس کی طرف التفات نہ کرے۔ چنانچہ حدیث شریف میں اس واسطے یہ دعا آئی ہے: "رَبِّ اغْفِرْلِیْ مَاقَدَّمْتُ وَمَااَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا عَلِمْتُ وَمَا لَمْ اَعْلَمْ"[1] (یا اللہ بخش دے جو کچھ پہلے کیا میں نے اور جو کچھ بعد میں کیا اور جو کچھ پوشیدہ کیا اور جو کچھ اعلانیہ کیا اور جو کچھ تو اسے زیادہ جانتا ہے مجھ سے) نہ فرمایا تاکہ گناہوں کی فہرست مستحضر نہ کرنا پڑے کہ اس میں مشغول ہونا تشاغل عن الحق ہے پس شان طالب کی یہ ہے کہ گناہ گو یاد آ دیں مگر اپنے کام کو خراب نہ کرے اور خدا کے سوا کسی چیز کو بھی گو وہ گناہ ہی کی یاد ہو دل میں جگہ نہ دے اور یہ حال ہو جیسا کہ کسی کا شعر ہے:

بے حجابانہ درآ اندرو کاشانہ ما　　　　کہ کسے نیست بجز درد تو درخانہ ما

اور یہ وہ امور ہیں جو کتب درسیہ سے حاصل نہیں ہوتے جس شخص کو اس پر ناز ہو اس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں:

جملہ اوراق و کتب در نارکن　　　　سینہ را از نور حق گلزار کن

طرز تربیت قرآن مجید

اور علاج یہ نہیں کہ ان خطرات کے دفع کرنے میں مشغول ہو۔ ایک کو دفع کرے گا دوسرا آوے گا۔ اسی طرح سلسلہ اس کا ختم نہ ہوگا۔ بس طریقہ ایکے دفع کا ہے تو یہ ہے کہ اپنے کام میں مشغول اور اس طرف التفات ہی نہ کرے۔ ایک ہمارے مخدوم نے ایک اس کی بہت اچھی مثال دی کہ اگر چوہے مکان کے اندر بہت ستاتے ہوں تو اگر یہ تدبیر کی کہ سوراخ بند کر دے تو وہ اور سوراخ کر کے آ جاویں گے ایک کو دفع کرے گا دوسرا آ جاوے گا۔ علاج یہ ہے کہ روشنی سے بھاگ جاویں گے۔ پس یہاں بھی ذکر کر کے نور سے سب خطرات دفع ہو جاویں گے۔ حاصل بیان کا یہ ہے کہ گناہوں کے غم میں مبتلا ہو جانا بعض اوقات بجائے نافع ہونے کے ضار ہو جاتا ہے اس میں مبالغہ نہ کرے ہاں ضروری توبہ کر کے کام میں لگ جاوے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم چونکہ بعد توبہ سے بھی اس غم میں مبتلا تھے اور یہ کسی وقت میں مضر ہوتا حق تعالیٰ نے ان آیات میں اور ان کے سیاق و سباق میں اس غم کو خفیف فرمایا۔ چنانچہ ایک تسلی اوپر فرمائی: "وَاَصَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا..... الآیۃ" (پس اللہ تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تاکہ تم مغموم نہ ہوا کرو) اور اس تقریر پر لاکو زائد لکھنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ

---

[1] (سنن الدارمی: ۳۰۵)

مطلب صاف ہے کہ ہم نے تم کو غم اس لیے دیا تھا کہ اس کو پاداش سمجھ کر تمہارا حزن ہلکا ہو جاوے کیونکہ مطیع کے لیے یہ بھی ایک موت ہے کہ اس کی خطا پر سزا نہ ہو وہ اس سے کچھ ہلکا ہو جاتا ہے کچھ سزا بھی دے دی جاوے۔ دوسری تسلی اس آیت میں فرمائی: "لَقَدْ عَفَا اللّٰہُ عَنْھُمْ" (اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا) تیسری تسلی بعد میں فرمائی: "فَبِاِذْنِ اللّٰہِ" الآیۃ (پس اللہ کے حکم سے) اور اگر غور کیا جاوے ان آیات میں تو اور بھی وجوہ تسلی کے متعدد ہیں۔ مثلاً "وَاَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً" (پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد تم پر چین بھیجی) اور مثلاً "اِسْتَزَلَّھُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا" (ان کو شیطان نے لغزش دے دی بہ سبب ان کے بعض اعمال کے) اور مثلاً "قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْھَا" (اسی طرح تم مبتلا ہوئے) اور مثلاً "وَلِیَعْلَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ" الآیۃ (تا کہ ایمان والے جان لیں) بس مقصود تو بیان سے یہ تھا اور "اِنَّمَا اسْتَزَلَّھُمْ" (ان کو لغزش دے دی) سے ایک یہ فائدہ بھی ماخوذ ہوا کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب ہو جاتا ہے اس لیے جو گناہ چھوٹ جائے چھوڑ دو اس سے کچھ گناہوں کا سلسلہ تو کم ہوگا اس کا انتظار نہ کرو کہ سب ہی چھوٹیں تو چھوڑوں۔ سبحان اللہ قرآن مجید کی کیا تربیت ہے۔ اب دعاء فرمایئے حق تعالیٰ فہم و توفیق دے۔ آمین۔

الوعظ المسمی بہ

الکاف

۱۷ ربیع الاول سنہ۱۳۳۶ھ بروز بدھ کو بمقام کالپی ضلع جالون میں یہ وعظ دو (۲) گھنٹے دو (۲) منٹ تک چوکی پر کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد مستورات کے علاوہ تقریباً دوسو تھی۔ حکیم مصطفیٰ صاحب بجنوری نے قلم بند فرمایا۔

یہ صیغہ اسم فاعل کا ہے کف بمعنی روکنے کے چونکہ یہ وعظ معاصی سے روکنے والا ہے اس طرح کہ اس میں معاصی سے رکنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اس لیے اس کا نام الکاف رکھا گیا۔۱۲ ظفر

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓائِفٌ مِّنَ الشَّیْطَانِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ○ وَاِخْوَانُھُمْ یَمُدُّوْنَھُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَایُقْصِرُوْنَ○

(الاعراف آیت نمبر۲۰۱'۲۰۲)

ترجمہ: ''یقیناً جولوگ خداترس ہیں جب ان کوکوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور جو شیطان کے تابع ہیں وہ ان کوگمراہی میں کھینچتے ہیں پس وہ باز نہیں آتے۔''

تمہید

یہ دوآیتیں ہیں جن میں حق تعالٰی نے ایک ایسا مضمون بیان فرمایا ہے جس کے دو جزو ہیں اوران دونوں جزوں میں تقابل ہے کیونکہ ایک آیت میں متقین کا ذکر ہے۔دوسری میں اشرار کا اور ایک آیت میں متقین کے ایک فعل کا ذکر ہے۔یعنی تذکر کا اس سے اشارۃً بتلادیا کہ اشرار کا کام غفلت ہے کیونکہ جب اشرار متقین کے مقابل ہیں تو دونوں کے کام بھی باہم متقابل ہونے چاہئیں اورتذکرہ کا تقابل غفلت کے سوا کچھ نہیں۔یہ تو آیت میں معنوی تقابل ہے اورعجیب بات ہے کہ جیساان میں معنوی تقابل تھا ایسا ہی بیان میں تقابل بھی ہو گیا ہے۔

کلام الٰہی کی لفظی خوبی

اوراس ہوگیا کے لفظ سے جوکہ ایک جملہ ہے یہ نہ سمجھا جائے کہ اتفاقاً اور بلاقصد ایسا ہو گیا جیسے کہ بعض وقت شعراء کے کلام میں ہوجاتا ہے کہ ایک مضمون لکھا اوراس میں کوئی صنعت بلاارادہ

پیدا ہوگئی۔ یہ بات قرآن شریف میں نہیں ہوسکتی کیونکہ قرآن حق تعالیٰ کا کلام ہے اور حق تعالیٰ کے افعال سب کے سب بلا اضطرار ہیں جو بھی صنعت اس میں ہے وہ باختیار وبقصد ہے اتفاقی نہیں ہے اور وہ لفظی تقابل مبصرون اور یبقصرون کا ہے۔ قرآن ہے تو نثر مگر رعایتیں صنائع کی اس میں نظم کی سی ہیں۔ اس کو دوسرے لفظ میں تناسب بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی تناسب کلمات اس میں نظم کا سا ہے۔ نظم میں تناسب کلمات کی رعایت خاص طور سے کی جاتی ہے کہ کلمات ایسے ملائے جائیں کہ ان میں ذرا بھی تنافی نہ ہو بلکہ ایسے مرتبط ہوں کہ زبان سے ادا کرنے میں بھی رکاوٹ نہ ہو اور اس کے لیے خاص خاص وزن مقرر ہیں جن کا یہی فائدہ ہے کہ کلمات کی ترکیب میں سلاست رہے اور پڑھنے میں زبان ذرا نہ رکے اسی واسطے نظم کا یاد ہونا بہ نسبت نثر کے سہل ہوتا ہے۔ یہی حالت قرآن کی ہے کہنے کو تو نثر ہے مگر تناسب کلمات ایسا رکھا گیا ہے کہ کسی نظم میں بھی نہیں ہوسکتا۔ دیکھ لیجئے کہ قرآن کی عبارت میں جو سلاست وحلاوت ہے وہ کسی نظم میں بھی نہیں ہے۔ علاوہ برکت اور اعجاز کے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن یاد ہونے میں نہایت سہل ہے کہ بچے تک حفظ کر لیتے ہیں اور کسی اتنی بڑی منظوم کتاب کو کبھی نہ سنا ہوگا کہ کسی نے ایسی سہولت سے حفظ کر لیا ہو اور پھر عام طور پر بلغاء کے کلام میں بھی تقابل ہوتا ہے' تناسب بھی ہوتا ہے اور تقابل جب ہی محمود ہے جبکہ تناسب بھی ہو ورنہ صرف قافیہ بندی ہوگی جو بلاغت میں دخیل تو کیا بعض وقت بلاغت میں مخل ہو جاتی ہے اور کلام کو بالکل گرا دیتی ہے۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا اور کلام الٰہی کی لفظ خوبی کا بیان تھا۔

برمحل تجویز

اصالۃً اور بالقصد بیان اس کا ہے کہ آیت میں دو ضروری مضمون بیان ہوئے ہیں اور وہ دونوں ایک مضمون کے دو جزو ہیں۔ اس لحاظ سے ان کو ایک مضمون بھی کہہ سکتے ہیں اور دو بھی کہہ سکتے ہیں اور ان کا ضروری ہونا عنقریب واضح ہوجائے گا جس سے اس مضمون کو اختیار کرنے کی وجہ بھی معلوم ہوجائے گی۔ یوں تو قرآن کی ہر آیت میں مضمون ضروری ہی بیان ہوتا ہے کیونکہ قرآن میں عبث ایک بات بھی نہیں عبث اور لغویات تو کسی ادنیٰ عاقل کے کلام میں بھی نہ ہونا چاہیے چہ جائیکہ اس کلام میں جس کو دلیل سے کلام الٰہی کہا جائے لیکن کسی نسخہ میں خاص حالتوں کے لحاظ سے اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ایک طبیب نہایت حاذق اور اپنے فن کا کامل ہے تو اس کے کسی نسخہ کو بے جا یا غلط تو نہیں کہہ سکتے اور یہی کہنا پڑے گا کہ اس کے سب نسخے اچھے اور صحیح ہیں تو نفس صحت میں تو سب نسخے برابر ہیں۔ لیکن بعض نسخے اعتبارات سے اور نسخوں سے فائق ہوسکتے ہیں مثلاً کوئی مرض عام ہوجائے اور

طبیب نے غور کر کے ایک نسخہ ایسا لکھا جس میں یہ بھی رعایت کی کہ مفید ہونے کے ساتھ سہل الحصول اور کم خرچ بھی ہوتا کہ ہر کس و ناکس اس سے فائدہ حاصل کر سکے اور مثلاً یہ بھی رعایت رکھی کہ بدمزہ بھی نہ ہو تو ان خوبیوں کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ نسخہ بہت ہی اچھا ہے اور ضروری ہے کیونکہ آج کل یہ بیماری زیادہ ہو رہی ہے اس کو دیکھ کر ہی برمحل تجویز کی ہے۔ یہی حالت امور دینیہ کی ہے کہ نفس صحت اور واجب العمل اور ضروری ہونے میں تو سب برابر ہیں اور اس لحاظ سے دین کی جس بات کی تبلیغ کی جائے وہ سب برمحل اور ضروری ہے مگر بعض امور خارجی ایسے بھی منضم ہو جاتے ہیں جو کسی ایک خاص امر کے تبلیغ و بیان کی ترجیح کو مقتضی ہوتے ہیں اور اس مقتضی کا کوئی ضابطہ نہیں جس میں واعظ کا فہم کافی ہو صرف تفہیم باری تعالیٰ پر موقوف ہے کہ بیان کرنے والے کے دل میں احساس مسلم پیدا کر دیتے ہیں کہ اس وقت فلاں مضمون کا بیان کرنا زیادہ ضروری ہے وہی کام لینے والے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے اور مسلم ہے کہ آج کل ہر ہر حالت خراب ہے تو جس حالت کو بھی بیان کیا جائے اور اس کی اصلاح کی تدبیر بتلائی جائے عین مصلحت ہوگی لیکن وہ حالات بھی باہم ایک تفاوت رکھتے ہیں جس کی رو سے بعض کی اصلاح کو راجح اور مقدم اور بعض کو مرجوح اور اور مؤخر کہہ سکتے ہیں بنا بریں مسلمانوں کی حالتوں کے متعلق جو بحث بھی کی جائے اس کے لیے ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ عجلت نہ کی جائے بلکہ تامل سے کام لیا جائے اور جس کی ضرورت زیادہ ہو اس سے بحث کی جائے یہی صورت مناسب ہے کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ ایک جلسہ میں سب حالتوں کا اور ان کی اصلاحوں کا بیان تو نہیں ہو سکتا بعض ہی کا بیان ہوگا اس لیے مجموعی حالات میں سے اس بعض کا انتخاب کرنا پڑے گا اور انتخاب کے لیے معیار اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ زیادہ ضروری کو لیا جائے اور کم ضروری کو چھوڑ دیا جائے اور اگر اس کا عکس کیا جائے تو ظاہر ہے کہ نامناسب ہوگا۔ دعویٰ کرنا بیجا ہے کہ میں نے اس معیار کو ملحوظ کہہ کر تمام بیانوں میں سے ایک کو اختیار کیا ہے مگر ہاں حق تعالیٰ کا انعام ہے کہ اس مقام پر آنے کے بعد منجانب اللہ قلب میں آیا کہ ایسا مضمون بیان ہو جو عام ہو اور نفع اس کا تام ہو۔

غفلت کا علاج

اور عموم اس کا بلحاظ اشخاص کے بھی ہو اور بلحاظ اوقات کے بھی اس واسطے میں نے اس آیت کو اختیار کیا۔ چنانچہ عرض کرتا ہوں "اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا" جو لوگ متقی ہیں ان کی شان یہ ہے کہ "اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ" جب ان کو شیطان کا ذرا سا بھی اثر ہو جاتا ہے تو تذکر وہ یاد کر لیتے ہیں اور ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ تذکروا کا مفعول ذکر نہیں کیا۔ اس میں اشارہ ہے کہ یاد

کر لینے کی چیز کو یاد کر لیتے ہیں اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اس وقت یاد سے کام لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت کا علاج یاد ہے۔ مطلقاً قطع نظر اس کے کسی خاص فرد سے اور اس کے افراد وغیرہ کی تعیین مستقل مسئلہ ہے اگر کسی فرد کو یہاں ذکر کر دیتے تو وہی متعین ہو جاتا باقی افراد کی نفی ہو جاتی مگر کسی فرد کی تعیین نہیں کی گئی اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی فرد کا بھی ذکر ہوتا تو بے محل ہوتا کیونکہ محض فائدہ یہاں صرف ضرورت تذکر ہے نہ کہ تعیین افراد کی۔ اس کی کسی قدر تفصیل یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ علاج بالضد ہوتا ہے مثلاً حرارت کا علاج برودت سے اور برودت کا حرارت سے ہوتا ہے۔ یہاں دیکھنا چاہیے کہ شیطان کے اثر سے کیا مرض پیدا ہوا جو مرض پیدا ہوا ہو اس کی ضد کا پیدا کرنا علاج ہوگا۔ سو شیطان کے اثر سے بہت سے امراض پیدا ہوتے ہیں مگر ان سب امراض کی جڑ غفلت ہے۔ یعنی شیطان کے اثر سے اولاً غفلت ہی پیدا ہوتی ہے مگر آیت میں اس کا بیان صراحۃً نہیں ہے اور اس کی وجہ دو ہیں ایک تو یہ کہ یہ بہت ظاہر ہے دوسرا یہ کہ تذکروا کے لفظ سے اس کا پتہ چل جاوے گا کیونکہ ایک مقابل سے دوسرے مقابل پر تنبیہ ہو جاتی ہے اور خود بخود دوسرے کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے جیسے اندھے کا ذکر سن کر سوانکھے کی طرف خود ذہن چلا جاتا ہے۔ اسی طرح تذکر سے غفلت خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے تو چنداں حاجت اس کے بیان کی نہ رہی اور کلام کی بلاغت اسی میں ہے کہ زائد از کار بات بالکل نہ ہو۔ پس آیت میں مقابلہ ہے غفلت اور یاد کا۔ باقی اس سے بحث نہیں کہ کس کی یاد۔ یہ ایسا ہے جیسے اگر بھوکے کو علاج بتاویں تو کہیں گے کچھ کھاؤ اور اس وقت یہ کہنا بے موقع ہوگا کہ پلاؤ یا قورمہ یا فیرنی کھاؤ' اس وقت اجمال میں جو بلاغت ہوگی تفصیل میں ہرگز نہ ہوگی بلکہ جتنی تفصیل بڑھتی جاوے گی کلام بلاغت سے گرتا جاوے گا۔ مثلاً کوئی بھوکے سے یوں کہنے لگے کہ علاج تمہارا یہ ہے کہ گوشت کو لے کر پانی سے دھو کر یخنی پکاؤ اور اس میں سونف دھنیا' گرم مصالحہ اتنا اتنا ڈالو اور اتنی دیر تک پکاؤ پھر ہاتھ تین دفعہ دھوؤ اور دستر خوان بچھا کر بیٹھو اور اس پلاؤ کو کھاؤ' تو ظاہر ہے کہ اس طویل تقریر کو کوئی بھی نظر استحسان سے نہ دیکھے گا۔ اس وقت بلیغ جواب یہی ہے کہ بھوک کا علاج یہ ہے کہ کچھ کھاؤ اور یہ مستقل بات ہے کہ کیا کھاؤ' اس کے لیے مستقل علم موجود ہے یعنی علم طب۔ غرض آیت پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ تذکروا کے مفعول کی تعیین نہیں کی۔ جواب یہی ہے کہ مقصود کی اہمیت کی وجہ سے اس کا ذکر نہیں کیا اور یہاں مقصود نفس تذکر ہے دوسرے تذکر کی اہمیت جتلانا بھی مقصود ہے۔ یہ نکتہ ہوا تذکروا کے مفعول کے حذف ہونے کا۔

اثر تذکر

آگے اثر تذکر کا بیان فرماتے ہیں: "فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُوْنَ" (پس یکا یک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) اذا کلمہ مفاجات ہے جو دلالت کرتا ہے تعجیل ترتب اثر پر۔ معنی یہ ہوئے کہ تذکر سے فوراً ہی وہ صاحب بصیرت ہو جاتے ہیں اور وہ بصیرت اثر مس شیطان کو روک دیتی ہے۔ آگے فرماتے ہیں: "وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ" (اور جو شیطان ان کے تابع ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچتے ہیں) اس میں متقین کے مقابلہ میں دوسرے لوگوں کا ذکر ہے۔ یعنی اشرار کا ان کا کام یہ ہے کہ جیسے خود گمراہ ہیں دوسروں کو بھی اپنی ہی طرف کھینچتے ہیں۔ ان کو حق تعالیٰ نے اخوانھم سے تعبیر فرمایا۔ اس کا ترجمہ قوم یا برادری سے کیا جاوے تو بہت مناسب ہے بلکہ آج کل کے مناسب اس کے ترجمہ کے لیے ایک لفظ بہت ہی بامحاورہ ہے جو بہت زبان زد ہے وہ لفظ برادران وطن ہے۔ یہ لفظ مخالفین کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے اور آیت میں بھی مراد مخالفین ہی ہیں لفظی تہذیب بھی عجب چیز ہے اس سے مخالفت کم ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ تکلف سے نہ ہو۔ جیسے آج کل بعض وقت کہتے ہیں ہمارے معزز دوست (یعنی دشمن) اور اگر ایسے الفاظ تکلف اور تصنع سے استعمال کیے جاویں تو بجائے اس کے کہ مخالفت کم ہو اور زیادہ ہو جاتی ہے اور مخالف کو اور زیادہ غیظ ہو جاتا ہے کیونکہ سمجھتا ہے کہ ہم کو بناتے ہیں۔ اصل غرض ایسے الفاظ سے مخالفت کا گھٹانا ہوتا ہے اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے وہ کہیں ان کے استعمال سے حاصل ہوتی ہے اور کہیں ان کے ترک سے حاصل ہوتی ہے اسی واسطے قرآن شریف میں ان الفاظ کا ہر جگہ التزام نہیں کیا گیا اور تہذیب حقیقی یہی ہے نہ یہ کہ صورت تہذیب اور الفاظ کے ایسے پیچھے پڑیں کہ حقیقت اور اصل غرض سے بھی بحث نہ رہے۔ جیسے آج کل تہذیب کا غلبہ ہے کہ کیا افعال کیا اقوال سب میں بناوٹ دکھاوا ہی رہ گیا ہے۔ منہ پر قبلہ وکعبہ کے سوا بات نہ کریں اور پیچھے گالیاں دیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ آج کل زبان کو اس قدر رشستہ کیا ہے کہ دہلتے دہلتے پھٹ گئی اور دھجیاں اڑ گئیں۔ شریعت نے ہم کو تہذیب سکھائی ہے مگر تلبیس اور پالیسی نہیں سکھلائی۔ جیسے آج کل کے مہذبین میں ہے کہ کوئی شخص شریعت کے مطابق نہیں اور چال سے خالی نہیں۔ غرض حق تعالیٰ نے مخالفین کو اخوانھم سے تعبیر فرمایا۔ گو حق تعالیٰ کو ضرورت اس قسم کے الفاظ کی نہ تھی۔ مگر تعلیماً ان کو اختیار کیا تا کہ مسلمان طریقہ گفتگو معلوم کر لیں۔ فرماتے ہیں: "وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ" یعنی دوسرے لوگ ان کو کھینچتے ہیں تانتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح گمراہی کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ "ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ" پھر وہ اپنے اس کام میں کوتاہی نہیں کرتے یعنی برابر کوشش جاری رکھتے ہیں۔ دونوں جملوں کا حاصل اور خلاصہ مضمون یہ ہوا کہ دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو اس

میں کوشاں ہیں کہ گناہ سے بچیں اور گناہ کو ترک کریں اور ہوشیار رہتے ہیں کہ ذرا بھی ان کے پاس شیطان آ جاتا ہے تو چونک جاتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں کہ گناہ میں پھنستے ہیں اور دوسروں کو بھی پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ قرآن شریف میں جو باتیں بطور اخبار میں بیان کی جاتی ہیں ان سے صرف نقل اور حکایت مقصود نہیں ہوتی بلکہ مقصود انشاء ہوتی ہے کیونکہ قرآن تاریخی کتاب نہیں ہے بلکہ روحانی مطب ہے اور طب کی کتابیں۔ حکایات سے بھی علاج ہی مقصود ہوا کرتا ہے۔ پس قرآن کے تمام قصص اور جمل خبریہ حقیقت میں اوامر واحکام وانشاء ات ہیں۔ علاوہ ازیں یہ کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ میں اصل جملہ انشائیہ ہی ہے وہی مقصود ہوتا ہے جملہ جزیہ خود مقصود نہیں ہوتا اور جس خبر سے محض خبر مقصود ہو اور کسی معنی انشائی پر دلالت نہ ہو وہ عقلاء کے نزدیک مہمل ہے۔ پس یہاں ان دونوں قسموں کے بیان کرنے سے صرف ایک واقعی بات کی خبر دینا مقصود نہیں ہو سکتی کہ معلوم کرلو کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں کیونکہ یہ تو فعل زائد ہے جو کسی ادنیٰ عاقل سے بھی بعید ہے۔ چہ جائیکہ خدا تعالیٰ کے کلام میں ایسا ہو بلکہ مقصود انشاء ہے یعنی امر کرنا اس بات کا کہ تم اول گروہ کے موافق بنو اور دوسرے کے موافق نہ بنو اور گناہ کے ترک کی ترکیب بتانا اور گناہوں میں مبتلا ہونے کے سبب پر مطلع کرنا منظور ہے کہ اس طرح گناہ سے بچ سکتے ہیں اور فلاں طریق اختیار کرنے سے گناہ میں پڑ جاتے ہیں۔ سو متقین کی حالت تو یہ بیان کی کہ جب ان کو ذرا سا بھی اثر شیطانی محسوس ہوتا ہے تو وہ تذکر اختیار کرتے ہیں اور میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ تذکر مقابل غفلت کا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ اثر شیطانی غفلت ہے۔ بس یہ ہی اصل الاصول تمام خرابیوں کا اور یہی ہے ذریعہ گناہ میں پڑنے کا اور اسی کا ترک کرنا علاج ہے تمام امراض کا اور یہی مقصود ہے اس وقت کے بیان سے اور یہی خلاصہ ہے آیت کا۔ غالباً اب اس مضمون کی اہمیت اور ضرورت اچھی طرح معلوم ہوگئی ہوگی کیونکہ گناہوں سے بچنے کی ہر شخص کو ضرورت ہے کون شخص ایسا ہے جس کو گناہوں سے بچنے کی ضرورت نہ ہو کیونکہ ہم سب اس مرض میں مبتلا ہیں اور مرض کا علاج سبب کے ازالہ سے ہوتا ہے اور گناہوں کا سبب غفلت ہے پس اس کے ازالہ کی ضرورت کا عام ہونا ظاہر ہے۔ غور کر کے دیکھ لیجئے کہ ہم میں صرف یہی تباہی ہے جس کا نام غفلت ہے۔ اسی سے ہماری دنیا بھی برباد ہے اور اسی سے دین بھی برباد ہے۔ اس نے ہمارے مذاقوں کو ایسا مسخ کیا ہے کہ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح سمجھنے لگے۔ دیکھئے! معاصی اور جرائم کیسی بری چیز ہیں اور انسانی فطرت کے بھی خلاف ہیں مگر غفلت ایسی چیز ہے کہ یہ ان کو بھی لذیذ بنا دیتی ہے۔ غفلت ہی سے معاصی پر اقدام ہوتا ہے پھر شدہ شدہ قلب سے گناہوں کی نفرت زائل ہو جاتی ہے کیونکہ معاصی میں خاصیت

ہے قلب کو مسخ کر دینے کی جیسے سنکھیا میں خاصیت ہے قتل نفس کی اور یہ کیفیت مسخ رفتہ رفتہ ایسی بڑھ جاتی ہے کہ بالکل قلب پر چھا جاتی ہے اور حواس کو الٹا کر دیتی ہے۔ معاصی کرنے والے غور کریں کہ اول مثلاً جب رشوت لی تھی تو کس قدر خجلت اور شرم تھی کہ رقم ٹھہرانا اور منہ سے مانگنا تو درکنار آنکھ بھی نہ اٹھتی تھی اور لینے کے لیے ہاتھ آگے نہ بڑھتا تھا' اول بار تو یہ حالت تھی۔ دوسری بار میں ذرا جھجک کم ہوئی۔ تیسری بار میں ہاتھ بھی پھیلنے لگا' پھر تو منہ سے بھی مانگنے لگے اور رشوت لیتے لیتے پھر تو یہ نوبت ہوگئی کہ تقاضا کرتے ہیں اور دھمکاتے ہیں کہ مقدمہ کا ناس کردوں گا اور کپڑے اتارلوں گا یہ بے باکی کاہے سے پیدا ہوئی اسی غفلت کے بڑھنے سے ورنہ اول دن جب غفلت نہ بڑھی تھی رشوت لیتے وقت کیسی خجلت پیدا ہوئی تھی۔

مسخ فطرت

بخلاف نیک کام کے کہ اس سے کسی دن خجلت اور ندامت نہیں ہوتی اور کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ اس نے نماز شروع کی ہو اور اول دن شرم کے مارے عرق عرق ہوگیا ہو۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ فعل قبیح درحقیقت فطرت انسانی کے خلاف ہی ہے اور جب تک سلامت فطرت باقی رہتی ہے ضرور اس سے طبیعت رکتی ہے ہاں جب یہ سلامتی مسخ ہوجاتی ہے تو افعال بھی برعکس ہونے لگتے ہیں۔ بخلاف فعل مشروع کے جس کو طاعت کہتے ہیں وہ فطرت انسانی کے عین موافق ہے اس کو کرکے کبھی انقباض نہیں ہوتا بلکہ بشاشت ہوتی ہے۔ بعض لوگ اس کی وجہ میں کہ رشوت اول بار لیتے وقت رکاوٹ تھی یہ کہا کرتے ہیں کہ چونکہ عادت کے خلاف ایک نیا کام تھا اس واسطے رکاوٹ تھی۔ یہ غلط ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اول بار نماز پڑھتے وقت بھی خجلت اور شرم ہوتی کیونکہ وہ بھی عادت کے خلاف نیا کام تھا حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ وجہ وہی مخالفت فطرت سلیمہ ہے جو حق تعالیٰ نے انسان کو خلقت عطا فرمائی ہے نہ کہ ترک عادت۔ اگر کوئی کہے کہ اول بار نماز پڑھتے وقت بھی تو ہم دیکھتے ہیں کہ پڑھنے والا افعال نماز کو رک رک کر کرتا ہے اور شرمایا شرمایا سا ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ ترک عادت ہی سبب ہے اس خجلت کا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ غور کرکے دیکھئے! نماز پڑھنے والا نماز سے نہیں شرماتا بلکہ اپنی ناواقفیت سے شرماتا ہے۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ دیکھنے والے ہنسیں گے کہ کیسا ناواقف ہے تو اس وقت جو کچھ خجلت سی معلوم ہوتی ہے وہ ناواقف ہونے سے ہے نہ کہ نماز سے اور نماز سے ناواقف ہونا بھی خود خلاف فطرت سلیمہ ہے تو یہ خجلت بھی اسی لیے ہوئی کہ یہ شخص نماز کے ساتھ ایک دوسرے فعل مذموم سے بھی متصف ہے۔ صرف نماز سے متصف ہوتا اور ناواقفیت سے موصوف نہ ہوتا تو خجلت کبھی نہ ہوتی اور یہ بہت ہی ظاہر بات ہے طول کی ضرورت نہیں۔ غرض طاعت سے کبھی پشیمانی نہیں ہوتی' نماز پڑھ کر کسی کا دل برا نہیں

ہوتا' نفس پر مشقت ہونے سے تکان اور کم ہمتی ہوجانا اور بات ہے۔ کوئی مکان بناتا ہے اور خوشی خوشی تعمیر کراتا ہے مگر اس میں بھی تھک کر کچھ دیر کو پڑ رہتا ہے حتیٰ کہ کبھی زبان سے بھی کہتا ہے کہ کیا بکھیڑا مول لیا اور کیا بلا پیچھے لگ گئی مگر یہ پشیمانی نہیں ہے بلکہ تکان اور تعب ہے۔ یہی حال نماز کا ہے کہ کبھی نفس درماندہ ہوکر منقبض ہوجاتا ہے مگر اس کو پشیمانی اور دل برا ہونا نہیں کہہ سکتے۔

دنیا کی بربادی

سو اس کی وجہ یہی ہے کہ خود فعل میں ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ برے فعل میں برا اثر اور اچھے فعل میں اچھا اثر۔ باقی غفلت سے احساس کا برعکس ہوجانا امر دیگر ہے اور غفلت کے اسی اثر کے سبب میں نے ابھی کہا تھا کہ غفلت سے ہماری دنیا بھی برباد ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ غفلت موجب ہے معاصی کی اور معاصی سے دنیا بھی برباد ہوتی ہے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ دنیا میں جو چیزیں بھی مطلوب ہیں اور ان کے حصول کو کامیابی کہا جاتا ہے ان سب کی اصل اور لب لباب راحت ہے۔ مثلاً تمول دنیا کا بڑا مقصود سمجھا جاتا ہے اور جو کوئی مالدار ہوگیا تو کہا جاتا ہے کہ بڑا خوش نصیب اور کامیاب ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تمول خود مقصود بالذات ہے یا مقصود بالذات کچھ اور ہے اور یہ اس کا ذریعے ہونے کی وجہ سے مقصود سمجھا جاتا ہے۔ سو حقیقت حال یہی ہے کہ امر واقع شق ثانی ہے یعنی تمول۔ اس واسطے مطلوب ہے کہ وہ ذریعہ ہے مطلوب اصلی کا اور مطلوب اور چیز ہے اور وہ راحت ہے چونکہ تمول عادت ذریعہ ہے ہر قسم کی راحت و آسائش کا' اس واسطے اسی کو مطلوب سمجھا جاتا ہے۔ اس کی بہت موٹی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی موقع پر تمول اس غایت سے خالی ہوجاوے تو پھر وہ مطلوب نہیں رہتا' مثال کے لیے عرض کرتا ہوں کہ ایک شخص سے کہا جائے کہ ایک لاکھ روپیہ ہم تجھ کو دیتے ہیں اس شرط سے کہ چھ مہینے کے بعد تجھ کو پھانسی دیں گے یا تیری سب اولاد کو مار ڈالیں گے تو تمول تو یہاں متوقع ہے مگر چونکہ ذریعہ راحت نہیں ہے اس واسطے کوئی بھی اسے منظور نہ کرے گا الا آنکہ کسی کی حس ہی باطل ہو اور عقل ہی سے خارج ہو۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ تمول مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصد بالغیر ہے۔ اور وہ غیر راحت ہے تو جو چیز اس میں مخل ہو وہ دنیا کی کامیابی میں مخل ہے اور جو چیز اس کا ذریعہ ہو وہ کامیابی کا ذریعہ ہے۔ اب دعوی کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ گناہ سے تشویش ضرور ہوتی ہے اور تشویش راحت کی ضد ہے تو گناہ دنیا کی کامیابی میں مخل ہوا نہ کہ ذریعہ کامیابی یہ اور بات ہے کہ گناہ کرتے کرتے عادت ایسی ہوگئی کہ اس کے اثر کا احساس نہیں رہا جیسے سنکھیا اور افیون کی عادت ہوجاتی ہے مگر جس طرح سنکھیا اور افیون کی عادت ایک دن رنگ لاتی ہے اور اخیر عمر میں وبال جان ہوجاتی ہے۔

عقوبت آخرت

اسی طرح جو لوگ معاصی کے عادی ہیں ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں تو عادت ہو جانے سے گو ان کو بے پروائی بھی ہو گئی ہے اور معصیت سے جو تشویش ہوتی ہے اس کا احساس نہیں رہا مگر معصیت کا جو نتیجہ آخرت میں ہونے والا ہے اس کی حالت ایسی نہیں ہے جس کی عادت یا بے پروائی ہو سکے۔ عقوبت آخرت کی برداشت کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی یہ نہیں ہو سکتا کہ چند روز عذاب ہونے سے اس کی عادت ہو جاوے اور برداشت ہونے لگے کیونکہ یہ بات دیکھنے کی ہے کہ تکلیف کے تکرار سے جو الم کا احساس جاتا رہتا ہے یا کم ہو جاتا ہے تو اس کا سبب کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے طبیعت انسانی میں یہ خاصیت رکھ دی ہے کہ کسی شے کے تکرار استعمال سے وہ اس چیز سے ساز کر لیتی ہے اس سے اس منافی کی منافات کم ہو جاتی ہیں اور الم کم ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ تکرار میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھ دی ہے کہ اس سے کلفت کی برداشت ہونے لگتی ہے مگر آخرت میں حق تعالیٰ یہ خاصیت اٹھالیں گے کیونکہ ان کو عذاب دینا منظور ہے کیونکہ وہ دار الجزاء ہے وہاں وہ خاصیت باقی نہ رہے گی جو یہاں ہے کیونکہ دنیا دار الجزاء نہیں وہاں عذاب میں تخفیف کبھی منظور ہی نہیں بلکہ دم بدم شدت منظور ہے۔ "**زِدْنَاهُمْ عَذَاباً فَوْقَ الْعَذَابِ**" (ان پر عذاب کے اوپر مزید عذاب ہوگا) نص موجود ہے۔ دوسرے اگر اس خاصیت کو باقی بھی مان لیا جاوے پھر اس پر کہا جاوے کہ تکرار عذاب سے برداشت کیوں نہ ہوگی؟ تو پھر جواب یہ ہے کہ کسی شے کی عادت اس وقت ہوتی ہے جبکہ مؤثر بھی اپنی حالت پر رہے۔ محل الم بھی اپنی حالت پر رہے اور آخرت میں نہ محل ایک رہے گا نہ مؤثر۔ چنانچہ تبدل محل کے متعلق ارشاد ہے:

"**كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوْداً غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ**" یعنی دم بدم ان کی مردہ کھالیں بدل دی جائیں گی اور نئی پیدا ہوں گی اور علت اس کی بھی یہی فرمائی کہ ان کو عذاب دینا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کو عذاب ہی دینا ہے تو پھر کیا کسر رہ سکتی ہے (نعوذ باللہ منہ) یہ تو محل کی حالت ہے کہ بدلتا جاوے گا۔ لہٰذا اصول طبعی کی بنا پر بھی عادت اور برداشت نہیں ہو سکتی اور ہر مؤثر کی یہ حالت کہ اس کا حال بھی یکساں نہیں۔ اس میں دم بدم قوت بڑھتی جاوے گی۔ "**زِدْنَاهُمْ عَذَاباً فَوْقَ الْعَذَابِ**" (ان پر عذاب کے اوپر مزید عذاب ہوگا) غرض عقوبت آخرت میں تحمل کا خیال غلط ہے یہاں تحمل بے حسی سے ہو جاتا ہے وہاں حس باطل نہ ہوگا اور یہ حق تعالیٰ کی قدرت ہے جہاں چاہا حس کو باطل کر دیا اور جہاں چاہا باطل نہ کیا۔ غرض معاصی سے پریشانی ضرور ہوتی ہے گو عادت کی وجہ سے دنیا میں اس کا احساس نہ ہوتا ہو۔

نقد پریشانی

مگر دنیا میں بھی یہ بے حسی اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کھانے کو مل رہا ہے اور کوئی مصیبت سر پر نہیں پڑی اور جس دن کوئی مصیبت ان پر واقع ہوتی ہے اس وقت احساس ہوتا ہے کہ واقعی ہمارے قلب میں جو وہ قوت اور وہ طمانیت و سکون نہیں ہے جو مصائب کے وقت اہل اللہ کے قلب میں ہوتا ہے اس کا سبب صرف معاصی ہیں۔ غرض اہل اللہ کی حالت دیکھ کر ان کو اپنی اور ان کی حالت میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے اور ان کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اہل اللہ سے زیادہ راحت میں کوئی نہیں اور اہل معاصی سے زیادہ پریشانی میں کوئی نہیں۔ پس جب معاصی سے پریشانی نقد حاصل ہوگئی تو صرف اسباب بلا راحت سے کیا نتیجہ ہوا اور دنیا بھی ان کو کیا حاصل ہوئی کیونکہ دنیا کے حصول کا خلاصہ تو حصول راحت ہی تھا اور وہ میسر نہیں بلکہ اس کی ضد یعنی پریشانی موجود ہے۔

بدلذت گناہ

میں بہ قسم کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان کے لیے تو گناہ ہمیشہ بے لذت ہی ہوتا ہے بلکہ بے لذت سے بڑھ کر بدلذت اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے مگر اس سے نظر قاصر اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ لوگوں نے لذت جسم ہی کو لذت سمجھ لیا ہے اور یہ نہیں دیکھا کہ لذت درحقیقت کس کو حاصل ہوتی ہے جسم کو یا روح کو جسم اور روح میں نسبت عینک اور آنکھ کی سی ہے دکھائی تو بیشک عینک ہی سے دیتا ہے مگر دیکھنے والی عینک نہیں ہے بلکہ آنکھ ہے بلکہ ترقی کر کے کہہ سکتے ہیں کہ آنکھ بھی دیکھنے والی نہیں ہے آنکھ آلہ ہے اور اکار اور مدرک نفس ناطقہ ہے درحقیقت صحیح یہی ہے کہ دیکھنے والا نفس ناطقہ ہے اور آنکھ اور عینک دونوں آلات ہیں تو عینک کی طرف اگر دیکھنے کی نسبت کی جاوے گی بلکہ آنکھ کی طرف بھی اگر کی جائے گی تو مجازاً ہی صحیح ہو سکتی ہے حقیقتاً صحیح نہیں۔ اسی طرح ادراک لذت یا ادراک الم کی نسبت جسم کی طرف ہمیشہ مجالا ہوگی جو کہ ناقابل اعتبار ہے اور درحقیقت الم اور لذت جو کچھ ہے وہ روح کو ہے مگر ایک زمانہ ہے جو اس غلطی میں مبتلا ہے کہ محض راحت جسم کا نام راحت رکھ لیا ہے گو روح کیسی ہی مردہ ہو رہی ہو حالانکہ اگر جسم کو لذت ہوئی اور روح کو نہ ہوئی تو وہ کیا خاک لذت ہے وہ لذت تو ایسی ہوگی جیسے زیادہ مرچ دار سالن کہ زبان کو تو مزہ آتا ہے مگر دل کو تکلیف پہنچتی ہے کہ گرمی بڑھ جاتی ہے اور خفقان ہوگا اور طبیبوں کی ناز برداری کرنی پڑے گی اور وہ لذت ایسی ہے کہ جیسے غصب کی چیز کھا رہا ہے اور غاصب پر غضب ساتھ ساتھ نازل ہو رہا ہے۔ مثلاً حلوائی کی دکان سے ہاتھ مار کر مٹھائی کھالی اور ادھر سے لاٹھیاں پڑنے لگیں کہ زبان کو تو

مٹھائی کا مزہ آیا مگر سر پھوٹا اور روز رے سے مزہ کے لیے مدتوں مرہم پٹی ہوتی رہی' لذت تو یہاں بھی آئی مگر کیا یہ لذت کس شمار میں ہے؟ اور کیا کوئی عقل مند اس لذت کے لیے غصب کی اجازت دے دے گا؟ اور بے حسی کی اور بات ہے۔

ایک سرحدی کی حکایت

جیسے ایک سرحدی دیہاتی کا قصہ سنا ہوگا وہ یہ ہے کہ کوئی سرحدی وحشی ہندوستان میں آیا تھا کسی حلوائی کی دکان پر حلوا رکھا دیکھا قیمت پاس تھی نہیں آپ اس میں سے بہت سا اٹھا کر کھا گئے' حلوائی نے حاکم شہر کو اطلاع دی' حاکم نے یہ سزا مقرر کی کہ ان کو گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں تشہیر کیا جاوے اور بہت سے لڑکے ساتھ کر دیے جاویں کہ وہ ڈھول بجاتے پیچھے پیچھے چلیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب حلوا خور صاحب اپنے گھر واپس گئے' تو لوگوں نے پوچھا کہ آغا ہندوستان رفتہ بودی ہندوستان چگونہ ملک ست؟ کہنے لگے کہ ہندوستان خوب ملک است' حلوا خردن مفت ست' سواری خر مفت ست' فوج طفلاں مفت ست' ڈم ڈم مفت ست' ہندوستان خوب ملک ست۔

روح کا زخم

بس واقعی ایسی لذت تو ہے گناہ میں اگر یہ آغاز کی لذت کچھ لذت ہے تو گناہ کی بھی ہم کہتے ہیں لذت ہے ورنہ گناہ تو ایسی پریشانی کی چیز ہے کہ اس سے قلب و روح سب مجروح ہو جاتے ہیں جسم کی لذت کو لذت کہہ لیجئے اور بس۔ مگر یہ ایسا ہے جیسے تمام جسم زخموں سے گل گیا مگر اوپر کاغذ چپکا کر کھڑا کر دیا کہ دیکھنے میں برا نہیں معلوم ہوتا مگر خدا نے اگر آنکھیں دی ہیں تو کاغذ اور کھال الگ الگ معلوم ہو سکتے ہیں' آنکھ بند کر لینا نہیں چاہیے۔ اسی طرح گناہوں میں تھوڑی دیر کے لیے کچھ جسم کو لذت ہوتی ہے پھر قلب و روح پر صدمہ پہنچتا ہے اسے بھی تو دیکھنا چاہیے یہ تو گناہ کا لازمی اثر ہے۔ یعنی وہ اثر ہے جو گناہ کرنے والے پر پڑتا ہے اس میں متعدی اثر بھی ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ ہر گناہ میں یہ اثر بھی ضرور ہے کہ دوسروں کو اس شخص سے ناگواری پیدا ہوتی ہے' بعض گناہوں میں تو یہ بات بہت ہی بدیہی ہے کہ فوراً ہی اس شخص سے دوسروں کو نفرت پیدا ہو جاتی ہے جیسے غیبت' جھوٹ' شراب خوری وغیرہ وغیرہ۔ دیکھئے! شراب پیتے ہی عقل رخصت ہوتی ہے پھر جو کچھ بھی ناشائستہ حرکت صادر ہو جائے کسی کو تکلیف پہنچے یا مار پیٹ ہو جاوے یا مال چھین لے تو کیا بعید ہے۔ کم از کم بدتمیزی اور بدزبانی گالیاں بکنا تو فوراً ہی شروع ہو جاتا ہے۔ آدمی افعال فحش کرنے لگتا ہے یہ سب دوسروں کے لیے باعث اذیت ہوتے ہیں اور جھوٹ اور غیبت سے کیسی

تکلیف پہنچتی ہے، غیبت سے عداوتیں پیدا ہوتی ہیں، جھوٹ سے حق تلفیاں ہوتی ہیں، یہ باتیں اذیت پہنچانے والی ہیں یا نہیں؟ جب دوسرے کو اذیت پہنچے گی تو وہ ضرور ناخوش ہوگا اور وہ بھی اذیت پہنچانے میں دریغ نہ کرے گا اور یہی اذیت جڑ ہے نااتفاقی کی اور گناہ جڑ ہے اذیت کی تو گناہ جڑ ہے نااتفاقی کی۔ ان خاص گناہوں میں تو یہ بات بہت ہی بدیہی ہے اور ان کا یہ فوری اثر اور لازمی نتیجہ ہے۔ باقی اگر غور سے دیکھا جاوے تو ہر گناہ پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کیونکہ تمام گناہوں سے قلب میں ظلمت وقساوت پیدا ہوتی ہے اور یہ اثر ہر گناہ کے لیے لازمی ہے اور جب قلب میں ظلمت وقساوت آجاتی ہے تو پھر یہ شخص کسی کی راحت کا خیال نہیں کرتا، اخلاق خراب ہوجاتے ہیں اور تکبر وظلم میں مبتلا ہوجاتا ہے اور تکبر وظلم اذیت کی اور اذیت نااتفاقی کی جڑ ہے۔

اساس اتفاق

آج کل تمدن تمدن کا بہت غل مچ رہا ہے، اسباب تمدن پر کسی کی نظر نہیں۔ صاحبو! تمدن تو اتفاق ہی کا نام ہے اور گناہ اس کی جڑ کاٹنے والا ہے تو گناہ جڑ ہوا تمدن کی خرابی کا۔ پس تمدن بدون اتباع شریعت کے نہیں ہوسکتا۔ ہمارے حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ لوگ اتفاق اتفاق پکارتے ہیں مگر اتفاق کے اساس کو اختیار نہیں کرتے، فرمایا کہ اتفاق کی جڑ ہے تواضع، بدون تواضع کے اتفاق نہیں ہوسکتا، متکبرین میں ہمیشہ اختلاف ہوگا کیونکہ ہر ایک یہ چاہے گا کہ میری رائے کے موافق کام ہو کوئی بھی اپنی رائے کو دوسرے کے تابع نہ کرے گا۔ پھر اس کا نتیجہ سوائے اختلاف ونزاع کے اور کیا ہوگا۔ پس جو لوگ اتفاق کے حامی ہیں وہ پہلے تواضع اختیار کریں اور دعوے سے کہا جاتا ہے کہ تواضع بدون اتباع شریعت اور امتثال احکام الٰہیہ واجتناب عن المعاصی کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ کہاں ہیں مدعیان عقل؟ اس دلیل کے کسی مقدمہ میں کلام کریں اور اگر اس دلیل میں کلام نہ کرسکیں تو نتیجہ مان لینا چاہیے۔ وہ نتیجہ یہ ہے کہ تمدن بدون ترک معاصی کے نہیں ہوسکتا، بات صحیح اور واقعی تو یہی ہے۔

فساد مذاق

یہ اور بات ہے کہ دہلی کا نام کلکتہ رکھ لیا جاوے اور اذیت کا نام راحت رکھ لیا جاوے، آج کل مذاق ایسے فاسد ہوگئے ہیں کہ چال میں ڈھال میں اور بول چال میں غرض ہر ہر حرکات وسکنات میں وہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو گناہ سے خالی نہ ہو اور گناہ بھی کونسا اصل الاصول گناہوں کا اور اکبر الکبائر جس کا نام تکبر ہے اور اس کو ترقی وتمدن کہا جاتا ہے۔ سنکھیا کا نام تریاق رکھا جاتا ہے حتیٰ کہ لباس میں بھی وہ وضع اختیار کی جاتی ہے جو حکمران قوم کی وضع ہے جس کا منشاء بہ جز تکبر کے کچھ نہیں،

صورت شکل ان کے قبضہ میں نہیں ورنہ شاید شکل بھی انہی جیسی بنا لیتے ہیں۔ میں تو دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آج کل کی تہذیب کی حقیقت محض تعذیب ہے کہ تقلید محض ہے اور ہر طرح کی تنگی مگر ایک دنیا ہے کہ آج اسی کی دلدادہ ہے جن اقوام کی تقلید کی جاتی ہے وہ خود اس کورانہ تقلید سے نفرت کرتے ہیں اور ان کو بیوقوف اور ذلیل سمجھتے ہیں اور بات ہے بھی یہی کہ وضع اور لباس میں کسی کی تقلید کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایسی تقلید کے وہ خود بھی تو خواستگار نہیں۔ لوگ خواہ مخواہ اس میں مرے جاتے ہیں اور تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور زیر بار ہوتے ہیں مگر کھپے جاتے ہیں اور اسی میں ہر قوم کے رسوم و رواج علیحدہ ہوتے ہیں۔ اپنے رسم و رواج میں صرف ان کو آسانی اور راحت ہو سکتی ہے نہ ہمیں، لوگ ان میں کچھ مصلحتیں بھی بیان کرتے ہیں، میں اس کی نفی نہیں کرتا کیونکہ جس قوم میں جو رسم و رواج ہے وہ تو مصلحت ہی کے لیے ہر بات کو اختیار کرتے ہیں مگر مقلدین کا اختیار کرنا مصلحت کے لیے نہیں ان کے ذہن میں تو مصلحت کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو صرف اس واسطے ان کی نقل کرتے ہیں کہ وہ بڑے ہیں تو ان کی نقل کر کے یہ بھی کچھ بڑے بن جاویں۔

مقصودِ فیشن

صاحبو! یہ ہے اصل فیشن کی۔ بس اسی کے دلدادہ اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں اور ایمان سے کہیں کہ وہ جو کچھ فیشن اختیار کرتے ہیں کیا ان مصلحتوں اور ضرورتوں کی وجہ سے اختیار کرتے ہیں جو اس میں بیان کی جاتی ہیں یا محض ان کی تشبہ اور نقل کے لیے۔ غرض فیشن صرف بڑا بننے کے لیے بنایا جاتا ہے اور یہ بڑا بننا خود سخت مرض ہے۔ کیسا بڑا بننا؟ ذرا آدمی اپنی اصل کو تو دیکھے اسی واسطے کہا ہے:

مالمن اولہ نطفتہ جیفتہ خرہ یفخر

یعنی جس کا اول یہ ہے کہ ایک نطفہ ناپاک تھا اور آخر یہ ہے کہ ایک گندہ مردار ہے اس کے لیے کیا شایاں ہے کہ اترائے اور بڑا بنے اور اگر بڑا ہی بننا ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ بڑوں کی نقل کی جاوے یہ تو بالکل غیر مؤثر ہے کیونکہ ذرا سی دیر میں یہ بات کھل جاتی ہے کہ یہ نقل ہے اصل نہیں ہے اور یہ بات کھل جانے کے بعد بجائے اس کے کہ آدمی کی عظمت ہوالٹی تحقیر ہو جاتی ہے جیسے کوئی بہروپیا حاکم کا لباس پہن کر کہیں چلا جائے تو لوگ اس کے ساتھ ایک دفعہ تو وہی برتاؤ کر لیں گے جو حاکم کے ساتھ کرتے ہیں لیکن جس وقت بات کھل جاوے گی تو وہ برتاؤ کہاں؟ اس کا عکس ہوگا بلکہ عجب نہیں کہ سر پر جوتیاں پڑیں۔ یاد رکھو! عظمت ہمیشہ اصل میں ہوتی ہے نقل میں کچھ بھی عظمت نہیں۔

تسخیر قلوب

پھر یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ اس بڑائی کی حقیقت جاہ ہے جس کو عزت اور عظمت بھی کہتے ہیں اور اس کی حقیقت قلوب کا مسخر کر لینا ہے یعنی دلوں میں محبت اور عزت پیدا ہو جانا۔ اب امتحان کر لیجئے! کہ اس وضع اور طرز کا اثر تسخیر قلوب ہے یا اس کا عکس؟ یعنی آیا دلوں میں اس سے کچھ عظمت اور عزت اور محبت پیدا ہوتی ہے یا نفرت اور وحشت؟ اگر انصاف سے غور کرو گے تو معلوم ہو جاوے گا کہ اس نقل سے کچھ بھی عزت و محبت قلوب میں پیدا نہیں ہوتی کیونکہ محبت ہوتی ہے انس سے اور جب تم نے وضع غیروں کی بنا رکھی ہے تو عام لوگوں کو خاک انس ہوگا؟ وہ تو تم سے بھی ویسے ہی گھبرائیں گے جیسے کسی انگریز کے آنے سے گھبرایا کرتے ہیں۔ باقی اس وضع اور طرز سے جو یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ لوگ آپ کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجلس میں جگہ مل جاتی ہے اور حضور حضور کرنے لگتے ہیں اس کا سبب عظمت و عزت نہیں بلکہ خوف ہے تو یہ جو کچھ تعظیم کی جاتی ہے ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیا کسی مجمع میں آ جاوے تو ظاہر ہے کہ دور سے اس کو دیکھتے ہی لوگ کھڑے ہو جاویں گے اگر کھڑے ہو جانے کا نام تعظیم اور جاہ ہے تو بھیڑیا بھی بہت معظم و معزز ہے جس کی ہر شخص چھوٹا اور بڑا اور حاکم اور محکوم حتیٰ کہ کلکٹر صاحب بلکہ لاٹ صاحب بھی تعظیم کرتے ہیں کیونکہ اگر لاٹ صاحب کے سامنے بھی بھیڑیا ایک دفعہ آ جاوے تو ان کو بھی کھڑا ہو جانا پڑے گا۔ لہٰذا عزت کے دلدادوں کو چاہیے کہ بھیڑیے کی وضع بنا دیں اور فیشن ایسا اختیار کریں جس سے آدمی ہو بہو بھیڑیا معلوم ہو۔ صاحبو! کیا ہو گیا جس کو لوگوں نے خوف کا نام عزت رکھ لیا ہے، میں اس موقع پر اس سرحدی کا قصہ پھر یاد دلاؤں گا جس نے لونڈوں کی بھیڑ کو فوج سمجھا اور گدھے کی سواری کو عزت سمجھا' خوب یاد رکھئے! کہ تسخیر قلوب تواضع سے ہوتی ہے لیکن چونکہ لوگ تواضع کے معنی سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں اس لیے میں اس کی حقیقت بھی بتلانا چاہتا ہوں۔

حقیقت تواضع

سو یاد رکھو کہ تواضع کے معنی یہ ہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں سے کم سمجھو۔ نہ یہ کہ اپنے آپ کو دوسروں سے کم تر بناؤ۔ بعض لوگ خراب خستہ صورت بنا لینے کو تواضع سمجھتے ہیں چاہے دل میں تکبر بھرا ہو تو خوب سمجھ لو! کہ اگر تواضع بھی بناوٹ سے ہو تو وہ بھی در حقیقت تواضع نہیں ہے بلکہ تکبر ہے۔ حقیقی تواضع اختیار کرو! یعنی دل سے اپنے کو سب سے کمتر سمجھو! انشاء اللہ دیکھ لو گے کہ جاہ اور عزت اور عظمت و محبت اس کے ساتھ ساتھ ہے۔

الر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو　　　کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا

یہ حالت بدمذاقی اور فساد حس کی ہے کہ جس چیز کے طالب ہیں اس کا طریقہ بھی غلط اختیار کر رکھا ہے۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی!　　　کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

(میں ڈرتا ہوں اے اعرابی تو کعبہ نہ پہنچے گا اس لیے کہ جو راستہ تو نے چلنا اختیار کیا ہے وہ ترکستان کا ہے)

یعنی جاہ حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کے طریقے بھی نہیں جانتے اور جو طریقے اختیار کر رکھے ہیں ان سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ یاد رکھیے! کہ جس چیز میں گناہ کی آمیزش ہو جاوے اس سے کبھی جاہ یا تمدن یا اتفاق حاصل نہیں ہو سکتا۔ خصوص مسلمان کو بلکہ اس کا مفاد پیدا ہوتا ہے کیونکہ ہر گناہ میں کسی نہ کسی درجہ کا کبر ضرور شامل ہوتا ہے اس کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے کہ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ شخص بڑا بننا چاہتا ہے تو وہ بھی اس کے مقابلہ میں بڑا بننا چاہتا ہے۔ اب دو متکبر جمع ہو گئے ہیں اور دو متکبروں میں کبھی میل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر شخص دوسرے سے کھچنا چاہتا ہے اور میل کی حقیقت دوسرے کی طرف میلان ہے اجتماع ضدین کیسے ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دو بادشاہوں میں بھی اتفاق نہیں ہوتا کیونکہ وہ دونوں بڑائی کے طالب ہیں اور دو فقیروں میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا کیونکہ کوئی ان میں بڑائی کا طالب نہیں (یعنی جو حقیقت میں فقیر ہوں ان میں اختلاف نہیں ہو سکتا نہ یہ کہ فقیر کی صورت میں ہوں) جن کی نسبت کہا ہے:

اینکہ مے بینی خلاف آدم اند　　　نیستند آدم غلاف آدم اند

(جو کچھ تم آدمیت کے غلاف میں دیکھتے ہو سوائے انسانیت کے لبادہ کے اس میں (حقیقی معنوں میں) انسان نہیں ہے۔

مشاجرات صحابہؓ

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ پھر صحابہ میں اختلاف کیوں ہوا؟ حالانکہ وہ کامل مکمل فقیر اور مہذب تھے ان سے زیادہ اصلاح نفس کون کر سکتا ہے اس کا جواب بھی صحابہ رضی اللہ عنہم ہی کے کلام میں موجود ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ شیخین کے وقت میں تو اختلاف نہیں ہوا آپ کے وقت میں اختلاف کیوں ہوا۔ آپ نے جواب دیا کہ سلطنت کا مدار وزراء پر ہوتا ہے۔ شیخین کے وزیر ہم تھے لہٰذا اختلاف نہیں ہوا اور ہمارے وزیر تم ہو تو اب جو کچھ اختلاف ہے وہ

تمہاری بدولت ہے ہمارا قصور نہیں۔ کیسا اچھا جواب ہے اور بات کیسی سچی ہے بڑوں پر چھوٹوں کے کہنے کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کوئی کسی کی شکایت مجھ کو نہ پہنچاوے: "وَوَدِدْتُ اَنْ اَخْرُجَ اِلَيْكُمْ وَاَنَا سَلِيْمُ الصَّدْرِ"[1] یعنی مجھے یہ پسند ہے کہ میں تم لوگوں سے ملوں تو صاف دل ملوں اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ شکوہ شکایت کا اثر ضرور ہوتا ہے جبھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا اگر اثر نہ ہوتا تو منع فرمانے کی کیا حاجت تھی؟ بیچ والوں کو دخل ضرور ہوتا ہے اگرچہ یہ بھی یقینی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر شکوہ شکایت کا طبعی اثر ہونے پر بھی اس کے مقتضی پر عمل نہ ہوگا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مغلوب النفس نہیں تھے آپ جو کچھ کریں گے سوچ سمجھ کر کریں گے اور حضورؐ صاحب وحی بھی ہیں اگر کوئی بات سمجھ میں بھی نہ آئے گی وحی سے اطلاع ہوجاوے گی مگر یہ تو ثابت ہوا کہ کہنے سننے کا اثر ہوتا ہے۔ تب تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیش بندی فرمائی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سلطنت تو بڑی چیز ہے گھروں میں اور چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی بیچ والوں اور متعلقین پر کچھ نہ کچھ وثوق ہوتا ہے اور ایسا کرنا پڑتا ہے ورنہ تنہا ایک آدمی کچھ کام نہیں کرسکتا کیونکہ ہر کام میں دوسروں کی اعانت کی ضرورت کچھ نہ کچھ ہوتی ہی ہے۔ انسان اپنے سارے کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرسکتا تو کام پورا ہونے کی صورت سوائے اس کے کیا ہوسکتی ہے کہ معینین پر اس کام کے اجزاء تھوڑے تھوڑے بانٹ دیئے جاویں اور اس جزو میں اس پر اعتماد کیا جاوے اور اگر ایسا نہ کیا جاوے تو کام پورا ہی نہیں ہوسکتا۔ مثلاً ذرا سا کام کھانا پکانا ہے دیکھ لیجئے! ہر انسان اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں پکا سکتا۔ اس واسطے اس کام کے لیے باورچی کو رکھتے ہیں مگر یہ کام پورا جب ہی ہوگا جبکہ باورچی پر اعتماد کیا جاوے اور اگر اعتماد نہ ہو اور اس کے کام میں وہم نکالے جاویں کہ ممکن ہے وہ زہر ملادے اور جان جاتی رہے یا کوئی نجاست ملادے یا چرالے تو کھانے پکانے کا کام پورا نہیں ہوسکتا بلکہ بدگمانی کو دخل دیا جاوے تو کوئی ایسا کام بھی پورا نہیں ہوسکتا جس میں دوسرے کی اعانت کی ضرورت نہ ہو مثلاً محلہ کے کنوئیں سے کوئی شخص پانی نکال کر وضو کرنا چاہے مگر یہ وہم کرے کہ شاید کسی نے استنجے کا ڈھیلا ڈال دیا ہو اور یہ ناپاک ہو تو وضو ہوچکا اور نماز پڑھی جاچکی۔ غرض اعتماد سے چارہ نہیں اور اپنے احباب پر اعتماد کرنا کوئی جرم نہیں نہ یہ غلطی میں داخل ہے۔ ہاں یہ غلطی ہوسکتی ہے کہ غیر معتبر سمجھ لیا جاوے اور اس میں بھی بعض وقت آدمی مجبور ہوتا ہے

---

[1] (لم اجد الحديث في "موسوعة اطراف الحديث النبوي الشريف")

کیونکہ کسی کے ظاہری حالات ہی کو دیکھ سکتا ہے اور انہیں پر اعتماد کر سکتا ہے اور ممکن ہے کسی کا ظاہر کچھ ہو اور دل میں کچھ چھپا رکھا ہو یا حالت کا بدل جانا بھی ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ طمع وغیرہ سے کسی کی نیت بدل جاوے۔ چنانچہ سلطنت میں ایسا بہت ہوا ہے اور ہوتا ہے تو ظاہر پر نظر کر کے اعتماد میں غلطی ممکن الوقوع ہے۔ بڑے بڑوں سے ایسی غلطی ہونا ممکن ہے اور اس میں وہ معذور ہیں اور جب اعتماد سے چارہ نہیں اور اس میں غلطی ہونا ممکن ہے تو اس کی تدبیر بس ایک ہی ہو سکتی ہے کہ معتمد علیہ کے اخلاق کی درستی کی جاوے اور اس کو تعلیم دی جاوے کہ وہ کسی قسم کا دھوکہ نہ کرے۔ آگے اس کا فعل ہے وہ اس پر عمل کرے نہ کرے۔ غرض دو شخصوں کا لڑادینا درمیانی غیر اصلاح شدہ لوگوں کا کام ہے تو اگر صحابہ پر درمیانی اشخاص کے لگائی بجھائی کا اثر ہو گیا ہو جن کو قابل اعتماد سمجھتے تھے تو تعجب کی کیا بات ہے؟ اس میں ان پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ اصل ہے مشاجرات صحابہ کی ۱۲ (میں کہتا ہوں کہ مشاجرات صحابہؓ کے واقعات صحیح روایات میں دیکھے جائیں تو یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ہر فریق نے جو صورت بھی اختیار کی اس میں وہ مجبور تھا۔ واقعات ایسے پیش آئے کہ حضرت معاویہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خلافت کے نہ تسلیم کرنے میں مجبور تھے اور حضرت علیؓ ان کی مخالفت کو بغاوت پر محمول کرنے میں مجبور تھے۔ واقعات میں غور کرنے کے بعد کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہتی ۱۲ ظفر اور غور کرنے کے بعد ان واقعات میں دوسروں کا ہاتھ نظر آوے گا۔ ۱۲ محشی)

تعظیم صحابہؓ

باقی ہمارے وہ سب بڑے اور بزرگ ہیں۔ ایک باپ ہیں تو دوسرے چچا ہیں اگر کچھ غلطی ہو تو چچا کی غلطی بھتیجے کو پکڑنا نہیں چاہیے ان کے اختلاف میں تاویل کریں گے وہ تاویل یہ ہے کہ کسی طرف غلطی اجتہادی ہوگئی جس میں مجتہد معذور ہوتا ہے اور یہ یقینی ہے کہ دونوں میں سے کسی نے ہوائے نفسانی سے ایسا نہیں کیا۔ شاید کوئی کہے کہ جیسے ان کی بزرگی کو اس کا موجب قرار دیا جاتا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے اور کسی پر طعن نہ کیا جاوے اسی طرح وہی بزرگی اس کی بھی تو موجب ہے کہ ان کی غلطی کی سزا بھی تو بڑی ہو کیونکہ بڑوں کی غلطی اور ان کی سزا بھی بڑی ہوتی ہے لہٰذا اس سزا کا ذکر کر کے طعن کرنے میں کیا حرج ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ کیا تھوڑی سزا ہے کہ ہم اس ناپاک منہ سے ان حضرات کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ ان سے غلطی اجتہادی ہوگئی ہمارے لیے تو یہ بھی چھوٹا منہ بڑی بات ہے اس سے آگے تم جزا و سزا کے تخمینے لگانے والے کون ہو؟ جہنم تمہاری ملک نہیں جس

کی ملک ہے وہ جائیں سوان کی سن لیجئے جنہم جن کا ہے وہ اپنے رسول کی زبان سے فرماتے ہیں:
"طُوْبٰی لِمَنْ رَاٰء نِی وَاٰمَنَ بِیْ"[1] اورفرماتے ہیں: "لَاتَمَسُّ النَّارُ مَنْ رَّاٰء نِی" وہ توان کو جہنم سے بری فرماتے ہیں اور آپ ان کے لیے سزائیں تجویز کریں۔ مدعی سست گواہ چست۔ ہمیں اس معاملہ میں گفتگو نہ کرنا چاہیے جب خدا تعالیٰ نے ہمارے ہاتھوں کو صحابہؓ کے خون میں رنگین ہونے سے بچالیا تو ہم پاگل ہیں کہ اپنی زبان کو ان کی تحقیر سے گندہ کریں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں: "تِلْکَ دِمَاءٌ فَقَدْ طَهَّرَ اللّٰهُ مِنْهَا اَیْدِیْنَا فَلَا نُلَوِّثُ بِهَا اَلْسِنَتَنَا" (یہ وہ خون ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاتھوں کو محفوظ رکھا۔ پس ہمیں اپنی زبانیں اس میں ملوث نہ کرنی چاہیے)

فرسودہ تاریخ

یہ تو جواب تحقیقی ہے اور جواب الزامی یہ ہے کہ مشاجرات صحابہؓ کا جس تاریخ میں ذکر ہے وہ تاریخ غلط ہوگی۔ تاریخ کی صحت پر کون سی وحی آ چکی ہے بلکہ وحی تو اس کے خلاف پر ہے۔ حق تعالیٰ ان کی نسبت فرماتے ہیں: "رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ" رحماء میں کہیں جنگ جدال بھی ہوتی ہے۔ الغرض ہم کو ان قصوں میں پڑنا نہ چاہیے ہمارا منہ تو ان حضرات کے سامنے ایسا ہے کہ اس سے ان کی مدح کے بھی لائق نہیں۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ۔ ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

جب ان کی مدح کے لائق بھی ہماری زبان نہیں تو قدح کی لائق تو کہاں۔ صحابہ ایسے لوگ نہ تھے جن کی طرف بدگمانی کی جاوے کوئی ان میں سے دوسرے سے بڑا بننا نہ چاہتا تھا تکبر تو ان حضرات کے پاس بھی نہ تھا جو جڑ ہے نااتفاقی کی ان میں نزاع کی وجہ تکبر یقیناً نہ تھی۔ بس ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی غلطی اجتہادی ہوگی جس میں دونوں فریق معذور ہیں مشاجرات صحابہؓ کی بحث درمیان میں ایک سوال کے جواب آ گئی نیز یہ فائدہ بھی ہوا کہ بعض لوگ اس میں بھی بعض وقت بڑی بے باکی کر جاتے ہیں بڑی احتیاط چاہیے سب کو ایک لکڑی سے ہانکنا ٹھیک نہیں۔

گناہ کا متعدی اثر

بیان یہ تھا کہ متواضعین میں نااتفاقی اور متکبرین میں اتفاق کبھی نہیں ہوسکتا کیونکہ تکبر گناہ ہے اور گناہ موجب اذیت ہے جب اذیت ہوگی تو میل کہاں اور اس میں ان کی غلطی کا بھی بیان

---

[1] (مسند احمد ۳: ۱۵۵، مشکوۃ المصابیح: ۶۲۸۱، کنز العمال: ۳۲۶۹۹، تفسیر القرطبی ۳: ۱۵۵)

ہوگیا جو مدنی تمدن ہیں اور صورتیں وہ اختیار کرتے ہیں جو گناہ پر مشتمل ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ گناہ کبھی سبب اتفاق اور تمدن کا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ جڑ ہے اذیت کی اور اذیت قاطع اتفاق ہے نہ کہ موجب اتفاق اور اس کو میں نے گناہ کا متعدی اثر کہا تھا کہ اس سے دوسرے کو ناگواری ہوتی ہے (ناگواری کا ترجمہ اذیت ہے) ناگواری ان سب مفاسد کی اصل ہے اور جب گناہ جڑ ہوئی اذیت کی تو طاعت اصل ہوئی راحت کی یہ بات دلیل تو بہت سہولت سے ثابت ہوگئی اگر حس صحیح ہے تو اس کے ماننے میں کچھ تامل نہیں ہوسکتا اور حس ہی فاسد ہو جائے تو مریض صفرا کو میٹھی چیزیں بھی کڑوی معلوم ہونے لگتی ہی۔ تو کیا اس سے مٹھائی کی شیرینی جاتی رہے گی؟

طاعت کی لذت

اگر کوئی کہے کہ طاعت ہمیشہ تو موجب راحت نہیں ہوتی بعض وقت تو طاعت سے بھی تکلیف ہوتی ہے جیسے کسی بے نمازی کو مجبور کر کے نماز پڑھوائیں تو اس کو کس قدر ناگواری ہوتی ہے کہ جان چراتا ہے اور بھاگتا ہے اور موقع دیکھتا ہے کہ ان لوگوں کے قبضہ سے نکل بھاگوں یہ سب تو امارات اذیت ہی کے ہیں نہ کہ راحت کے پھر یہ دعویٰ کیسے صادر ہوا کہ طاعت ہمیشہ موجب راحت ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ طاعت سے جو کچھ اذیت ہوتی ہے وہ صرف تبدیل عادت کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے کوئی گنوار ہو جس کو ہمیشہ چٹنی روٹی کھانے کی عادت ہے اور کہیں اس کو پلاؤ قورمہ ملنے لگے تو اس کا معدہ اس کو ایک دم قبول نہ کر سکے گا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ چٹنی روٹی پلاؤ قورمہ سے اچھی چیز ہے اور پلاؤ قورمہ معدہ کے لیے مضر ہے بلکہ وجہ اس کی صرف تبدیل عادت ہے۔ چنانچہ چند روز کے بعد جب اس کا معدہ اس کا خوگر ہو جاوے گا تو معلوم ہوگا کہ پلاؤ قورمہ کس قدر لذیذ اور مفید اور مقوی چیز ہے اسی طرح بے نماز کو نماز پڑھوانے سے جو تکلیف ہوگی وجہ اسکی صرف تبدیل عادت ہے نہ واقعی تکلیف اسی واسطے اس تکلیف کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے پھر وہ جاتی رہتی ہے اور راحت کا احساس ہونے لگتا ہے پھر وہ خود قائل ہوتا ہے اس راحت کا۔ چنانچہ نماز کے لیے کسی سے کہا جاوے تو اس وقت تو اس پر بار ہوتا ہے مگر پھر عنقریب ہی وہ اس میں نہایت لذت پاتا ہے۔

طاعت کی خاصیت

اور ہر طاعت کی یہی خاصیت ہے اگر اس میں تھوڑی سی مشقت ہی ہو مگر جلدی ہی اس کی راحت و لذت نظر آنے لگتی ہے اور صرف آخرت ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی بھی چنانچہ ایک عطر فروش کا

قصہ ہے کہ وہ قنوج سے کالپی میں عطر فروخت کرنے آئے نماز پڑھنے جو مسجد میں آئے اتفاق سے ایک سب انسپکٹر بھی مسجد میں آئے تھے جنہوں نے نماز پڑھی مگر ولایتی نماز کیونکہ آج کل ولایتی ہی پڑھی یعنی نئی قسم کی کہ نہ رکوع ٹھیک نہ سجود ٹھیک' بس اٹھک بیٹھک سی کرلی۔ یہی لوگوں کی ایک عادت ہوتی ہے کہ اول تو نماز کم پڑھتے ہیں اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو تعدیل وعدم تعدیل سے کچھ بحث نہیں' ٹکریں مارلیں اور بس۔ افسوس کی بات ہے کہ محنت تو آتی ہی ہوئی جتنی صحیح نماز میں ہوتی ایک ذرا سا فرق رہ گیا جس سے نماز مطلوب ادا بھی نہ ہوئی بے نماز کے بے نماز رہے جیسے ایک آقا اور نوکر شرط باندھ کر نماز پڑھتے تھے کہ دیکھیں کون جلدی پڑھے' ایک ظریف نے کہا معلوم ہوتا ہے نماز میں جوذکر اذکار وغیرہ ہیں تو وہ گھر پر کر لیتے ہو صرف اٹھک بیٹھک رہ جاتی ہے وہ یہاں کر لیتے ہو۔ غرض اسی طرح سب انسپکٹر صاحب نے ولایتی نماز پڑھی۔ ایک خدا کا بندہ یعنی وہی عطر فروش وہ بھی دیکھ رہا تھا اس نے نہایت تہذیب سے اور نرم لہجہ میں بلکہ خوشامد کے لہجہ میں کہا کہ حضور نماز پھر پڑھ لیں اس میں فلاں فلاں رکن رہ گئے اور نماز ادا نہیں ہوئی۔ بس سب انسپکٹر صاحب کہاں تھے' بڑے زور کا غصہ آیا کہ ایسے معمولی آدمی نے ہم کو ٹوکا کہا اب تو کیا جانے چھوٹا منہ بڑی بات' تو ہم کو ٹوکتا ہے اس نے کہا میں جانتا ہے شک نہیں اور چھوٹا بھی ہوں مگر یہ نماز نہیں ہوئی اس کو تو لوٹا ہی لیجئے۔ سب انسپکٹر صاحب کو اور غصہ آیا اور بہت سخت سست کہا اس نے پھر کہا چاہے کچھ ہی کہہ لیجئے مگر نماز نہیں ہوئی اس کو تو لوٹا ہی لیجئے۔ سب انسپکٹر صاحب نے اس کو مارا اور خوب غصہ نکالا' کمزور کو سب ہی دبا لیتے ہیں مار کھانے کے بعد پھر اس اللہ کے بندہ نے یہی کہا کہ آپ زبردست ہیں مجھے مار لیں' پیٹ لیں مگر نماز لوٹا لیں' یہ نماز نہیں ہوئی۔ حق بات میں عجب اثر ہے کہ دل میں گھس ہی جاتی ہے (بشرطیکہ خلوص کے ساتھ کہی جاوے) اب سب انسپکٹر صاحب پر اثر ہوا اور کہا ظالم تو مجھ سے پڑھوا ہی کر چھوڑے گا اچھا میں لوٹائے ہی لیتا ہوں چنانچہ لوٹائی اور صحیح کر کے پڑھی۔

تاثیر حق گوئی

اس عطر فروش نے دین کا کام کیا یعنی امر بالمعروف اس سے ثواب آخرت تو کمایا ہے دنیا کا بھی یہ فائدہ پہنچا کہ تمام شہر میں شہرت ہوگئی اور جس طرف وہ نکلتے ہے لوگ انگلیاں اٹھاتے اور کہتے یہ ہیں وہ شخص جس نے کلمہ حق کہا اور سب انسپکٹر صاحب سے نماز پڑھوا ہی لی۔ اب برکت کے لیے لوگ اس کو اپنی دکانوں پر بٹھاتے ہیں اور اس کا عطر خریدتے ہیں۔ غرض اس کا عطر خوب بکا اور رو کا نداری کو بڑا فائدہ پہنچا۔ سو طاعت سے اکثر دنیا کا بھی فائدہ ہو جاتا ہے تو دیکھئے! اس عطر

فروش کو اولاً تو اذیت پہنچی مگر اس کی عمر اتنی ہی تھی کہ ایک جلسہ میں ختم ہو گئی اور بالآخر راحت ہی رہ گئی اور داروغہ صاحب پر بھی غالب یہ ہے کہ اثر ہوا ہوگا کیونکہ تجربہ سے ثابت ہے کہ حق بات بلا اثر کیے نہیں رہتی اور اپنے اس فعل پر پچھتائے ہوں گے اور دل میں اس عطر فروش کی تحسین کی ہوگی جس کی ظاہرا علامت یہ ہے کہ نماز کا اعادہ کیا اور فرضاً داروغہ صاحب نے دل میں تحسین نہ بھی کی ہو تب بھی آج کل تو کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تمام شہر تو اس کی تعریف کرتا تھا۔ غرض طاعت سے جو ناگواری ہوتی ہے اس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے اور طاعت ایسی راحت کی چیز ہے کہ جبراً بھی کسی سے کرائی جاوے تو ذرا دیر کے بعد خود اس کو ناگواری نہیں رہتی۔ چنانچہ داروغہ صاحب کے دل سے پوچھا جاوے کہ عطر فروش کے اصرار کے بعد نماز پڑھی تھی اس میں مزا آیا تھا یا پہلی ولایتی نماز میں؟ اگر انصاف ہوگا تو اقرار کریں گے کہ دوسری نماز میں خاص لذت تھی جو عمر بھر بھی ان کو نصیب نہ ہوئی ہوگی تو بے نماز کو اگرچہ جبر و قہر سے اس وقت ناگوار ہوتا ہے مگر دل میں وہ بھی قائل ہوتا ہے کہ یہ لوگ کچھ برا نہیں کر رہے اور میں ہی غلطی پر ہوں۔

نرم گوئی کا اثر

دوسرے یہ کہ طاعت کا امر کرنے سے اتنی ناگواری بھی اس وقت ہوتی ہے جبکہ سخت لہجہ سے کہا جاوے ورنہ اگر مناسب طریق سے کہا جاوے تو اتنی ناگواری بھی نہیں ہوتی۔ جیسے ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک آدمی کا پائجامہ ٹخنے سے نیچا دیکھا اس کو انہوں نے متنبہ کرنا چاہا تو کیا عجیب پیرایہ اختیار کیا کہ اس کے پاس آئے اور کہا جناب بعض اوقات اپنا عیب آدمی کو معلوم نہیں ہوتا اس لیے درخواست کرتا ہوں کہ ذرا دیکھنا میرا پائجامہ ٹخنے سے نیچا تو نہیں ہے اگر نیچا ہو تو میں زیادہ اونچا بنوایا کروں کیونکہ اس پر یہ وعیدیں آئی ہیں بس وہ شخص سمجھ گیا اور توبہ کی کہ اب ایسا پائجامہ نہیں پہنوں گا۔ ہماری طرف مولانا مظفر حسین صاحب ایک بزرگ تھے ان کا قصہ ہے کہ مسجد میں پہنچے دیکھا کہ مؤذن ایک شخص سے جھک جھک کر رہا ہے یہ شخص ایک پہلوان تھا جو غسل کرنے کے لیے آیا تھا مؤذن اکثر لڑا کا اور بدمزاج ہو جاتے ہیں اس سے الجھ رہے تھے کہ نہ نماز کے نہ روزہ کے آ جاتے ہیں مسجد میں ناپاکی اتارنے کے لیے مولانا نے مؤذن کو ڈانٹا کہ کیوں احمق ہوا ہے تیرا کیا حرج ہے ایک مسلمان ناپاک سے پاک ہونا چاہتا ہے تو تو کیوں منع کرتا ہے۔ ان حضرات کو بے محل غصہ نہیں آتا کیونکہ ایسا غصہ جب آتا ہے کہ اپنے آپ کو کسی سے بڑا سمجھیں اور یہ بات دعوئ تقدس سے ہوتی ہے اور یہ حضرات دعوئ تقدس سے بری ہیں کیونکہ وہ تکبر کی فرع ہے البتہ اصلاح کے موقع پر اصلاح کر دیتے ہیں اور چونکہ اصلاح میں بعض دفعہ نرمی کام نہیں دیتی سختی ہی کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہ حضرات ایسے موقع پر ظاہر میں سختی اور

خصہ سے بات کہہ دیتے ہیں مگر وہ غصہ محض ظاہری ہوتا ہے۔ حقیقت اس کی اصلاح ہوتی ہے اس کے بعد اس پہلوان صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا تم اس کی باتوں پر خیال نہ کرو اور شوق سے نہاؤ' لاؤ میں پانی بھردوں' بھلا اس کو تو وہ کب گوارا کرتا' پانی پانی ہوگیا اور پانی کھینچنے لگا۔ مولانا نے کہا تم پہلوان معلوم ہوتے ہو تم میں تو بڑا زور ہے ذرا نفس پر زور نہیں کرتے' پہلوان ہو کر اس سے ایسے دبے ہوئے ہو کہ صبح کی نماز کے لیے نہیں اٹھ سکتے' سویرے اٹھا کرو اور دو رکعت نماز بھی پڑھ لیا کرو! بس یہ بات اس کے دل میں گھس گئی اور توبہ کی اور نمازی ہوگیا' نرم لہجہ کا یہ اثر ہے۔

طرزِ تعلیم طاعت

واعظین کو ہمیشہ اس کا خیال رکھنا چاہیے اور ایک بزرگ ہمارے قصبہ میں تھے مولانا شیخ محمد صاحبؒ۔ ان کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ جھنجھانہ تشریف لے گئے وہاں مسجد میں ایک بے نمازی بھی آ گیا تو چاروں طرف سے لوگوں نے چڑانا شروع کیا کیا آہا آپ بھی آ گئے' ایک بولے نئے نمازی بورے کا تہہ۔ کوئی بولے نئے نمازی اور ٹلگوں کی تسبیح (یہ عجیب بدتمیزی ہے کہ نئے آدمی کو لوگ چڑاتے ہیں یہ بہت بری بات ہے اور منع عن الخیر ہے بڑی احتیاط چاہیے اس کو ترغیب چاہیے نہ کہ تنفیر۔) مولانا نے کہا کیا ہے لوگوں نے کہا حضرت یہ نماز نہیں پڑھتا فرمایا تم کو اس کا نماز نہ پڑھنا کیسے معلوم ہوا لوگوں نے کہا نمازی ہوتا تو مسجد میں آتا ہم نے اسے کبھی مسجد میں دیکھا نہیں۔ کہا ممکن ہے کہ یہ صاحب مکان ہی پر پڑھ لیتے ہوں (بزرگوں کی تہذیب تو دیکھئے کہ الفاظ کیسے ہیں) لوگوں نے کہا اور جماعت کی ضرورت نہیں؟ فرمایا ممکن ہے کہ کوئی عذر ہو بس یہ الفاظ اس کے دل میں گھس گئے اور اسی دن سے پکا نمازی ہوگیا۔ دیکھئے! یہاں طاعت کا امر ایسے شخص کو کیا گیا جو اس کا عادی بھی نہ تھا پھر بھی اس کو ناگواری نہ ہوئی۔ ثابت ہوا کہ طاعت موجب ناگواری نہیں ہاں ناگواری ہوتی ہے بے طریقہ گفتگو سے تو یہ امر زائد ہے۔ سخت بات میں خاصیت ہی یہ ہے کہ کسی کو گوارا نہیں ہوتی خواہ وہ نیک ہی کام کے لیے ہو۔

سختی کا موقع

ہاں کبھی شاذ و نادر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ طاعت کی تعلیم طریقہ سے ہی کی جاوے اور دل آزاری کی بھی کوئی بات نہ ہو۔ مگر پھر بھی ناگواری اور اذیت ہوتی ہے۔ یہ اس موقع پر ہوتا ہے کہ مخاطب میں اہلیت ہی نہ ہو۔ بعض طبیعتیں ایسی بھی پیدا ہوتی ہیں کہ بات کو الٹا ہی سمجھتی ہیں اور ہر چیز کا اثر ان پر الٹا ہی ہوتا ہے ان پر نرمی سے بھی برا ہی اثر ہوتا ہے۔ دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر شفیق تھے اس قدر نرم تھے کہ حق تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا "وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ" کہ کچھ تو سختی

کیجئے ہر جگہ نرم نہ بنئے! معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں فطرتاً نرمی ہی تھی چنانچہ واقعات سے اور روایات سے بخوبی ثابت ہے کہ تعلیم میں بلکہ کسی برتاؤ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سختی نہ کرتے تھے مگر پھر بھی بعض طبیعتیں ایسی ہوتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے بھی سخت متوحش ہوئیں حالانکہ حضورؐ کا لب ولہجہ طبعاً بھی نہایت شیریں تھا' پھر حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم بھی ایسی کی تھی جس سے اخلاق میں کسی قسم کی کمی نہ رہے۔ دیکھئے! وہ قصہ جس پر سورہ عبس وتولی نازل ہوئی کہ عبداللہ بن ام مکتوم آئے' یہ نابینا تھے اور طالب تھے۔ نابیناؤں کو بعض اوقات موقع کا اندازہ نہیں ہوتا' انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پوچھنا چاہا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگ اور بیٹھے تھے' آپ ان کی اصلاح کی طرف متوجہ تھے۔ انہوں نے کچھ سوال کیا آپ کو بے موقع سوال سے ایک گونہ ناگواری ہوئی کیونکہ آپ تبلیغ اصول میں مشغول تھے اور یہ فروع کا سوال کرتے تھے اور اصول مقدم ہیں فروع پر لیکن یہاں سائل نابینا تھا جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشغول یا فارغ ہونا معلوم نہ تھا اس لیے وہ بھی اس فعل میں معذور تھے۔ اس پر یہ آیت اتری جس میں عتاب ہے اور بطور شکایت نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے برا مانا اور منہ پھیر لیا' کیا مزہ کا عتاب ہے جس میں آگے حضورؐ کے عذر کا بھی بیان ہے کہ ایسا کیوں ہوا "اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى" اعمیٰ کے لفظ میں اشارہ ہو گیا کہ آپ کے عبوس کی اس سائل کو اطلاع بھی نہیں ہوئی جس سے اس کو ناگواری ہوتی۔ غرض کوئی تکلیف سائل کو نہیں ہوئی۔ باقی یہ کہ پھر کیوں عتاب ہوا؟ تو وہ عتاب اس پر ہوا کہ ایسی شکل بنائی کیونکہ اگر وہ سوانکھا ہوتا تو برا مانتا کس قدر اخلاق کی تعلیم ہے کہ عبوس کی صورت بنانے سے بھی منع فرمایا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان محبت الٰہی کو دیکھئے کہ اس واقعہ کے بعد یہ حالت تھی کہ جب کبھی عبداللہ بن مکتوم آتے تو آپ اپنی ردائے مبارک ان کے واسطے بچھا دیتے اور فرماتے: "مَرْحَبًا بِمَنْ عَاتَبَنِىْ فِيْهِ رَبِّىْ"[1] یعنی مرحبا اس شخص کو جس کے بارے میں مجھ پر میرے رب نے عتاب کیا اس پر لطف عتاب کا مزہ کوئی دوسرا کیا جان سکتا ہے میں بھی کبھی بعضے اندھے آدمیوں کے پاس کو گزرتا ہوں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ سلام نہیں کرتا' اس خیال سے کہ وہ مجھے مشغول کر لیں گے اس وقت سورہ عبس کو یاد کر کے شرما جاتا ہوں اور اسی واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اس وقت جن لوگوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بات کر رہے تھے وہ مسلمان نہ تھے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان

---

[1] (تفسیر القرطبی ۱۹: ۲۱۳)

کو ایک اہل دین کے مقابلہ میں خطاب میں مقدم رکھا تو یہ کس قدر شفقت ہے کہ دشمنوں کے ساتھ برتاؤ ہے کہ دوستوں سے ان کو مقدم رکھا جاتا ہے۔ غرض یہ نظائر ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور نرمی اور اخلاق کے لیکن اس پر بھی بہت سی طبیعتیں ایسی تھی کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بری لگتی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ مخاطب ہی میں صلاحیت نہ تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ گو اصل یہی ہے کہ اچھی بات دل میں جگہ کر لیتی ہے۔ خصوصاً جبکہ اس کا پیرایہ بھی نرم ہو۔

حس کی خرابی

لیکن اصل کے خلاف بھی بعض طبائع موجود ہیں مگر ایسے بے حس لوگوں کا یہاں ذکر نہیں اور نہ ایسی طبائع قابل اعتبار ہیں۔ اصل قاعدہ یہی ہے کہ اچھی بات کا اثر ناگواری نہیں ہوتا' باقی جو لوگ بے حس ہیں ان کو خود اچھی بات کی اچھائی ہی کا احساس نہیں ہوتا اور اس کے ساتھ مزید یہ کہ ان کو اپنی بے حسی کا بھی احساس نہیں ہوتا جیسے ایک بڑے میاں کا قصہ ہے کہ طبیب کے پاس گئے اور اپنی کچھ شکایتیں بیان کیں کہ چلا پھرا نہیں جاتا' انہوں نے کہا کہ یہ بڑھاپے کا اثر ہے۔ کہا اور بھوک بھی نہیں لگتی' کہا ہاں یہ بھی بڑھاپے کا اثر ہے' کہا نظر بھی کم آتا ہے' کہا یہ بھی بڑھاپے کا اثر ہے' کہا اور بدن میں درد بھی ہوتا رہتا ہے' کہاں ہاں بڑھاپا ہے'اس پر بڑے میاں بہت بگڑے کہ تمام طب میں بس ایک یہی پڑھا ہے کہ بڑھاپے کا اثر ہے۔ طبیب صاحب نے کہا میں آپ کی اس خفگی کا بھی برا نہیں مانتا یہ بھی بڑھاپے ہی کا اثر ہے تو جس طرح اس بوڑھے کو اپنے بڑھاپے کی خاصیت معلوم نہ تھی اس لیے بڑھاپے کا لفظ سن کر چڑتا تھا۔ اسی طرح بعض لوگوں کو اپنی بے حسی کی بھی خبر نہیں ہوتی' ایسے بدتمیز کا تو ذکر نہیں۔ اگر ایسی چند طبیعتیں دنیا میں موجود ہیں تو اس سے حکیم کی تجویز غلط نہیں ہوسکتی اسی طرح اگر ان پر نرمی کا اثر الٹا ہوتا ہے تو اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اثر نرمی کا ہوا بلکہ یہ اثر ان کے فساد مذاق کا ہے جیسے اگر مٹھائی اس شخص کو کھلائی جاوے جس کے مزاج میں صفرا بڑھ گیا ہے تو اس کو وہ تلخ معلوم ہوتی ہے تو اس سے وہ مٹھائی تلخ نہیں ہوگئی بلکہ یوں ہی کہا جاوے گا کہ یہ اسی کے حس کی خرابی ہے مٹھائی کا قصور نہیں۔ اسی طرح ناصح مشفق کی بات اگر بری معلوم ہو تو ناصح میں کمی نہیں بلکہ یہ اس کے قلب کا قصور ہے کہ الٹا ناصح کو برا کہتا ہے:

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد　　ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(بے وقوف تو اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

مولانا نے حکایت لکھی ہے شیر اور نخچیروں کی کہ ایک جنگل میں شیر آ گیا تھا اور جانوروں کو دق کرنا شروع کیا' انہوں نے مشورہ کر کے ایک جانور روزانہ اس کی خوراک کا مقرر کر دیا تاکہ سب کو تشویش نہ رہے۔ یہاں تک کہ ایک روز خرگوش کا نمبر آ گیا' اس نے ایک ایسی چال چلی کہ ذرا دیر میں پہنچا وہ شیر ناراض ہوا' خرگوش نے کہا آپ کی خوراک کے لیے بڑا موٹا خرگوش بھیجا گیا تھا مگر ایک دوسرے شیر نے اس کو چھین لیا' شیر نے کہا مجھ کو بتلاؤ' وہ شیر کہاں ہے وہ خرگوش اس شیر کو کنویں پر لے گیا اور پانی میں جھکا کر دکھایا کہ یہ ہے پس شیر کو غصہ آ گیا اور اس سے انتقام لینے کے لیے کنوئیں میں کود پڑا حالانکہ وہاں نہ شیر تھا نہ کچھ وہ اپنی ہی صورت تھی' یہ حملہ اپنے ہی اوپر حملہ ہو گیا۔ فساد حس کے یہی نتائج ہوتے ہیں کہ آدمی دوسرے میں عیب نکالتا ہے اور عیب ہوتا ہے اپنا۔ جیسے ایک اور قصہ ایک حبشی کا ہے کہ راستہ میں چلا جا رہا تھا کہ ایک آئینہ پڑا ہوا ملا اسے اٹھا کر جو دیکھا تو مہیب ڈراؤنی شکل نظر آئی کہ ہونٹ لٹکا ہوا ہے' سیاہ رنگ ہے' نقشہ نہایت برا ہے بس آپ کو غصہ آیا اور اس کو زمین پر پٹخ دیا کہ جب تیری شکل ایسی ہے جبھی تو کوئی زمین پر پھینک گیا' کوئی پوچھے کہ یہ شکل آئینہ کی تھی یا اپنی تھی۔ ایک اس سے بھی زیادہ بیہودہ قصہ ہے۔ ایک بڈھے تھے ان کے یہاں ایک بچہ روٹی کھا رہا تھا' اتفاق سے اس کے ہاتھ سے ٹکڑا لوٹے کے اندر جا پڑا' اس نے جھانک کر جو دیکھا تو پانی کے اندر ایک بچہ نظر آیا پس اس نے رونا شروع کیا کہ ابا اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا' یہ حرکت بچہ سے تو چنداں بعید نہیں تھی اب بڑے میاں کی سنئے کہ آپ نے بھی لوٹے میں جھانکا کہ دیکھوں کس نے چھین لیا تو لوٹے میں اپنی صورت نظر آئی کہ بڑی سی داڑھی ہے اور بزرگ صورت ہے تو آپ اس سے خطاب کر کے کہتے ہیں' افسوس ہے یہ صورت اور یہ داڑھی اور بچہ کا ٹکڑا چھین لیا' دیکھئے یہ خطاب درحقیقت کس سے ہوا۔

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد   ہمچواں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(بے وقوف تو اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

غرض جو طبائع ایسی ہیں کہ ناصح مشفق کی بات ان کو بری معلوم ہوتی ہے وہ عیب ناصح کا نہیں ہے بلکہ اپنی طبیعت کا ہے ورنہ اصل میں طاعت میں خود کشش ہے کہ دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور اس سے قلب کو عجیب راحت پہنچتی ہے' ہاں سلامت فطرت شرط ہے اور معصیت اس کی ضد ہے کہ اس سے ضرور اذیت ہوتی ہے الا آنکہ حس ہی خراب ہو گئی ہو' سو یہ نادر اور نادر کا اعتبار نہیں تو کلیتہ یہ دعویٰ محفوظ رہا کہ ہر معصیت موجب تکلیف ہے اور ہر طاعت موجب راحت ہے۔

فقدان حلاوۃ

اور میں کہتا ہوں کہ جو شخص خدا کا قائل ہو اس کو تو کبھی معصیت میں لطف ہو نہیں سکتا بلکہ معصیت کر کے دوسری لذات بھی اس کی مکدر ہو جاویں گی کیونکہ اس کے دل میں خدا تعالیٰ سے ندامت و خجالت ضرور ہو گی جو کسی وقت اس کو چین نہ لینے دے گی۔ بس اس کی مثال ایسی ہو گی جیسے ایک باورچی نے کھانا چرایا ہو تو اس کو یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ کھانا مالک کے سامنے بیٹھ کر کھالے اور اگر چوری چھپے کھا بھی لے تو لذت اور حلاوت نہیں پا سکتا۔ معصیت میں اثر یہی ہے کہ لذت کو کھو دیتی ہے کیونکہ عاصی کا قلب بے فکر نہیں ہوتا' خواہ دنیوی ضرر کی فکر ہو خواہ اخروی ضرر کی اور بے فکری اصل ہے' حلاوت کی یہی وجہ ہے کہ دو پیسہ کا مزدور راحت پاتا ہے اور وہ نواب راحت نہیں پا سکتا جس کے پیچھے کوئی خطرہ عظیم کا یا کسی جرم کا لگا ہوا ہو۔ وہ ٹکے کا مزدور اس نواب سے بڑھا ہوا ہے' جب معصیت میں بے فکری نہیں ہو سکتی تو حلاوت بھی نہیں ہو سکتی تو عاصی کی زندگی کا کوئی حصہ بھی اور کوئی شعبہ بھی باحلاوت نہیں ہو سکتا' خصوصاً جبکہ وہ خدا کا بھی قائل ہے اس کی تو یہ حالت ہو گی کہ معصیت کر رہے ہیں اور دل کو یہ خیال پریشان کر رہا ہے کہ حق تعالیٰ دیکھ رہے ہیں۔ گویا ڈاکہ ڈال رہے ہیں اور حاکم سامنے بیٹھا ہے تو کیا اس ڈاکہ میں بے فکری ہو گی' حاشا و کلا ہاں خدا کا انکار کر کے گناہ کیا جائے تو شاید کچھ لطف آئے کیونکہ اس کو یہ خطرہ نہ ہو گا لیکن اس عارض کے نہ ہونے سے اس معصیت میں جو ذاتی خاصیت ہے تکدر' وہ ہر حال میں لازم ہے۔

انسداد جرائم

غرض گناہ میں ہر طرح کی پریشانی ہے اور جتنی خرابیاں ہیں سب گناہوں کی بدولت ہیں اور جو اصل الاصول ہے تمام لذات کا یعنی چین اور راحت وہ گناہ کے ساتھ جمع نہیں ہوتی تو گناہ ہی سبب ہے پریشانی کا اور پریشانی اصل الاصول ہے تمام خرابیوں کی اگر گناہ نہ رہیں تو دینی ثمرات تو پیچھے ہوں گے دنیا میں بھی آسائش ہو جاوے۔ مثلاً چوری نہ رہے' غصب نہ رہے' قتل نہ رہے' غیبت اور طعن نہ رہے' حرص نہ رہے تو دنیا میں امن ہو جاوے چنانچہ بعض گناہوں کو جو قانون نے منع کر دیا ہے دیکھئے اس سے کیا کیا فائدے پہنچ رہے ہیں قتل اور چوری اور غصب کو مثلاً منع کیا ہے اور ان کی نگرانی کی جاتی ہے تو دیکھئے! کیسے کیسے فائدے ملک کو پہنچ رہے ہیں' تجارت کی ترقی ہے' صنعت کی ترقی ہے' یہ سب اسی کی بدولت ہے کہ جرائم کا انسداد کیا جاتا ہے اگر امن ذرا دیر کو اٹھ جاوے تو ابھی سب ترقیاں دھری رہ جاویں۔ چنانچہ بدامنی کے زمانے لوگوں نے دیکھے ہیں' یہ سب نتائج منع عن المعاصی کے ہیں۔

قانون وشریعت کا فرق

البتہ قانون میں اور شریعت میں اتنا فرق ہے کہ قانون کی نظر جہاں تک پہنچی وہاں تک اس نے جرائم کی فہرست کو ضبط کیا اور ان کا انسداد کر دیا لیکن وہ انسان ہی کی تو نظر ہے جو کہ ناتمام اور محدود ہے اور شریعت خدائے تعالیٰ کا مقرر کردہ قانون ہے اور خدائے تعالیٰ کی نظر محدود نہیں اس نے تمام جرائم کو منع فرما دیا' ایک فرق تو یہ ہے نیز ایک دوسرا فرق ہے کہ قانونی ممانعتوں میں اپنے اغراض بھی شامل ہیں اس لیے قانون میں انہی جرائم سے روکا گیا جو مصالح سلطنت کے خلاف تھے اور جو جرائم سلطنت کی مصالح کے خلاف نہ تھے۔ گو رعایا کی مصالح کے خلاف تھے' ان سے نہیں روکا جیسے نظر بد' غیبت' شکایت' حسد و کبر و عجب وغیرہ اور خدائے تعالیٰ کی نظر کامل اور بلا غرض ہے اس واسطے حق تعالیٰ کے قانون میں کچھ جرائم وہ بھی ملتے ہیں جو قانون میں نہیں ہیں۔ حق تعالیٰ نے کوئی جرم بھی ممانعت سے نہیں چھوڑا اور سب گناہوں سے منع کر دیا اور صرف جرائم ظاہری پر ہی بس نہیں کیا بلکہ باطنی گناہوں کو بھی بتایا اور ان سے منع فرمایا۔ خدا تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں کہ بعض جرائم کو کسی اپنی ضرورت یا ملکی غرض سے فہرست سے خارج فرما دیں یا بعض ان باتوں کو جو جرم نہیں ہیں ان ہی ضرورتوں سے جرم قرار دیں۔ قانون الٰہی وہ مکمل قانون ہے کہ اگر اس موافق عمل درآمد ہو تو دنیا سے بدامنی کی جڑ کٹ جاوے اور راحت ہی راحت ہو جاوے۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی:

وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ○

''اور زمین پر اس کی اصلاح کے بعد فساد مت کرو اور اللہ تعالیٰ کو خوف اور امید سے پکارو' بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہے۔''

اس میں ایک امر ہے اور ایک نہی۔ نہی ہے فساد فی الارض سے اور امر ہے طاعت کا۔ ادعوا مشتق ہے دعا سے اور دعا ایک فرد ہے طاعت کا۔ پس مراد طاعت ہے بعض خصوصیات کی وجہ سے ایک فرد کو یہاں ذکر کیا گیا جو اکمل افراد ہے۔ اس وقت ان خصوصیات سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ ان دونوں نہی اور امر میں ارتباط کیا ہے؟ جس کی وجہ سے دونوں یکجا لائے گئے۔ ظاہراً بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے کہ فساد سے منع کر کے فرماتے ہیں اور خدا کا نام لیا کرو (عبادت کیا کرو) سو ان میں جوڑ یہی ہے کہ ایک سبب ہے اور اصل دوسرا سبب اور فرع ہے یعنی

عبادت سبب دراصل ہے عدم فساد کا اس لیے فساد سے منع کر کے عبادت وطاعت کا امر کیا گیا کہ فساد فی الارض سے بچنا چاہتے ہو تو طاعت کو اختیار کرو! پس اصل مقصود ادعوہ ہے یعنی عبادت اسی کی کمی سے فساد پیدا ہوتا ہے اور اس کی ترقی سے انسداد فساد یعنی اصلاح کو ترقی ہوتی ہے پس معصیت وفساد میں باہم تعلق ہے اور طاعت اور اصلاح میں باہم ارتباط اور ان دونوں کے تعلق میں کچھ وسائط نہیں ہیں، بہت کھلی ہوئی بات ہے وہ یہ کہ عبادت صرف روزہ اور نماز ہی کا نام نہیں ہے عبادت جملہ نیک کاموں کو شامل ہے اس میں معاملات بھی داخل ہیں اور معاشرات بھی اور عادات بھی اور اخلاق بھی اگر یہ سب طریق پر پورے ادا کیے جاویں یعنی اس طریق سے جس کی شریعت نے تعلیم کی ہے تو ان کا لازمی نتیجہ ہے کہ فساد نہ رہے اسی لیے آگے وادعوہ سے بھی بڑھ کر ایک چیز لائے ہیں اور فرماتے ہیں: "اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ" یعنی رحمت اللہ تعالیٰ کی قریب ہے ان سے جو عبادت میں عمل احسان بھی اختیار کرتے ہیں احسان کے معنی وہی ہیں جو حدیث میں آئے ہیں کہ "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ"[1] یعنی خدا تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر عبادت کرو جس کے لیے مختصر لفظ خلوص ہے تو مطلب یہ ہوا کہ نری عبادت پر بھی یہ وعدہ نہیں کہ رحمت قریب ہے بلکہ اس عبادت پر ہے جس میں خلوص محض ہو اب آپ انصاف سے دیکھیں! کہ اگر ایک جماعت ایسی ہو جو سب کے سب خلوص محض کے ساتھ شریعت کی تعلیم کے موافق عبادات کے اور عادات کے معاملات کے معاشرات کے اخلاق کے پابند ہوں تو کیا ان میں کبھی فساد ہوگا یا کسی کو ان سے اذیت پہنچے گی حاشاو کلا وہ فرشتہ صفت انسان ہوں گے اور کسی کو ان سے ناگواری تو کیسی وہ ہر دلعزیز ہوں گے۔ چنانچہ جو افراد اس کے مصداق ہوئے ہیں یعنی اہل اللہ ان کے حالات تواریخ میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کا وجود دنیا میں کیسا تھا کیا ان سے کسی کو تکلیف پہنچتی تھی یا ان کا وجود باعث فساد تھا؟ نہیں بلکہ ان کا وجود باعث رحمت اور باعث رفع فساد ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عالم کا عالم ان پر فدا ہوتا ہے اور ہر شخص کا قلب ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ یہ بات ان میں کاہے سے پیدا ہوئی اسی چیز سے جس کا نام عبادت یا طاعت ہے اس سے ثابت ہوا کہ طاعت کو رفع فساد میں ضرور دخل ہے اور فساد اسی کے نہ ہونے سے ہوتا ہے۔ یہ علاقہ ہے "لاتفسدو" (فساد نہ کرو) اور "وادعوہ" (اور اسے پکارو) میں کہ طاعت کو دخل ہے رفع فساد میں یہاں تک بیان ہوا گناہ کے دو اثروں کا۔ ایک کو میں نے لازم کہا تھا اور دوسرے کو متعدی اور یہ دونوں ظاہری اثر ہیں۔

---

[1] الصحیح للبخاری ۱: ۲۰، صحیح ابن خزیمہ ۲۲۴۴، کنز العمال ۵۲۴۹

مصائب اور معاصی میں ارتباط

ایک مخفی اثر ہے گناہ میں جس کی وجہ سے گناہ سبب ہے معصیت کا جس کے بعض عقلاء ممکن ہے کہ منکر ہوں مگر کسی کے انکار یا سمجھ میں نہ آنے سے یہ نہیں ہوسکتا کہ واقعی بات بیان نہ کی جاوے۔ جیسا ارشاد ہے: "اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ" وہ یہ ہے کہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ جو کچھ بھی خرابی اور مصیبت دنیا میں ہوتی ہے وہ سب گناہ کی بدولت ہے ایک تو خرابی دنیا کی وہ ہے جو مسبب ہے اذیت سے اس کو تو میں نے قسم دوم میں بیان کردیا ہے جس کو میں نے ضرر متعدی کہا تھا۔ اب میں اور زیادہ تعمیم کرتا ہوں کہ قطع نظر ان مصائب سے جو اذیت سے مسبب ہیں جو بھی مصیبت ہو وہ گناہ ہی سے آتی ہے اور چونکہ ان دونوں میں یعنی گناہ اور دنیا کے مصائب میں کوئی علاقہ ظاہراً سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی وجہ سے میں نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے بعض عقلاء اس کے منکر بھی ہوں مگر میرے بیان سے عنقریب سمجھ میں آجاوے گا کہ دونوں میں کیا علاقہ ہے اور وہ علاقہ بہت ہی ظاہر ہے مگر ہماری عادت غور کرنے کی نہیں رہی ہے اس وجہ سے یہ نوبت آگئی کہ یہ بات نئی سی معلوم ہوتی ہے کہ نافرمانیوں سے مصائب آتے ہیں اب اس کو بیان کرتا ہوں۔ دیکھئے! یہ تو ثابت ہے کہ گناہ کو حق تعالیٰ نے منع کیا ہے اس کے تو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ کوئی شخص اس کا منکر نہیں ہے اور جب حق تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے تو اس کا ارتکاب موجب ناراضی ہے یہ مقدمہ بھی بداہۃً ثابت ہے اب ایک مقدمہ اور رہ گیا۔ سو اس کے ثابت کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہ ہوگی صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ سب مقدمات کو ملا کر نتیجہ نکال لیا جاوے وہ مقدمہ یہ ہے کہ جب اپنے سے کسی بڑے کو ناراض کیا جاتا ہے تو اس پر سزا تجویز ہوتی ہے۔ ان تینوں مقدموں کو ملا کر اس طرح پر نتیجہ کیوں نہیں نکالا جاتا کہ گناہ کو حق تعالیٰ نے منع کیا ہے اور ممنوع کا ارتکاب باعث ناراضی ہے اور ناراضی کا نتیجہ سزا ہے تو گناہ پر بھی سزا ہونی چاہیے۔ یہ نتیجہ دنیا کے کاموں میں سب نکال لیتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں مثلاً چوری کو مانا جاتا ہے کہ یہ فعل ممنوع اور باعث ناراضی حکام ہوتا ہے اور ناراضی موجب سزا ہے۔ لہٰذا چور کو سزا ہوگی۔ دین کے کاموں میں کیوں ان مقدمات کی ترتیب نہیں کی جاتی اور یہی نتیجہ کیوں نہیں نکالا جاتا؟ اب علاقہ مصائب اور معاصی میں سمجھ میں آگیا ہوگا۔ پس عقلاً اور عرفاً یہ بات کچھ بعید نہیں رہی کہ گناہ پر سزا ہو اور مصیبتیں نازل کی جاویں۔ غرض امکان اس کا ثابت ہوگیا کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ گناہ کی پاداش میں مصائب بھیجے جاویں۔ پھر شریعت نے اس کی خبر دی ہے کہ ایسا واقع بھی ہوتا ہے۔ تو اب اس میں کیا استبعاد رہا؟ اور اس کے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

نتائج معاصی

شریعت میں اس پر نصوص موجود ہیں۔ مثلاً "وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ" (اور تم پر جو مصیبت نازل ہوتی ہے وہ تمہارے اعمال بد کے سبب آتی ہے) اور "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ" (خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال (بد) کے سبب فساد پھیل گیا) اور "قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُکَذِّبِیْنَ" اس اخیر کی آیت کا حاصل یہ ہے کہ مکذبین پر جو بلائیں آئیں ہلاک ہوئے اور ہوا سے اڑا دیے گئے یا زمین الٹ دی گئی یا غرق ہوئے یہ سب تکذیب کی پاداش میں ہوا یہ مصائب گناہ کی بدولت نازل ہوئے ان سب نصوص سے مطلق مصیبت کا معاصی پر متفرع ہونا ثابت ہوا اور بعض نصوص میں خاص معاصی پر خاص انواع مصیبت کے مرتب ہونے کی بھی تصریح ہے۔ مثلاً طاعون کو بالتصریح فرمایا گیا ہے کہ زنا سے آتا ہے۔ تو یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ بلا نافرمانی سے آتی ہے۔ قحط، وباء، ہیضہ، گرانی، جنگ سلاطین، یہ سب نتائج ہیں معاصی کے۔

نئی تحقیق کا جواب

اور یہ سب مثالی صورتیں ہیں گناہوں کی، ہمارے گناہ ان بلاؤں کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں:

زشتی اعمال ما صورت نادر گرفت

(ہم اس بداعمالی کی بناء پر نادر جیسے ظالم حاکم کے ظلم میں مبتلا ہوگئے)

اس پر قبل تامل یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ طاعون کا سبب تو کیڑے ہیں جیسا کہ آج کل کی تحقیق سے ثابت ہے۔ گویا مشاہدہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر طاعون کا سبب معاصی ہیں تو نیک لوگ اس میں کیوں مرتے ہیں۔ یہ دو شبہ ہیں اور آج کل ہمارے بھائی ان شبہوں میں بکثرت مبتلا ہیں مگر علماء سے تحقیق کرنے کا اور شک رفع کرنے کا خیال ہی کسی کو نہیں ہوتا۔ دیکھئے جراثیم کو طاعونی مریض کے جسم میں پاکر گمان کرلیا گیا کہ یہی سبب ہیں طاعون کے۔ یہ صرف ایک قرینہ ہے ان کی سببیت کا اگر اس قرینہ پر ایسا یقینی حکم کیا جاسکتا ہے کہ نصوص شرعیہ کی طرف سے بھی اعتقاد میں کمی آجائے تو میں ایک قرینہ جانب مخالف کا پیش کرتا ہوں۔ اس سے حکم اس کے خلاف کا یقینی طور پر کیوں نہیں کیا جاتا۔ وہ یہ ہے کہ اگر جراثیم سبب ہیں طاعون کے اور وہ کیڑے ایک سے دوسرے میں پہنچتے ہیں اور اس طرح دور دور تک یہ بلا پھیل جاتی ہے یا جو لوگ جراثیم کے قائل نہیں اور طاعون کو ویسے متعدی مانتے ہیں تو ان دونوں سے پوچھا جاتا ہے کہ اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ جب طاعون پھیلے تو سب ہی مرجائیں کوئی

ایک بھی کیوں بچتا ہے یا سب نہیں تو آدھے سے زیادہ تو مرنے ہی چاہئیں تاکہ للاکثر حکم الکل ہی کی بناء پر سببیت اور تعدیہ کا حکم کیا جاسکے یا کم از کم طاعونی مریض کے تیمارداروں کو بھی کو مرجانا چاہیے۔ خصوصاً جو ہروقت پاس رہتے ہوں کیونکہ مریض کے جراثیم اور بھی کہیں نہ جائیں تو تیماردار پر تو ضرور ہی جائیں گے مگر تجربہ اس کے خلاف ہے جہاں سولہ ہزار کی مردم شماری تھی ایک ہزار مرے حالانکہ ہونا چاہیے تھا اس کا عکس کہ ایک ہزار بچتے اور پندرہ ہزار مرجاتے اور مریض طاعون کے تیماردار تو سب ہی مرجاتے جراثیم کا یا تعدیہ کا اثر سب میں اور کم از کم سب تیمارداروں میں کیوں نہیں ہوتا؟ اب اگر للاکثر حکم الکل کو جاری کیا جائے تو یہ حکم لگانا چاہیے کہ جراثیم سبب طاعون نہیں اور نہ تعدیہ سبب ہے۔ اس پر شاید کوئی یوں کہے کہ سولہ ہزار کی آبادی پر یہ حکم لگانا صحیح نہیں کیونکہ سب اشخاص مماس نہیں ہوتے۔ جہاں ایک کو دوسرے سے مس ہو وہاں جراثیم پہنچ جاتے ہیں اور تعدیہ بھی ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں یہ بھی غلط ہے کیونکہ میں اس کے خلاف بھی مشاہدہ کرتا ہوں ایک حکیم امیر احمد نام ہمارے دوستوں میں ہیں دیندار آدمی ہیں ان کا بیان ہے کہ انہوں نے زمانہ وبا میں تریسٹھ طاعونی مریضوں کا علاج کیا اور اس طرح سے کہ بار باران کی نبض دیکھتا اور خود اپنے سہارے لگا کر دوا پلانا غرض ان کے ساتھ خوب خلا ملا کر رکھا مگر ان کا کان بھی گرم نہ ہوا۔ بتلایئے وہ باوجود شدت تماس و التصاق کے جراثیم کہاں گئے اور تعدیہ کا اثر کیا ہوا؟ اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں جراثیم کا منکر ہوں ممکن ہے کہ جراثیم ہوں اور ان سے طاعون پیدا بھی ہوتا ہو مگر اس پر ایسا اعتقاد نہیں کیا جاسکتا جس سے نصوص شرعیہ کی مزاحمت کی جاوے۔ اس کی توضیح کے لیے ان خیالات کی نفی کے قرائن اور دلائل میں نے ایسے پیش کردیئے جن سے وہ خیالات ظن کے مرتبہ میں بھی نہیں رہتے بلکہ مرجوح ہوجاتے ہیں پھر ان سے مزاحمت نصوص کی کیسے کی جاسکتی ہے اول تو ان جراثیم کا وجود یا اثر ہی محتاج اثبات ہے اور اس کے ثابت ہونے کے بعد بھی ہم پوچھتے ہیں کہ وہ قدیم ہیں یا حادث اور بندہ ہیں یا خدا یہاں آ کر سب کو قائل ہونا پڑے گا اور اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔

شعور فی الجماد

بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ حادث اور بندے ہیں اور خدا کے مسخر ہیں تو وہاں کا تو یہ قانون ہے۔

نیارد   ہوا   تانگوئی   بیار   نیارد   زمین   تانگوئی   بیار

یعنی کوئی چیز بھی بلا حکم خدا کے کچھ نہیں کرسکتی۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ایک حکایت کے ضمن میں وہ حکایت یہودیوں کی ہے کہ انہوں نے اہل ایمان کو آگ میں ڈالا مگر وہ نہ جلے تو بادشاہ نے غصہ میں آ کر آگ سے خطاب کیا کہ تجھے کیا ہوا تو آگ نہیں رہی آگ نے جواب دیا:

گفت آتش من ہانم اندر آتا تو بنی تابشم
طبع من دیگر نگشت و عنصرم تیغ آشتم ہم بدستوری برم

(آگ نے کہا کہ میں آگ ہی ہوں آپ تشریف لائیے تاکہ میری تیزی حرارت کو دیکھو۔ نہ میری خاصیت میں فرق پڑا اور نہ میرے عنصر میں تغیر آیا میں آگ ہوں اور جلانا بدستور میرا کام ہے)

آگے مولانا فرماتے ہیں:

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند با من و تو مردہ باحق زندہ اند

(ہوا، مٹی، پانی اور آگ (سب اللہ کے) غلام ہیں، تمہارے اور میرے نزدیک مردہ ہیں لیکن اللہ کے نزدیک زندہ ہیں)

یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جمہور عقلاء بھی اس کے قائل ہوئے ہیں۔ بعض عقلاء تو شعور فی الجماد تک کے قائل ہوئے ہیں اور کہتے ہیں پتھروں میں بھی کچھ سمجھ ہے انسان کی سی نہ سہی اور نباتات میں تو شعور ہونے کے آج کل تقریباً سب قائل ہوتے جاتے ہیں۔ حق یہی ہے کہ ہر چیز اپنے مالک کے احکام کو پہچانتی ہے۔ ہاں بعضے حواس بعض چیزوں میں نہیں ہیں، مثلاً امرود میں حس لمس نہیں ہے اور امرود کو کھائے جانے کی تکلیف نہیں ہوتی تو اس سے مطلقاً غیر ذی حس اور بے جان ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔ خود ہمارے بدن میں بعض اعضاء ایسے موجود ہیں جن کو حس لمس نہیں مثلاً بال غیر ذی حس ہے مگر حق تعالیٰ کی معرفت فطری ہے ممکن ہے کہ وہ ہر چیز کو حاصل ہو اور امرود کو بھی حاصل ہو اور اکل کا الم نہ ہو۔ اور اگر یہ بھی کہا جائے کہ الم بھی ہوتا ہے تب بھی کوئی اشکال نہیں۔ اس کو الم حق تعالیٰ نے دیا اور ہم کو حکم کھانے کا کیا ہم حکم سے کھاتے ہیں جیسے گائے کو ذبح کی تکلیف ہوتی ہے مگر ہم کو حق تعالیٰ نے کھانے کی اجازت دی ہے اس لیے ہم کھاتے ہیں۔ غرض یہ بات بدلیل ثابت ہے کہ کوئی چیز بلا اذن خالق جل شانہ کے اثر نہیں کر سکتی تو جراثیم بھی اگر کسی کے بدن میں تعدیہ کا اثر کر سکتے ہیں تو حکم ہی سے کر سکتے ہیں یہ تو تحقیق ہوئی اصل مسئلہ کی۔

اب مزید تقریب الی الفہم کے لیے کہتا ہوں کہ اسباب دو قسم کے ہوتے ہیں قریب اور بعید اور دونوں کی طرف مسبب کی نسبت ہوتی ہے۔ مثلاً پھانسی ایک فعل ہے اس کے سبب ظاہر میں کئی ہو سکتے ہیں مگر ایک ایسے شخص سے جو عالم ہو خواص افعال کا، اس سے اگر سوال کریں کہ اس شخص کی موت کیوں ہوئی تو وہ جواب دے گا کہ اس کا سبب حقیق ڈیکیتی ہے سو اس شخص کی نظر اصلی سبب پر ہے اور اگر سائنس والوں سے جو محض خواص اشیاء سے واقف ہیں یہی سوال کیا جاوے تو ان کا

جواب یہ ہوگا کہ رسی کا پھندا سبب حقیقی ہے موت کا۔ میں پوچھتا ہوں کہ دونوں میں سے صحیح جواب کس کا ہے۔ غالباً سب یہی کہیں گے کہ پہلا جواب صحیح ہے حالانکہ اس جواب کے صحیح ماننے میں کئی وسائط بیچ میں ماننے پڑتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے اول ڈکیتی کی اس میں خون کیا' پھر گرفتار ہوا اس کے بعد چالان ہوا پھر مقدمہ ثابت ہوا' پھر پھانسی کا حکم دیا گیا اور طریقہ اس کا یہ استعمال میں آیا کہ گلے میں رسی کا پھندا ڈالا گیا۔ پس اس سلسلہ میں سبب قریب واقعی رسی کا پھندا ہے اور سائنس والے کی نظر اسی تک گئی' سبب بعید تک نہیں گئی اس لیے اس نے اسی کو سبب کہہ دیا لیکن اس عالم کی نظر سبب بعید تک گئی وہ سب کو بیچ میں سے اڑا کر اس سبب کی طرف جو در حقیقت سبب ہے موت کی نسبت کرتا ہے اور ان تمام وسائط کو بھی اسی کی طرف راجع کرتا ہے۔ اب دیکھئے! ہر شخص اسی کی تحقیق کو پسند کرتا ہے اور سائنس والے کو کوتاہ نظر بناتا ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے بہت کھالیا جس سے ہیضہ ہوگیا اور موت کی نوبت آ گئی تو اب کہا جاتا ہے کہ بہت کھانا کھالیا تھا اس وجہ سے مرگیا تو کیا محض اس وجہ سے کہ سبب قریب تو ہیضہ ہے اور کھانا تو سبب السبب ہے یہ کہنا غلط ہوگا اور کھانے کی طرف موت کی نسبت صحیح نہ ہوگی لیکن پھر بھی کہتا ہر شخص یہی ہے کہ کھانے سے مرگیا۔ معلوم ہوا کہ صحیح مذاق یہی ہے کہ سبب اصلی کی طرف نسبت کی جاوے گو بعید ہو کیونکہ بیچ کے اور اسباب بھی اسی پر مبنی ہیں اگر وہ سبب اصلی نہ ہوتا تو ان وسائط کا وجود بھی نہ ہوتا اور اثر بھی نہ ہوتا اور سبب قریب کی طرف کرنا قصور نظر ہے۔ اسی طرح طاعون کے بھی دو سبب ہیں ایک سبب بعید ناراضی حق اور دوسرا سبب قریب یعنی جراثیم کا پیدا ہونا شریعت کی نظر سبب بعید پر ہے جو کہ اصلی سبب ہے اگر وہ نہ ہوتا تو جراثیم بھی ہرگز پیدا نہ ہوتے اور اہل سائنس کی نظر سبب قریب پر ہے تو ان کا جراثیم کو طاعون کا سبب کہنا ایسا ہی ہے جیسا موت کا سبب پھانسی کی رسی کے پھندے کو کہا جاوے مگر کون نہیں جانتا کہ یہ قصور نظر ہے۔ واللہ یہ ناتمام علم ایسا مضر ہے کہ اس سے جہل مرکب پیدا ہوتا ہے جو لاعلاج مرض ہے۔ دیکھئے! آج کل کے سائنس دان اس پر کس قدر اشکال کرتے ہیں کہ گناہوں کو سبب مصائب کا بتایا جاتا ہے لیکن یہ مسئلہ کس قدر صاف ہے کہ سبب کبھی قریب ہوتا ہے اور کبھی بعید اور نسبت دونوں کی طرف ہوتی ہے اور دونوں نسبتوں میں سے صحیح تر سبب بعید کی طرف نسبت ہے جب وہ اصلی ہو چنانچہ اسی لیے یہ کہنا صحیح ہوا کہ پھانسی اس واسطے ہوئی کہ ڈاکہ ڈالا تھا اسی کو سب پسند کرتے ہیں نہ اس کو کہ پھانسی اس واسطے ہوئی کہ گلے میں رسی کا پھندا تھا' سائنس کی تحقیق ہے۔ ہم کو انکار نہیں۔ پس جیسے ہم یہ نہیں کہتے کہ پھانسی والے کے

گلے میں رسی کا پھندا نہ تھا بلکہ اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر ایک سبب بعید اور بھی مانتے ہیں جو راس الاسباب اور سبب الاسباب ہے یعنی ڈاکہ۔ اسی طرح رسی کے پھندے کے قائل ہونے والے کو راس الاسباب ہے یعنی ڈاکہ کے سبب ہونے سے بھی انکار کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح اگر سائنس کی یہ تحقیق ہے کہ طاعون کے کیڑے ہوتے ہیں اور وہ سبب ہیں طاعون کے تو ہم اس کے منکر نہیں اور یہ نہیں کہتے کہ کیڑوں کا وجود نہیں' کیڑے ہوں مگر ان کے اوپر ایک سبب جو راس الاسباب ہے اور بھی ہو اور وہ گناہ ہے۔ سائنس دان کو بھی اس سے انکار کا کوئی حق نہیں ہے اور جو آج کل کے لوگ انکار کر بیٹھتے ہیں اس کی وجہ قصور علم ہے۔ اس تقریر کے بعد کوئی صاحب بتائیں کہ کیونکر ان کو اس شرعی تحقیق سے انکار کا حق حاصل ہے۔ درحقیقت شریعت اور سائنس میں تخالف ہی نہیں یہ ناتمام سائنس کے نتائج ہیں کہ ایسی موٹی موٹی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ شرعی تحقیق یہی تو ہے کہ معاصی سبب ہیں طاعون کے سو سائنس کی اس میں کوئی مخالفت نہیں' گناہ کرنے سے حق تعالیٰ ناراض ہوئے اور جراثیم کو پیدا کر دیا اور آدمی ہلاک ہو گیا۔ گویا جراثیم سرکاری فوج ہیں' فوج گولہ باری سرکار کے حکم سے کرتی ہے تو اگر کہیں گولہ باری ہونے لگے تو وہاں نسبت فوج کی طرف ہو گی یا سلطان کی طرف اور آیا علاج یہ ہو گا کہ فوج کا مقابلہ کیا جاوے یا یہ ہو گا کہ سلطان سے چارہ جوئی کی جاوے۔ ظاہر ہے کہ نسبت کسی معنی میں فوج کی طرف بھی صحیح ہو گی مگر فہیم آدمی یہی کہے گا کہ بادشاہ نے فلاں جگہ پر گولہ باری کی یہ کوئی نہیں کہتا کہ اصل میں فوج نے کی اور فوج سے اگر مقابلہ کیا گیا تو نتیجہ کچھ بھی نہیں کیونکہ اگر مقابلہ میں کسی نے ہمت کی بھی کہ فوج پر غالب آ گیا اور سب کو تہ تیغ کر دیا تو کیا ہو گا' بادشاہ کے پاس فوج کی کمی نہیں۔ دوسری فوج اسی قسم کی یا اور کسی قسم کی آ جاوے گی برخلاف اس کے اگر یوں کیا جاوے کہ جیسے ہی گولہ باری شروع ہو سلطان کی خوشامد درآمد کی جاوے اور معافی چاہی جاوے یا صلح کر لی جاوے تو نتیجہ اچھا برآمد ہو گا۔ یہی فوج گولہ باری بند کر کے چلتی ہو جاوے گی اور دوسری بھی نہ آوے گی اور بادشاہ کی رضا جوئی کے ساتھ عقلاً اتنی بھی اجازت ہے کہ گولہ باری کی زد سے بچنے کے لیے کسی محفوظ و مستحکم مکان میں یا تہہ خانے میں گھس جاؤ مگر ہرگز فوج کا مقابلہ نہ کرو کیونکہ یہ بے سود ہے بلکہ زیادہ اہتمام سلطان سے معافی چاہنے کا کرو یہ ہے صحیح طریقہ جو شریعت نے تعلیم کیا ہے اور علاج معالجہ کی بھی اجازت اور اس کے حدود اس بیان سے نکل آئے کہ بطور تسکین قلب علاج کی بھی اجازت ہے بلکہ سنت ہے کیونکہ دنیا عالم اسباب ہے یہ وہ حد ہے جس کو میں نے مکان میں گھس جانا اور گولہ سے بچنا کہا ہے اور علاج پر اتنا

بھروسہ کر لینا جس سے اصلی تدبیر یعنی طلب عفو عن السلطان سے غفلت ہو جاوے بلکہ اسی ضرورت ہی سے انکار ہو جاوے' مذموم ہے اور یہ وہ ہے جس کو فوج کا مقابلہ کہا گیا کہ ہرگز کارآمد نہیں' فوج کے پیچھے دوسری فوج اور اس کے پیچھے تیسری اور چوتھی فوج ہے' طاعونی کیڑوں کو ہلاک کر دو گے' بخار کے کیڑے پیدا ہو جاویں گے' ان کو ہلاک کر دو گے تو ہیضہ کے کیڑے پیدا ہو جاویں گے' حاکم اور احکم الحاکمین سے کہاں تک جیتو گے؟ یہ تحقیق ہوئی معاصی کے سبب بلیات ہونے کی۔

حقیقت مصیبت

اب دوسرا سوال باقی رہا کہ اگر معاصی سبب ہیں طاعون کے تو نیک آدمی طاعون میں کیوں مرتے ہیں اسکے جواب کے لیے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے جو ذرا دقیق ہے وہ یہ کہ جس چیز کو مصیبت کہتے ہیں آیا وہ اپنی صورت سے مصیبت ہے یا حقیقت سے۔ میں اس بات کو نظائر سے صاف کروں گا۔ سو دعوٰی سے کہا جاتا ہے کہ مصیبت جبھی مصیبت ہے جبکہ اس میں حقیقت مصیبت کی موجود ہو۔ صرف صورت مصیبت کے وجود سے اس کو مصیبت نہیں کہا جا سکتا ہے۔ میں اس کی مثال پیش کرتا ہوں وہ یہ کہ کسی کو بغل میں زور سے دبایا تو ظاہر ہے کہ یہ فعل تکلیف دہ ہے مگر سوال کیا جاتا ہے کہ کیا اس کو ہر جگہ جہاں اس کی صورت کا وجود ہو مصیبت ہی کہیں گے یا اگر کہیں ایسا ہو کہ صورت تو یہی ہے مگر حقیقت اس کی یعنی اذیت قلب نہ ہو تو وہاں اس کا نام اور کہیں گے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ ایک محبوب ہو اور ایسے ناز نخرے والا ہو کہ کسی کو منہ نہیں لگاتا اور ایک شخص مدت سے اس کی ملاقات کی فکر میں ہو مگر کبھی رسائی نہیں ہوتی اور دفعتاً ایک دن وہ محبوب پیچھے سے آ کر اس کو بغل میں دبا لے اور ایسا دبائے کہ ہڈی پسلی ٹوٹی جاتی ہوں تو اس وقت صورت تو وہی موجود ہے جس کا نام مصیبت تھا مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اس کا نام مصیبت رکھیں گے؟ اگر نہیں رکھیں گے تو کیوں اور میں کہتا ہوں کہ آپ تو صرف دور سے دیکھنے والے ہیں اگر خود اس شخص سے جس پر یہ تکلیف گزر رہی ہے اور دبانے کا الم پا رہا ہے پوچھا جاوے کہ یہ مصیبت ہے یا راحت؟ تو وہ کیا کہے گا! مثلاً محبوب اس سے کہے کہ اگر تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دوں تو اس وقت کیا کہے گا اس کی تو یہ حالت ہوگی کہ قالاً اور حالاً یہ کہتا ہوگا:

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے　　کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اور

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے　　یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

یہ بات بلا مبالغہ ہے کہ دم نکلنا بھی گوارا ہوگا اور چھوڑ نا گوارا نہ ہوگا اور یہی کہے گا کہ میرے کہاں نصیب جو یہ موقع ملا اور خصوصاً جبکہ ایسا دیا پایا ہو کہ موت کا اندیشہ بھی نہ ہو تو اس کو مصیبت کسی طرح بھی نہ کہے گا۔ بتلائیے کہ جب صورت اس کی بعینہ وہی ہے جس کا نام دوسری جگہ مصیبت تھا پھر یہاں اس صورت خاص میں اس کو مصیبت کیوں نہیں کہتے' ایک ہی فعل ہے مگر ایک وقت میں تو اس کا نام مصیبت ہے اور ایک وقت میں راحت اس کی وجہ سوائے اسکے کیا ہے کہ صورت مصیبت کو مصیبت نہیں کہتے بلکہ معنی مصیبت کو مصیبت کہتے ہیں۔ ایک وقت میں وہ معنی موجود ہیں اور ایک وقت میں نہیں حتیٰ کہ اس صورت میں اگر محبوب کہے کہ اگر تجھے تکلیف ہوتی ہو تو میں تجھے چھوڑ کر رقیب کو بغل میں دبا لوں' سو اگر یہ مصیبت ہے تو کیوں اپنے اوپر سے اس کا ٹلنا اور اپنے دشمن پر اس کا مسلط ہو جانا گوارا نہیں کرتا' اس صورت میں تو وہی یہی کہے گا:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔۔۔۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر تیری خنجر آزمائی کے لیے سلامت)

بحمد اللہ اس تقریر سے میرا دعویٰ مبرہن ہو گیا کہ صورت مصیبت پر مصیبت کا حکم کر دینا صحیح نہیں بلکہ معنی کا اعتبار ہے۔

اعتبار نسبت

وہ معنی کیا ہیں وہ ایک ننھی سی چیز ہے جو نظر بھی نہیں آتی جیسے گھڑی میں بال کمانی کی ذرا سی نامعلوم سی چیز ہے مگر گھڑی کی چال کا مدار اسی پر ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو گھڑی بیکار ہے یا وہ خراب ہو تو چال صحیح نہیں ہو سکتی وہ ننھی سی چیز نسبت ہے۔ ایک ہی فعل کی نسبت ایک کی طرف ہو تو مصیبت بن جاوے اور اسی فعل کی نسبت دوسرے کی طرف ہو تو راحت بن جاوے' دبانے کی نسبت صدیق یعنی دوست کی طرف ہوئی تو عین راحت ہے اور عدو یعنی مخالف کی طرف ہوئی تو مصیبت ہے اس نسبت سے کھانا بھی زہر بن جاتا ہے اور اسی نسبت سے زہر شکر ہو جاتا ہے۔ اب یہ شبہ حل ہو گیا کہ طاعون میں اولیاء اور نیک لوگ بھی مرتے ہیں تو کیا حق تعالیٰ اپنے دوستوں کو عذاب دیتے ہیں۔ حاصل اس حل کا یہی ہے کہ طاعون اپنی ذات میں مصیبت نہیں اس کے اندر ایک اور چیز ہے جس سے وہ مصیبت بن جاتا ہے اور وہ چیز وہی نسبت ہے۔ جب طاعون مطیع پر آتا ہے تو اس نسبت سے آتا ہے جس سے وہ دبانا راحت ہوا تھا یعنی دوستی اور محبت و رحمت کے ساتھ آتا ہے اس لیے راحت ہوتا ہے اور جب غیر مطیع پر آتا ہے تو اس نسبت سے آتا ہے جس سے وہ دبانا باعث اذیت ہوا تھا یعنی

دشمنی اور قہر کے ساتھ آتا ہے اس لیے مصیبت ہوتا ہے۔ مطیع پر حق تعالیٰ کی نظر رحمت ہوتی ہے لہذا ہر بات اس کے لیے باعث راحت ہوتی ہے۔ اس واسطے دعویٰ سے کہا جاتا ہے کہ مصیبت اہل اللہ پر آتی ہی نہیں کیا منہ ہے مصیبت کا جوان کے پاس بھی آسکے اور جس کو آپ مصیبت سمجھتے ہیں یہ آپ کی غلطی ہے وہ مصیبت نہیں ہاں صورت مصیبت ہے۔ میں ایک اور مثال مشاہدات سے دیتا ہوں جس کے بعد اس کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہ رہے گی۔ مصیبت کی مثال لوہ کی سی ہے کہ کیسی ناگوار اور تکلیف دینے والی چیز ہے لیکن یہ ضروری بات نہیں کہ وہ سب کو تکلیف ہی دے کسی کے لیے لوہ تکلیف دینے والی ہے اور کسی کے لیے آرام دینے والی۔ وہ کون شخص ہے جس کو لوہ آرام دیتی ہے وہ وہ ہے جو خس خانہ میں بیٹھا ہے کہ لوہ جتنی سخت اور تیز ہوگی اتنا ہی اس کو آرام پہنچے گا۔ ایک کوتاہ نظر جس نے خس کی ٹٹی کو نہیں دیکھا لوہ چلتی دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص بیچ میدان میں ہے لوہ اس کو چاروں طرف سے بھون دے گی اور رحم کرے گا کہ بیچارہ کس مصیبت میں ہے اور یہ خبر نہیں کہ وہ کس قدر آرام میں بیٹھا ہے لوہ اس کو ذرا ناگوار نہیں بلکہ باعث راحت ہے حتیٰ کہ خواہش کررہا ہے کہ لوہ خوب چلے کیونکہ خس کی ٹٹی کا لطف لوہ ہی میں آتا ہے۔ جتنی لوہ زیادہ چلتی ہے اتنا ہی خس خانہ برف خانہ ہوتا ہے۔ یہی حالت اہل اللہ کی ہے کہ اہل دنیا مصائب کی لوہ دیکھ کر ان پر رحم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ مصائب کا شکار ہیں اور یہ خبر نہیں کہ وہ ان ہی پر رحم کھاتے ہیں اور اس قدر مزہ میں بیٹھے ہیں کہ تمنا کرتے ہیں کہ لوہ اور چلے تاکہ خس خانہ رضا کا لطف آوے ان کے پاس ایسی چیز ہے کہ اس سے مصیبت مصیبت نہیں رہتی جس کی مثال بالکل خس کی ٹٹی کی سی ہے واقعات آتے ہیں مگر چھنکر اور گرمی چھوڑ کر سرد ہو کر اور اذیت سے خالی ہو کر عین راحت بن کر۔ اس مصیبت کے وقت ان کے حالات دیکھ کر صاف پتہ چل سکتا ہے۔ وہ تکلیف میں ہیں یا آرام میں بعضوں پر تو ایسا غلبہ ہوا لذت کا کہ موت کے وقت قہقہہ مارتے تھے کیا تکلیف میں کوئی قہقہہ مارا کرتا ہے اور اکابر اہل اللہ کا تو کہنا ہی کیا ہے ادنیٰ مسلمان کی حالت میں بھی مصیبت کے وقت کفار کی حالت سے فرق ہوتا ہے جس کو جتنی نسبت حق تعالیٰ سے حاصل ہے اسی قدر مصیبت کی تکلیف کم ہوتی ہے۔ اب شبہ جاتا رہا اور وہ دعویٰ صحیح ہوا کہ اہل اللہ پر مصیبت نہیں آتی۔

مصیبت بر معصوم

اب ایک شبہ یہ اور رہا کہ اگر مصیبت معصیت ہی سے آتی ہے تو بچوں کو تکلیف کیوں ہوتی ہے؟ نزع میں دیکھا ہوگا کہ بچوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے حالانکہ ابھی بچوں نے کوئی گناہ نہیں کیا

کیونکہ وہ ابھی مکلف ہی نہیں ہیں اس میں بھی شبہ کی خرابی غور نہ کرنے ہی سے ہے بلکہ دنیا میں جو کچھ بھی اختلافات ہیں وہ فہم سے کام نہ لینے ہی سے ہیں۔

جنگ ہفتا دو دو ملت ہمہ را عذر   چون ندید ند حقیقت رہ افسانہ زوند

(بہتر فرقوں کی جنگ میں تمام کو معذور سمجھو جب ان کو حقیقت کا پتہ نہ چل سکا تو انہوں نے ڈھکوسلوں کی راہ اختیار کی)

سنئے! ہم کہتے ہیں کہ بچوں کے لیے بھی مصائب تکلیف دہ نہیں گو وہ جسم کو تکلیف ہو مگر روح کو تکلیف نہیں ہوتی کیونکہ ان کی روح کو تعلق مع اللہ حاصل ہے کیونکہ تعلق مع اللہ قطع ہوتا ہے معصیت سے اور ان سے معصیت اب تک ہوئی نہیں تو تعلق باقی ہے لیکن روح سے مراد روح طبی نہیں ہے بلکہ روح الٰہی مراد ہے نزع سے یا دیگر تکالیف سے روح طبی کو بیشک ضغط ہوتا ہے یہ روح طبی گویا مرکب ہے روح الٰہی اور ان دونوں میں تعلق سوار اور گھوڑے کا سا ہے' گھوڑے کے اگر چابک مارا جاوے تو سوار کو کوئی نقصان یا تکلیف نہیں پہنچتی بلکہ گھوڑا تیز ہو جاتا ہے اور اس میں سوار کا نفع ہے ہاں سوار ہوشیار ہونا چاہیے تا کہ گر نہ پڑے جسم کو تکلیف پہنچنے سے روح حقیقی کو تکلیف نہیں پہنچتی کیونکہ وہ جسم کا جزو نہیں ہے اس کو جسم سے صرف ایک خاص تعلق ہے جیسے ہم کو گرمی کے موسم میں جاڑوں کے ان کپڑوں سے تعلق ہوتا ہے جن کو تہہ کر کے رکھ دیا گیا ہے کہ اگر کوئی ہماری رضائی ہمارے سامنے جلا وے تو ہم کو ایک قسم کی تکلیف تو پہنچتی ہے جس کو رنج کہتے ہیں اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو واقع رضائی پر ہوا وہی ہم پر ہوا یعنی جلنا۔ اس رضائی کے جلنے سے ہمارا جسم نہیں جلا۔ اسی طرح جو تکلیف بچوں پر نظر آتی ہے وہ روح طبی اور جسم پر ہوتی ہے روح حقیقی پر نہیں ہے اور یہ بہت موٹی بات ہے۔ اہل فلسفہ کے نزدیک بھی ایک خاص عنوان سے یہ مسئلہ مسلم ہے کیونکہ مجرد ہے اس کو آرام و تکلیف جسم سے نہیں پہنچتی کیونکہ وہ جسم میں حلول کیے ہوئے نہیں ہے ہاں اس کو تعلق ہے جسم سے۔ جیسے بادشاہ کو تعلق ہے ملک سے کہ بادشاہ بیٹھا ہے' لندن میں اور کام سب یہاں تک ہو رہے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ بادشاہ یہاں موجود ہو تب ہی حکومت کے آثار ظاہر ہوں یا جیسے آفتاب کی بنا بر مشہور ہے فلک چہارم پر اور روشنی و حرارت اس کی زمین تک پہنچتی ہے فلک چہارم پر میں نے بناء بر مشہور کہہ دیا ورنہ اس کی کوئی دلیل نہیں۔ ظاہر نصوص سے آفتاب کا آسمان اول پر ہونا معلوم ہوتا ہے اور آج کل کے سائنس والوں نے تو اپنے زعم فاسد میں یہ قصہ ہی نہیں رکھا' آسمان ہی کا انکار کر دیا' چہارم اور اول سے بحث ہی نہ رہی۔ انہوں نے تو

ایسا کیا جیسے ایک شخص کی ناک پر مکھی بار بار بیٹھتی تھی انہوں نے غصہ میں آ کر ناک ہی کو کاٹ ڈالا کہ جا اب کاہے پر بیٹھے گی ہم نے اڈا ہی نہیں رکھا۔ سو یہ قول بھی غلط ہے اور میں اس وقت اس سے بحث نہیں کرتا یہ مسئلہ دوسری جگہ کا ہے اصل مدعا یہ ہے کہ باوجود دوری کے آفتاب کو زمین سے علاقہ ہے۔ شعراء کے یہاں ضرب المثل ہے ؂

کالشمس فی کبدالسماء ونورھا یغشی البلاد مشارقا و مغاربا

روح کو ایسا ہی علاقہ ہے جسم سے کہ گو روح جسم کے اندر نہ ہو مگر جسم پر اثر کرتی ہے اور ان دونوں مثالوں میں پوری ٹھیک دوسری مثال ہے یعنی آفتاب اور زمین والی اور بادشاہ اور ملک والی مثال پوری ٹھیک نہیں کیونکہ بادشاہ کو ملک سے علاقہ صرف حکومت کا ہے جو بواسطہ خدم حشم کے ہوتی ہے اور آفتاب کا اثر زمین پر بلاواسطہ ہے اور روح حقیقی کا اثر بھی جسم پر بلاواسطہ ہے اس لیے دوسری مثال زیادہ صحیح ہے۔ غرض اس روح پر جسم کی تکلیف وراحت کا اثر نہیں پڑتا۔ سو بچوں کو جو تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ صرف روح طبی کے تغیرات ہیں نہ کہ اصلی اور حقیقی روح کے۔

فراق کی مصیبت

اس روح کی تکلیف وراحت کا مدار تو صرف بعد عن اللہ اور قرب الی اللہ ہے اور بعد ہوتا ہے معصیت سے اور بچوں سے معصیت ہوتی نہیں تو ان کو بعد عن اللہ نہیں لہٰذا تکلیف بھی نہیں۔ اسی بعد کو عشاق فراق سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک بس فراق ہی ایک مصیبت ہے اگر فراق نہ ہو تو پھر کوئی مصیبت مصیبت نہیں۔ عارف رومیؒ نے خوب کہا ہے:

از فراق تلخ میگوئی سخن ہر چہ خواہی کن و لیکن ایں مکن

(جدائی کی تلخ بات مت کرو اور جو چاہے کرو لیکن نہ کرو)

عارف شیرازی فرماتے ہیں:

شنیدہ ام سخنے خوش کہ پیر کنعاں گفت فراق یار نہ آں میکند کہ بتواں گفت

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر کنائے ست کہ از روزگار ہجراں گفت

(پیر کنعاں نے یہ نہایت کیا عمدہ بات کہی وہ یہ کہ فراق محبوب ایسی مصیبت ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا' واعظ شہر نے جو قیامت کی گھبراہٹ کی بات کی اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اس نے زمانہ کے فراق کا تذکرہ کیا)

پس اصل تکلیف بعد عن المحبوب ہے اور محبوب پاس ہو تو پھر یہ حالت ہے:

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں — فوق گردوں است نے قعر زمیں
ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ — جنت است آں گرچہ قعرِ چاہ
با تو دوزخ جنت است اے جانفزا — بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

(جس جگہ محبوب خوش وخرم بیٹھا ہو وہ جگہ مرتبہ میں آسمان سے بلند تر ہے نہ کہ پست زمین، جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو اے دلربا تیری ہمنشینی میں دوزخ جنت ہے اور تیرے بغیر جنت بھی دوزخ ہے)

غرض اصل دولت قرب محبوب ہے اگر یہ حاصل ہو تو سب کچھ حاصل ہے اس کے ساتھ کیسے ہی واقعات پیش آویں تکلیف نہیں ہو سکتی، اہل اللہ کو موت کا بلاوا بھی آ جاوے تو پرواہ نہیں بلکہ وہ تو موت کو ڈھونڈتے اور بلاتے پھرتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم

(وہ دن بہت اچھا ہوگا کہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جاؤں، جان کو آرام مل جائے اور محبوب کے دیدار کے لیے چلا جاؤں)

موت جس سے لوگ بھاگتے پھرتے ہیں ان کے یہاں اس کی خوشیاں منائی جاتی ہیں اور نذریں مانی جاتی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — تا در میکدہ شاداں وغزلخواں بروم

(میں نے یہ نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش وخرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

جن پر موت کا یہ اثر ہو ان پر دیگر معمولی واقعات کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اہل اللہ پر مصیبت نہ آنے کے معنی یہ نہیں کہ ان کو واقعات پیش نہیں آتے۔

ذکر کی عجیب خاصیت

واقعات سب پیش آتے ہیں جیل خانہ، موت، بیماری، فاقے بلکہ بعض اوقات یہ ان کو اوروں سے زیادہ پیش آتے ہیں مگر یہ سب چیزیں باہر ہی باہر رہتی ہیں اور اندرونی حالت ان کی یہ ہوتی ہے جس کو ایک شاعر نے دکھایا ہے ؎

عذل العواذل حول قلب التائه — وهوى الا حبة منه في سودائه

(ملامت گروں کی ملامت قلب کے اردگرد ہے اور محبوب کی محبت قلب میں جاگزیں ہے)

یہ شعر صرف ملامت کے بارے میں ہے۔ گو ملامت بھی ایک مصیبت ہے مگر اہل اللہ کے لیے تو ہر مصیبت کی حالت یہی ہے کہ باہر ہی باہر رہتی ہے قلب کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی ان کے

قلب کی مثال ایسی ہے جیسے ایک صاف بوتل کے اندر کوئی میٹھی چیزیں رکھی ہوئی ہے اگر اس پر مکھی بھی آ جاوے تو چاروں طرف گھومتی پھرتی ہے مگر مجال نہیں کہ اندر چلی جاوے ناواقف آدمی اور دور سے دیکھنے والا جو بوتل کی اس خاصیت کو نہ جانتا ہو کہ یہ جرم شفاف ہے جس میں نظر بھی پار ہو سکتی ہے کوئی اور چیز نہیں جا سکتی وہ دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ اس چیز پر مکھیاں بھنک رہی ہیں اور ضرور اس کو خراب کرتی ہوں گی مگر جو بوتل کی خاصیت سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ کبھی بوتل کے اندر نہیں ہے اہل دنیا ذکر اللہ کی خاصیت کو جانتے ہیں اس واسطے اہل اللہ پر واقعات کا ہجوم دیکھ کر اعتراض کرتے ہیں یا افسوس اور رحم کرتے ہیں کہ بیچارے سخت تکلیف میں ہیں اور یہ خبر نہیں کہ یہ سب مکھیاں باہر ہی باہر ہیں اندر مجال نہیں کہ چلی جاویں۔

سلطنت قلب

اندر ایک ایسی ذات کی سلطنت ہے جس کے سامنے فرشتہ اور جن بھی دم نہیں مار سکتا اور جس کے سامنے تمام عالم سربسجود ہے وہ حق تعالیٰ ہے ان کے ہوتے ہوئے وہاں دوسرے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ دوسری چیز آ ہی نہیں سکتی اور ان کی وسعت کی یہ حالت ہے کہ تمام دنیا بھی اس کے سامنے کوئی چیز نہیں۔

گر آفتاب است یک ذرہ نیست　　　وگرہفت دریاست یک قطرہ نیست

(اگر تمام مخلوق مثل آفتاب کے ہے خدا تعالیٰ کے سامنے ایک ذرہ کے بھی برابر نہیں۔ اسی طرح سات دریا حق سبحانہ وتعالیٰ کے یہاں ایک ذرہ کے بھی برابر نہیں)

چو سلطان عزت علم برکشد　　　جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے تو سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں)

انہوں نے عالم سے اپنے کو مستور کر دیا ہے اگر موقعہ تجلی سے پردہ اٹھا دیتے تو سارا جہاں مٹ جاتا۔ حدیث میں ہے: "**حجابه النور لو كشف الحجاب لا حرقت سبحات وجهه ما انتهى اليه بصره**"[۱] (اس کا حجاب نور ہے اگر حجاب اٹھالیا جائے تو جملہ اطراف جہاں تک نظر پہنچتی ہے سب کو جلا دے) اور یہ حجاب اجسام پر ہے مگر قلب میں ایک خاص تجلی ہے۔ گو آخرت جیسی نہ سہی سو جہاں انوار الٰہی موجود ہیں وہاں ظلمات اور تکدر کا کیا کام اور جب منبع سکون اور اطمینان وہاں موجود ہے تو پریشانی کا کیا ذکر۔ واقعات و مصائب موجود ہیں مگر اثر نہیں کرتے۔ دیکھنے والا جو ناواقف ہو وہ جو چاہے سمجھ لے اس کا کون ذمہ دار ہے غرض مطیعین کے لیے مصیبت

---

[۱] (اتحاف السادۃ المتقین ۲: ۴۷، فتح الباری ۱۳: ۴۷۳، المغنی عن حمل الاسفار ۱: ۱۰۱)

واقع میں معصیت نہیں۔ تو یہ شبہ رفع ہو گیا کہ نیک لوگوں پر طاعون یا اور مصائب کیوں آتے ہیں اور اس کا جواب پہلے ہی ہو چکا کہ اسباب طبعیہ کو مصائب میں کہاں تک دخل ہے میں نے ثابت کر دیا ہے کہ اسباب طبعیہ کو مصائب کے آنے میں دخل صرف اتنا ہے جتنا رسی کو پھانسی میں کہ اصل سبب پھانسی کا ڈکیتی ہے مثلاً اور رسی صرف ایک ذریعہ سزا کا۔ اسی طرح اصلی سبب مصائب کا خدا تعالیٰ کی معاصی اور حق تعالیٰ کی ناراضی ہے اور ان معاصی کے لازمی اور متعدی مفاسد بھی سب بیان ہو چکے۔ غرض سب شبہات حل ہو کر اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ تمام مفاسد کی جڑ معصیت ہے خواہ وہ مفاسد دنیوی ہوں یا دینی۔ جب معصیت تمام مفاسد کی جڑ ہے تو اس کا مقابل اطاعت ہمیشہ سبب ہو گی ہر قسم کی راحت کی۔ جب وہ شبہات جو حائل تھے معاصی کے موجب فساد ہونے میں رفع ہو گئے تو وہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ فقط معصیت ہی مرض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مرض مسلمانوں میں بھی موجود ہے اسی کی وجہ سے خود بھی پریشان ہوتے ہیں اور دوسرے بھی پریشان ہوتے ہیں۔ تو بتلایئے! اس کے دفعیہ اور علاج و تدبیر کی ضرورت ہے یا نہیں؟ ضرور ہے اور ظاہر ہے کہ جب اصل مرض معصیت ٹھہرا تو علاج تمام مفاسد کا ازالہ معصیت ہی ہو سکتا ہے کما ہو ظاہر۔

معصیت ماضیہ اور عقل

اب ایک اور بات سمجھئے! کہ معصیت دو قسم کی ہیں ایک وہ جن کو تعلق زمانہ ماضی سے ہے یعنی وہ گناہ جو کیے جا چکے اور ایک وہ جن کو تعلق زمانہ مستقبل سے ہے آئندہ کیے جا سکتے ہیں اور گو ایک زمانہ حال بھی ہے اس کے لحاظ سے ایک تیسری قسم اور بھی ہونی چاہیے لیکن زمانہ حال خود منقسم الی الجزء میں ہے ایک جزو اس کا ماضی ہے اور ایک مستقبل اور دونوں جزوں کے بیچ میں کوئی جزو ایسا نہیں جس میں کوئی عمل کیا جا سکے وہ صرف ایک آن ہے جو محل عمل نہیں ہو سکتی لہٰذا تیسری قسم نکالنا فضول ہے۔ غرض ایک قسم تو وہ ہے معصیت کی جس کو تعلق ہو زمانہ ماضی سے اس کا مقتضا یہ ہے کہ وہ اب آپ کے اختیار میں نہ رہے اور جو اثر اس پر مرتب ہونے والا ہو وہ ضرور مرتب ہو۔ مثلاً ایک شخص ڈکیتی کر چکا تو اب کچھ نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ سزا ہو۔ گویا اس معصیت کی جس کو زمانہ ماضی سے تعلق ہو عقلاً یہ خاصیت ہے کہ اس پر سزا ضرور ہونا چاہیے اور اگر یہ قاعدہ نہ مانا جاوے تو کسی جرم پر سزا نہ ہونا چاہیے اور تعزیرات بیکار ہی ہوں بس مجرم یہ کہہ کر چھوٹ جاوے کہ زمانہ تو گزر گیا اور فعل زمانہ کے ساتھ ساتھ تھا وہ بھی گزر گیا تو تم ایک معدوم فعل پر مجھے سزا کیوں دیتے ہو؟ اس وقت مجھ میں جرم کا وجود کہاں ہے اگر کوئی مجرم یہ کہے تو اس کا جواب یہی دیا

جاتا ہے کہ تو نے جرم کو ایسا موقع کیوں دیا جو وہ تجھ میں موجود ہو کر معدوم ہوا تو یہ سزا معدوم محض پر نہیں بلکہ معدوم بعد الوجود پر ہے تو مقتضائے عقل یہ ہوا کہ اگر چہ یہ بات ہے کہ زمانہ اختیار میں نہ رہا تو زمانی بھی (یعنی وہ فعل) اختیار میں نہ رہا نہ وہ لوٹ سکتا ہے نہ اس کے ساتھ حقیقتاً مجرم موصوف ہے لیکن سزا کا مدار اس پر نہیں بلکہ مطلق وجود اگر چہ اس پر عدم طاری ہو گیا ہو سزا کے لیے کافی ہے اس لیے گزشتہ جرم پر سزا ضرور ہونی چاہیے۔

عقل کی بے رحمی

یہاں بطور جملہ معترضہ کہا جاتا ہے کہ آج کل عقل کا زمانہ ہے' لوگ عقل کے ایسے دلدادہ ہوئے ہیں اور ایسی دوستی کی ہے عقل سے کہ شریعت کو بوجہ خلاف عقل فتویٰ دینے کے چھوڑ دیتے ہیں مگر عقل کی درستی دیکھ لی' آپ نے کہ اس نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ گزشتہ جرم پر سزا ہونا چاہیے مگر حق تعالیٰ نے یہ فتویٰ منظور نہیں کیا اور کہہ دیا ہم بہت سے گناہوں کی سزا معاف کر دیں گے۔ شریعت جو آپ کو ناگوار ہے وہ اس قدر آپ کی خیر خواہ ہے اور رحم کرتی ہے اور عقل جس کے آپ مرید ہیں وہ ایسی آپ کی دشمن ہے مقابلہ کر کے فیصلہ کیجئے جس نے دونوں کو دیکھا ہے اس نے تو کہہ دیا۔

آزمودم عقل دور اندیش را　　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے عقل دور اندیش کو بارہا آزمایا' بعد میں اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

اور کہہ دیا کہ:

اوست دیوانہ کو دیوانہ نہ شد　　　مرعسس رادیدو درخانہ نہ شد

(وہ دیوانہ دیوانہ نہیں ہے جو کوتوال کو دیکھتا ہے (اور اس کے ڈنڈے سے بچنے کے لیے) گھر چلا جاتا ہے۔

یہ خیر خواہ صاحب ایسے ہیں جیسے الف لیلیٰ کے نائی نے اپنے آقا کی خیر خواہی کی تھی کہ وہ کسی باوجاہت شخص کی بیٹی سے تعلق رکھتا تھا اور خفیہ اس کے پاس گیا تھا یہ نائی صاحب بھی خدمت کے لیے ساتھ تھے وہ شخص گھر آیا تو چور صاحب چھپ گئے' اتفاق سے وہ شخص اپنے نوکر کو کسی قصور پر مارنے لگا' نائی سمجھا میرا آقا پٹ رہا ہے' آپ حمایت کے لیے دوڑے اور اس شخص سے کہلا بھیجا کیا میرا آقا خود آیا ہے' تیری ہی بیٹی نے بلایا ہے پھر میرے آقا کو کیا کہتا ہے غرض نائی صاحب نے بتلایا کہ میرا آقا تیرے گھر میں ہے پھر تو اس کو تلاش کر کے نکالا گیا اور خوب رسوائی اور گندہ کاری ہوئی' یہ قصے بچپن میں دیکھے تھے۔ ہیں تو یہ لغویات مگر بچپن کا شغل بھی اس وقت کام دکھا گیا اور نتیجہ

اس سے اچھا نکل آیا۔ غرض عقل ایسی ہی خیر خواہ ہے' سینکڑوں قصے اس قسم کے موجود ہیں جن سے عقل کی بدخواہی اور بے رحمی ثابت ہوتی ہے۔

شریعت کی خیر خواہی

میں ایک نظیر اور دیتا ہوں اس بات کی کہ عقل آپ کے ساتھ ہمدردی کرتی ہے یا شریعت۔ دیکھئے! عقل کا مقتضا ہے کہ جتنی بڑی چیز مقصود ہو اتنی ہی کوشش بھی زیادہ چاہیے۔ ایک مقدمہ یہ ہوا اور اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ آخرت کی دنیا سے کیا نسبت ہے ظاہر ہے کہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی ہے اور فانی اور باقی میں کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بعض اعلیٰ مقاصد بھی اتنی کوششوں کے محتاج ہیں کہ تمام عمر ان میں کھپ جاتی ہے پھر بھی بعض وقت میسر نہیں ہوتے تو اس حساب سے آخرت کے کسی ادنیٰ مقصد کے لیے بھی کوشش اس دنیوی مقصد سے زیادہ ہی ہونا چاہیے کیونکہ وہ کیسا ہی ادنیٰ ہو مگر باقی ہونے کی وجہ سے فانی سے تو اعلیٰ ہی ہے۔ ادنیٰ کہنا کسی مقصد آخرت کو صرف بہ نسبت دیگر مقاصد آخرت کے ہے ورنہ دنیا کے تو کسی اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد کو بھی اس سے کچھ لگاؤ نہیں ہوسکتا۔ غرض عقل یہ حکم کرتی ہے کہ آخرت اس وقت حاصل ہوسکتی ہے جبکہ کوشش اس کے اندازہ کی موافق ہو اور شریعت کا حکم یہ ہے کہ تھوڑی کوشش بھی کافی ہے پھر وہ تھوڑی کوشش بھی دس حصہ تک بڑھا دی جاتی ہے بلکہ رعایات کو اگر دیکھا جاوے تو یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ صرف بہانہ دیکھا جاتا ہے کہ ذرا سی کوشش کرے بلکہ کوشش کا ارادہ ہی کرے بلکہ ذرا رخ بھی اوپر کو کرے تو اس کے اوپر انعامات کی بارش کردیں۔ اب دیکھ لیجئے! کہ عقل کی خیر خواہی بڑھی ہوئی ہے یا شریعت کی۔ پھر افسوس ہے کہ اس کو خیر خواہ کہیں جس کے یہاں ضابطہ کے سوا رعایت کا نام ہی نہیں اور واقعی خیر خواہ کو دشمن سمجھیں۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ عقل بری چیز ہے' نہیں عقل کام کی چیز بھی ہے مگر اس قید سے کہ اس سے زیادہ دوستی نہ کرو' تھوڑا کام لو وہ کام یہ کہ اس کے ذریعے سے اصول دین کو سمجھ لو باقی فروع میں یہ بیکار ہے فروع میں اس کے فتویٰ پر عمل نہ کرو۔

مراحم خسروانہ

غرض معصیت کے بارے میں مقتضائے عقل تو یہ ہے کہ گزشتہ جرم پر سزا ضرور ہو مگر شریعت نے اس کو نہیں مانا اور اپنا قانون یہ رکھا ہے: "وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ"

یعنی حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ توبہ کو قبول فرماتے ہیں اور گناہوں سے درگزر کرتے ہیں۔ عقلی قواعد کو سب کو بالائے طاق رکھ دیا۔ یہ نعمت کس قدر شکر کے قابل ہے اور کس قدر غنیمت سمجھنا چاہیے یہ وہ حکم ہے جو عقل کے خلاف صرف ہماری خاطر سے جاری کیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہوا جیسے کوئی پھانسی کا مجرم ہو اور کوئی گنجائش اس کے مقدمہ میں نہ ہو اور تمام عدالتوں سے پھانسی کا حکم بحال رکھا گیا ہو لیکن سلطان اس کو بلا کر ایک دم یوں کہہ دے کہ مراحم خسروانہ سے اس کو معاف کرتے ہیں صرف اس شرط سے کہ تم اقرار کرو کہ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔ بتایئے! اس ترحم کو دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوگی۔ اس کے پیروں میں گر پڑے گا اور دل و جان سے فدا ہو جاوے گا۔ کیا اس وقت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس اقرار میں ذرا بھی دیر لگائے گا۔ دیر لگانا کیا معنی؟ اس سے تو اگر یہ بھی کہیں کہ تمام عمر اس توبہ کا وظیفہ پڑھا کر تب بھی اس کو تامل نہ ہوگا۔ یہ ہے توبہ جس سے لوگ بھاگتے پھرتے ہیں اس کو غنیمت نہیں سمجھتے کہ ضابطہ کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ ترحم کا برتاؤ کیا گیا جس کا ہم کو کسی طرح استحقاق نہ تھا۔ غرض گزشتہ گناہوں کی تدبیر تو یہ ہے کہ ان سے شرعی قاعدہ کے موافق توبہ کی جاوے اور آئندہ کے گناہوں کا جن کو میں نے دوسری قسم کہا تھا علاج یہ ہے کہ ان کا انسداد کیا جاوے اور خیال رکھا جاوے کہ گناہ نہ ہونے پاوے یہ ہے مجاہدہ جو ہر وقت کا شغل ہے کیونکہ ہماری طبائع کی یہ خاصیت ہے کہ ہر آن میں ضرورت ہے انسداد گناہ کی ذرا نظر چوکی اور گناہ کا صدور ہوا۔ حق تعالیٰ نے اسی مضمون کو اس آیت میں جو اس وقت تلاوت کی گئی ہے بیان فرمایا ہے اور میرا اختیار کرنا اس آیت کو بے حد مناسب ہوا کیونکہ یہ مضمون جامع ہے مسلمانوں کے تمام مفاسد کو کیونکہ مفاسد کا خلاصہ گناہ ہیں اور گناہ کے جملہ اقسام کا اور ان کی تدابیر کا اس میں بیان ہے اور ان دو آیتوں میں ان کی ہی بحث ہے اول میں گناہ سے بچنے کی تدبیر کا بیان ہے اور دوسری میں گناہ کے ممتد ہونے کے اسباب کا بیان ہے کہ گناہ میں ترقی کیونکر ہوتی ہے تاکہ ان سے بچ سکیں۔

توبہ طاعات

مگر تفسیر آیات سے پہلے میں ایک ضروری مضمون پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ توبہ کے متعلق ایک بات قابل یاد رکھنے کی ہے جس میں بہت لوگ غلطی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا تھا اس کو مع جواب کے نقل کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب گزشتہ گناہوں کے لیے توبہ کافی ہے تو نماز اگر وقت پر نہ پڑھی گئی تو اس کا تدارک یہ ہونا چاہیے کہ توبہ کر لی جاوے کیونکہ وہ گناہ ہوا اور توبہ گزشتہ گناہ کا علاج ہے اس کی قضا کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ توبہ سے گناہ معاف ہوتے ہیں نہ کہ طاعات۔ طاعت کا وجوب جب ذمہ ہو چکا تو وہ تو ادا کرنے ہی سے ادا

ہوگی تو طاعت گزشتہ کی قضا معاف نہیں ہوسکتی ہاں توبہ سے تاخیر صلوٰۃ کا گناہ معاف ہوجاوے گا۔ اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں، کہتے ہیں گزشتہ را صلوات آئندہ را احتیاط نصوص سے ثابت ہے کہ طاعات کی قضا ضروری ہے وہ بلا قضا کیے ذمہ سے ساقط نہیں ہوتیں ان کی توبہ کا یہی طریقہ ہے کہ ان کو ادا کیا جاوے۔ غرض توبہ طریقہ سے ہو تو سب گناہوں کی تلافی ہوسکتی ہے۔ اب سمجھئے کہ ان آیتوں میں گزشتہ گناہ اور آئندہ گناہ دونوں سے بچنے کی تدبیر حق تعالیٰ نے بتلائی ہے اور وہ تذکرہ یہی معاصی ماضیہ کے لیے کافی ہے اس طرح کہ تذکر ہوگا تو توبہ کی توفیق بھی ہوگی جس مسلمان کو اپنے پہلے گناہ یاد ہوں اور اس کے ساتھ ہی حق تعالیٰ کے انعامات واحسانات کو بھی یاد کرے گا تو ضرور اس کے قلب میں ندامت اور خجلت کی کیفیت پیدا ہوگی۔ یہی اصل ہے توبہ کی۔ پھر وہ زبان ودل سے معافی کی بھی درخواست کرے گا لیکن یہاں ایک بات قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ معاصی ماضیہ کا تذکر خود مقصود بالذات نہیں صرف تحصیل توبہ کے لیے مقصود ہے جب اس تذکر سے توبہ کی توفیق ہوجاوے اور خوب گڑگڑا کر جی بھر کر حق تعالیٰ سے معافی چاہ لی جاوے تو پھر بار باران کو قصداً یاد نہ کرنا چاہیے۔ بس اب ان سے التفات ہٹالے ورنہ معاصی ماضیہ کا بار بار بکثرت یاد کرنا اور ہر وقت اسی غم میں گھلنا بندہ کے اور حق تعالیٰ کے درمیان ایک حجاب ہوجاتا ہے جس سے محبت وانس میں کمی ہوجاتی ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

ماضی و مستقبلت پردہ خداست

(ماضی اور مستقبل اللہ تعالیٰ کا پردہ ہے)

یہ تو معاصی ماضیہ کے ضرر سے بچنے کی تدبیر ہے۔

سلطنت نفس

اور آئندہ کی حفاظت کی تدبیر یہ ہے اور وہ بھی اسی تذکر میں داخل ہے کہ انسان میں ایک کمبخت چیز تقاضائے نفس ہے یہی باعث ہوتا ہے معصیت کا۔ شیطان کا اثر بھی بواسطہ تقاضائے نفس ہی ہوتا ہے اگر تقاضائے نفس نہ ہو تو شیطان کا بہکانا اس سے زیادہ اثر نہیں رکھ سکتا کہ اندھے سے کہیں کہ عورت کو دیکھ یا بہرے سے کہیں کہ گانا سن اور وہ یہ کہنے سے اس پر آمادہ بھی ہوجاویں لیکن ان میں خود دیکھنے کی اور سننے کی قوت نہیں تو اس صورت میں وہ اس خاص گناہ میں مبتلا نہیں ہوسکتے، گناہ جب ہی ہوتا ہے کہ اندر سے اس کی طرف میلان موجود ہو اس میلان ہی کو تقاضائے نفس کہتے ہیں اور شیطان ذرا اس کا محرک ہوجاتا ہے۔ اصل چیز تقاضائے نفس ہی ہے اور شیطان

کوئی چیز نہیں (اس کے معنی کوئی صاحب یہ نہ سمجھ جاویں کہ میں شیطان کے وجود کا منکر ہوں۔ جیسا کہ آج کل بعض لوگوں کا مذہب ہو گیا ہے' اس کا جواب تو ایک شخص نے خوب دیا تھا' ایک شخص اسی خیال سے کمرہ میں ٹہلتے پھرتے تھے اور کہہ رہے تھے کہ شیطان کیا چیز ہے کسی نے دیکھا ہے۔ خواہ مخواہ ایک فرضی چیز کو کیوں مان لیا جاوے۔ انسان خود اپنا شیطان ہے ان کے ایک دوست نے کہا کہ جناب آپ نے شیطان کو نہیں دیکھا میں دکھلا دوں۔ یہ کہہ کر آئینہ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور کہا دیکھ لیجئے اس میں شیطان موجود ہے ایسے اعتراضوں کے لیے ایسے ہی جواب ٹھیک ہوتے ہیں)۔ غرض شیطان کا وجود تو ہے مگر میرا مطلب یہ ہے کہ اس کو زیادہ دخل معصیت کے کرانے میں نہیں ہے بلکہ زیادہ دخل نفس کو ہے اور میں اس پر ایک لطیف دلیل رکھتا ہوں وہ یہ کہ آخر شیطان کو کس نے تباہ کیا' اسی نفس نے۔ نفس ہی کے اغواء سے تو یہ شخص شیطان ہو گیا ورنہ یہ شیطان نہ تھا۔ گو معلم الملوک بھی نہ تھا جیسا کہ مشہور ہے کہ یہ فرشتوں کو پڑھایا کرتا تھا' فرشتوں کو پڑھنے کی اور الف۔ ب کی تعلیم کی ضرورت ہی کیا ہے ان کو تو احکام ملہم ہوتے ہیں۔

شیطان ایک شخص تھا جس کا نام عزازیل تھا' نفس ہی کے اغواء سے اس نے نافرمانی کی اور مردود ہو گیا' اس واسطے نام اس کا شیطان ہو گیا' ابلیس ہو گیا۔ ابلیس مشتق ہے تلبیس سے۔ تلبیس کے معنی ہیں ناامید کرنا یہ چونکہ خود بھی رحمت الٰہی سے ناامید ہے اور دوسروں کو بھی ناامید کرتا ہے اس لیے ابلیس لقب ہو گیا اور اصل میں اس کا نام عزازیل ہے پس جبکہ شیطان کو بھی نفس ہی نے غارت کیا تو اصل چیز نفس ہی ہوا۔ اب اگر کوئی سوال کرے کہ نفس کو کس نے خراب کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ نفس کی ذات میں خود شر کا مادہ ہے گو یہ شرارت بھی مجعول ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ زمین پر روشنی آتی ہے' آفتاب سے اور آفتاب میں روشنی ذاتی ہے۔ ذاتی کے یہ معنی نہیں کہ وہ مجعول نہیں ہے' ہے مجعول ہی مگر اور کوئی نور واسطہ نہیں ہے۔ اسی طرح شیطان کو گمراہ کیا' نفس نے اور نفس میں یہ مادہ ذاتی ہے تو شیطان سے نفس بڑھا ہوا ہے اور اصل چیز معصیت میں نفس ہی ہے۔ شیطان کا کام اتنا ہے کہ نفس کو سکھلاتا ہے' اس میں بھی شرط یہ ہے کہ اس میں صلاحیت دیکھے ورنہ اگر صلاحیت نہ دیکھے تو کچھ نہیں کر سکتا۔

وزارت شیطان

اس کی مثال وزیر اور بادشاہ کی سی ہے کہ وزیر کو بڑا دخل ہے ہر کام میں مگر وہ دخل یہی ہے کہ سلطان کو مشورہ دے اور سلطان اپنے ارادہ سے کام کرتا ہے۔ وزیر کا قابو اسی صورت میں چل

سکتا ہے کہ سلطان میں استعداد اس کے اتباع کی ہو کہ اس صورت میں جو کچھ وزیر چاہے گا اس سے کرالے گا جس پر چاہے ظلم کرادے اور اگر سلطان اس کے قابو میں نہ ہو تو وزیر کو اختیار بالذات کسی کام کا نہیں ہے۔ اسی واسطے کہا ہے الشیطان وزیر النفس سلطان یعنی شیطان تو وزیر ہے اور نفس سلطان ہے۔ مطلب یہ کہ اصل قابو نفس ہی کا ہے اور شیطان کو چنداں قابو نہیں۔ اور یہ قرآن شریف سے بھی مفہوم ہے حق تعالیٰ نے شیطان کا قول نقل فرمایا ہے جو وہ قیامت کے دن کہے گا: "مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي" یعنی جب دوزخی شیطان پر اعتراض کریں گے کہ تو نے ہم کو بہکایا تو وہ جواب میں کہے گا کہ میرا کچھ قابو تم پر نہیں تھا اس سے زیادہ میں نے کیا کیا؟ کہ تم کو ایک کام کی طرف بلایا اور تم نے اس کو مان لیا' دیکھ لیجئے! قرآن سے اس کا ثبوت ہو گیا بلکہ خود ارشاد خداوندی بھی ہے: "إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ" الآیۃ (بلاشبہ وہ (ان لوگوں کا' ایمان والوں کا) بادشاہ نہیں ہے غرض شیطان اتنا برا نہیں ہے جتنا لوگوں کی زبان پر ہے کیونکہ کسی کو گھسیٹ کر معصیت کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ ہاں کہتا ہے اور خوب ترغیب دیتا ہے معصیت کی۔ گوفساد سارے اس کی ترغیب ہی سے ہو جاتے ہیں مگر بڑھاتا ہے نفس۔ جیسے شیطان کے شیرہ کا قصہ مشہور ہے۔ یعنی کسی نے شیطان سے کہا تھا کہ تم نے دنیا میں بڑا فساد مچا رکھا ہے' اس نے کہا میں تو مفت میں بدنام ہوں' آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ میں کیا کرتا ہوں۔ ایک بنئے کی دکان پر لے گیا اور ایک انگلی سے شیرہ دیوار پر لگا دیا' اس پر ایک مکھی آ بیٹھی' مکھی پر ایک چھپکلی لپکی' بنئے کی بلی چھپکلی پر جھپٹی اسی وقت ایک فوجی سوار کچھ سودا بنئے کی دکان سے لے رہا تھا اس کے ساتھ ایک بڑا کتا تھا' وہ بلی پر دوڑا' بنئے نے اپنی بلی کو بچانے کے لیے کتے کے سر پر ڈنڈا مارا' اتفاق سے ڈنڈا نازک جگہ پر لگ گیا اور کتا وہیں تڑپ کر مر گیا' سوار کو جو غصہ آیا اس نے تلوار کھینچ لی اور بنئے کو وہیں مار ڈالا' اس کو دیکھ کر بنئے دوڑ پڑے اور سوار کی تکا بوٹی کر ڈالی' یہ خبر رسالہ میں پہنچ گئی وہاں سے اس کے ساتھی توپ اور بندوق لے کر چڑھ آئے اور آن کی آن میں خون کے ندی نالے بہہ گئے۔ شیطان نے کہا دیکھو! میں نے اس فساد میں کیا کیا سوائے اس کے کہ ایک انگلی بھر شیرہ لگا دیا تھا پھر جو کچھ طوفان برپا ہوا وہ تمہیں لوگوں نے کیا۔ (یہ قصہ کوئی کتابی تو ہے نہیں' صرف ایک تمثیل ہے سو تمثیلات ایسی ہی ہوا کرتی ہیں) لشکر میں اونٹ بدنام ۔۔۔۔۔۔

شیطان کا کام

شیطان کا نام نکل گیا ہے ورنہ اس کا کام تو صرف یہ ہے کہ دیا سلائی میں مصالح لگاتا ہے وہ دیا سلائی کام نہیں دے سکتی جب تک کہ رگڑی نہ جاوے اور یہ رگڑنا دوسروں کا کام ہے ایک ایک دیا سلائی سب کی جیب میں ڈال دی ہے اس میں آگ بالقوہ موجود ہے' مصالح پر رگڑو گے تو آگ لے لے گی ورنہ ہرگز نہیں لے گی تو اس میں سے آگ نکلنا تمہارے ارادوں پر موقوف ہے کوئی گناہ بھی ایسا نہیں جو اختیار سے باہر ہو۔

نگاہ کا تیر

مثلاً کہتے ہیں کہ نگاہ پر قابو نہیں' نظر بد سے رکا نہیں جاتا' یہ غلط ہے' نظر یقیناً فعل اختیار ہے اور میں کہتا ہوں کہ جو تکلیف نظر کرنے میں ہوتی ہے وہ نظر کو روکنے کی تکلیف سے زیادہ ہے۔ یہ ایسی بلا کی چیز ہے کہ کسی نے اس کے بارے میں بہت ہی ٹھیک کہا ہے اور بچی ہوئی کہی ہے:

دروں سینہ من زخم بے نشاں زدہ   بحیرتم کہ عجب تیرے بے کماں زدہ

تجربہ کر کے دیکھئے! دو چار دفعہ نظر کو روکئے! اس سے اندازہ ہو جاوے گا کہ جو تکلیف نظر کرنے میں ہوتی ہے وہ اس میں ہرگز نہیں ہوگی۔ ایک روایت ہے: "اَلنَّظَرُ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ"[1] یعنی نظر ایک تیر ہے شیطانوں کے تیروں میں سے۔ نظر کرنے سے دل میں ایک آگ بھڑک اٹھتی ہے اور نظر کو روکنے میں وہ آگ گھٹتی ہے جس سے تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن وہ آگ وہیں رہ جاتی ہے جہاں تھی بھڑکتی نہیں۔ گھٹ کر بجھ جاتی ہے اور نظر کرنے سے موت تک نوبت آ جاتی ہے کیونکہ ہر نگاہ کے بعد نکاح تو ضروری نہیں جو اصل غایت ہے نگاہ کی اور جب غایت حاصل نہیں تو پھر تقاضا پیدا ہوتا ہے تکرار نگاہ کا اور پھر بھی مقصود حاصل نہیں ہوتا تو پھر تقاضا ہوتا ہے۔ غرض یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا تو نگاہ کر لینے کا نقصان تو ختم نہیں ہوتا اور نگاہ کو روک لینے کی تکلیف ذرا دیر میں ختم ہو لیتی ہے۔

عبرتناک واقعہ

ایک حکایت لکھی ہے ابن القیمؒ نے کہ ایک عاشق جو محبوب کے ملنے سے مایوس ہو چکا تھا' مرنے لگا' کسی نے محبوب سے جا کر کہا کہ وہ مر رہا ہے رحم کرو' اگر اس وقت پہنچ جاؤ گے تو اس کی جان بچ جاوے گی۔ کچھ اس کی سمجھ میں آ گئی اور اٹھ کر اس کی طرف چل پڑا۔ کسی نے عاشق کو خبر

---

[1] (مجمع الزوائد ۸: ۶۳' الترغیب والترهيب للمنذری ۳: ۳۴)

دی کہ تیرا محبوب آ رہا ہے یہ سن کر اس میں جان آ گئی اور اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کی وہ حالت ہو گئی جس کو کسی نے کہا ہے:

ازسر بالیں من برخیز اے ناداں طبیب — دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم — کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

(اے نادان طبیب میرے سرہانے سے اٹھ جا' دردمندان عشق کا علاج سوائے دیدار کے اور کچھ نہیں' اگرچہ میں دور پڑا ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ کبھی میرا ہاتھ دوبارہ میرا محبوب پکڑے گا)

مگر آتے آتے محبوب کو کچھ غیرت آئی اور یہ کہہ کر لوٹ گیا کہ کون بدنام ہو کسی نے یہ بھی جا کہا' یہ خبر سنتے ہی پھر وہ عاشق گر گیا اور نزع میں مبتلا ہو گیا' اس سے کہا گیا کہ کلمہ پڑھ تو وہ بجائے کلمہ کے کفر کا کلمہ کہتا ہے:

رضاک اشھی الی فوادی — من رحمتہ الخالق الجلیل

اور اسی حالت میں جان نکل گئی۔ دیکھئے کس قدر عبرتناک واقعہ ہے اس کی اگر اصل تلاش کریں گے تو کہیں پہنچ کر نگاہ ہی پر ختم ہو گی۔ جان بھی گئی اور ایمان بھی گیا اور یہ سب خرابی نگاہ کی ہوئی۔ اب دیکھ لیجئے! کہ نگاہ کرنے میں زیادہ تکلیف ہوئی یا نگاہ کے روکنے میں ہوتی' نگاہ کے روکنے میں کہیں نہ سنا ہوگا کہ کوئی تکلیف سے مر گیا ہو' تکلیف اس میں ضرور ہے مگر وہ تکلیف آسان ہے۔

نظر کی پاکیزگی

یہی نکتہ ہے کہ جس آیت میں غض بصر اور حفاظت فرج دونوں کا حکم ہے اس میں حق تعالیٰ نے امر غض بصر کو مقدم کیا ہے۔ ارشاد ہے: "قُل لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ" یعنی کہہ دیجئے مومنین سے کہ اپنی نگاہیں نیچی کریں یعنی نظر سے بچیں اس حکم کو مقدم کیا۔ دوسرے حکم پر یعنی وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ پر یعنی اصل فعل سے بچنے پر اس کی وجہ یہی ہے کہ غض بصر ذریعہ ہے حفاظت شرمگاہ کا اور ذریعہ آسان ہوتا ہے اسی واسطے اس کو اختیار کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل فعل یعنی زنا سے بچنا اتنا آسان نہیں جتنا نظر کو بچا لینا آسان ہے۔ ثابت ہوا کہ غض بصر کوئی زیادہ مشکل کام نہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت مقدسہ نے آسانی کے واسطے تدبیر بتلائی ہے اور اسی واسطے پردہ کا حکم رکھا ہے' لوگ کہتے تو ہیں کہ پردہ کی کیا ضرورت ہے۔ اصل گناہ یعنی زنا کیا نہ جاوے پردہ ہو یا نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ ذرائع کو اختیار کرنے کے بعد بھی اگر مقصود

میں کامیابی ہو جاوے تو بہت ہے۔ چہ جائیکہ ذرائع کو اختیار ہی نہ کیا جاوے اور کامیابی کی امید رکھی جاوے۔ میں کہتا ہوں کہ پردہ کے بعد بھی زبان سے بچ جاؤ تو بڑی بات ہے کیونکہ شیطان کے شر سے کہیں بے پردگی ہو جاتی ہے اور پردہ کو توڑ کر امید رکھنا کہ زنا سے حفاظت رہے گی، محض حماقت ہے ان لوگوں نے شرعی انتظام کو بالکل لغو سمجھا ہے۔

پردہ کی ضرورت

ذرا بتائیں! کہ یہاں لیغضوا کو یحفظوا پر مقدم کرنے میں کیا حکمت ہے؟ سوائے اس کے کہ حفاظت فرج کے لیے وہ ذریعہ ہے، شریعت کو اتنا اہتمام حفاظت کا منظور ہے کہ اس کے لیے ذرائع کے اختیار کرنے کا حکم دیا۔ نیز شریعت کے نزدیک حفاظت فرج اس قدر مشکل ہے جس کے لیے ذریعہ کو ضروری بتلایا اور براہ راست کامیابی کو عادۃ ناممکن قرار دیا مگر یہ شخص جو پردہ کا مخالف ہے شریعت میں اصلاح دینا چاہتا ہے کہ وہ تو ایک کام کو اتنا مشکل سمجھتی ہے اور یہ اس کو آسان سمجھیں۔ صاحب! تجربہ کر کے دیکھ لیجئے! کہ جہاں پردہ نہیں وہاں زبانی دعویٰ جو کچھ بھی ہوں لیکن زنا سے حفاظت مطلق نہیں ہے۔ مخالفان پردہ کے گھروں میں جب واقعات رونما ہوں گے ان کی اس وقت آنکھیں کھلیں گی۔ بہت اچھا یہ پردہ کو توڑ کر دیکھیں، انشاء اللہ اب سے بیس برس کے بعد ان کو وہی کہنا پڑے گا جواب شریعت کہہ رہی ہے مگر جب یہ بے پردگی کے برے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اس وقت پھر اپنی غلطی کے اقرار کا وقت نہ رہے گا کیونکہ پھر روکنا کسی کے اختیار میں نہ ہوگا۔

بے پردگی کے مفاسد

اس پر ایک جگہ اعتراض کیا گیا ہے کہ پردہ میں بھی سب کچھ ہو جاتا ہے جن طبیعتوں میں خرابی ہوتی ہے وہ کسی صورت میں باز نہیں رہ سکتیں، کیا پردہ داروں میں زنا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا جب کبھی بھی کچھ ہوا تو بے پردگی ہی سے ہوا اور اکثر تو یہ ہے کہ جن لوگوں میں ایسے واقعات ہوئے ہیں ان کو پردہ دار کہنا ہی برائے نام ہے ورنہ ان کے یہاں نہ چچازاد بھائی سے پردہ ہے نہ ماموں زاد بھائی سے، نہ خالہ زاد سے، نہ بہنوئی سے، نہ دیور سے، نہ جیٹھ سے۔ جب ہی تو مفاسد مرتب ہوئے ہیں۔ اس حالت میں ان کو پردہ دار کہنا ایسا ہے جیسے کوئی معزز آدمی جوا کھیل کر یا شراب پی کر جیل خانہ میں پہنچ جائے تو کوئی کہے لو صاحب جیل خانہ میں معززین بھی جانے لگے۔ یہ غلط ہے بلکہ وہ معززین جیل خانہ میں جب ہی پہنچے جب کہ عزت کو چھوڑ دیا۔ اس وقت ان کو معزز کہنا تو ان کا صرف خاندانی

انتساب سے ہے ورنہ عزت تو رخصت ہو چکی کیونکہ عزت تو عزت کے افعال کا نام ہے جب جوا کھیلا یا شراب پی تو افعال بگڑ چکے پھر عزت کہاں؟ ایسے ہی پردہ واروں میں جو زنا ہو جاتا ہے ان کو پردہ دار کہنا باعتبار ماکان کے ہوگا یا باعتبار رسم کے ہوگا ورنہ پردہ ٹوٹنے کے بعد ہی تو اس فعل کی نوبت آئی۔ غرض غلطی ہے ان لوگوں کی جو پردہ کے خلاف ہیں اور یہ خیال خام ہے کہ زنا سے حفاظت ہو سکتی ہے بلا سد ذرائع کے۔ جب شریعت اس کو ایسا مشکل سمجھتی ہے کہ اس کے لیے ذرائع اور تدابیر کی ضرورت سمجھتی ہے تو وہ واقع میں مشکل ہی ہے شریعت کی نظر ہم سے کہیں غامض ہے؟ اس کے سامنے ہماری تحقیق کیا چیز ہے؟ اور پھر وہ کچھ تحقیق بھی تو ہو صرف تقلید اور خود رائی کا نام تو تحقیق نہیں ہو سکتا۔

ضبط نفس

خوب سمجھ لیجئے! کہ عفت نہایت قابل اہتمام چیز ہے اور اس کے لیے ان ذرائع کی ضرورت ہے جو شریعت نے تجویز کیے ہیں اور وہ ذرائع اختیار میں ہیں مثلاً نگاہ کا بچانا کہ یہ قابو سے باہر نہیں ہے گو اس میں کچھ تکلیف ہو مگر وہ تکلیف نگاہ کو آلودہ کرنے کی تکلیف سے کم ہے۔ غرض نفس کو نگاہ کے روکنے سے تکلیف تو ہوتی ہے مگر یہ روک لینا اختیار میں ہے اگر اپنے اختیار سے کام لیا جاوے اور اس تھوڑی سی تکلیف کو گوارا کر لیا جاوے تو شیطان اخیر تک نہیں پہنچ سکتا۔ شیطان کو ہر معصیت میں اختیار صرف بلانے اور ترغیب دینے ہی کا ہے۔ بڑی چیز وہ تقاضا ہے جو خود آپ کے اندر موجود ہے یعنی تقاضائے نفس تو شیطان سے بڑا نفس ہوا۔ شیطان کو جس قدر بدنام کر رکھا ہے اس کا مستحق وہ بیچارہ ہے نہیں نفس کو روکئے! یہاں تک کہ دو مقدمے ہوئے ایک یہ کہ معصیت کا اصل سبب تقاضائے نفس ہے اور شیطان صرف محرک ہے وہ کوئی فعل جبراً ہم سے نہیں کرا سکتا کہ ہم ارادہ بھی نہ کریں اور کام ہو جاوے اور دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ تقاضائے نفس کے بعد ہمارا ارادہ سبب معصیت ہے اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ علاج بالضد ہوتا ہے تو جبکہ معصیت تقاضائے نفس سے ہوتی ہے تو کوئی تدبیر معصیت سے بچنے کی سوائے اس کے نہیں کہ تقاضائے نفس کو ضبط کیا جاوے اور یہ مشکل ہے۔

علاج معصیت

اس کے لیے سہل تدبیر یہ ہے کہ دیکھا جاوے کہ تقاضائے نفس کیوں ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ معاصی میں نفس کو لذت آتی ہے وہ لذت گناہ کرنے والے کے پیش نظر ہوتی ہے اور واقع میں اس گناہ پر

ایک عقوبت بھی مرتب ہونے والی ہے وہ پیش نظر نہیں ہوتی اور وہ خدا کی ناراضی ہے اور عذاب جہنم۔ اس کو دوسرے لفظ سے اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ گناہ کرنے والے کو ارادہ گناہ کے وقت صرف ایک مخلوق پیش نظر ہوتی ہے یعنی لذت اور خدا پیش نظر نہیں ہوتا۔ اگر خدا ابھی پیش نظر ہو جائے تو تقاضائے گناہ کبھی نہ ہو کیونکہ جب کوئی مانع پیش نظر ہوتا ہے تو بیجا کام کا ارادہ بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً باپ کے سامنے بیٹے کا حقہ پینا معیوب سمجھا جاتا ہے تو جب تک باپ سامنے ہو اور بیٹے کو اس کا علم بھی ہو تو وہ حقہ نہیں پی سکتا اور اگر سامنے نہ ہو یا اس کے سامنے ہونے کا علم نہ ہو تو بے تکلف پئے گا تو تقاضائے نفس کا سبب یہ نکلا کہ لذت پیش نظر ہے اور خدا پیش نظر نہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک کیفیت کے استحضار اور غلبہ سے دوسری کیفیت مغلوب اور بے اثر ہو گئی ہے۔ دیکھا ہوگا کہ ایک شخص کھانا کھانے بیٹھے اور اس کو بھوک بھی ہو لیکن اسی حالت میں اس کا کوئی گہرا دوست آ کر آواز دے تو وہ بے اختیار کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوگا۔ دیکھئے! بھوک موجود ہے لیکن مغلوب ہو گئی، دوست کی محبت سے یعنی ایک کیفیت مغلوب ہو گئی دوسری کیفیت سے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس وقت آدمی معصیت کرتا ہے اس وقت وہ چیز جو داعی ہے معصیت کی طرف وہ تو موجود ہے یعنی استحضار لذت اور وہ چیز جو مانع ہے معصیت سے وہ نظر سے غائب ہے۔ یعنی خوف عقوبت یا خوف خدا۔ حاصل یہ ہوا کہ غفلت عن اللہ سبب ہے تقاضائے معصیت کا اور جبکہ علاج بالضد ہوتا ہے تو علاج اس کا استحضار ہوا اس مانع کا اور یہی حاصل ہے تذکر کا جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔ یہ علاج ایسا ہے جس کا ثبوت صرف شرعی نہیں بلکہ از روئے سائنس بھی ہے۔ دیکھئے! یہ سائنس ہی کا تو مسئلہ ہے کہ علاج بالضد ہوتا ہے اور یہ کہ ایک کیفیت کے غلبہ سے دوسری کیفیت مغلوب ہو جاتی ہے ان دونوں کے ملانے سے یہ علاج معصیت کا نکل آیا کہ عقوبت کے خیال کو یا خوف خدا پیش نظر رکھا جاوے اور اس کو لذت پر غالب رکھا جاوے اس طرح صرف تذکر ہی آئندہ کے معاصی سے بچنے کی بھی تدبیر ہے یہاں سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شرعی تعلیمات سائنس کے موافق ہیں قرآن میں سب سائنس بھرا ہوا ہے مگر کونسا سائنس، وہ سائنس جس کی نسبت کہا ہے:

چند خوانی حکمت یونانیاں　　حکمت ایمانیاں را ہم بخواں

(یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھو، ایمانی حکمت کی کتابیں بھی پڑھو)

اصلاح نفس

اور حکمت ایمانیاں وہ چیز ہے جس سے آدمی کے حس کی کجی نکل جاتی ہے اور حقیقت شناسی پیدا ہو جاتی ہے یہ بات حکمت یونانی سے نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ صرف قیل وقال ہے اور ان کا دعویٰ

حقیقت شناسی کا صرف زبانی ہے:

صحت ایں حس بجوئید از طبیب　　　　صحت آں حس بجوئید از حبیب

(مرض جسمانی کی صحت کسی طبیب سے پوچھو مرض روحانی کی صحت کسی شیخ کامل سے پوچھو)

حبیب سے مراد شیخ مرشد ہادی ہے کہ حقیقت شناسی اسی کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے معنی یہ نہیں کہ اس سے بیعت بھی ضرور ہو خواہ بیعت ہو یا نہ ہو اس کی صحبت سے فیض حاصل کرے اور یہ رسمی بیعت جو صرف برکت کے لیے ہو اور اصلاح کے لیے نہ ہو اس کو تو کم کر دینا چاہیے۔ حقیقت شناسی حاصل کرنے اور اصلاح نفس کی تدبیر صرف یہی ہے کہ ہادی کا دامن پکڑ لیا جاوے اور دامن پکڑنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا اتباع پورا پورا کیا جاوے۔ جدھر کو وہ چلاوے ادھر کو چلے۔ لیکن آج کل اس طریق کی وہ مٹی خراب کی گئی ہے کہ پیر اور مرید دونوں کو مقصود سے بھی بحث نہیں رہی۔ مرید تو صرف اس خیال سے بیعت ہوتے ہیں کہ مرید ہو کر ذمہ داری بخشش کی جاوے گی۔ بس اب پیر ذمہ دار ہیں کہ بخشوا ہی کر چھوڑیں گے۔ خواہ یہ کچھ کریں یا نہ کریں خواہ برے سے برے کام میں مبتلا رہیں۔ پیر صاحب خدا کے رشتہ دار ہیں اور ان کی وہاں ایسی چلتی ہے کہ جو یہ کہیں گے وہی ہوگا اور پیر صاحب کا مقصود بیعت کرنے سے نذرانہ کی تحصیل ہے۔ پس یہ دونوں کے اغراض ہیں اور وہ حاصل ہیں جتنی تعداد بڑھے اتنا ہی اچھا ہے۔ بعض پیروں کے یہاں تو رجسٹر رہتے ہیں اور مریدوں کی گنتی ہوتی ہے جو سچا پیر ہے اور خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہے وہ تو تعلقات سے گھبراتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو بکھیڑوں کو کم کرتا ہے۔ رجسٹر اور شمار بکھیڑے ہیں اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ مریدوں کے نام لکھے جاویں اور ان کی جانچ پڑتال کی جاوے یہ کام تو سلطنتوں کے ہیں کہ مردم شماری ہو اور نگرانی ہو۔ کوئی اگر اپنی اصلاح کے لیے مرید ہوگا تو اس تعلق کا محفوظ رکھنا خود اس کے ذمہ ہے۔ پیر نے مرید کا کام اپنے ذمہ کیوں لیا یہ رجسٹر اور شمار تو وہیں ہوگی جہاں کھانے پینے کا دھندا ہو ورنہ ضرورت ہی کیا ہے بلکہ خود پیری مریدی اور رسمی بیعت ہی کی کیا ضرورت ہے اللہ کا راستہ بتانا ہے جو کوئی پوچھے اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ مریدی کا نام نہ لگے گا تو کیا کسر رہ جاوے گی۔

حقیقت شناسی

پس شیخ وہ ہے جو خدا کا رستہ بتادے برکت کے لیے اس سے بیعت بھی ہو جاوے تو مضائقہ نہیں۔ سو حقیقت پیری کی خدا کا رستہ بتانا ہے اور حقیقت مریدی کی اس کے بتائے ہوئے رستہ پر چلنا ہے۔ اگر یہ حاصل ہے تو اس کے ساتھ صورت بیعت کا ہونا بھی مضائقہ نہیں اور اگر

صوری بیعت نہ بھی ہو تو کچھ حرج بھی نہیں جو خدا کا رستہ بتائے چاہے آدمی اس سے بیعت نہ بھی ہو تو وہ اس کا شیخ ہے اور اگر حقیقت بیعت کی موجود نہیں کہ پیر صاحب خدا کا راستہ جانتے ہی نہیں صرف کماؤ پیر ہیں یا مرید صاحب صرف بوجھ اتارنے اور پیر صاحب کو ذمہ دار بنانے کے لیے مرید ہوئے ہیں تو ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ بیعت ہوا کیجئے بیکار ہے۔ غرض حقیقت شناسی حاصل کرنے کا طریق یہ ہے اس سے وہ فلسفہ حاصل ہوتا ہے جو واقعی فلسفہ ہے جس کو فلسفہ ایمانی یا حکمت ایمانی کہا گیا ہے اس کو حاصل کیجئے! پھر دیکھئے کہ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ قرآن میں سب سائنس بھرا ہوا ہے اور اس وقت نظر آوے گا کہ کلام اللہ میں کیا کیا خوبیاں ہیں اور امراض کا علاج کیسا اصول کے موافق کیا گیا ہے۔

انسداد سبب

دیکھئے! تعلیم شرعی کتنی صحیح اور قاعدہ کے موافق ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ معصیت سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ سبب کا انسداد کرو۔ سبب معصیت کا غفلت ہے اس چیز سے جو مانع ہوتی ہے معصیت سے اس غفلت کو چھوڑیئے! اور اس مانع کا استحضار کیجئے! یہی بتایا ہے حق تعالیٰ نے اس آیت میں "اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّیْطَانِ تَذَكَّرُوْا" یعنی اہل تقویٰ کی حالت یہ ہے کہ جب ان پر شیطان کا اثر ہو جاتا ہے (میں بتا چکا ہوں کہ وہ اثر غفلت ہے بقرینہ تذکروا تو وہ تذکر اختیار کرتے ہیں تو علاج غفلت کا تذکر ٹھہرا۔ تذکروا کا مفعول یہاں مذکور نہیں میں اس کی حکمت تو شروع میں بیان کر چکا ہوں اب میں اس کی تعیین بتاؤں گا کہ وہ مفعول کیا محذوف ہے۔ پہلے آیت کا خلاصہ سمجھ لیجئے! وہ یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ بندگان خدا کی شان یہ ہے کہ جب ان پر شیطان کا اثر ہوتا ہے یعنی غفلت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ تذکر سے اس کا علاج کرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ "فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ" پس ناگہاں ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس میں گناہ کی مذمومیت اور اثر کا بھی بیان ہو گیا۔ اس طرح کہ جب علاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھیں کھل گئیں۔ معلوم ہوا کہ گناہ سے آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور معصیت کے تقاضے کے وقت اندھے ہو گئے تھے۔ واقعی گناہ میں یہی اثر ہے کہ آدمی تقاضے کے وقت اندھا ہو جاتا ہے قتل تک کر گزرتا ہے حالانکہ معلوم ہے کہ پھانسی ہوگی مگر اس وقت اس سے ذہول ہو جاتا ہے۔ نیز "فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ" سے یہ بھی معنی پیدا ہوتے ہیں کہ وہ چیز فی نفسہ مخفی نہ تھی بلکہ یہ اثر جو ہو گیا تھا یہ اس کی آنکھ کا قصور ہے کہ اس میں شعاع نہ رہی تھی جو اس پر پڑتی اور دیکھ لیتی تذکر سے شعاعیں پیدا ہو گئیں اور وہ آنکھوں والے ہو گئے اور وہ چیز تو اس جگہ موجود تھی ہی اب نظر آنے لگی اور امتناع عن المعصیت اس پر مرتب ہو گیا۔

تفسیر ذکر

اور وہ چیز جو مفعول ہے تذکر کا جس کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے اب اس کی تعیین بتلاتا ہوں اس کا دوسری آیت سے پتہ چلتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ○

اس میں بھی متقین کی شان کا بیان ہے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ گناہوں سے استغفار کرتے ہیں اور گناہوں کا بخشنے والا سوائے اللہ کے کون ہے اور وہ اپنے اس فعل پر (جان بوجھ کر) اصرار نہیں کرتے ہیں۔ دیکھئے! اس میں صاف مذکور ہے کہ وہ یاد کرنے کی چیز کیا ہے وہ بس ایک چیز ہے اللہ مفسرین نے ذکروا اللہ کی تفسیر کی ہے۔ ذکروا عذاب اللہ کیونکہ عذاب ہی کا خوف سبب ہوتا ہے۔ استغفار اور کف عن المعصیت کا۔ میں کہتا ہوں لفظ عذاب محذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں اس میں کیا اشکال ہے کہ اللہ کو یاد کرتے ہیں یا خدا کافی ہے معصیت سے روکنے کو بلکہ عذاب کا خوف اتنا مانع نہیں ہو سکتا جتنا کہ خدا کی یاد مانع ہوتی ہے۔ اہل بصیرت اس کو خوف سمجھتے ہیں یہ تو جب ہے کہ ذات کی طرف توجہ مراد لی جاوے اور خدا کی یاد کی ایک توجیہ اور بھی ہو سکتی ہے جس میں اس یاد کی کسی نوع کی تخصیص ہی نہ رہے وہ توجیہ یہ ہے کہ دیکھئے! خدا کی یاد کس کو کہتے ہیں؟ کیا صرف اللہ اللہ زبان سے کہنے کو کہتے ہیں نہیں بلکہ خدا کی ہر بات کی یاد کو خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں توجہ الی الذات کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں۔ لفظ اللہ اللہ زبان سے کہنے کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں اور عذاب اور دوزخ کی یاد کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں کیونکہ خدا نے اس کو یاد دلایا ہے اور ثواب اور نعمائے آخرت اور جنت کی یاد کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں۔ (اسی لیے صاحب حصن حصین نے کہا ہے کہ کل مطیع اللہ فہو ذاکر ۱۲ ظ) تو آیت کے یہ معنی ہوئے کہ جب ان پر شیطان کا اثر ہو جاتا ہے تو وہ خدا کی یاد کرتے ہیں یعنی خدا کی کسی چیز کو یاد کر لیتے ہیں خواہ ذات کو یاد کرتے ہیں خواہ ذکر اللہ زبان سے کرنے لگتے ہیں یا عذاب کو یاد کرتے ہیں یا ثواب اور جنت کو یاد کرتے ہیں۔ یہ اپنا اپنا مذاق ہے۔ بعضوں کو تقاضائے معصیت مغلوب کرنے کے لیے صرف ذکر اللہ ہی بالمعنی المتبادر کافی ہوتا ہے اور بعضوں کو عذاب کے استحضار کی ضرورت پڑتی ہے اور بعضوں کو جنت کا یاد کرنا مفید ہوتا ہے بلکہ میں یہاں تک تعمیم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو یاد کرنا یہ بھی اللہ ہی کی یاد ہے کیونکہ جس طرح جنت دوزخ اللہ ہی کی چیزیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی

مذکر ہیں اسی طرح مقبولین وصلحاء اللہ کی چیزیں ہیں اور اس کی مذکر ہیں۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ صلحاء کے اقوال افعال اخلاق کے ذکر سے طاعت کی رغبت اور معصیت سے نفرت ہوتی ہے اور اس تعمیم سے ایک بڑا مسئلہ حل ہوا وہ یہ کہ ایک ذاکر نے مجھ سے پوچھا کہ ذکر لا الہ الا اللہ میں تعلیم کی جاتی ہے کہ لا الہ کے ساتھ سب غیر اللہ کی نفی کی جاوے تو غیر اللہ میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی آ گئے تو مطلب یہ ہوا کہ ذاکر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی قطع تعلق کرنا چاہیے وہ حل یہ ہے کہ غیر اللہ سے مراد وہ ہے جو حق تعالیٰ سے حاجب ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہادی اور موصل ہونے کا ہے اس لیے آپ اس نفی میں داخل نہیں اور اس خاص تعلق کے سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر غیر اللہ کا ذکر نہیں بلکہ اللہ ہی کا ذکر ہے اور حضور کی شان تو بڑی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب یعنی شیخ کا ذکر بھی ذکر اللہ ہی ہے اس کے ساتھ تعلق پیدا کرنا اور اس کے حالات کو پڑھنا سننا کسی کے سامنے ذکر کرنا سب ذکر اللہ ہی ہے اس میں غلو تو کرتے نہیں کیونکہ جہالت کا زمانہ ہے نیز اس میں لوگوں نے بہت زیادتیاں بھی کر رکھی ہیں اس لیے اس میں اعتدال سے نہ بڑھے بلکہ لوگوں کے سامنے پیر کا ایسے عنوان سے ذکر بھی نہ کرے جس سے متوہم ہو کہ لوگوں کو کھینچ کھینچ کر پیر کی طرف لاتا ہے اور یہ قصداً کھینچ کھینچ کر لانا تو بے غیرتی کی بات ہے اس کے ایہام سے بھی بچنا چاہیے۔ نیز بعضے لوگ ہر وقت کی چھیڑ چھاڑ سے یہ بھی سمجھیں گے کہ پیر صاحب نے گرگے چھوڑ رکھے ہیں یہ تو ایک گونہ اس کے احتیاج الی الخلق کی صورت ہے حالانکہ وہ کسی مخلوق کا محتاج نہیں وہ تو مظہر ہے صفات حق تعالیٰ کا اور ایک صفت حق تعالیٰ کی غنی بھی ہے اس کے یہاں تو اس غنا کے سبب یہ اعلان ہے؟

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو دار و گیرو حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

خیر یہ مشورہ تحرز عن الایہام کا تو جملہ معترضہ تھا' مضمون یہ تھا کہ جب شیخ کا ذکر اور اطاعت بھی بالکل خدا کا ذکر اور اطاعت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت اعلیٰ اور ارفع ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر غیر اللہ کا ذکر کیسے ہوگا؟ تو یہ مسئلہ حل ہوگیا کہ لا الہ الا اللہ میں ماسوائے اللہ کی نفی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نفی لازم نہیں آتی۔ غرض خدا تعالیٰ کے تعلق کی چیزوں کا ذکر ذکر اللہ ہی ہے۔ (اسی حدیث میں ہے الدنیا معلونة و ملعون مافیها الا ذکر اللّٰه وما والاہ' جملہ والاہ میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو کہ ذکر اللہ میں معین ہیں پس وہ بھی ذکر اللہ کے حکم میں ہیں ۱۲ ظ) تو ذکر وا اللہ میں جنت اور دوزخ اور ذکر لسانی وغیرہ یہ سب آ گئے تو کوئی ضرورت لفظ عذاب کے تخصیص کی نہ رہی کیونکہ اس میں مانع کی تخصیص ہوئی جاتی ہے کہ صرف ترہیب ہی مانع عن المعصیۃ ہوتی ہے حالانکہ یہ واقع کے خلاف ہے۔

اختلاف احوال

بعضوں کو ترغیب زیادہ نافع ہوتی ہے اس لیے ذکر اللہ کو عام ہی رکھا جاوے جس میں سب داخل رہیں۔ ترغیب بھی اور ترہیب بھی اور خود یاد خدا بھی۔ چنانچہ بعضوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ان کو نہ ترغیب کام دے نہ ترہیب جس پر غلبہ ہوتا ہے فناء کا اور توحید کا وہ جو معصیت سے رکتا ہے اس کو نہ جنت روکتی ہے نہ دوزخ اس کو صرف یاد خدا روکتی ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ بے حیائی کا کام باپ کے سامنے بیٹے سے نہیں ہوسکتا۔ گو اس کو یہ بھی ڈر نہ ہو کہ یہ مجھے مارے پیٹے گا۔ یہاں خوف نے نہیں روکا بلکہ باپ کی عظمت نے روکا اسی طرح بعضوں کا علاقہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ خیال کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ دیکھ رہے ہیں تو شرما جاتے ہیں اور اس وقت ان سے معصیت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں صرف ذکر اللہ مانع ہوا اور بعضے ایسے حیادار نہیں ہوتے بلکہ محتاج ہوتے ہیں۔ ترہیب کے ان کے لیے یہی کارآمد ہے کہ تقاضائے نفس کے وقت عذاب الٰہی کو یاد کریں اور بعضے ترہیب سے متوحش ہوتے ہیں ان سے اگر ترغیب سے کام لیا جاوے تو رجوع ہوتے ہیں تو ان کو جنت کا ذکر چاہیے۔ بعضوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ احسان کا اثر ان پر بہت زیادہ ہوتا ہے اگر وہ حق تعالیٰ کی نعمتیں یاد کریں تو شرماتے ہیں احسان سے دبے جاتے ہیں ان کے واسطے حق تعالیٰ کی نعمتوں کا یاد کرنا ہی گناہ سے رکنے کے لیے طریق نافع ہے کیونکہ وہ نعمتوں کو گناہ میں استعمال کرنے سے شرماتے ہیں اور یہ واقعی شرمانے کی بات ہے جیسے کوئی گورنمنٹ کا باغی ہو اور گورنمنٹ ہی کے دیئے ہوئے ہتھیاروں سے مقابلہ کرے تو یہ اور زیادہ برائی کی بات ہے۔ ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی آنکھ سے اس کے حکم کے خلاف کیسے کام لیں اور خدا کے دیئے ہوئے ہاتھ سے گناہ کیسے کریں' خدا کی بنائی ہوئی آنکھیں پھوڑ دیں اور خدا کے دیئے ہوئے ہاتھ توڑ دیں اور کہیں اور سے دوسری آنکھیں اور ہاتھ لے آئیں تب ان سے گناہ کریں آنکھ وغیرہ۔ دوسرے کے دیئے پر ایک قصہ یاد آیا' میرے چھوٹے ماموں صاحب تھے جو کہ نہایت سمجھدار اور ذی علم شخص اور بہت ہی قابل تھے چونکہ پہلے لوگوں میں قناعت کا مادہ بہت تھا۔ انہوں نے سرکاری مدرسہ میں ایک معمولی مدرسی کر رکھی تھی۔ وہاں ایک انسپکٹر نہایت متعصب اور ملحد آ گیا' اس نے بچوں کا امتحان لیا اور ایک بچہ سے پوچھا کہ خدا کے وجود کی کیا دلیل ہے' ایک مبتدی بچہ خدا کے وجود کی دلیل کیا بتا سکتا تھا؟ یہ مسئلہ تو معرکۃ الآراء ہے۔ ماموں صاحب کو اس کی یہ حرکت نہایت ناگوار ہوئی' کہا کہ ان بچوں سے آپ ایسا سوال کرتے ہیں جوان کو پڑھایا نہیں گیا یہ مناسب نہیں' اگر پوچھنا ہے مجھ سے پوچھئے۔ کہا آپ ہی بتلایئے! آپ بڑے علامہ ہیں۔ کہا خدا

کے وجود کی دلیل یہ ہے کہ آپ موجود نہ تھے آپ کو پیدا کردیا۔ اس نے کہا کہ ہم کو تو ہمارے ماں باپ نے پیدا کیا ہے۔ ماموں صاحب نے کہا کہ ان کو کس نے پیدا کیا، کہا ان کے ماں باپ نے ماموں صاحب نے کہا یہ سلسلہ کہیں ختم ہوگا یا نہیں، اگر ختم ہوگا تو تسلسل لازم آتا ہے جو محال ہے اور اگر ختم ہو جاوے گا تو جس پر ختم ہوا اسی کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ ہم ان منطقی باتوں کو نہیں سمجھتے، ہم تو ایک موٹی بات جانتے ہیں کہ ہماری ایک آنکھ نہیں ہے (وہ خیر سے کانا بھی تھا) اگر خدا کا وجود ہے تو تم اپنے خدا سے کہہ کر ہماری آنکھ کو بنوا دو، ماموں صاحب کے مزاج میں ذہانت کے ساتھ ظرافت بھی بے انتہا تھی، آسمان کی طرف منہ اٹھا کر تھوڑی دیر تک ہونٹوں کو ہلاتے رہے جیسے کسی سے کوئی کچھ کہہ رہا ہو پھر کان لگا کر سننے لگے، جیسے کوئی جواب دے رہا ہو اور یہ اس کو سن رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے کہ ہاں صاحب خدا سے کہا تھا، یہ جواب ملا ہے کہ ہم نے اس کی دونوں آنکھیں پیدا کی تھیں، لیکن اس نے قدر نہ کی اور ہمارا شکر ہوا اس گستاخی پر ہمیں غصہ آیا اور ہم نے اس کی آنکھ پھوڑ دی۔ اب اس سے کہو کہ جن ماں باپ نے اس کے زعم میں اس کے سارے وجود کو پیدا کیا ہے انہیں سے کہہ کر اپنے ایک جز و یعنی آنکھ کو بنوا لے۔

واقعی نہایت ہی محققانہ جواب دیا مگر ظرافت کے پیرایہ میں اس پر وہ کمبخت لاجواب اور ساکت ہو گیا لیکن غصہ اس طرح نکالا کہ معائنہ کو بہت خراب لکھا۔ اس کی اطلاع بڑے ماموں صاحب کو ہوئی، وہ بڑے اہل دل تھے۔ انہیں حق تعالیٰ کی شان میں اس کی یہ گستاخی نہایت ناگوار ہوئی اور ادھر اپنے بھائی کے نقصان کا بھی صدمہ ہوا، حق تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ اس نے آپ کی شان میں سخت گستاخی کی ہے اور میرے بھائی پر بے جا ظلم کیا ہے اس کی آپ اس کو سزا دیں۔ چنانچہ ایک ہفتہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ دفعتاً اسے ایک سخت درد اٹھا اور دفعتاً مر گیا۔ یہ قصہ نئی آنکھ بنوانے پر یاد آ گیا تھا اور واقعی نئی آنکھ کہاں سے بنے گی اول تو بن ہی نہیں سکتی لیکن سائنس آج کل بہت ترقی کر رہا ہے شاید کبھی کوئی ترکیب آنکھ بنانے کی بھی نکل آوے۔ مگر یہ یاد رہے کہ وہ ترکیب ایسی ہونی چاہیے جس کا سلسلہ خدا تک نہ پہنچے نہ اس میں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہوا سے کام لیا جاوے نہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے پانی سے نہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کسی دوا سے غرض خدا کا تعلق کسی طرح اس کے بنانے میں قریب یا بعید بواسطہ یا بلا واسطہ نہ ہو اور یہ ناممکن ہے۔ غرض جب آنکھ اور ہاتھ نیا بنے اس وقت گناہ کرو ورنہ سخت بے حیائی ہے اور ڈوب مرنے کی بات ہے کہ اس کی دی ہوئی چیزیں اور اسی کے خلاف ان کو استعمال کیا جائے۔ اسی معنی پر ایک مورخ نے ایک باغی جماعت کی شکایت کی ہے جس کا قصہ تاریخ یمینی میں مذکور ہے۔

سلوا سیوف محمد بمحمد　　　شجوابہاھا مات ال محمد

محمد نام ایک بادشاہ صاحب کا ہے جس سے بغاوت کی گئی تھی اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی کی تلوار اور اللہ تعالیٰ ہی کا مقابلہ۔ یہ کیسی نمک حرامی اور بے شرمی کی بات ہے۔

نیا وردم از خانہ چیزے نخست　　　تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(ہم اپنے گھر سے کچھ نہیں لاتے ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب آپ ہی کا عطیہ ہے)

یہ ایسی بات ہے کہ ذرا بھی اگر کسی میں حیا ہو تو آدمی سے گناہ نہیں ہو سکتا۔ غرض اس کو بھی یاد کر کے بعض لوگ شرما سکتے ہیں تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ذکر اللہ کو بمعنی "ذکروا عذاب اللہ" کے لیں۔ غرض جب کسی کو عذاب کے تذکرے سے نفع ہوتا ہے اور کسی کو ثواب کے اور کسی کو احسان کے تذکرے سے لہٰذا تذکر کو بلا قید ہی رکھنا چاہیے۔

تذکر کے معنی

اب ایک دوسری بات سمجھو آیت میں تذکروا فرمایا اور اس کی کچھ حد نہیں فرمائی، سو باب تفعل تدریج کو چاہتا ہے۔ پس تذکر کے معنی یہ ہوئے کہ بتدریج تذکر میں بڑھتے چلے جائیں اور حد نہ ہونے سے اس تدریج کا قطع نہ ہونا مفہوم ہوا۔ پس دو مسئلوں کی طرف اشارہ ہو گیا ایک تو یہ کہ اضطراب نہ کریں، سکون کے ساتھ چلتے رہیں، دوسرا یہ کہ سلوک کو کہیں ختم نہ کریں ہمیشہ چلتے ہی رہیں اس میں سالکین دو غلطیاں کرتے ہیں ایک اضطراب دوسری اس سے بڑھ کر انقطاع یعنی کسی مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں اور قناعت کر لیتے ہیں۔ مثلاً حضور قلب حاصل ہو گیا اور مجاہدہ کرنے سے یہ ملکہ پیدا ہو گیا کہ جب چاہیں خیال کو ایک طرف کر لیں تو بس حضور قلب کو چھوڑ بیٹھے اس اعتماد پر کہ ہم کو قدرت تو حاصل ہے ہی۔ کیوں صاحب وہ قدرت کس کام کے لیے حاصل ہوتی ہے قوت سے فعل میں لانے کے لیے یا فقط دل کو سمجھانے کے لیے یہ خوب بات ہے کہ بھوکے کے پاس کھانا آ جاوے تو وہ یہ سمجھ کر بیٹھ رہے کہ کھانا آ تو گیا ہے جب چاہیں گے کھا لیں گے اور اس کو کھائے نہیں تو اس شخص میں اور اس شخص میں کیا فرق ہے جس کے پاس کھانا نہیں آیا۔ یہ بھی بھوکوں مر رہا ہے اور وہ بھی بھوکوں مر رہا ہے جب یہ ملکہ حاصل ہو گیا تو اس سے کام کیوں نہیں لیتے۔ مقصود صرف ملکہ حاصل ہو جانا نہیں ہے۔ مقصود تو حضور قلب ہے یہ ملکہ کس روز کام آوے گا کیا مرنے کے بعد اس سے کام لو گے بلکہ اس صورت میں حجت اللہ اور زیادہ قائم ہے اور باز پرس ہو سکتی ہے کہ جب یہ قدرت حاصل تھی تو نماز میں قلب کو حاضر کیوں نہیں کیا۔ حضور قلب کا ملکہ

حاصل ہوجانا فقط دل کے سمجھانے کے لیے تو نہیں ہے بلکہ اس کا گاہ گاہ ہونا بھی قابل شمار نہیں وہ تو ایسا حضور ہوگا جیسے ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ ایک گاؤں میں وعظ کہا اور بے نمازیوں کی مذمت کی اور اس میں بہت تشدد کیا اس پر گاؤں والے بہت بگڑے اور واعظ صاحب کو مارنے پیٹنے کے لیے تیار ہو گئے اور ان سے باز پرس کی۔ آخر طالب علم تھے انہوں نے ایک تاویل کی جس سے ان کا جوش فرو ہو گیا کہا کہ کبھی عید بقرعید کی بھی نماز تم لوگوں نے پڑھی ہے' کہا ہاں' عید بقرعید کی تو ہمیشہ پڑھتے ہیں کہا پھر تم بے نمازی کہاں رہے' بے نمازی تو وہ ہے جس نے کبھی کوئی نماز نہ پڑھی ہو بس اس سے ان لوگوں کا من سمجھوتہ ہو گیا اور اپنے خیال میں نمازی بن گئے۔ ایسے ہی اہل سلوک بھی غلطی کرتے ہیں کہ کسی عمل کے احیانا ہوجانے کو یا اس کا ملکہ حاصل ہوجانے کو کافی سمجھ لیتے ہیں جب کسی سے کہا جاتا ہے کہ فلانے گناہ سے بچے رہو مثلاً غصہ میں بیہوش نہ ہو اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ خوف خدا کو پیش نظر رکھو اور عذاب الٰہی کو یاد کرو اور غصہ کے وقت سمجھو کہ میں بھی کسی کی مخالفت کرتا ہوں وہ بھی مجھ پر غصہ کرسکتا ہے تو دل میں خوش ہوتے ہیں کہ ہم کو تو ترکیب آتی ہے اور ہم کو اس سے بچنا مشکل نہیں اور اس ترکیب کے جاننے ہی پر قناعت کیے بیٹھے رہتے ہیں اور اس کو قوت سے فعل میں نہیں لاتے سو ایسے لوگ وقت پر ہمیشہ دھوکہ کھاتے ہیں۔ مثلاً جب کبھی غصہ کا موقع ہوگا تو ان کو یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ غصہ دبانے کی ترکیب کیا تھی۔ ترکیب آتی ہے تو کب کرو گے؟ بعد موت کے سوا! تذکر وا کے غیر محدود ہونے سے یہ معنی مفہوم ہوئے کہ ہمیشہ جب موقع ہو تو تذکر کیا کرو اور اس میں ترقی کرتے جاؤ۔ غرض ترکیب تقاضائے نفس کو مغلوب کرنے کی یہی ہے کہ جب گناہ کا خیال آوے تو خدا کو یاد کرو یا عذاب خدا کو یاد کرو یا ثواب کو یاد کرو یا حق تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو یا حقوق الٰہی کو یاد کرو اور ذرا دیر سوچو۔ بس سوچنا ہوگا اور تقاضا رفع ہوجاوے گا۔ یہ ایسے کام کی بات میں نے بتائی ہے کہ اس کی قدر سالک کو وقت پر معلوم ہوگی۔

تحقیق ناتمام

پھر اس تدبیر کو ہمیشہ مستحضر رکھنے کی اور اس سے بار بار کام لینے کی ضرورت ہے یہ نہیں کہ تھوڑی روز کی مشق کو کافی سمجھ گئے اور استحضار کا قصد چھوڑ دیا اکثر لوگ اس میں ... یہی غلطی کرتے ہیں اس طرح کہ کسی خلق مذموم سے بچنے کا مجاہدہ کیا اور سال بھر تک اس کی قصد سے حفاظت رہی بس ہم سمجھ بیٹھے کہ ہم کو ملکہ حاصل ہو گیا اور وہ خوش ہیں کہ اس خلق کی تکمیل ہوگئی اور اس سے بڑھ کر یہ غلطی کی جاتی ہے کہ سمجھ جاویں کہ ہم عارف کامل ہو گئے اور اب ہم کو کسی دوسرے کی طرف رجوع

کرنے کی ضرورت نہیں رہی حالانکہ یہ ابھی عارف نہیں ہوئے اور کسی عارف کامل کی طرف ان کو رجوع کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہر عمل میں بہت سے شعبے ہوتے ہیں ان کا علم بار بار موقع پر نگرانی کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک دو دفعہ کامیاب ہونے اور حفاظت رہنے سے عرفان حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح نرے ذکر و شغل سے بھی کمال حاصل نہیں ہوتا ذکر شغل کتابوں میں بہت لکھے ہیں تو چاہیے ان کو دیکھ کر ہر شخص عارف بن جاوے مگر ایسا نہیں ہوسکتا' محقق کی ضرورت ہے اور عامل کی جس نے خود بار بار موقعوں پر مجاہدے کرکے بصیرت حاصل کی ہو اسی کی تعلیم سے نفع ہوتا ہے اور اگر وہ خود محقق اور عامل نہیں تو اس کی تعلیم میں برکت نہیں ہوتی یہ شخص جس کو چند روز تک کامیابی ہوئی ہے اور کچھ عرصہ تک وہ غلطی سے محفوظ رہا ہے وہ ابھی محقق نہیں ہوا اسی وجہ سے یہ غلطی کرتا ہے کہ اپنے آپ کو عارف سمجھ لیتا ہے اور اس پر اس کے علاوہ ایک اور آفت آتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایک موقع پر تقاضا گناہ کا ہو یا کسی طاعت میں سستی ہوئی تو شیطان کہتا ہے کہ اتنے دنوں کے مجاہدہ سے کیا ہوا' جب موقع پڑا تو کامیابی نہیں ہوئی چونکہ یہ ابھی محقق ہوا نہیں اس لیے ناتجربہ کاری سے اور طریق کے نشیب و فراز نہ جاننے سے بددل ہوجاتا ہے اور کام چھوڑ بیٹھتا ہے اور شیخ کی شکایت قلب میں پیدا ہوتی ہے کہ شیخ نے میری تکمیل نہیں کی یا حق تعالیٰ کی شکایت پیدا ہوتی ہے کہ اتنا مجاہدہ کیا مگر کچھ بھی اعانت نہیں ہوئی یا اپنی طرف یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ میں مردود ہوں میں کسی قابل ہی نہیں ہوں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیخ سے بغض پیدا ہوجاتا کبھی جان سے تنگ ہوجاتا ہے اور بسا اوقات خودکشی کر بیٹھتا ہے۔ یہ ایک مرحلہ ہے جو بعض وقت سالکین کو پیش آتا ہے۔ بات آسان تھی مگر نہ جاننے سے یہ سب کچھ ہوا۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے محض عرفان ہی کو کافی سمجھ لیا حالانکہ دو چیزوں کی ضرورت ہے' علم حقائق اور عمل اور ان دونوں میں نسبت بنیاد اور تعمیر کی سی ہے۔ علم حقائق بنیاد ہے اور عمل تعمیر ہے نہ نری بنیاد بلا تعمیر کے کارآمد ہے کہ دھوپ سے سایہ دے یا بارش وغیرہ سے بچاوے اور نہ صرف تعمیر بلا بنیاد کے قائم رہ سکتی ہے بلکہ دونوں کو ملنے سے مکان بنتا ہے۔ یہ شخص بلا تحقیق اپنے آپ کو عارف اور کامل سمجھ بیٹھا حالانکہ ابھی تحقیق اس کی ناتمام ہے۔

نفس کی شائستگی

اس سے یہ اخیر کی غلطی اس وجہ سے ہوئی کہ اس نے یوں سمجھا کہ مجاہدہ سے مادہ گناہ کا جاتا رہا جبھی تو پھر تقاضا ہونے سے یہ خیال ہوا کہ مجاہدہ بیکار رہا کیونکہ ابھی تو مادہ موجود ہے اور شکایتیں

پیدا ہوئیں؛ خوب سمجھ لیجئے! کہ مجاہدہ سے مادہ نہیں جاتا بلکہ تقاضے کا غلبہ جاتا رہتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک گھوڑا تعلیم دیا ہوا ہے اور ایک بے تعلیم ہے۔ تعلیم دیا ہوا شائستہ بیشک ہوتا ہے مگر شائستہ کے معنی یہ نہیں کہ اس میں شرارت کا مادہ جاتا رہتا ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ اس کا رام کرنا بہ نسبت غیر تعلیم یافتہ کے سہل ہوتا ہے یوں وہ بھی کبھی شرارت کرتا ہے حتیٰ کہ کھڑا بھی ہو جاتا ہے اس کو دیکھ کر سوار کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔ آخر گھوڑا ہے وہی گھوڑا ہے جو پہلے تھا۔ ہاں! اتنا فرق ہو گیا ہے کہ اب آسانی سے قابو میں آ سکتا ہے اور پہلے ایسا نہ تھا ایسے ہی نفس ہے کہ مجاہدہ کرنے سے شائستہ ہو جاتا ہے یعنی اس کا قابو میں کرنا سہل ہو جاتا ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ اس میں سے مادہ ہی شرارت کا نکل جاوے؛ بس فرشتہ ہو جاوے کیونکہ انسان مجاہدہ کے بعد بھی انسان ہی رہتا ہے۔ مجاہدہ سے تبدل حقیقت نہیں ہوتا کہ انسان سے فرشتہ ہو جاوے جس میں مادہ شرارت بالکل نہ رہے بلکہ مجاہدہ سے اصلاح ہو جاتی ہے جیسے فصد سے خون فاسد کی اصلاح ہو جاتی ہے فصد کے یہ معنی تو نہیں کہ سارا خون نکل جاتا ہے بلکہ جوش خون دب جاتا ہے خوب سمجھ لو!

مجاہدہ کا فائدہ

اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ آدمی کیسا ہی مجاہدہ کر چکا لیکن نفس کو مردہ نہ سمجھے اور اس کے مکائد سے کبھی غافل نہ رہے۔

نفس اژدہا ہست او کے مردہ است ازغم بے آلتی افسردہ است

(نفس اژدھا ہے وہ نہیں مرا بے سروسامانی کے خوف سے وہ مردہ ہو رہا ہے)

اس سے غافل بھی نہ ہو اور مجاہدہ کو بیکار بھی نہ سمجھے اس سے شرارت کا مادہ نہیں جاتا رہا۔ ہاں ریاضت سے اس مادہ کو ابھار نہیں ہوتا اور اگر کبھی ابھرتا ہے تو ذرا سے اشارہ سے دب جاتا ہے۔ غرض یہ غلطی کی بات ہے کہ کسی وقت اس کی شرارت دیکھ کر مجاہدہ کو بیکار سمجھے۔ سالک کو چاہیے کہ مایوس نہ ہووے؛ پس سمجھ لے کہ اس مادہ کو حرکت ہوئی ہے اور اس کا علاج کرے تجربہ کر کے دیکھ لو کہ مجاہدہ کے بعد جب نفس میں نگاہ بد کا تقاضا پیدا ہو تو نگاہ کو روکو! انشاء اللہ تعالیٰ دیکھو گے کہ آج اس کے روکنے میں پہلے کی سی بے چینی نہ ہوگی جیسی پہلی ہوئی تھی اور آسانی سے قادر ہو جاؤ گے۔ یہ نتیجہ اسی مجاہدہ کا ہے تو مجاہدہ کو بیکار کیسے سمجھ لیا۔ یہاں سے اس کا بھی جواب ہو گیا کہ جب بعد مجاہدہ کے بھی کف عن المعصیۃ کا مدار اپنے روکنے ہی پر رہا تو مجاہدہ کا کیا فائدہ ہوا؟ وہ جواب یہی ہے کہ فائدہ کی تفسیر زوال مادہ نہیں ہے۔ کیا یہ فائدہ نہیں ہے کہ اس کے جوش کے روکنے میں سہولت ہوگئی یہی تو بڑا

فائدہ ہے بلکہ فائدہ اسی میں منحصر ہے کیونکہ اگر مادہ کا زوال ہوجاوے تو کف عن المعصیۃ اختیار قصہ سے نہ رہے گا پھر اس پر اجر وثواب بھی نہ ہوگا کیونکہ اجر وثواب فعل اختیاری پر ہوتا ہے اور جو خرابیاں کہ زوال مادہ پر مرتب ہوتی ہیں وہ الگ رہیں۔ وہ یہ کہ حرکت ہی تو ایسی چیز ہے جو باعث ہوتی ہے طاعات کی بھی جب حرکت نہ رہی تو آدمی جماد محض ہوگیا تو طاعات بھی کیسے ہوں گی۔ انسانی کمالات جبھی حاصل ہوسکتے ہیں کہ حرکت باقی ہو اور اس کے ساتھ بے موقع حرکت کو روکنے کی بھی قدرت ہو اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ریاضت بیکار چیز نہیں بلکہ ضروری چیز ہے مگر نتیجہ اس کا یہ نہیں کہ مادہ سلب ہی ہوجاوے ہاں مغلوب ہوجاتا ہے اور یہی فضیلت کی بات ہے کہ مادہ موجود ہو لیکن غالب نہ آنے پائے ورنہ دیوار کو زیادہ فضیلت ہوگی انسان پر۔

متقی کا گناہ

خود اس آیت سے بھی میری اس تقریر کا ثبوت ملتا ہے کہ مجاہدہ سے مادہ کا قطع نہیں ہوجاتا کیونکہ آیت میں صاف موجود ہے کہ تقویٰ کے بعد بھی مس شیطان ہوجاتا ہے۔ فرماتے ہیں: "اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّہُمۡ طٰٓئِفٌ" یعنی متقیوں پر بھی یہ مس واقع ہوتا ہے مگر فرق ہوتا ہے۔ اس مس میں اور اس مس میں جو غیر متقین پر واقع ہوتا ہے۔ غیر متقین اس سے متاثر ہوجاتے ہیں اور شیطان کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور متقین پر یہ اثر ہوتا ہے کہ "تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا ہُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ" یعنی وہ فوراً چونک اٹھتے ہیں اور صاحب بصیرت ہوجاتے ہیں۔ دیکھئے! کتنا بڑا فرق ہے۔ ڈاکو ایک اناڑی اور غافل پر چھاپہ مارتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب مال واسباب لوٹ کرلے جاتے ہیں بلکہ اس کو بھی مار کر ڈال دیتے ہیں یا باندھ کر لے جاتے ہیں اور کبھی ایک کارکردہ اور تجربہ کار اور ہوشیار پر چھاپہ مارتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے غل تو مچ جاتا ہے اور تماشائیوں کا مجمع ہوجاتا ہے لیکن اس کی ذات کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا بلکہ یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ہوشیار ہوکر پھر سے چوکی کو اور درست کرلیتا ہے بلکہ کبھی ڈاکوؤں کو بھی باندھ لیتا ہے چھاپہ مارنا دونوں جگہ ہوا مگر اثر میں فرق ہے۔ اسی طرح فرق ہے متقین پر مس شیطان کے اثر میں اور غیر متقین پر اثر میں اور اس آیت میں تو مس شیطان کو مجملاً ہی بیان فرمایا ہے اور اس کے کسی خاص اثر کا بیان نہیں کیا کہ اس مس سے کچھ اثر بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ بس اتنا فرمایا ہے کہ مس شیطان متقین کو بھی ہوتا ہے مگر ایک دوسری جگہ اس اثر کے بعض افراد کی تعیین بھی فرمادی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وَاِذَا مَا غَضِبُوۡا ہُمۡ یَغۡفِرُوۡنَ" یہ آیت بھی متقین کی شان میں ہے ترجمہ یہ ہے کہ جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کردیتے ہیں یہاں مس شیطان کا ایک اثر غضب مذکور

ہے کہ جب ان کو غصہ آتا ہے جو شیطان کا اثر ہے تو وہ شیطان کے کہنے پر عمل کر کے مقتضائے غضب پر عمل نہیں کرتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ متقین کو غصہ بھی آ جایا کرتا ہے کیونکہ اذا اور ان میں فرق ہے۔ اذا یقینیات پر آتا ہے اور ان محتملات پر اور یہاں لفظ اذا لایا گیا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ متقین کو بھی غصہ آنا غالب ہے مگر اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ مغلوب نہیں ہوتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں غصہ مس شیطان کا ایک فرد ہے اس آیت میں اس کی تصریح ہو گئی۔ دیکھئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غصہ کا بالکل جاتا رہنا مطلوب و محمود نہیں بلکہ متقین کی شان یہ ہے کہ ان میں غصہ بھی ہوتا ہے مگر اس کے مقتضا پر عمل نہیں ہوتا وہ بات صحیح ہوئی کہ مادہ کا بالکل ازالہ مطلوب نہیں ہاں اس کو مغلوب کر لینا چاہیے اور اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ مثلاً اگر غصہ بالکل جاتا رہے تو ہزاروں خرابیاں پیدا ہو جاویں آدمی دیوث ہو جاوے کہ اپنی عورت کے پاس دوسرے مرد کو دیکھ کر بھی اس کو غیظ نہ پیدا ہو۔ یہ غصہ ہی ہے کہ آدمی ایسے موقع پر جان دے دیتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے کہ میں ایسا بہادر ہوں اسی طرح اور بہت سی خرابیاں ہیں جو غصہ نہ رہنے کی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے۔ حق تعالیٰ کی تعلیم عجیب ہے اور فطرت سلیمہ کے مطابق ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فطرت اس کے موافق ہو جاوے تو سلیم ہی فرماتے ہیں: "وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ" یہ بھی متقین کی شان ہے معنی یہ ہیں کہ وہ غصہ کو دبا لیتے ہیں۔ الفاقدین الغیظ نہیں فرمایا جس کے معنی یہ ہوئے کہ ان میں غصہ نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ غصہ انسان میں ہونا چاہیے ہاں! اس کے ساتھ کظم کی قوت بھی ہونی چاہیے کہ اس پر غالب رہے۔ مثال اس کی موٹر کی سی ہے کہ اس کے اسٹیم کا ٹھنڈا ہونا مطلوب نہیں اسٹیم تو پوری قوت کا ہونا چاہیے ہاں اس کو اعتدال کے ساتھ چلانے کی ترکیب بھی ہونی چاہیے اگر ٹھنڈا ہو جاوے تو بیکار ہے۔ دوسری مثال پہلوان کی ہے کہ اس کے ظلم و زیادتی کم کرنے کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ اس کی طاقت بالکل سلب کر لی جاوے بلکہ تدبیر یہی ہے کہ اس کے افعال میں اعتدال پیدا کر دیا جاوے۔ جوش ہو اور قوت کو اعتدال کے ساتھ خرچ کیا جاوے۔ غرض ہر چیز اپنے مصرف میں صرف ہو تو محمود اور مفید ہے پس اپنے محل میں غصہ بھی اچھا اور بخل بھی اچھا۔ غرض یہ غلطی ہے کہ مجاہدہ کا اثر یہ سمجھا جائے کہ معصیت کا مادہ ہی سلب ہو جائے۔

تدبیر اصلاح

اور یہ تحقیق مذکور آدمی کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ بار ہا زک اٹھائی ہو اور کامل استاد نے اس وقت رہبری کی ہو۔ تحقیق صرف کتابیں پڑھ لینے بلکہ ایک دو دفعہ کامیاب ہو جانے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اسی کو میں نے کہا تھا کہ عارف بننے کے لیے ضرورت ہے علم حقائق کی اور عمل کی

اور یہ علم حقائق اور عمل حاصل ہوتا ہے کسی کامل کی صحبت سے اور مہارت ہوتی ہے بار بار کے تذکر سے یہی معنی ہیں تذکر میں تدریج ہونے کے۔ پس بتدریج دین کے تمام شعبوں کو حاصل کرنا چاہیے اور ہر قسم کی اصلاح کرنا چاہیے اور تدبیر اصلاح کی یہ ہے کہ عقائد تو مطلقاً سب درست کر لیے جاویں اور احکام میں سے جو اپنی ضرورت کے ہوں ان کو معلوم کر کے واجبات و فرائض کا اہتمام کیا جاوے اور معاصی سے بچا جاوے اور اخلاق باطنہ اور ملکات کو بجائے ازالہ کے ان کے مصرف میں صرف کیا جاوے اگر بخل اور امساک کو اپنے اپنے مصرف میں صرف کیا جاوے تو دونوں چیزیں محمود ہوں گی۔

اے بسا امساک از انفاق بہ ‏ ‏ ‏ ‏ مال حق راجز با مرحق مدہ

(اے طالب بہت مرتبہ خرچ نہ کرنا بہتر ہوتا ہے' خرچ کرنے سے حق تعالیٰ کے مال کو سوائے امر حق کے اور کہیں خرچ نہ کرو)

غلبہ تقویٰ

اس تحقیق کی بنا اس پر ہے کہ مادہ شر کا سلب مطلوب نہیں ہے بلکہ اس پر غلبہ حاصل کر لینا مطلوب ہے جس سے وہ اعتدال پر رہے اور یہی کمال ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ تقویٰ کے بعد مس شیطان ہی نہیں ہوتا اور ان کو معصیت کا خیال ہی نہیں آتا بلکہ تذکروا فرمایا' کیا معنی؟ کہ وہ سنبھل جاتے ہیں اور ہوشیار ہو جاتے ہیں حاصل یہ کہ مس تو ہوتا ہے مگر اس مس کو قیام نہیں ہوتا اور اس مس کرنے والی چیز کو طائف سے تعبیر فرمایا اس کے معنی ہیں گرد پھرنے والا یعنی آیا اور بھاگ گیا۔ بس متقی کی حالت تو یہ ہے کہ وساوس اس کے دل میں جمتے نہیں اور غیر متقی کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل میں وہ خیالات جمتے ہیں اور طائف کا ترجمہ جو میں نے گرد پھرنے والا کیا اس میں ایک اور اشارہ بھی ہے کہ اس کو قدرت آس پاس ہی پھرنے کی ہے قلب کے اندر نہیں جا سکتا یہ ایسا ہے جیسے ایک شاعر نے کہا ہے:

عذل العواذل حول قلب التائه ‏ ‏ ‏ ‏ وھوی الاحبته منه فی سودائه

(ملامت گروں کی ملامت قلب کے ارد گرد ہے اور محبوب کی محبت سودائے قلب میں ہے)

یہ حالت تو وساوس کی ہے اور تقویٰ کی شان یہ ہے کہ وہ اندرون قلب میں جاگزیں ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: "اَلَا اِنَّ التَّقْوٰی هٰهُنَا وَاَشَارَ اِلٰی صَدْرِهٖ"[1] یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے اور سینہ کی طرف اشارہ کیا یعنی قلب کے اندر ہے اور طائف کے معنی آس پاس پھرنے والے کے ہیں تو آیت اور حدیث کو ملا کر یہ بات ثابت ہو گئی کہ متقی کے

[1] (الصحیح لمسلم کتاب البر والصلة: ۳۲، سنن الترمذی: ۱۹۲۷، مسند احمد ۲: ۲۷۷)

دل میں تقویٰ ہی کا غلبہ ہوتا ہے اور شیطان اندر نہیں جا سکتا اس میں شیطان کے ضعیف ہونے کو بیان فرمایا اور سالک کو تسلی دی کہ اسے قلعہ دار ڈرنا نہیں، خندق کے باہر ہی شیطان ہے اسی واسطے عارف شیطان کی بالکل پروا نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اس کے دفع کی طرف بھی زیادہ التفاف نہیں کرتا۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب وہ اعوذ باللہ پڑھتے تو شیطان کو مخاطب کر کے کہتے کہ چونکہ شریعت کی تعلیم ہے ایسے موقع پر اعوذ پڑھنے کی اس واسطے پڑھتا ہوں تیرے ڈر سے نہیں پڑھتا، تجھ سے کیا خوف۔ قرآن شریف میں موجود ہے: "اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کہ شیطان کو کسی قسم کی قدرت اور اختیار نہیں۔ ایمان والوں پر بلکہ عارف کو بعض وقت بجائے نقصان کے شیطان سے الٹا نفع پہنچ جاتا ہے۔ "عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد" اور شیطان گو بڑا ہی عاقل اور تجربہ کار ہے مگر کبھی اس سے غلطی بھی ہو جاتی ہے وہ اس لالچ سے کہ انسان اس کے کہنے میں آ جاوے گا، بہکاتا برابر ہے کبھی اس سے نہیں چوکتا مگر کبھی اس کو دھوکہ ہو جاتا ہے کہ کسی کو خوب بہکایا اور اس میں بڑا وقت صرف کیا اور اس میں ایسا مشغول ہوا کہ اور کاموں سے رہ گیا اور یہاں اس شخص کو جس پر اتنی محنت کی تھی تذکر ہو گیا بس ساری محنت ضائع گئی بلکہ الٹا اور نقصان پہنچا کہ وہ شخص مقتضائے فاذاھم مبصرون کے اور صاحب بصیرت ہو گیا اور آئندہ کو بھی اس کے قریب میں آنے کی امید کم ہو گئی اس وقت شیطان پچھتاتا ہے کہ وہ ایسا نہ کرتا تو اس وقت اور کاموں سے بھی نہ رہ جاتا اور آئندہ کو اس سے امید تو مغالطہ میں آنے کی رہتی اور ہمت اس کی ٹوٹ جاتی ہے مگر بے حیا ہے کہ پھر تھوڑی دیر میں آتا ہے اور گو کامیابی کی امید نہیں مگر پھر بھی اپنا کام کرتا ہی ہے۔ ہمت میں تو شیطان استاد بنانے کے قابل ہے کہ تھکتا ہی نہیں۔

حکمائے اسلام

اور اہل اللہ نے اس سے بھی بھی کام لیا ہے کہ برے شخص میں کوئی کمال دیکھ کر اس سے سبق حاصل کیا۔ چنانچہ ایک بار حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ ایک شخص کو سولی پر چڑھایا گیا، پوچھا کیا جرم ہے؟ کہا گیا اس نے ایک دفعہ چوری کی تو حسب حکم شرع اس کا ہاتھ کاٹا گیا مگر یہ باز نہیں آیا اور دوبارہ چوری کی تو اس کا پیر کاٹ دیا گیا۔ اس نے پھر چوری کی تو حاکم نے غصہ میں آ کر سیاستاً سولی پر چڑھانے کا حکم دیدیا۔ یہ شخص کس قدر تو برا تھا مگر حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے پاؤں چوم لیے کسی نے پوچھا کہ آپ ایسے بد آدمی کے پاؤں چومتے ہیں کہا اس کے پاؤں نہیں چومتا اس کی ہمت کے پاؤں چومتا ہوں اس نے یہ کر کے دکھا دیا کہ:

دست از طلب ندارم تا کام من برآید یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(جب تک میرا مقصد پورا نہ ہوا میں طلب سے باز نہیں آؤں گا' یا تو جسم محبوب حقیقی کی طرف پہنچے یا جان جسم سے نکل جائے)

سولی پر چڑھ گیا مگر اپنا کام نہ چھوڑا' الفاظ پرست معقولی تو کہتے ہیں کہ سارق بلاسرقہ کے نہیں پایا جاسکتا تو گویا حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے ہمت سارق قید سرقہ کے پاؤں چومے مگر یہ لوگ الفاظ کے ایسے پابند نہیں ان کی نظر لفظی جھگڑوں پر زیادہ نہیں پڑتی۔ یہ اعتبار قید کو مقید سے الگ بھی کر لیتے ہیں چنانچہ انہوں نے سارق میں سے سرقہ کی قید نکال ڈالی اور اپنا مطلب نکال لیا اور الفاظ پرست لفظی جھگڑوں ہی میں رہے ان کے نزدیک اس کے پیر چومنا گویا چور کے پیر چومنا ہیں اور پیر چومنا چوری کی تعظیم کرنا اور اس کے ساتھ اور جانیں کیا کیا سمجھ لیا ہوگا جس سے جو چاہیں فتویٰ لگا سکتے ہیں مگر یہ سب الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ حقیقت کا اس میں پتہ بھی نہیں جس کے فلسفی مدعی ہیں اور یہ لوگ یعنی عارفین لفظی بحث چھوڑ کر سیدھے حقیقت پر پہنچتے ہیں۔ حقیقی فلسفی یہ ہیں خود افلاطون کو جو مسلم فلسفی ہے کسی نے خواب میں دیکھا اور چند فلسفیوں کے نام لیے کہ کیا یہ فلسفی ہیں۔ اس نے سر ہلایا پھر اس نے حضرت بایزید وغیرہ حکمائے اسلام کے نام لیے تو اس نے کہا "**اولئک هم الفلاسفة حقا**" کہ یہ ہیں سچے فلسفی واقعی فلاسفہ اپنے منہ میاں مٹھو بن جاویں مگر جس چیز کے وہ مدعی ہیں یعنی حقیقت شناسی کے اس سے ان کو مس بھی نہیں۔ حقیقت شناس یہ لوگ ہیں کیسی قید اور کیسا مقید بری سے بری چیز میں بھی اگر ذرہ برابر بھی خیر اور کام کی بات ہو تو وہ ان کی نظر سے نہیں چھپ سکتی (فقہائے نے بھی اس کو سمجھا ہے چنانچہ مسافر عاصی کے لیے حنفیہ رخصت قصر و افطار کے قائل ہیں یہاں مسافر کو صفت معصیت سے الگ کر کے مستحق رخصت بنادیا۔ علیٰ ہذا صوم یوم النحر کو صحیح علی الکراہت کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ ۱۲ ظ) آدمی حقیقت شناس ہو تو شیطان سے بھی اچھی بات حاصل کر سکتا ہے مثلاً یہی کہ وہ اگر سو جگہ دھوکہ کھاوے اور بہکانے میں کامیاب نہ ہو بلکہ بجائے نقصان پہنچانے کے غلطی سے موجب نفع بن جاوے جو اس کے مقصود کے خلاف ہے مگر ہمت نہیں ہارتا اور اپنے کام سے تھکتا نہیں یہ سبق اس سے حاصل کر لیا جاوے تو کیا حرج؟

شیطانی دھوکہ

اور وہ شخص عارف ہے جس کو شیطان سے نقصان نہیں پہنچتا بلکہ بعض وقت نفع پہنچ جاتا ہے اس لیے وہ اس سے مطلق نہیں ڈرتے کیونکہ جانتے ہیں کہ اس کو یہ قابو حاصل نہیں ہے کہ اس کو

زبردستی کھینچ کر شر کی طرف لے آوے قلب کے باہر باہر رہتا ہے اس کا صرف اتنا اختیار ہے کہ انسان کو بلاتا ہے شر کی طرف بس انسان اس کے ساتھ ہو لیتا ہے پھر شیطان کا سارا ہی کام بن جاتا ہے جیسے بچے کو کوئی چور بدمعاش زیور اتارنے کے لیے لڈو پیڑے دکھا کر دور سے بلاوے تو وہ اپنی نادانی سے چلا جاتا ہے۔ پھر زیور بھی چھن جاتا ہے اور بسا اوقات جان بھی جاتی رہتی ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ایسے ہی وقت کی تدبیر اس آیت میں بتا دی کہ جب شیطان تمہارے پاس کو آوے اور معصیت کی طرف بلاوے تو اس کا نسخہ یہ ہے کہ تذکر اختیار کرو اس کا یہ اثر ہوگا کہ بصیرت پیدا ہو جاوے گی اور اس کے دھوکے میں نہ آؤ گے۔ یہاں ایک دفع دخل بھی کیے دیتا ہوں وہ یہ کہ آیت میں جو اس کے مقابلہ کے لیے یہ نسخہ بتا دیا ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے مقابلہ کے وقت نہ ڈریں تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شیطان سے بے خوف ہو جانا چاہیے اور مقابلہ کے لیے تیار بھی نہ رہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس سانپ کی مجرب دوا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب سانپ سے ڈرنا ہی نہ چاہیے بایں معنی کہ منہ میں ہاتھ دے دیا کریں خواہ مخواہ ایسی جگہ رہیں جہاں سانپ ہوں بلکہ اس کا حاصل یہی ہے کہ اگر کسی کو سانپ کاٹ لے تو دوا مجرب پاس ہے۔ علاج اطمینان سے اور بے حراس ہو کر کریں وہ دوا خطا نہ کرے گی اور خواہ مخواہ سانپ سے کٹوانا تو نہایت ہی بیوقوفی اور نادانی ہے۔ بعض سانپ ایسے زہریلے ہوتے ہیں کہ انکے کاٹنے کے بعد دوا کے استعمال کا موقع بھی نہیں ملتا اور کام تمام ہو جاتا ہے۔ آج کل اس مذاق کے لوگ بھی موجود ہیں جو شیطان سے نہ ڈرنے کے معنی یہ لیتے ہیں کہ شیطان کے کاٹ لینے سے بھی ان کو ضرر نہیں پہنچتا' گناہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم کو کوئی نقصان نہیں ہوتا بعض وقت سالکین کو بھی یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ کوئی کیفیت قلب میں پیدا ہوگئی اور کبھی نظر وغیرہ کا اتفاق ہو گیا اور اس کیفیت میں کوئی فرق نہ آیا تو سمجھتے ہیں کہ ہم ایسے کامل اور شیطان سے محفوظ ہو گئے ہیں کہ ایسے گناہ سے بھی کوئی ضرر نہیں پہنچتا ہے۔ یہ دھوکہ ہے گناہ اپنا اثر ضرور کرے گا اب نہ سہی ذرا دیر کے بعد سہی اور اس دھوکہ سے جرأت بڑھ جاتی ہے تو پھر بڑے بڑے گناہ بھی ہونے لگتے ہیں اور کام اندر ہی اندر تمام ہو جاتا ہے اور یہ اسی دھوکہ میں رہتے ہیں کہ شیطان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور بعض گناہ ایسا اثر کر جاتا ہے جیسا بہت زہریلے سانپ کا زہر کرتا ہے کہ دوا کے استعمال کی نوبت بھی نہیں آتی اور کام تمام ہو جاتا ہے۔ ایسے بہت سے واقعات ہوئے ہیں لہٰذا یہ سمجھنا تو غلطی ہے کہ شیطان سے بے خوف ہو جاویں بلکہ نسخہ کے مجرب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اگر اس سے کام

لیا جاوے تو بیشک خطا نہ کرے گا تو اس کا مقتضا یہ ہوا کہ اس دوا کو ہر وقت پاس رکھنا چاہیے کہ خدا جانے کس وقت ضرورت ہو جائے اس صورت میں شیطان سے خوف بھی رہا۔ بایں معنی کہ اس سے احتیاط کی اور اس کو ہر وقت اپنی تاک میں سمجھا اور نسخہ پر اعتماد بھی ہوا کہ اس کو مجرب سمجھا تب تو پاس رکھا۔ یہ تو آیت کے ایک جزو کا بیان ہوا جس کا حاصل یہ ہے کہ گناہ ہوتا ہے نفس کے تقاضے سے اور تقاضا ہوتا ہے غفلت سے یعنی ان چیزوں کے غائب عن النظر ہونے سے جو اس تقاضے کو مغلوب کر سکیں اور اس غفلت کا علاج ان چیزوں کا استحضار و تذکر ہے۔

صحبت صالح

اس کے آگے دوسرا جزو آیت کا یہ ہے: "**وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَايُقْصِرُوْنَ٥**" (وقت زیادہ ہو گیا ہے لہٰذا اس کو بطور خلاصہ بیان کرتا ہوں) سو سمجھنا چاہیے کہ گناہ کے متعلق ایک تو مانع تھا گناہ پر تنبہ سے۔ اس مانع کے رفع کا بیان تو پہلی آیت میں تھا اور وہ مانع غفلت ہے اور ایک باعث ہوتا ہے معصیت پر جس کو داعی الی المعصیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ علاج مکمل جب ہوگا کہ رفع موانع بھی کیا جاوے اور اس باعث و داعی سے بھی اجتناب کیا جاوے۔ یہ مجموعہ شرط ہے نفع کی سو ہر کام کے پورا نہ ہونے میں جس طرح رفع موانع شرط ہے اسی طرح اجتماع شرائط بھی ضروری ہے چونکہ یہاں حق تعالیٰ کو مقصود روکنا ہے گناہ سے اس واسطے باعث کا بھی انسداد فرمایا اور رفع موانع کی بھی تدبیر بتائی۔ اس انسداد کا خلاصہ صحبت بد سے بچنا ہے جس کا بیان "**وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ**" میں ہے۔ یہ بلا صحبت بد کی آج کل بہت ہی عام ہے۔ صحبت نیک کا ملنا تو مشکل ہے اور بری صحبت ہر جگہ میسر ہے آج کل ایسی جماعتیں بہت ہیں اور بالقصد قائم کی جاتی ہیں جن میں دیندار کم اور دین سے آزاد زیادہ ہوتے ہیں۔ جیسے ایک زمانہ میں کانپور میں ایک جماعت تھی اس میں ایسے ہی قسم کے آدمی تھے اور اس جماعت کا نام ان لوگوں نے رکھا تھا اخوان الصفا۔ میں نے اس کا نام اخوان السفہاء رکھا تھا ایسی جماعتوں سے نہ کچھ دنیا کا کام ہوتا ہے نہ دین کا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد وہ انجمن رہی نہ وہ اخوان رہے۔ ہاں چندوں سے جو دستر خوان حاصل کر لیے تھے شاید وہ بعضے گھروں میں رہ گئے ہوں تو آج کل مسلمانوں کو کوئی جمعیت قائم کرتے ہوئے اس کا خیال بالکل نہیں ہوتا کہ اہل جمعیت نیک ہوں جن کی صحبت سے دین کا اثر لوگوں میں پیدا ہو بس رواجی لیاقت پر نظر ہوتی ہے کہ بی اے پاس ہوں ایم اے پاس ہوں چاہے دین کے اندر بالکل فیل ہوں جبھی تو آج کوئی کام انجام نہیں پاتا۔ یاد رکھو صحبت نیک جس طرح دین کے کامل کرنے کے لیے ضروری ہے دنیا کے کاموں میں بھی ضروری ہے۔

دوستی کا معیار

میں ایک بہت کام کی بات بتلاتا ہوں کہ جو کوئی اپنے دین کی اصلاح چاہے اس کو ایک کام یہ بھی کرنا چاہیے اور اس کے تحت اہتمام کی ضرورت ہے کہ اپنے ایسے ساتھیوں سے جو دیندار نہ ہوں صاف کہہ دے (مگر ان سے لڑے نہیں اور عداوت بھی نہ کرے اور ان کو بالکل ترک بھی نہ کرے کیونکہ یہ خلاف مروت ہے نرمی سے یوں کہہ دے) کہ صاف سن لیجئے! ہم بن گئے ہیں قل اعوذ یے اور ہم جس دھن میں ہیں اسی دھن میں رہیں گے:

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے یہی دولت کیا ہے کہ اس ساقی اور محبوب حقیقی اور اس کی شراب محبت سے مست ہیں)

اگر تم ایسے ہی بنو تب تو ہماری تمہاری دوستی ہے ورنہ دوستی آج سے قطع ہے۔ یوں معمولی تعلق رکھے تو اور بات ہے۔ دنیا میں ہر شخص اپنی جنس سے ملتا ہے تو اس طریق میں آنے والوں کو کیا ضرورت ہے کہ دوسری وضع کے لوگوں سے میل جول رکھیں۔ دوستی اور محبت سوائے اپنے ہم جنس کے کسی سے نہ چاہیے بلکہ اختلاط بھی نہیں چاہیے۔ یعنی بلا ضرورت باقی کسی دینی یا دنیوی ضرورت سے اختلاط کا مضائقہ نہیں مثلاً کسی سے کچھ معاملہ کرنا ہے کسی سے بیع وشرا کرنا ہے تو ایسے اختلاط سے کوئی دوست نہیں بن سکتا بلکہ اہل معاملہ ہیں اور کسی سے معاملہ کرنا اور معاملہ کی غرض سے اختلاط کرنا ناجائز نہیں' معاملہ تو کفار سے بھی کیا جاتا ہے اور ان سے بقدر ضرورت ملا بھی جاتا ہے۔ یہ صحبت بد میں داخل نہیں بشرطیکہ وہاں آنا جانا معاملہ کی ضرورت ہی تک محدود رہے۔ غرض میں تجارت یا نوکری کو منع نہیں کرتا ہاں ان کے مجموعوں میں بلا ضرورت شامل ہونے کو اور تجارت اور نوکری کے علاوہ اختلاط رکھنے کو منع کرتا ہوں' مجمع میں انہیں کے داخل رہو جو تمہارے ہم جنس ہوں اور ناجنس مجموعوں کو یا تو اپنی طرح لو ورنہ الگ کرو اگر اپنی اصلاح منظور ہے تو صحبت بدل دو ورنہ اصلاح کا نام بدنام نہ کرو۔ میں نے پہلے بھی بہت دفعہ بیان کیا ہے کہ ایک ناقص العقل لڑکی کی معاشرت جو شادی سے پہلے ہو چکی ہے اس میں اور اس معاشرت میں جو بعد شادی کے ہوتی ہے بڑا فرق ہوتا ہے حالانکہ وہ لڑکی ہے اور نا سمجھ ہے اور ناقص العقل بھی ہے مگر کیسا مذاق صحیح رکھتی ہے اور یہ فطری مذاق ہے کہ شادی ہوتے ہی اپنی معاشرت سابقہ کو بالکل بدل دیتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اب اس کو شوہر سے تعلق ہو گیا اب جو شوہر کا دوست ہے وہ اس کا بھی دوست ہے اور جو

شوہر کا دشمن ہے وہ اس کا بھی دشمن ہے اس میں چاہے اس کا بھائی اور باپ ماں ہی کیوں نہ ہوں یہی حالت طالب خدا کی ہونی چاہیے اس کا تو مذہب یہ ہونا چاہیے کہ

یکے دان و یکے بین و یکے گوے

(ایک ہی کو جانو ایک ہی دیکھو اور ایک ہی کی باتیں کرو)

بس ایک سے تعلق رہے جس کو اس سے تعلق ہے اس کو بھی اس سے تعلق ہے اور جس کو اس سے تعلق نہیں وہ کوئی بھی ہو اس سے بھی اس کا تعلق نہیں۔

مصلحت سوزی

اور اس کا مذہب یہ ہے:

خلیل آسا در ملک یقیں زن   صدائے لا احب الا فلین زن

(حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مانند عزم و یقین کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے نوائے لا احب الافلین یعنی میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا کہ صدا بلند کرو)

اور یہ کہ

ہمہ شہر پر زخوباں منم و خیال ما ہے   چہ کنم کہ چشم بد خوکند بہ کس نگاہے

(سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند کے خیال میں مست ہوں کیا کروں، کاش کہ بدخو کی نظر کسی پر نہ پڑتی)

اور یہ کہ

دلا رامے کہ داری دل دروبند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو)

اور یہ کہ

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار   بگذارند و خم طرہ یارے گیرند

(بڑی مصلحت یہ ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک کے ہولو)

مصلحت کے لفظ میں یہ بھی لطیفہ ہے کہ آج کل پالیسی کا غلبہ ہے شاید کسی کو اس ترک صحبت سے خیال ہو کہ نقصان پہنچ جاوے گا۔ اس واسطے مشا کلتہً لفظ مصلحت نہایت برمحل ہے کہ نہیں اس میں نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ مصلحت اسی میں ہے

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار   بگذارند و خم طرہ یارے گیرند

(بڑی مصلحت یہ ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک کے ہولو)

اس سے کوئی پالیسی کا ثبوت نہ نکالے کیونکہ دوسرے ایک شعر میں جواب اس کا موجود ہے کہ یہ مصلحت نہیں بلکہ مصلحت سوزی ہے۔

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار — کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل و تدبیر چاہیے)

اور۔

ساقیا برخیزد دردہ جام را — خاک برسرکن غم ایام را

(ساقی دردو جام اٹھائے غم ایام پر خاک ڈال دے)

اور آگے چل کر تو صاف ہی صاف کہہ دیا ہے۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں — مانمے خواہیم ننگ و نام را

(اگر چہ یہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے لیکن ہمیں بدنامی کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے)

اس مضمون کو کسی نے اردو میں یوں کہا ہے۔

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا — اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

مسلمان کا تو یہ مذہب ہونا چاہیے جب ایک دس برس کی لڑکی کا یہ مذہب ہو تو غیرت ہونا چاہیے پچاس برس کی عمر والے کو۔ افسوس اس نے شوہر کے لیے کچھ کر کے دکھا دیا اور تم سے خدا کے لیے بھی نہیں ہو سکتا' نظیر غیرت دلانے والی موجود ہے۔ نظیر کا بڑا اثر ہوتا ہے۔

خلاصہ بیان

الحمدللہ بیان ختم ہوا اور اس تمام بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ گناہوں کا علاج یہ ہے کہ پچھلے گناہوں سے توبہ کرو اور آگے کے لیے نفس کو روکو اور اس کے لیے تذکر کو اختیار کرو' تذکر کے معنی خدا کی یاد کے ہیں اور اس کی شرح میں نے پوری طرح کر دی ہے کہ خدا کی یاد سے کیا مراد ہے۔ دوزخ اور جنت اور حقوق العباد ان سب کی یاد خدا ہی کی یاد ہے اور صحبت بدلو۔ نیک صحبت اختیار کرو! اور اہل اللہ کے کلام کی صحبت یہ بھی انہیں کی صحبت ہے اگر کسی کو بزرگوں کے پاس جانے کی ہمت یا فرصت نہ ہو وہ اس کے ملفوظات' حالات و تالیفات ہی کا مطالعہ کرے اور اگر کوئی زندہ بزرگ اس کا معتقد فیہ ہو اور اس سے ملاقات نہ ہو سکے تو کم از کم اس سے خط و کتابت ہی رکھے' اس میں بھی صحبت ہی کا اثر ہے۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است — صراحی مئی آب و سفینہ غزل ست

(جو زمانہ صحبت شیخ سے خالی ہو اس میں اس کے مکتوبات اور ملفوظات (کے مطالعہ سے) مستفید ہونا چاہیے)

اور اگر کسی کو صحبت نیک میسر ہو جائے تو اس کو غنیمت سمجھے۔

مقام امن و مئے بے غش و رفیق شفیق گرت مدام میسر شود زہے توفیق

(مامون مقام اور اللہ تعالیٰ کی محبت کی خالص شراب اور مشفق شیخ اگر تم کو ہمیشہ میسر ہو تو بڑی خوش نصیبی ہے)۔

اب توفیق کی دعاء اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

خلاصہ وعظ بالفاظ حضرت مولانا مدظلہم العالی

خلاصہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے گناہ سے بچنے کا طریقہ فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ گناہ ہوتا ہے نفس کے تقاضے سے اور نفس کا تقاضا ہوتا ہے ایسی چیزوں کے غائب عن النظر ہونے سے جو اس تقاضے کے اثر کو مغلوب کر سکیں جیسے خدا کی یاد جنت کی یاد دوزخ کی یاد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی اور ان کے حقوق کی یاد۔ پس ان چیزوں کا استحضار تقاضے کو مغلوب کر دے گا اور تقاضے کے مغلوب ہونے سے گناہ سے محفوظ رہے گا۔ تذکروا کا حاصل یہی ہے اسی واسطے اس پر فاذاھم مبصرون کو مرتب فرمایا ہے اور دوسری آیت میں گناہ کے داعی کا انسداد ہے اور وہ داعی اخوان شر کی صحبت ہے۔ پس مجموعہ علاج یہ ہوا کہ تذکر ہو اور صحبت بد سے تحرز ہو۔ فقط انتہی بلفظ مولانا)

(یہ خلاصہ لکھے جانے کے بعد حضرت مولانا کو سنا بھی دیا)

وعظ کے بعد مصافحہ نہیں کیا۔ ایک شخص نے پیر پکڑے حضرت والا نے بھی اس کے پیر پکڑ لیے وہ بہت شرمندہ ہوا' فرمایا ذرا معلوم تو ہو کہ پیر پکڑنے سے دوسرے پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس وعظ میں شیعہ اور آریہ اور ہندو بھی تھے اور کہتے تھے کہ ہم کو یہ گمان نہ تھا کہ اتنا اچھا بیان ہوگا۔ جامع ۱۲

اشرف علی شب ۲۱ شوال ۱۳۵۲ھ

تیسیر الاصلاح

۲۹ جمادی الاول سنہ ۱۳۳۰ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں ۲ گھنٹہ تیس منٹ تک بیٹھ کر بیان فرمایا جس میں ترک معاصی کا نہایت سہل اور اکسیر نسخہ بتلایا گیا۔ مولوی سعید احمد تھانوی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ ط وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًاo وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّہٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰہِ مَتَابًاo (الفرقان آیت نمبر ۷۰،۷۱)

ترجمہ: ''(مگر جو شرک و معاصی سے) توبہ کرے اور ایمان (بھی) لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گذشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے اور جو شخص (جس معصیت سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے تو وہ (بھی عذاب سے بچا رہے گا کیونکہ وہ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر رجوع کر رہا ہے۔''

تمہید

یہ دو آیتیں ہیں جن میں پہلی آیت اپنے سے پہلی آیت کی محتاج ہے مگر جو مضمون اس وقت مقصود ہے اس کے لیے چونکہ یہ بھی کافی ہے اس واسطے پہلی آیت کو جس میں مستثنیٰ منہ مذکور ہے تلاوت نہیں کیا گیا اور اس کی تلاوت کی ضرورت نہیں سمجھی اور محض مضمون استثناء اور اس کی تتمیم پر اکتفا کیا گیا۔ ان دونوں آیتوں میں سے اول آیت میں ایک بہت بڑے مرض کا ایک نہایت ہی سہل علاج فرمایا ہے۔ ہم میں امراض تو بہت ہی شدید ہیں اور اس لیے قاعدہ معتادہ کے موافق ان کے علاج بھی بہت ہی سخت ہونے چاہئیں تھے مگر یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ سخت سے سخت امراض کے نہایت سہل علاج تجویز فرمائے اور یہ بھی ایک امتیاز ہے شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے

شرائع اور دیگر طریق اصلاح سے کہ اس شریعت میں سخت امراض کے لیے بھی نہایت سہل علاج
بتلائے گئے ہیں ورنہ تمام دنیا کا قاعدہ ہے کہ جس درجہ کا مرض ہوتا ہے اسی درجہ کا علاج بھی کیا جاتا
ہے اگر مرض سخت ہے تو اس کا علاج بھی سخت ہوگا اور مرض ہلکا ہے تو علاج بھی ہلکا ہوگا۔ غرض اس
روحانی طب میں یہ امتیاز ہے کہ سخت امراض روحانی کا علاج بھی سہولت سے کیا گیا ہے۔

اعتدال روحانی

اور امراض روحانی سے مراد معاصی ہیں حدوثاً یا بقاءً یعنی گناہ کا صادر ہونا یا اس کا باقی اور مستمر
رہنا۔ حاصل یہ ہے کہ معصیت مرض ہے اور اس میں دو درجے ہیں ایک تو اس کا حدوث اور ایک
اس کا بقاء یعنی صدور کے بعد اس سے رجوع میسر نہ ہو تو اصل مرض معصیت ہوا اس کے مرض ہونے
میں تطویل کلام کی ضرورت نہیں جس میں ایمان ہوگا وہ اس کو ضرور ہی تسلیم کرے گا کیونکہ مرض کی
حقیقت ہے مزاج کا اعتدال سے خارج ہونا اور جس طرح ایک قسم اعتدال کی طبعی ہے اسی طرح
ایک قسم اعتدال کی روحانی بھی ہے جس کو شریعت نے بتلایا ہے کہ انسان کو اس حالت پر رہنا چاہیے
کہ نہ اس میں افراط ہو اور نہ تفریط ہو یعنی غلو اور انہماک کو بھی جائز نہیں رکھا۔ پس یہ جو سمجھا جاتا ہے
کہ دین میں مبالغہ کرنا مقصود ہے یہ بھی خلاف واقع ہے۔ سو اس میں دو غلطیاں لوگوں کو واقع ہوئی
ہیں بعض تو یہ سمجھے کہ عبادات میں خوب مبالغہ کرو جتنا مبالغہ ہوگا اچھا ہوگا اس کا ایک برا نتیجہ تو یہ ہے
کہ دین سے توحش و ثقل پیدا ہوگا' دوسرا برا اثر بعض معتقدین پر یہ ہوگا کہ اس کو قبول کر کے ایسے
منہمک ہوں گے کہ تمام دنیا کے کاروبار کو چھوڑ کر اور ترک تعلقات کر کے بیٹھ رہیں گے۔ اگر چہ وہ
تعلقات واجب ہی کیوں نہ ہوں جیسے بیوی بچوں وغیرہ کا اور اس کا نام رکھا ہے آزادی و تفرد و تجرد کہ
ہم کو خدا کے سوا کسی سے غرض نہیں نہ بیوی سے نہ بچے سے اور اس کا ثمرہ آخر یہ ہوا کہ تمام حقوق
واجبہ ضائع ہو گئے ان لوگوں نے یہ نہ سمجھا کہ آزادی اسی حد تک جائز ہے جہاں تک کہ شریعت نے
اجازت دی ہے اور جہاں شریعت نے مقید کر دیا ہے وہاں مقید ہی رہنا چاہیے۔

چونکہ برمیخت بہ بند وبستہ باش   چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جب کسی میخ سے تجھے باندھ دیا جائے تو اسی جگہ بندھا ہوا رہنا بہتر ہے اور جب کھول دیا
جائے تو خوب چستی و چالاکی دکھلا)

یعنی جب باندھ دیں بندھ جائے اور جب کھول دیں تو اچھلتا کودتا پھرے۔ دیکھئے گھوڑے
کی شائستگی یہی ہے کہ جب اس کو باندھا جائے تو بندھا رہے اور جب کھول کر چلایا جائے تو کھل کر

چلے اور اگر وہ کھولنے پر بھی بندھ جائے یعنی چلے نہیں یا باندھنے کے بعد بھی اچھلے کودے تو وہ شریر گھوڑا ہے۔ پس اطاعت یہی ہے کہ باندھنے سے بندھ جائے اور کھولنے سے کھل جائے۔ اس وقت دنیاداروں نے تو بالکل اپنے گلے سے پٹہ ہی نکال دیا ہے اور دینداروں نے اپنے کو زاویہ میں ہی جکڑ لیا ہے۔ سو یہ سخت غلطی ہے اور بہت لوگ اس میں مبتلا ہیں اور اس غلطی سے یا تو دین سے توحش پیدا ہوتا ہے اور یا انہماک۔ تو اصل سبب اس توحش اور انہماک کا یہی ہے کہ مبالغہ کو مستحسن سمجھا۔ اسی مبالغہ کی نسبت فرماتے ہیں: "یٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ" (اے اہل کتاب دین کے معاملات میں تم غلو اور زیادتی مت کرو) تو ہر چیز میں سخت ضرورت اعتدال کی ہے دنیا میں بھی اور دین میں بھی اور جب معلوم ہوا کہ دین میں اعتدال مقصود ہے تو جو اس اعتدال سے نکلے گا وہ مریض روحانی سمجھا جاوے گا۔ یہ تو حقیقت کے اعتبار سے تقریر ہے۔

تکدر معصیت

اور اثر کے اعتبار سے کہ معصیت اس طرح مرض ہے کہ مرض سے طبیعت مکدر ہوتی ہے ادھر معصیت میں بھی طبیعت مکدر ہوتی ہے اور اس سے پریشانی اور ضعف روحانی بڑھتا ہے اور صاحب معصیت ہر وقت پریشان اور افسردہ رہتا ہے اور یہ بات مشاہدہ کرنے کی ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ عبادت کے بعد قلب میں ایک نور پیدا ہوتا ہے جس کو عابد محسوس کرتا ہے اور معصیت کے بعد قلب میں ایک ظلمت اور تکدر ہوتا ہے جس سے قلب بالکل پژمردہ ہوجاتا ہے۔ دیکھو! نمازی کی نماز اگر قضا ہوجائے تو اس کو کس قدر رنج ہوتا ہے اور اگر اپنے وقت پر ادا ہوجائے تو کیسی فرحت محسوس ہوتی ہے۔ خوب کہا ہے:

بردل سالک ہزاراں غم بود　　　گرز باغ دل خلالے کم بود

(درویش کے دل پر ہزاروں غم چھا جاتے ہیں اگر ان کے دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہوجائے)

دیکھئے! اگر کسی کو نماز سے محبت ہوجائے تو گو اس کی حالت اہل اللہ کی سی نہ ہو لیکن پھر بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر اس کو کوئی ایک ہزار روپیہ بھی دے اور یہ کہے کہ تم ایک وقت کی نماز مت پڑھو تو قیامت تک نہ مانے گا بلکہ اگر ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اس شرط پر اس کو دی جائے اس پر بھی لات مار دے گا تو اس شخص کو نماز میں آخر کوئی شگفتگی تو ہے جس کی وجہ سے ہفت اقلیم کو بھی اس کے عوض میں ہیچ سمجھتا ہے وہ یہی روحانی فرحت ہے وہ جانتا ہے کہ نماز کو چھوڑنے سے یہ فرحت جاتی رہے گی اور قلب میں اس کی جگہ ایک کدورت اور ظلمت پیدا ہوجائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ طاعت سے ایک نور پیدا ہوتا ہے اور معصیت سے ایک قسم کا تکدر ہوتا ہے۔

ہمت افزا نور

اور اس نور میں یہ بھی خاصیت ہے کہ وہ قوت بخشتا ہے اور اسی طرح اس تکدر کا خاصہ ہے کہ وہ کم ہمت اور کسل مند کر دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے! اگر دو شخص قوت میں برابر ہوں مگر ان میں سے ایک متقی ہو اور ایک غیر متقی تو ان دونوں کی حرکات میں غور کرنے سے یہ تفاوت نظر آئے گا کہ متقی سے جو کام ہمت کا ہو سکے گا وہ غیر متقی سے نہ ہو گا اور ہر کام میں جو ہمت متقی سے ظاہر ہو گی وہ غیر متقی سے کبھی نہ ہو سکے گی اور یہی راز ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم باجود اپنے ضعف جسمانی کے اپنے مقابل کفار پر باوجود ان کی قوت کے غالب آ گئے۔ حتیٰ کہ اہل فارس جن میں رستم جیسا شخص موجود تھا جو اپنے زمانہ کا بڑا زور آور سمجھا جاتا تھا ان کے مقابلے میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے دبلے پتلے کمزور جب کام کا وقت آیا تو یہ کمزور قوی ثابت ہوئے اور وہ زور آور کمزور ثابت ہوئے تو یہ قوت اسی نور کی تھی جو عبادت کی وجہ سے ان کے قلب میں بلکہ رگ و پا میں سرایت کر گیا تھا اور یہی نور ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَفِیْ عَصَبِیْ نُوْرًا وَفِیْ لَحْمِیْ نُوْرًا وَفِیْ دَمِیْ نُوْرًا وَمِنْ تَحْتِیْ نُوْرًا وَمِنْ فَوْقِیْ نُوْرًا وَعَنْ یَمِیْنِیْ نُوْرًا وَعَنْ شِمَالِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْنِیْ نُوْرًا۝[1]

یعنی اے اللہ میرے قلب میں رگ و پے میں گوشت پوست میں خون میں نور پیدا کیجئے اور میرے نیچے اور اوپر اور داہنے اور بائیں نور پیدا کیجئے اور مجھ کو بھی نور کر دیجئے۔ حقیقت میں اطاعت اور عبادت سے ایک نور پیدا ہو جاتا ہے اور عابد کو اس کا ادراک بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ ہم کو بوجہ اخبار صادق کے بلا ادراک بھی ایمان لانا چاہیے اور اگر کوئی کہے کہ ہم کو تو کبھی نور محسوس نہیں ہوا تو میں کہوں گا کہ اس لیے محسوس نہیں ہوا کہ ابھی آپ نے وہ تقویٰ اختیار نہیں کیا جس سے نور پیدا ہوتا ہے ورنہ آپ دیکھتے کہ کیسا نور آپ کے قلب میں پیدا ہوتا ہے۔ جس کے سامنے کسی قسم کا ضعف ہی نہیں رہتا۔ اسی بارے میں فرماتے ہیں: "کَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً کَثِیْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ" اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر فتح پا لیتی ہے اور کسی کا قول ہے۔

ہر چند پیر وخستہ و بس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم دم جواں شدم

(کہ میں اگرچہ بوڑھا ہو گیا لیکن جب تجھ پر نظر پڑتی ہے تو وہی جوانی کی قوت آ جاتی ہے)

---

[1] (سنن النسائی ۲: ۲۱۸، سنن ابی داؤد: ۱۳۴۹، مشکوۃ المصابیح: ۱۱۹۵)

محسوسات میں اس کی تائید دیکھ لیجئے کہ اگر کسی شخص کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کی کیا حالت ہو جاتی ہے کہ اس کے کسی کام میں بھی اس کو تکان نہیں ہوتا پھر اگر کسی کو خدا تعالیٰ سے اور اس کے احکام سے محبت ہو جائے تو اس کی قوت قلبی کا کیا تعجب ہے۔ جیسا سعدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں

عجب داری از سالکان طریق　　　کا باشند در بحر معنی غریق

(جو لوگ درویشی کے سیدھے راستہ پر چلنے والے ہیں تجھے سن کر تعجب ہوگا کہ وہ ہمیشہ معنی کے دریا میں غرق رہتے ہیں)

مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

خود قوی ترمیشود خمر کہن　　　خاصہ آن خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب خود بخود زیادہ قوی ہو جایا کرتی ہے یہ خصوصیت اس شراب کی ہے جو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے)

یعنی بڑھاپے میں زور گھٹتا نہیں بلکہ اور زیادہ ہو جاتا ہے کیونکہ شراب جتنی پرانی ہوتی ہے اتنی ہی تیز ہو جاتی ہے تو اس نور سے باوجود ضعف جسمانی کے روحانی قوت بڑھتی جاتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ایک درجہ قوت اور صحت کا روحانی بھی ہے اور اس سے خروج کا نام مرض ہے اور گناہ اسی خروج کا نام ہے اور اس میں بہت زیادہ تطویل کی ضرورت نہیں کیونکہ بحمد اللہ ہر مسلمان اس کو سمجھتا ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں یہ تو امراض تھے۔

اصلاح بلا تدبیر

اب ان امراض کے خاص خاص معالجات ہیں کیونکہ ہر مرض کی دوا ہونا حدیث شریف میں مصرح ہے مگر امراض روحانی کی دوا سے اکثر لوگ بے خبر ہیں اسی لیے اکثر لوگ گناہ کو باوجود یکہ چھوڑنا چاہتے ہیں مگر اس کے چھوٹنے کا طریقہ اور اس کا علاج معلوم نہ ہونے کے سبب ان سے نہیں چھوٹتے دیکھو اگر کوئی اچھا ہونے کا متمنی ہو مگر اس کا طریقہ معلوم نہ ہو یا کہ اس طریقہ کا استعمال نہ کرے تو کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح آج کل لوگ بڑی تمنائیں کرتے ہیں بعضے تو طریقہ ہی نہیں جانتے اور بعضے جان کر بھی عمل نہیں کرتے چنانچہ اکثر لوگ بزرگوں سے کہتے ہیں کہ کچھ توجہ کر دیجئے۔ مطلب یہ کہ ان کو کچھ نہ کرنا پڑے۔ صاحبو! ہر کام اس کے طریقے ہی سے ہوا کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "واتوا البیوت من ابوابھا" (گھروں میں دروازوں سے آنا چاہیے) تو ہر مقصود ایک گھر ہے اور اس کا ایک دروازہ ہے کہ اگر اس سے داخل ہوا جائے تو عادۃً اس گھر میں پہنچ

سکتا ہے ورنہ نہیں تو نری تمنا دارالمقصود کا دروازہ نہیں ہے اور نہ ہر تمنا کا پورا ہونا ضروری ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شد وصال　　　صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

(اے عرفی اگر رونے چلانے سے محبوب کا وصال ہو جایا کرتا تو میں اسی تمنا میں سو سال تک رو سکتا ہوں)

جیسا بعض لوگ دو آنسو گرا لیتے ہیں اور اس کو کافی سمجھتے ہیں۔ اسی باب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے

لو کان ھذا العلم یدرک بالمنی　　　ماکان یبقی فی البریۃ جاھل

(یعنی اگر علم اور اسی طرح عمل تمنا سے حاصل ہو جاتا تو دنیا میں کوئی بھی جاہل نہ رہتا)

فاجھد ولا تکسل ولا تک غافلا　　　فندامۃ العقبی لمن یتکاسل

(پس کوشش کر سستی مت کر نہ غافل بن آخرت میں اس شخص کو شرمندہ ہونا پڑے گا جو سستی کرتا رہا)

تو صاحبو! نری تمنا سے کچھ نہیں ہوتا مگر افسوس کہ آج کل تمنائیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن کام کے طریقے سے کوئی بھی کام نہیں کرتا۔ خوب کہا ہے

ماکل مایتمنی المرء یدرکہ　　　تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

(آدمی جو تمنا کرتا ہے وہ سب پا نہیں لیتا بسا اوقات کشتیوں کے مخالف ہوائیں بھی چلا کرتی ہیں)

غرض خدا تعالیٰ نے ہر ایک کام کے لیے عادتاً ایک تدبیر بتلائی ہے کہ جب اس تدبیر سے وہ کام کیا جائے گا تو اس میں کامیابی ہوگی ورنہ نہیں بعضے لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ محض دعا ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ صاحبو! دعا میں برکت ضرور ہے لیکن ہر جگہ اس کا بھی محل نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ مقاصد دو قسم کے ہیں ایک وہ کہ ان کا اسباب سے کچھ تعلق نہیں وہاں تو باستثناء ممتنعات عقلیہ یا شرعیہ دعا کا صرف یہ اثر ہے کہ بصورت استجابہ وہ مقصود بلا تدبیر حاصل ہو جائے گا اور بعض کام عادتاً تدبیر پر موقوف ہیں ان میں باستثناء خوارق دعاء کا وہ اثر نہ ہوگا جو پہلی قسم کے کام میں ہوا بلکہ ان میں دعاء کا اثر یہ ہوگا کہ اگر تدبیر کی جائے گی تو اس تدبیر میں برکت ہوگی اور اگر تدبیر نہ کی جائے گی تو کچھ بھی نہ ہوگا اور اسی سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ جب کاموں کا مدار تدبیر پر ہے تو پھر دعاء کا ان میں کیا دخل اور اثر ہوا؟ سو وہ اثر یہ ہوا کہ تدبیر میں برکت ہوگی اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے زراعت کہ اگر کوئی تخم پاشی ہی نہ کرے اور دعا کرے کہ غلہ پیدا ہو جائے تو عادتاً ہرگز پیدا نہ ہوگا اور خرق عادت میں کلام نہیں ہے مگر وہ دائم نہیں تو وہاں اس کی ضرورت ہے کہ تخم پاشی کر و اس کے بعد ... [illegible] پیدا ہونا یا نہ پیدا ہونا جو متعلق ہے مشیت کے تو یہاں تعلق مشیت کے لیے دعا کی جائے گی کہ آپ اس میں اپنی مشیت

سے غلہ پیدا کردیں اور یہی حالت ہے اپنی اصلاح اعمال وترک معاصی کی۔ ہر مقام پر نری دعا کو کافی سمجھنا سخت غلطی ہے آج کل بھی اصلاح چاہتے ہیں مگر تدبیر نہیں کرتے صرف دعاء پر اکتفا کرتے ہیں۔ تو صاحبو! تدبیر کرو کامیابی ہوگی ورنہ دوسری ایسی مثال ہے کہ اگر کوئی شخص کمربند کھول کر کھڑا ہوجائے اور دعا کرے کمربند بندھ جائے تو ہرگز بھی نہ بندھے گا۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ دعاء کا کیا اثر ہے اور یہ بھی معلوم کرلیا کہ وہ بعض جگہ ناکافی ہے۔

سہولت کی ناقدری

حاصل یہ کہ لوگوں نے ناکافی تدابیر تجویز کررکھی ہیں اور کافی تدابیر ان کی وہ ہی ہیں جو قرآن وحدیث شریف نے بتائی ہیں مگر ہم لوگ ان کو بالکل نہیں ڈھونڈتے اور یہ بہت بڑا علم ہے جو علی العموم مسلمانوں سے مخفی ہورہا ہے بلکہ اکثر اہل علم سے بھی کہ اس فن کی کتابوں میں غور نہیں کرتے اس لیے وہ علم ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ لوگ قرآن شریف پڑھتے ہیں وہ بھی اس نظر سے نہیں پڑھتے کہ اس میں معالجات امراض کو سمجھیں کہ اس میں عجیب معالجات ہیں۔ چنانچہ اس آیت شریفہ میں بھی ایک سخت مرض کا ایک سہل علاج بتلایا ہے لیکن افسوس ہے کہ لوگوں کو محض اس وجہ سے قدر نہیں کہ بہت سہل علاج ہے اور لوگوں کا طبعی امر ہے کہ جو چیز سہل طریق سے حاصل ہو اس کی قدر نہیں ہوتی اور جو عجیب طور پر حاصل ہو اس کی قدر ہوتی ہے۔ ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ انبہٹہ میں ایک دولت مند شخص کو بہت سخت مرض تھا کہ خلط سودا کا بہت زور ہوگیا تھا' مولانا کو بلایا گیا تو مولانا رحمتہ اللہ علیہ نے اس کے لیے افتیمون تجویز فرمایا اور ان لوگوں نے ارزاں دوا سمجھ کر ٹال دیا' وہاں ایک نابینا حافظ جی رہتے تھے ان سے علاج پوچھا گیا' انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص افتیمون ہی بتلاتے ہیں انہوں نے لوگوں سے ذکر کیا لوگوں نے حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ سے ذکر کیا' مولانا رحمتہ اللہ علیہ خوش مزاج بہت تھے حافظ جی سے پوچھا کہ خواب میں میں تو نہ تھا تو حافظ جی کہتے ہیں جی ہاں آواز تو ایسی ہی تھی اور پھر اس کا استعمال کیا۔ یہ مثال اس پر یاد آگئی کہ یہ نسخہ چونکہ نہایت سہل تھا اس لیے اس کی قدر نہیں کی گئی۔ اس طرح ہمارے مولانا نے ایک شخص کو جامن کی کونپل بتلائی تھی وہ بھی بڑے آدمی تھے کچھ التفات نہ کیا' اکثر سہل الوصول چیز کی قیمت کم ہی ہوتی ہے۔ مولانا رحمتہ اللہ علیہ بعنوان شکایات فرماتے ہیں۔

ای گراں جاں خوار دیدستی مرا زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا
ہرکہ او ارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرصے ناں دہد

(اے بڑے آدمی تو مجھ کو ذلیل سمجھ رہا ہے اس لیے کہ تو نے مجھ کو بہت سستا خرید لیا ہے جو سستا خریدتا ہے وہ سستا ہی فروخت بھی کر دیتا ہے مثلاً بچہ قیمتی موتی کو ایک روٹی کے بدلے میں دے دے گا)
غرض جو معالجات سہل ہوتے ہیں ان کی قدر نہیں کی جاتی اس لیے اطباء بعض اوقات دوا کی قدر بڑھانے کو ورق نقرہ وغیرہ بڑھا دیتے ہیں تا کہ مریض کو قدر ہو جائے مگر ارزانی کو دلیل قلت نفع کی قرار دینا خود یہی غلطی ہے اکثر تو یہی ہے کہ جس قدر کوئی چیز نافع ہے اسی قدر وہ زیادہ ارزاں ہے جیسے ہوا کہ نافع تو اس قدر کہ مدار زندگی اسی پر ہے اور ارزاں اتنی کہ بالکل بے قیمت' ہوا کے بعد پانی ہے کہ وہ ہوا کے برابر نافع نہیں اس لیے اتنا تو سستا نہیں مگر چونکہ اور دوسری تمام چیزوں سے زیادہ نافع ہے اس لیے اور سب چیزوں سے سستا ہے تو اسی طرح سوچتے چلے جایئے معلوم ہوگا کہ جتنی کوئی چیز بیکار ہے اتنی ہی وہ گراں ہے۔ حتیٰ کہ سب سے زیادہ گراں جواہرات ہیں۔ پھر دیکھ لیجئے! کہ ان کا فائدہ سوائے تفاخر کے اور کیا ہے' ہزاروں غرباء نے کبھی موتی کی شکل بھی نہیں دیکھی چنانچہ خود میں نے عمر بھر میں کل اب تک ایک مرتبہ لکھنؤ میں ایک سوداگر سے درخواست کر کے یہ جواہرات دیکھے ہیں۔ غرض جواہرات جو سب سے نکمے ہیں وہ سب سے گراں ہیں اگر چہ چاہئے تو یوں تھا کہ جتنی زیادہ ضرورت کی کوئی چیز ہوتی اتنی ہی گراں ہوتی لیکن چونکہ اس میں سخت دشواری ہوتی اس لیے رحمت خداوندی نے اس کے برعکس معاملہ کیا کہ ضرورت کی چیزوں کو ارزاں بنایا اور بیکار چیزوں کو گراں کر دیا بلکہ جو سب سے زیادہ ضرورت کی چیز ہے اس میں طلب کی بھی ضرورت نہیں۔ دیکھو اگر سانس کو بھی کہ ایک ہوا ہے اور ہر وقت ضروری پانی کی طرح بہ قصد لینا پڑتا تو ہر وقت کی مصیبت تھی۔ بالخصوص سونے کے وقت تو مر ہی جایا کرتے کیونکہ اس وقت قصد ممکن نہیں تو خدا تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ اس کو کیسا یسیر الحصول کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کی ارزانی اس کی بے وقعتی کی دلیل نہیں ہے پس امراض روحانی کا علاج بھی ایسا ہی ہے کہ سب سے زیادہ ضروری اور سب سے آسان' سہل۔ یہ تمہید میں نے اس لیے عرض کی کہ اس مقام پر مرض کی صعوبت اور علاج کی آسانی کو دیکھ کر اس علاج کی بیقدری نہ ہو۔

استمداد گناہ

اب سنو! کہ وہ علاج کیا ہے اور سننے کے بعد اس کو برتو اور پہلے ہی اس کی بے وقعتی نہ کرو' ہاں اگر برتنے سے بھی مفید ثابت نہ ہو تو بیشک بیکار اور غیر مفید ہونا ہے کہ یہ شخص ہم کو حقیر سمجھے گا۔

یا اس لیے ہوتا ہے کہ دوسروں کو کہتا پھرے گا سو بحمد اللہ ان حضرات میں یہ دونوں احتمال نہیں اس لیے ایسے لوگوں سے کہنے میں کچھ پرواہ نہ کرنا چاہیے اور اظہار گناہ سے جو ممانعت آئی ہے وہ اس وقت ہے جبکہ محض براہ بے باکی ہو جیسے تفاخراً کہا کرتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ معالجے کے لیے ظاہر کرے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ غرض ان بزرگ نے اپنا ایک مرض جو کہ بچپن سے آخر عمر تک تھا بیان کیا۔ اسی طرح بعض لوگوں کو جھوٹ بولنے کا مرض ہو جاتا ہے یا نظر بازی کا کہ بعض اوقات تو یاد نہیں رہتا اور بعض اوقات آدمی مغلوب ہو جاتا ہے اور پھر ارتکاب کے بعد نادم ہوتا ہے مگر وہ پھر ہو جاتا ہے۔ غرض ہر گناہ جس کی بار بار معاودت ہو اس میں ایسا ہی ہوتا ہے سو عقل کے موافق اس کا علاج بھی سخت ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ اہل عقل نے جو اخلاق کی درستی کی تعلیم کی ہے تو انہوں نے اس کے لیے سخت سخت علاج تجویز کیے ہیں جن کا حاصل مجاہدہ ہے۔ مثلاً تکبر کا علاج یہ تجویز کیا ہے کہ متکبر سے چھوٹوں کی تعظیم کرائی اور مدت تک ایسے کاموں پر مجبور کیا جن میں نفس کو ذلت ہو تو اصل با قاعدہ علاج یہی مجاہدہ ممتدہ ہے۔ ایک حکیم کہتے ہیں۔

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامی بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(تصوف اختیار کرنے والا اس وقت تک پاکیزہ و مزکی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ شراب معرفت کا جام نوش نہیں کر لیتا اور ہر ناپختہ کو پختگی حاصل کرنے کے لیے بہت محنت و مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے)

پس ایسی ایسی مشقتوں کے بعد کچھ فائدہ محسوس ہو جاتا ہے اور اسی قسم کے علاج سے تمام تصوف کی کتابیں بھری پڑی ہیں احیاء اور قوت القلوب میں اسی طرز کے علاج کو مفصلاً ذکر کیا گیا ہے اور یہ اس قسم کے علاج ہیں کہ ایک ایک مرض کے علاج کے لیے عمر چاہیے اسی لیے حضرات متاخرین نے ان علاجوں کی جگہ دوسرا اس سے سہل علاج اختیار کیا اور وہ خلوت و کثرت ذکر ہے مگر پھر بھی وہ اتنا سہل نہیں کہ ہر شخص اور ہر مشغول اس کو اختیار کر سکے۔ مثلاً جیسے ایک تاجر ہے کہ وہ خلوت میں نہیں رہ سکتا تو ان دونوں طرز میں سے اس کے لیے ایک بھی کارآمد نہیں تو بظاہر یہ غریب کی اطلاع کر کے ہم سے جواب لو۔ دیکھو اگر طبیب کوئی علاج بتلائے تو اول اس کو برتا جاتا ہے پھر اس کی نسبت مفید یا غیر مفید ہونے کی رائے قائم کی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ نسخہ سنتے ہی اس کو رد کر دیا جائے۔ اسی طرح جو علاج یہاں بتلایا جا رہا ہے اول اس کو استعمال کروا سکے بعد پھر شبہ ... اب میں وہ مرض اور علاج بتلاتا ہوں اور تحدیث بالنعمۃ کے طور پر یہ بھی ظاہر کرتا ہوں کہ ان

آیتوں سے جو بات اسی وقت بیان کرتا ہوں اس کے قبل یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی تھی یہ علم تھوڑا ہی زمانہ ہوا کہ عطا ہوا ہے اور چونکہ بے حد مفید تھا اس لیے جی چاہا کہ ع

حلوا بہ تنہا نبایست خورد

(حلوا تنہا نہ کھانا چاہیے)

سو وہ مرض یہ ہے کہ بسا اوقات انسان گناہ کو چھوڑنا چاہتا ہے لیکن وہ نہیں چھوڑتا' یعنی دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں کہ گناہ کی پرواہ ہی نہیں کرتے اور بعض وہ ہیں کہ گناہ کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن وہ پھر ہو جاتا ہے پھر چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے بعد پھر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بعضوں کی تمام عمر اسی میں گزر جاتی ہے لیکن پھر بھی وہ اس سے نہیں چھوٹتا' سو اول تو معصیت خود مرض دوسرے اس کی معاودت مرض پھر اس میں کچھ معصیت کے اثر سے بھی اور کچھ ارادہ ترک میں ناکامی کی وجہ سے بھی کوفت ہوتا کہ یہ جسمانی اذیت ہے پھر ممتد اتنا کہ عمر بھر نہیں چھوٹتا جس سے عمر بھر یہ تکلیفیں جمع رہتی ہیں۔ چنانچہ مجھ سے ایک بوڑھے شخص نے اپنی حالت بیان کی کہ میں ایک مرض میں ابتدائے عمر سے مبتلا ہوں اور اس وقت قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوں لیکن ابھی تک وہ مرض موجود ہے وہ بیچارے کہتے ہوئے شرماتے تھے مگر چونکہ اس کے ضرر کو جانتے تھے اس لیے باوجود شرم کے کہہ رہے تھے کیونکہ ع

نتواں نہفتن درد از طبیبان

(طبیبوں سے مرض چھپایا نہیں جا سکتا)

میں طبیب ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن وہ ایسا سمجھتے تھے اور جب کوئی مشفق خیر خواہ جاننے والا مل جائے تو ایسے موقع پر پھر چھپانا نہ چاہیے کیونکہ یا تو اس لیے ہوتا محروم ہی رہا حالانکہ

ہنوز آں ابر رحمت در فشانست خم و خمخانہ با مہر و نشانست

(ابھی تک وہ رحم کا بادل موتی برسا رہا ہے شراب کا مٹکا اور میخانہ سب پر مہر اور نشانی لگی ہوئی ہے) اور ؎

چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

(اللہ تعالیٰ کے دستر خوان پر دوست دشمن سب برابر ہیں)

تو ایسوں کے لیے کونسی تدبیر ہونا چاہیے جو ان کو بھی سہل ہے سو الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ اول خدا تعالیٰ نے وہ تدبیر بلا واسطہ قلب میں ڈالی اور پھر اس پر اس قدر اطمینان ہوا کہ اس میں ذرا شک و شبہ باقی نہ رہا جس کے بعد اپنے بہت احباب کو بتلایا اور خود بھی اس کو برتا اور آزمایا' سو بحمد اللہ مفید ثابت ہوا اور

بالکل حق الیقین ہو گیا کہ یہ نافع ہے اس کے بعد خدا تعالیٰ کا دوسرا فضل یہ ہوا کہ ابھی تک اس میں جو ایک کمی تھی کہ وہ معالجہ بوجہ اس کے کہ علوم القائیہ ظنی ہوتے ہیں اور تجربہ میں احتمال خصوصیت مزاج کا بھی ہوتا ہے۔ ظنی سمجھا جاتا تھا آج وہ بھی جاتی رہی اور آج ہی قرآن مجید میں اس معالجہ کا منصوص اور مفید ہونا معلوم ہو گیا۔ اگرچہ اس معنی کر اب بھی ظنی ہے کہ اس آیت کی دوسری تفسیر بھی ہو سکتی ہے مگر ثبوتاً تو مظنون نہیں رہا گو دلالۃ مظنون ہو تو وہ تدبیر وہ ہے جو اس آیت میں بتلائی گئی ہے۔

ملکات اعمال

اب میں اول آیت کا ترجمہ کرتا ہوں۔ اس آیت کے قبل بعضی وعیدوں اور بعضے گناہ کرنے والوں کی حالت کا بیان ہے اس کے بعد فرماتے ہیں: "اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ الخ" جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہ کا علاج توبہ ہے مگر اس کو سن کر آپ سامعین بد اعتقاد نہ ہو جائیں کہ یہ تو معمولی بات نکلی جو پہلے سے موہوم ہے سو ابھی بات تم نے سنی نہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے تو ان کے گناہوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا تو خدا تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کے باب میں (جبکہ اس کے شرائط بھی پائے جائیں جن میں ایک ایمان ہے کیونکہ کافر کی توبہ مقبول نہیں اور دوسرا عمل صالح ہے) یہ فرمایا ہے کہ اس کی برائیاں مبدل بہ حسنات ہو جائیں گی اور یہ دوسری شرط یعنی عمل صالح قبول توبہ کے لیے تو نہیں کیونکہ بالا جماع خود گناہ معاف ہونے میں اس کی ضرورت نہیں کہ دوسرے نیک عمل بھی کرے صرف توبہ بطرقیہا ئے کافی ہے لیکن "اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ" (یہی وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نیکیاں عطا فرمادیتے ہیں) میں اس دوسری شرط کی ضرورت ہے اور تفسیر اس تبدیل سیات کی مختلف ہے اور یہ مسئلہ اس آیت سے اس تفسیر کی بنا پر ماخوذ ہے جو میں عرض کر رہا ہوں۔ دوسری تفسیر کی بنا پر نہیں لیکن اگر کوئی دوسری تفسیر کو بھی اختیار کرے تو ہمارے مقصود میں مضر نہیں کیونکہ اس علاج کا نافع ہونا تجربہ سے بھی ثابت ہو چکا ہے تو ایک تفسیر تو اس کی یہ ہے کہ قیامت کے دن بعض بندوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا کہ اول ان کے بعضے گناہ ظاہر کیے جائیں گے اور وہ ڈریں گے کہ اب دوسروں کی نوبت آئے گی مگر رحمت سے ان کو کہا جائے گا کہ اچھا ہم نے گناہوں کو معاف کیا اور ان کے برابر نیکیاں تم کو دیں اس وقت وہ بندہ عرض کرے گا کہ یا الٰہی میں نے تو اور بھی گناہ کیے ہیں تو بعض نے اس قصے سے اس کی تفسیر کی ہے مگر یہ تفسیر میرے نزدیک اس لیے مرجوح ہے کہ خود اس حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملہ سب کے ساتھ نہ ہوگا اور یہاں ہر تائب کے لیے یہ حکم فرمایا گیا

ہے تو راجح تفسیر وہی ہوئی جو میں عرض کرتا ہوں اور وہ بھی سلف سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ سیات سے مراد ملکات سیات ہیں اور حسنات سے مراد ملکات حسنات ہیں۔

یعنی ہر عمل کے دو مرتبے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اس کو تکلف سے کیا جائے یا اتفاقاً صدور ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کا ملکہ ہو جائے۔ اول کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بچہ اتفاق سے ایک جیم نہایت اچھی لکھ دے تو یہ ملکہ نہیں بلکہ اتفاق ہے۔ میرے ایک عزیز نے ایک مرتبہ بے ساختہ ایک شعر لکھ دیا تھا کہ جو نہایت ہی لاجواب تھا لیکن ایک کے بعد پھر دوسرا باوجود تعب کے بھی نہیں لکھ سکے وہ شعر یہ تھا۔

نظر جب سے آئی نہیں تیری صورت　　　عجب قابل دید ہے میری صورت

تو یہ شعر تو اتنا عجیب ہے کہ لاثانی ہے مگر چونکہ ان کو فن میں علماً وعملاً ملکہ نہ تھا اس لیے خود اس کی بھی خبر نہ تھی کہ یہ شعر ممتنع النظیر ہے۔ چنانچہ جب دوسرے شعر سے عاجز ہو کر تنگ ہو گئے تو اپنے استاد سے جا کر عرض کیا' انہوں نے کہا ظالم! اس میں تیری میری قافیہ ہے تو قافیہ کہاں سے لائے گا۔ علی ہذا میرے ایک دوست نے اپنے وعظ میں لکھنؤ کے ایک سقے کا ایک مصرعہ سنایا تھا کہ اس کے سامنے کسی نے بارش کے وقت ایک مصرعہ پڑھا تھا۔

اگر یوں ہی پانی برستا رہے گا

تو اس سقے نے فوراً دوسرا مصرعہ کہا کہ۔

تو کاہے کو گلیوں پھرتا رہے گا

یہ تو سب اتفاقیات ہیں یا اسی طرح کوئی تکلف کر کے کہہ دے تو وہ ہر دفعہ نہ کہہ سکے گا اسی طرح اعمال حسنہ بھی کبھی تو تکلف سے ادا ہوتے ہیں جیسے بعض کو نماز کی عادت نہیں ہوتی مگر مارے باندھے پڑھتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم ایک مرتبہ تہجد کے وقت مسجد میں تشریف لائے سب پڑے سوتے تھے آپ نے ان کو ڈانٹا کہ کمبخت پڑے سوتے ہیں اور تہجد نہیں پڑھتے' تو سب کے سب خوف سے اٹھ کر بے وضو ہی پڑھنے لگے لیکن چونکہ عادت نہ تھی بس ایک ہی دن میں ختم بھی کر دی یا جیسے ساڈ ہورہ کے ایک پیرزادے کا واقعہ ہے کہ ان کو ایک مولوی صاحب نے زبردستی نماز میں کھڑا کیا' نیت بندھوائی تو ان پیرزادے نے نیت میں یہ بھی کہا کہ نماز ظہر کی منہ طرف قبلہ کے ظلم اس مولوی صاحب کا۔ واقعی بعض لوگ تو محض ظلم ہی سے نماز پڑھتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے بعض کالج ایسے ہی ہیں کہ وہاں کے اکثر طالب علم محض ظلماً ظلمی نماز

پڑھتے ہیں تو یہ عمل تکلف سے تھا اور ایک عمل ہوتا ہے ملکہ کے بعد جس سے قلب میں خود تقاضا نیکی کا پیدا ہوتا ہے علیٰ ہذا گناہ سے بچنا بھی کہ اس میں بھی کبھی تو ملکہ کا درجہ ہوتا ہے اور کبھی محض تکلف سے اجتناب ہوتا ہے تو صدور بھی دو طرح ہوا اور اجتناب بھی دو طرح ہوا۔

عمل بے ملکہ

تو جو عمل بے ملکہ کے ہوگا اس کو پائیداری نہیں ہوگی اس کی حالت یہ ہوگی کہ ع

اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند

اور جو عمل ملکہ کے ساتھ ہوتا ہے اس کو دوام ہوتا ہے۔ عراقی رحمۃ اللہ علیہ اسی کی تمنا میں کہتے ہیں۔

صنما رہ قلندر سزدار بمن نمائی　　　که دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(اے محبوب میرے لیے قلندروں والا راستہ یعنی عشق کا راستہ مناسب ہے وہی راستہ مجھے دکھادے کیونکہ پارسائی پرہیزگاری یعنی شریعت کا راستہ تو بڑا لمبا ہے)

یعنی وہ محبت اور عشق کا رستہ دکھادے جس سے عمل پر رسائی ہو اور یہ تکلف کی پارسائی کا رستہ تو بہت دور دراز ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک گاڑی کو تو مزدور لے جائیں جب چھوڑ دیں گے کھڑی ہو جائے گی اور ایک کو انجن لے جائے جس میں اسٹیم بھری ہو۔ بس یہی فرق ہے تکلف اور ملکہ میں۔ اب سمجھئے! کہ ہر شخص جس میں ذرا بھی تدین ہوگا گناہ کو چھوڑتا چاہے گا مگر اکثر دیکھا جاتا ہے کہ پھر بھی نہیں چھوٹ سکتا بلکہ کشاکش ہوتی ہے تو وجہ اس کی یہی ہے کہ اس کا ملکہ حاصل نہیں اور جس عمل میں ملکہ مساعد نہ ہوگا اس کا فعل یا ترک دونوں نہایت دشوار ہوں گے کیونکہ ملکہ تو ہے اور بات کا اور کوشش کرتا ہے اس کے خلاف کی تو دشواری ہی ہوگی تو اصل تدبیر یہ ہے کہ اول گناہ کا ملکہ کم کیا جائے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ زیادہ کھانے سے گناہ کا صدور ہوتا ہے تو اس کو دور کرو اور اس کے دور کرنے کے لیے بظاہر عمر سے بایہ کیونکہ جتنا پرانا مرض ہوتا ہے اتنا ہی طویل زمانہ اس کے زائل ہونے کے لیے بھی چاہیے وہ جلد زائل نہیں ہوتا چنانچہ مشہور ہے کہ جب محمود غزنوی رحمۃ اللہ ہندوستان میں آئے تو سومنات میں ایک ہندو کو ایک بت کے سامنے مراقب بیٹھا ہوا دیکھا' ایک سپاہی نے للکار کر اس سے کہا کہ کہو لا الہ الا اللہ ورنہ تلوار سے گردن اڑائے دیتا ہوں اس نے کہا ذرا ٹھہرو کہتا ہوں جب تلوار ہٹالی تو چپ ہو رہا' کئی مرتبہ ایسا ہی ہوا' سپاہی نے کہا تو کئی بار حیلے کر چکا ہے اب کی بار میں نہ چھوڑوں گا ورنہ کلمہ پڑھ تب اس ہندو نے کہا کہ میاں سپاہی چاہو مارو چاہو چھوڑو اتنی جلدی تو کلمہ نہیں پڑھ سکتا۔ دیکھو میری عمر نوے برس کی ہے تو نوے برس کا رام تو نکلتے ہی نکلتے نکلے گا' مسلمان تو ہو جاؤں گا مگر مجھے دو چار دن کی مہلت دو! دیکھو! پرانا مرض اس دشواری سے جاتا ہے۔

ایک تائب چور کی حکایت

ایک اور حکایت یاد آئی کہ ایک چور کسی بزرگ سے بیعت ہوگیا اور چوری سے توبہ کی اور خانقاہ میں رہنا شروع کیا۔ جب رات ہوتی تو چوری کا جوش ہوتا مگر عہد یاد آتا تو طبیعت کو روکتا' آخر جب طبیعت بہت بے چین ہوتی تو اٹھتا اور تمام لوگوں کے جوتے اِدھر سے اُدھر' اُدھر سے اِدھر کر دیتا اور پھر سو جاتا' تمام لوگ سخت پریشان ہوتے' آخر ایک دن لوگوں نے ان کو دیکھ لیا اور پکڑ کر پیر صاحب کے پاس لے گئے۔ پیر صاحب نے پوچھا کہ بھائی یہ کیا حرکت ہے تو نے تو توبہ کر لی تھی کہنے لگا جناب میں نے چوری سے توبہ کر لی ہے ہیرا پھیری سے نہیں کی۔ بات یہ ہے کہ میں رئیس السارقین ہوں پچاس برس کی بری عادت ہے ہر روز رات کو قلب میں تقاضا پیدا ہوتا ہے مگر چونکہ آپ سے عہد کیا ہے اس لیے روکتا ہوں' جب تقاضے سے مجبور ہوتا ہوں تو نفس کو اس پر راضی کرتا ہوں کہ لوگوں کے جوتے اِدھر سے اُدھر کر دوں گا یہ بھی ایک قسم کی چوری ہے اب آپ کو اختیار ہے اگر آپ اس کو چھڑائیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ میں پھر چوری کرنے لگوں گا' پیر صاحب نے کہا کہ اچھا تم کو ہیرا پھیری کی اجازت ہے۔ تو جس چیز کا ملکہ ہوتا ہے وہ ضرور بار بار عود کرتا ہے۔

احوال سلوک

اور یہاں ایک فائدہ بطور جملہ معترضہ کے ہے وہ یہ کہ کبھی سالک کو بعد خلوات و ریاضت کے بھی میلان ہوتا ہے۔ معاصی کی طرف اور اس میں آکر شیوخ پریشان ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اذکار و اشغال سب بیکار ہو گئے کامیابی نہیں ہوئی سو یہ غلط ہے۔ ذکر و شغل نافع ہوا لیکن اس کا نفع یہ نہیں ہے کہ میلان بھی نہ رہے البتہ جو تقاضا قبل مجاہدہ ہوتا تھا کہ اس کا دفع و مقابلہ دشوار تھا۔ اب مقابلہ آسان ہے۔ باقی نفسی میلان وہ گاہ گاہ ہو سکتا ہے اور اس میں دھوکہ اس سے ہو جاتا ہے کہ اکثر ابتداء سلوک کی حالت میں بالکل میلان نہیں رہتا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ منتہی کو بدرجہ اولیٰ نہ ہونا چاہیے حالانکہ یہ قیاس غلط ہے کیونکہ سالک کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اول اول ولولہ میں اس کو گناہ سے سخت نفرت ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس وقت ذکر کی لذت کا غلبہ ہوتا ہے اور پھر یہ لذت اخیر تک نہیں رہتی جیسا کہ ہر کام کا قاعدہ ہے کہ ابتداء میں اس میں لذت ہوتی ہے اور اس کا غلبہ ہوتا ہے پھر آخر میں مساوات سی ہو جاتی ہے۔ اسی مضمون کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ ایک مرتبہ ایک مرید کے جواب میں کہ انہوں نے سابق جیسی لذت ذکر میں نہ ہونے

کی شکایت کی تھی بطور لطیفہ کے فرماتے تھے کہ میاں پرانی جورو ماں ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ لذت کا جوش جو ابتداء میں ہوتا ہے وہ اخیر میں نہیں رہتا۔ پس بیوی کے متعلق اتنا ہی کام رہ جاتا ہے کہ ماں کی طرح وہ ان کی خدمت کرے۔ ایک بھولے سیدھے نواب صاحب کی حکایت سنی ہے کہ ان کی بیوی مرگئی تھی۔ کلکٹر تعزیت کے لیے آئے اور کہنے لگے کہ ہم کو افسوس ہوا کہ آپ کی بیوی مرگئی۔ اس پر نواب صاحب فرماتے ہیں کہ جناب وہ بیوی نہ تھا ہماری اماں تھی۔ اسی طرح ابتدائی ذکر میں لذت ذکر کا جوش ہوتا ہے اس وقت ترک معاصی تو کیا ذکر ہے ترک آباء وترک ازدواج اور ترک اہل تک کی سوجھتی ہے مگر اس جوش کی مثال صبح کاذب کی سی ہے اس میں ضیاء تو صبح صادق سے زیادہ ہوتی ہے مگر اس کو بقاء نہیں ہوتا اسی کو فرماتے ہیں ۔

ای شدہ تو صبح کاذب را رہیں! صبح صادق را زکاذب ہم بہ بیں!

(اے شخص تو صبح کاذب کے پیچھے ہی لگ گیا ہے صبح صادق اور صبح کاذب میں فرق دیکھ)

کہ تم تو صبح کاذب کے مرہون ہوگئے اس کو چھوڑ و اور کاذب و صادق میں تمیز پیدا کرو! دیکھو ایک پھول وہ ہوتا ہے جو آ کر جھڑ جاتا ہے اور اس کے بعد پھر اصلی پھول آتا ہے جس پر پھل آتا ہے۔ اسی طرح ایک حالت راسخ ہوتی ہے اور ایک عارض۔ تو ابتداء میں جو حالت ہوتی ہے وہ قائم اور باقی اور صادق حالت نہیں ہوتی۔ البتہ اگر ترک ذکر نہ کرے تو اس کے بعد جو حالت پیدا ہوگی وہ صادق ہوگی اور وہ مقام کہلاتا ہے۔ مگر اس میں جوش وخروش اور ولولہ نہ ہوگا اس کی حالت پختہ ہنڈیا کی سی ہوگی کہ اس میں نہ غلیان ہوتا ہے نہ شور ہوتا ہے۔ اسی لیے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے جب پوچھا گیا کہ "ماالنھایۃ" (انتہا کیا ہے؟) تو فرمایا "العود الی البدایۃ" (ابتداء کی طرف لوٹنا) یعنی ایسی حالت ہوجاتی ہے کہ عوام الناس تو یہ سمجھیں کہ یہ عوام میں داخل ہیں اور خواص واقفین یہ جانیں کہ یہ خواص میں سے ہیں۔ جیسے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حالت تھی کہ وہ بالکل عوام میں ملے چلے رہتے تھے' بازاروں سے جا کر ترکاری بھی لے آتے تھے تو انتہا میں جوش وغیرہ تو جاتا رہتا ہے لیکن ایک دوسری قسم کی حلاوت لطیف پیدا ہوتی ہے۔ پہلی حالت کی مثال گڑ کی شیرینی کی سی ہے اور دوسری حالت کی مثال قند کی شیرینی کی سی ہے کہ گڑ کی شیرینی کا ادراک تو ہر عام شخص کو بھی ہوتا ہے لیکن قند کی شیرینی چونکہ لطیف ہے اس کا کامل ادراک ہر شخص کو نہیں ہوتا صرف لطیف المزاج ہی لوگوں کو ہوتا ہے۔ دیوبند میں شیخ کرامت حسینؒ نے اپنے فرزند کی شادی کی تو اس میں چماروں کو بھی جو کہ بیگار میں آئے تھے کھانا دینے کا حکم دیا'

کھانے کے ساتھ فیرنی تھی جب فیرنی سامنے آئی تو چکھ کر چمار کہتے ہیں یہ تھوک سا کیا ہے؟ تو جیسا ان چماروں نے فیرنی کی شیرینی کو نہیں سمجھا اسی طرح عامی بھی منتہی کی حالت کو نہیں سمجھ سکتے

درنیابد حال پختہ ہیچ خام　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

(جو ابھی درویشی میں کچا ہے وہ پختہ اور کامل درویشوں کے حالات کو نہیں سمجھ سکتا بس ٹھیک بات تو یہی ہے کہ ان کے ساتھ بحث و مناظرہ نہ کیا جائے بلکہ انہیں ان ہی کے حال پر چھوڑ دیا جائے)

اس شعر سے ایک نیا مسئلہ اس وقت یہ بھی سمجھ میں آیا کہ پختہ لوگوں کو چاہیے کہ خام سے گفتگو نہ کیا کریں کیونکہ وہ ان کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا اور اس کی تائید اس شعر سے ہوتی ہے۔

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(جو خواہ مخواہ درویشی کے دعویدار ہوں ان سے عشق و مستی کی راز کی باتیں مت کہو ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو تا کہ وہ اپنی اسی خود پرستی میں ٹھوکریں کھاتے رہیں)

کہ ان منکرین کو شبہات ہی میں مرنے دو ان سے اسرار عشق نہ کہو تو عوام کو منتہی کی حالت کا ادراک نہیں ہوتا کیونکہ منتہی میں جوش و خروش نہیں رہتا۔ چونکہ غلبہ لذت ذکر نہیں رہتا اور جب اس لذت کا غلبہ نہیں رہتا اور یہی لذت غالب تھی میلان الی المعصیۃ پر اس لیے کبھی کبھی معاصی کی طرف میلان ہو جاتا ہے اور ناواقفی سے اس وقت سالک کو سخت شکستہ دلی ہوتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میری محنت و مجاہدہ بالکل بیکار رہا حالانکہ اس کو شکستہ دل نہ ہونا چاہیے کیونکہ میلان الی المعصیۃ مذموم نہیں اصل مذموم تو معصیت ہے اور مفضی قریب الی المذموم تقاضائے معصیت ہے اس لیے اس کو بھی زائل کیا جاتا ہے اور مجاہدے کے بعد تقاضا باقی نہیں رہا اور جب تقاضا باقی نہیں رہا تو معلوم ہوا کہ یہ ناکام نہیں بلکہ کامیاب ہے۔ ہاں! اگر پھر تقاضا ہونے لگے تو پھر مجاہدہ کرے۔ خیر یہ ضمن میں ایک بات بطور جملہ معترضہ کے یاد آ گئی تھی اس کو بھی عرض کر دیا۔

بدل مجاہدہ

مگر بالا صالۃ یہ کہہ رہا تھا کہ قاعدہ کے موافق اتنے مجاہدوں کے بعد تبدیل ملکہ میں کامیابی ہوتی ہے مگر ظاہر ہے کہ ہر شخص مجاہدہ کے لیے آمادہ نہیں ہے تو پھر ایسے لوگوں کے لیے اس تبدیل کی کیا تدبیر ہے اور ضرورت اس تبدیل کی اوپر ثابت ہو چکی ہے کہ بدون اس کے معاصی سے بچنا سخت دشوار ہے سو خدا کا فضل ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے اس آیت سے یہ سمجھ میں آیا کہ توبہ کرنے میں بھی

وہی خاصیت ہے جو مجاہدہ میں ہے یعنی جس مجاہدے نے ملکہ معصیت کو جو کہ منشا گناہ کا تھا بدل دیا تھا اور جس کا اثر یہ ہوا تھا کہ گناہ کا تقاضا نہ رہا تھا اس مجاہدے کے قائم مقام یہ ایک بے مشقت بوٹی ہے یعنی توبہ جس کے لیے کہیں جانا بھی نہیں پڑتا اور جس کے عامل کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ؎

خلوت گزیدہ رابہ تماشا چہ حاجت ست چوں کوئی دوست ہست بہ صحرا چہ حاجت است

(جس نے خلوت وتنہائی کا مزہ چکھ لیا وہ ہنگامہائے حیات سے بے نیاز ہے اور جو کوچہ جاناں سے آشنا ہو گیا اس کا جنون صحرا و بیابان کی تلاش نہیں کرتا)

اور جس کی نسبت یہ کہا جائے گا کہ ؎

سمست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدہ درد دل کشابہ بہ چمن درا

(اگر تجھے جذبہ عشق ومحبت اب بھی چمن کے رنگ و بو کی طرف کھینچ لے جائے تو افسوس ہے تو خود ایک حسین غنچے کی طرح کھلا ہوا ہے اپنے دل کا دروازہ کھول اور اس باغ و بہار کی سیر کر)

اور یہ کہیں گے ؎

اے برادر عقل یکدم باخود آر دمبدم در تو خزاں ست و بہار

(اے بھائی عقل کو کام میں لا اور سوچ تو ہی بہار اور خزاں تو ہمہ اوقات تیرے اندر موجود ہیں)

اس سہل نسخہ کی نسبت الحمدللہ کہ امتحان سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اس میں وہی اثر ہے جو مجاہدہ میں ہے اور مجھے افسوس ہوتا ہے جب دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ معالجہ نہیں آتا۔ صاحبو! امتحان تو کرو! اور بحمداللہ میں نے تو اپنے دوستوں پر اس کا امتحان کر کے آپ صاحبوں کے سامنے پیش کیا ہے اور امتحان اس طرح کیا گیا کہ خاص دوستوں کو یہ کہا گیا کہ جب گناہ ہو جایا کرے توبہ کرلیا کرو، اگر پھر ہو جائے پھر توبہ کرلو پھر ہو جائے پھر توبہ کرلو۔ غرض جب گناہ کا ارتکاب ہو جائے تو فوراً توبہ کرلیا کرو، انشاءاللہ تعالیٰ ایک دن وہ آئے گا جو گناہ کے مادہ کا بالکلیہ قلع قمع ہو جائے گا۔ دیکھیے! اس میں نہ ہلدی لگی نہ پھٹکری۔

تاثیر توبہ

اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ بار بار جو توبہ کرنے کا حکم ہے اس میں یہ بھی ایک مصلحت ہے۔ افسوس ہے کہ بعض لوگ اس کی قدر نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ شریعت نے یہ ایک تسہیل کو ہم کو بتلا دیا ہے۔ صاحبو! اس علاج کا اثر یہ ہے کہ وہ گناہ ساری عمر چلے گا ہی نہیں کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ آدمی بار بار توبہ کرے اور پھر گناہ چلتا رہے۔

تبدیل ملکہ کا طریقہ

بار بار توبہ کرنے کی نسبت فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوْا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَافَعَلُوْا ○

''اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں زیادتی ہو اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو؟ اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے۔''

حدیث شریف میں ہے: ''مااصر من استغفروان عادفی الیوم سبعین مرة'' (جو توبہ کرتا رہتا ہے پھر چاہے وہ دن میں ستر مرتبہ گناہ کر بیٹھے گناہ پر اصرار کرنے والا نہیں) صاحبو! کیا بھی کوئی مشکل بات ہے کہ جب گناہ ہو گیا توبہ بھی کر لی' دیکھو جب گناہ کرتے ہو تو کس توجہ سے کرتے ہو کہ پیر بھی ہلاتے ہو ہاتھ بھی ہلاتے ہو' ارادہ بھی کرتے ہو اگر توبہ میں بھی ذرا زبان اور قلب کو حرکت دے لیا کرو تو کیا دشوار ہے؟ اصل یہ ہے کہ جب شیطان نے دیکھا کہ یہ تو بڑا چلتا ہوا نسخہ ہے اور سب ہی اس کا استعمال کر لیں گے اور میری ساری کوشش جو گناہ کرانے میں ہوئی تھی مٹ جائے گی تو اس نے ہم کو اس طرح گمراہ کیا کہ اس علاج کی وقعت ہی دلوں سے نکال دی اور یہ سمجھا دیا کہ جب پھر گناہ ہو جائے گا توبہ سے کیا فائدہ؟ چنانچہ عام طور سے سب اس میں مبتلا ہیں کہ توبہ اس وقت کرتے ہیں جبکہ بالکل ہی ترک کا یقین کر لیتے ہیں اور جب تک یہ اندیشہ رہتا ہے کہ پھر ہو جائے گا تو توبہ ہی نہ کریں گے۔ صاحبو! توبہ ہر حالت میں کرنا ضروری اور مفید ہے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر کافر و گبرو بت پرستی باز آ
ایں درگہ مادر گہ نومیدی نیست	صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(تو پھر آ تو پھر آ تو جیسا بھی کچھ ہے پھر آ اگرچہ کافر یا بت کا پوجنے والا ہے پھر بھی آ جا۔ ہمارا یہ دربار نا اُمیدی کا دربار نہیں۔ سو دفعہ بھی اگر تو توبہ کو توڑ چکا ہے پھر بھی آ جا)

علاوہ اس کے میں کہتا ہوں کہ اندیشہ ابتلاء فی المعصیة کی صورت میں اگر بالفرض توبہ مفید بھی نہ ہوتی جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے تب بھی توبہ کر لینے میں کوئی حرج بھی تو نہیں ہے اور اس سے کوئی نقصان بھی تو نہ ہو جائے گا۔ مثلاً اگر ایک شخص دن میں پانچ مرتبہ شراب پیتا ہے اور ہر دفعہ توبہ کر لے تو اس کا نقصان کیا ہوا۔ غرض انتہائے مرتبہ پر پہنچ کر میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کے خیال کے موافق اس میں

کوئی نفع بھی نہیں لیکن کوئی نقصان بھی تو نہیں ہے۔افسوس کہ ایسی اکسیر کی پڑیہ مگر شیطان برتنے نہیں دیتا۔صاحبو! یہ عمل دس پانچ مرتبہ کر کے تو دیکھو واللہ یقیناً گناہ چھوٹ جائیں گے میں صدائے عام دیتا ہوں کہ جس گناہ کو کوئی شخص چھوڑنا چاہے اس کے لیے کافی تدبیر ہے کہ جب وہ ہو جایا کرے فوراً ہی اس سے توبہ کرلیا کرے۔کیا کسی نے کبھی ایسا سہل علاج سنا ہے۔یہ ہیں قرآن شریف کے علوم جوامت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو عطا ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہر گناہ کے بعد ضرور توبہ کرلیا کرے اس سے ان کے برے ملکات مبدل بہ ملکات حسنہ ہو جائیں گے۔اس کو فرماتے ہیں:
"فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ" (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گذشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا) یہ وعدہ ہے جو قرآن کریم میں کیا گیا ہے اور اگرچہ آیت شریفہ کی دلالت اس پر ظنی ہے لیکن یہ تفسیر دوسری تفسیر سے راجح ہے اور دوسری تفسیر اس کے مقابلے میں مرجوح ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے۔بتلایئے اس علاج میں کیا دشواری ہے چونکہ مسلمانوں میں یہ مرض عام ہے کہ وہ گناہ کے چھوڑنے کو سخت دشوار سمجھتے ہیں اس لیے میں نے اس کو یہ علاج بتادیا کہ بار بار توبہ کرلیا کرو۔

توبہ کا طریقہ

مگر توبہ بھی اسی طرح کی ہو کہ جس طرح سے ذات پاک نے ہم کو بتلائی ہے اور اس کی تعلیم ہم کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے پہنچی ہے اور وہ طریقہ موافق حدیث کے یہ ہے کہ اول وضو کرو اور دو رکعت پڑھو اور خوب دل لگا کر دعا مانگو اور دل لگانے کا ارادہ کرو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ دل بھی لگنے لگے گا۔باقی یہ سوال کہ اگر دل نہ لگے تو کیا کریں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ اگر ایسا ہے جیسا امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد کا تھا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں جب کہ سب اپنی اپنی پوچھ رہے تھے ان سے کہا کہ تم کبھی کچھ نہیں پوچھتے' کہنے لگے کہ اب کے پوچھوں گا۔امام صاحب نے اثنائے تقریر میں اتفاقاً یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ جب سورج چھپ جائے تو روزے کے افطار میں تاخیر نہ کرے' آپ سن کر فرماتے ہیں کہ کیوں حضرت! اگر کسی دن سورج نہ چھپے تو کیا کرے؟ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہاں! بھائی تمہارا ساکت ہی رہنا اچھا ہے جس طرح سے ایک ساس بہو کی حکایت مشہور ہے کہ بہو بالکل ہی نہیں بولتی تھی۔ساس نے کہا کہ بہو بولا کرو ورنہ لوگ گونگا کہیں گے' آخر کہنے سننے سے بولی تو یہ کہا اماں! اگر تمہارا لڑکا مر گیا تو میرا دوسرا بیاہ بھی کرا دو گی؟ اس نے کہا بس بھائی ایسے کا خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔تو جیسا حال امام صاحب کے اس شاگرد کا تھا ویسا ہی اگر آپ کا بھی ہے۔صاحبو! پہلے عمل کر کے تو دیکھو پھر دیکھنا دل

لگتا ہے یا نہیں ممکن نہیں کہ ایک شخص خدا تعالیٰ کے سامنے دیر تک متوجہ ہو کر بیٹھے اور دل نہ لگے انشاء اللہ تعالیٰ ضرور دل لگے گا اور جب دل لگنے لگے تو دعا اور استغفار کرو اور فارغ ہو جاؤ اور اگر وہ گناہ پھر ہو جائے پھر ایسا ہی کرو اس کے بعد دیکھو کہ وہ گناہ کیسا رفو چکر ہوتا ہے۔

توبہ کا مقناطیسی اثر

صاحبو! غضب ہے کہ محمد بن زکریا اگر ایک نسخہ بتلائے تو اس کا تو یقین کر لو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ کے بتلائے ہوئے نسخہ پر یقین نہ کرو تو کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ کا ارشاد (نعوذ باللہ) محمد بن زکریا کی رائے سے بھی کم ہے۔ اسی ارشاد کی ترجیح کی تعلیم فرماتے ہیں:

چند خوانی حکمت یونانیاں! حکمت ایمانیاں راہم بخواں!
صحت ایں حس بجوئید از طبیب صحت آں حسن بجوئید از حبیب
صحت ایں حس زمعموری تن! صحت آں حس زتخریب بدن!

(یونانی حکیموں کی باتیں تم نے بہت پڑھ لی ہیں اب ایمان والوں کی باتیں بھی پڑھو! جسمانی احسان کی درستی طبیب سے کراؤ اور ایمانی احساس کی درستی محبوب سے کراؤ' جسمانی احساس کی درستی جسم کی درستی ہوتی ہے اور ایمانی احساس کی درستی جسم سے بے نیاز ہو جانے میں ہے)

تخریب بدن کا مطلب یہ ہے کہ حظوظ نفسانیہ کو چھوڑ و' حرام کو بالکلیہ اور مباح کو انہماک کے درجے میں۔ صاحبو! اس میں ہرگز شک نہ کرو آزمانے ہی کے لیے چند روز تک کر دیکھو:

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں را یک زمانے خاک باش

(تو برسوں تک پتھر کی طرح دل کو زخمی کرنے والا بنا رہا ہے بھی آزما کر دیکھ لو کہ کچھ دیر کے لیے مٹی بن جاؤ)

یہ ہے طریقہ استعمال کا۔ اب یہ بات رہی کہ اس معالجہ کو اس مرض کے ازالہ میں دخل کیا ہوا اور یہ کیوں مؤثر ہے؟ سو اول تو یہ سوال ہی لغو ہے کیونکہ ممکن ہے اس میں بالخاصیۃ یہ اثر ہو جیسے مقناطیس میں جذب آہن کا اثر ہوتا ہے۔ دوسرے اگر یہ مؤثر بالکیفیۃ ہی ہو تو ہم نے جاننے کا کب دعویٰ کیا ہے۔ تیسرے اگر ہم جانتے بھی ہوں تو کیوں بتلائیں کیونکہ مریض کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں کہ گل بنفشہ کیوں مؤثر ہے اور اس کا کیا مزاج ہے؟ دیکھو! اگر کوئی بادشاہ کسی کو کچھ روپیہ عطا فرمائے اور وہ سوال کرے کہ یہ بتلایئے کہ یہ روپیہ ٹکسال میں کس طرح بنتا ہے تو اس کو گستاخ اور بے ادب سمجھا جائے گا لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی بتلائے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ نفس کو عبادت کا کرنا سخت ہوتا ہے اور تو بہ خصوص نفیس پڑھ کر یہ ایک گراں عبادت ہے پس جب کوئی شخص یہ التزام کرلے گا

کہ جب گناہ ہوجایا کرے ہر دفعہ توبہ بھی کیا کرے اور اس کے لیے وضو کیا کرے اور نفلیں پڑھا کرے تو نفس اس سے سخت پریشان ہوگا اور بآسانی صلح اس پر کرلے گا کہ میں اب گناہ نہ کروں گا اس کی بالکل ایسی حالت ہے جیسے شریر لڑکا کہ کسی طرح نہ مانتا ہو لیکن جب اس کے لیے میاں جی یہ تجویز کردیں کہ اس کے گلے میں اتنا بھاری پتھر ڈالو کہ اس سے اٹھ ہی نہ سکے تو وہ فوراً سیدھا ہوجاتا ہے تو نفس بھی اعمال صالحہ کو چونکہ بوجھ سمجھتا ہے اس لیے اس بوجھ کے رکھتے ہی گناہ سے باز آجاتا ہے اور اس کو عبادت سے یہاں تک گرانی ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اس نے بیان کیا کہ میں کسی مقام پر روپیہ دفن کرکے بھول گیا ہوں ہر چند یاد کرتا ہوں لیکن کسی طرح یاد ہی نہیں آتا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تم جاکر نفلیں پڑھنا شروع کرو اور جب تک روپیہ یاد نہ آئے برابر نفلیں پڑھتے رہو اس ترکیب سے انشاء اللہ بہت جلد یاد آجائے گا۔ چنانچہ اس نے جاکر نفلیں شروع کیں چند ہی نفلیں پڑھی تھیں کہ بہت جلد روپیہ کی جگہ یاد آگئی۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فراست سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ شیطان نے اس کو پریشان کرنے کے لیے روپے کی جگہ بھلادی ہے۔ جب یہ نفلیں پڑھے گا اور شیطان کو نفلیں پڑھنا ناگوار ہوں گی تو نفلوں سے روکنے کے لیے فوراً اس جگہ کو یاد دلادے گا مگر یہ دریافت کرنا بھی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا کام تھا کہ یہ شیطان نے بہکایا ہے۔ غرض نفس اور شیطان عبادت سے بہت گھبراتے ہیں۔

دوسری مثال اس کی ایسی ہے کہ جیسے بچے کے دودھ چھڑانے کے وقت اکثر چھاتیوں کو ایلوا لگادیتے ہیں کہ وہ جب دودھ پینے کا ارادہ کرتا ہے فوراً ہی تلخی منہ میں پہنچتی ہے بس وہ دودھ ہی چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح چونکہ عبادت بھی نفس کو سخت بار اور ناگوار ہوتی ہے اس لیے اس کی ناگواری کے اندیشے سے وہ اپنی مرغوب چیز یعنی معصیت کو چھوڑ دیتا ہے لیکن اس میں اتنا شبہ رہا کہ جب یہ علت ہے تو نفس کو تو ہر عمل صالح میں گرانی ہوتی ہے تو پھر توبہ ہی کی کیا تخصیص ہے؟ دوسرے اعمال کا بھی یہی اثر ہونا چاہیے۔ جواب یہ ہے کہ اول تو اوپر آچکا ہے کہ اس تبدیل کے لیے توبہ کے ساتھ دوسرے اعمال صالحہ بھی شرط عادی ہے دوسرے ممکن ہے کہ اور اعمال تو اپنی نوع کے اعتبار سے کہ وہ عمل صالح ہے مؤثر ہو اور توبہ اپنے مرتبہ شخص میں بھی مؤثر ہو۔

تیسرے توبہ میں یہ تو ضرور ہی کہے گا کہ میرا قصور معاف کردیجئے اور یہ طبعی بات ہے کہ جب کوئی اپنے کسی بڑے سے بار بار معافی چاہے اور آئندہ موافقت کا عہد کرے تو پھر اس کے خلاف کرتے ہوئے شرماتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ دل سے توبہ ہو کیونکہ اسی سے عہد کے یاد میں رسوخ ہوجائے گا اور اس سے طبعی طور پر حیاء غالب ہوگی۔

قطع راہ

چوتھی وجہ ایک اور ہے جو کہ قرآن شرف سے سمجھ میں آئی۔ یعنی اگلی آیت شریف میں فرماتے ہیں: "وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا" ترجمہ یہ ہے کہ (جو توبہ کرتا ہے اور عمل صالح کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہے) اب اس آیت شریفہ کے ساتھ حدیث شریف کو ملائیے! فرماتے ہیں: حدیث قدسی میں ہے:

مَنْ تَقَرَّبَ إِلَى شِبْرًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعًا وَمَنْ آتَنِي يَمْشِي اَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً[1]

"جو شخص میری طرف ایک بالشت برابر قریب ہو میں ایک ہاتھ کے برابر اس کے قریب ہوتا ہوں اور جو ایک ہاتھ برابر میرے قریب ہوگا میں ایک گز کے برابر اس کے قریب ہوتا ہوں اور جو شخص میرے پاس چل کر آتا ہے میں دوڑ کر اس کے پاس آتا ہوں۔"

(اور یہیں سے آپ کو یہ بھی کافی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ قرآن شریف سے بغیر استعانت حدیث شریف کے کسی مقصود کا اثبات کم ممکن ہے۔ جامع) یعنی خدا تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ جو شخص اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے خدا تعالیٰ اس سے زیادہ اس شخص کی طرف توجہ فرماتے ہیں اور اس توجہ سے وہ بعد جو وجوب اور امکان کے سبب سے تھا اور جس کی وجہ سے بندے کو خدا تک پہنچنا مصیبت تھا وہ جاتا رہتا ہے اور یہ بعد ہر چند کہ خدا تعالیٰ کی توجہ سے دور ہوتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کی توجہ کی شرط یہ ہے کہ بندہ متوجہ ہو اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بچہ ہے کمزور اور وہ باپ سے دور کھڑا ہے اب اگر وہ باپ تک پہنچنا چاہے تو وہ بدون اس کے ممکن نہیں کہ خود باپ آگے بڑھ کر اس کو اٹھالے کیونکہ درمیانی مسافت کو وہ بچہ قطع نہیں کر سکتا لیکن بعض اوقات باپ کی توجہ کی شرط یہ ہوتی ہے کہ بچہ ہاتھ پھیلا کر آنے کی کوشش کرے تو اسی طرح بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان جو بعد ہے وہ بندہ کے قطع کیے قطع نہیں ہوتا:

نہ گردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا ۔۔۔ کہ میبالد بہ خود ایں راہ چوں تاک ز بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے طے نہیں ہوتا بلکہ یہ آپ ہی آپ بڑھتا ہے جیسے شاخیں کاٹنے سے پودے بڑھتے ہیں)

تو جب یہ راہ قطع ہوگی تو خدا تعالیٰ ہی کی عنایت سے ہوگی مگر اس کے لیے شرط عادی ہے کہ بندہ کی طرف سے توجہ ہو اس لیے فرمایا ہے: "مَنْ تَقَرَّبَ إِلَى شِبْرًا" (جس نے بالشت برابر میرا قرب اختیار کیا)

---

[1] (مسند احمد ۲: ۴۱۳، کنز العمال ۱۱۷۹، الترغیب والترھیب ۴: ۱۰۴)

آغوشِ رحمت

غرض اس طرح خدا تعالیٰ اس کو آغوشِ رحمت میں لے لیتے ہیں۔ تو ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ جو توبہ کرے گا وہ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا جو آیت سے ثابت ہے اور دوسرا مقدمہ یہ ہوا جو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا خدا تعالیٰ اس کی طرف متوجہ ہوگا جو حدیث شریف سے ثابت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو توبہ کرے گا خدا تعالیٰ اس کی طرف متوجہ ہوگا اب اس کے ساتھ ایک اور مقدمہ ملائیے کہ جس کی طرف خدا تعالیٰ متوجہ ہوں گے وہ یقیناً اعداء کی دست برد سے محفوظ رہے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو توبہ کرے گا وہ اعداء (نفس وشیطان) کی دست برد سے محفوظ رہے گا۔ چنانچہ خود شیطان نے بھی ایسے لوگوں کو مستثنیٰ کیا تھا جبکہ کہا تھا: "لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ" (میں ضرور ضرور ان سب کو بہکاؤں گا سوائے ان کے جو تیرے مخلص بندے ہیں) اور معصیت اثر ہے نفس وشیطان کی دست برد کا۔ پس وہ اس سے محفوظ رہے گا اور عادۃً بدون تبدیل ملکات کے محفوظ مستبعد ہے۔ پس توبہ وعمل صالح پر اس طرح تبدیل ملکات مرتب ہوگیا اور یہی معنی ہیں اس کے

"إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنٰتٍ"

"اور جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل کرے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرماتے ہیں۔"

اب اس مسئلہ میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا ہر طرح اچھی طرح ثابت ہوگیا۔ اب میں مکرر اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں تاکہ یاد رہنا آسان ہو اور اسی پر بیان کو ختم کردوں گا۔

خلاصہ علاج

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص مجاہدہ نہ کرسکے اس کے لیے بھی خدا تعالیٰ نے ترک معاصی کا ایک علاج مقرر فرمایا ہے جو نہایت ہی سہل ہے یعنی جو طالب ہو اور مجاہدہ پر قادر نہ ہو وہ یہ کرے کہ جب گناہ ہوجایا کرے فوراً توبہ کرلیا کرے اور اگر معاودت ہوجائے پھر فوراً توبہ کرے۔ یہ ہے وہ علاج اور اگر اب اس سہولت پر بھی کوئی اس کو اختیار نہ کرے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس کی طینت ہی خراب ہے اپنی اصلاح ہی نہیں چاہتا تو اس کے لیے یہ کہا جائے گا:

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر   تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اور آخر میں یہ کہا جائے گا کہ (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

خاتمہ ودعا: اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ فہم دے۔ آمین

الجلاء للابتلاء

۲۶ محرم الحرام سنہ ۱۳۳۷ھ بروز جمعۃ المبارک کو دو گھنٹہ تک کرسی پر بیٹھ کر الجلاء للابتلاء کے عنوان پر بیان فرمایا۔ جامع مسجد تھانہ بھون میں یہ بیان ہوا۔ سامعین کی تعداد تقریباً یک صد تھی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

وَمَآاَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍO

(الشوریٰ آیت نمبر ۳۰)

ترجمہ: ''تم (اے گناہ گارو) جو کچھ مصیبت حقیقتاً پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھ کے کیے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے اور (اللہ تعالیٰ) بہت سے (گناہوں سے) تو درگزر ہی کر دیتا ہے۔''

تمہید

اس وقت مجھ کو تین مضمونوں کا بیان کرنا مقصود ہے چونکہ ان تینوں کو جمع کرنے والی کوئی حدیث یا آیت اس وقت میرے ذہن میں نہیں اس لیے کوئی آیت وغیرہ نہیں پڑھی۔ ان میں سے ایک مضمون تو یہ ہے کہ جس قدر مصیبتیں ہمارے اوپر آتی ہیں وہ اکثر ہمارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں مصرح ہے: ''وَمَآاَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ'' (جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھ کے کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے) اس لیے ہم کو ایسے وقت میں توبہ و استغفار سے کام لینا چاہیے اور اپنے اعمال کی اصلاح کا خیال کرنا چاہیے اور یہ مضمون گو آپ حضرات بارہا سن چکے ہیں مگر سننا اور چیز ہے اور گننا اور چیز ہے۔ سو یہ بات کانوں میں اگرچہ پڑ چکی ہے مگر اب تک گنا نہیں۔

فہم احناف

اور اس گننے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہے وہ یہ کہ ایک عالم ہدایہ کے حافظ تھے ایک دوسرے عالم ہدایہ کے تو حافظ نہ تھے مگر اس

کو سمجھے ہوئے زیادہ تھے۔ ایک مسئلہ انہوں نے بیان کیا اور یہ کہا کہ یہ مسئلہ ہدایہ میں ہے۔ وہ حافظ ہدایہ بولے کہ ہدایہ میں یہ مسئلہ نہیں ہے ان کو اپنے حفظ پر ناز تھا مگر دوسرے عالم نے ہدایہ کھول کر دکھلا دیا کہ فلاں جگہ سے یہ مسئلہ نکلتا ہے وہ مقام ان حافظ ہدایہ کو بھی یاد تھا مگر وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ اس مقام سے ایک دوسرا مسئلہ بھی نکلتا ہے جب ان کو مسئلہ سمجھا دیا گیا تو وہ حافظ ہدایہ یہ دیکھ کر رو پڑے۔ اس حکایت کے بعد مولانا نے فرمایا کہ ان دونوں میں سے ایک تو ہدایہ کو صرف پڑھے ہوئے تھے اور ایک ہدایہ کو گنے ہوئے تھے۔ سو دیکھ لو! پڑھنے میں اور گننے میں کتنا بڑا فرق ہے اور یہی فرق ہے درمیان علماء حنفیہ کے اور دیگر علماء کے خصوصاً شافعیہ وحنبلیہ کے۔ شافعیہ اگرچہ کثیر الروایت ہیں اور حنبلیہ تو اس صفت میں شافعیہ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں مگر فہم حنفیہ کو خدا نے ایسی دی ہے کہ دوسرے علماء ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ یہ بات میں سے بات ایسی نکال لیتے ہیں کہ حیرت ہو جاتی ہے گو ان کی نسبت سے قلیل الروایت ضرور ہیں اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ کمی ان میں ضرور رہ گئی مگر معانی کی خدمت ولذت میں وہ الفاظ حدیث کی زیادہ خدمت کرنے میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے اور یہ بات میں کوئی اعتقاداً نہیں کہتا بلکہ مخالفین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر من حیث لا یدرون چنانچہ ابن خلکان کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ کی نسبت لکھا ہے کہ امام صاحب کو کل سترہ حدیثیں پہنچی ہیں یہ قول اگرچہ کسی درجہ میں بھی صحیح ماننے کے قابل نہیں کیونکہ امام صاحب کے واسطہ سے جس قدر روایات موطا محمدؒ، آثار محمدؒ وغیرہ میں اس وقت موجود ہیں اگر ان کو ہی جمع کر لیا جائے تو وہ اس سے بدر جہا زیادہ نکلیں گی اور یہ ظاہر ہے کہ ان حضرات نے مسندات ابوحنیفہؒ کے احاطہ کا قصد نہیں کیا تھا بلکہ تبعاً وضمناً امام صاحب کی روایات کو بھی دیگر شیوخ کی روایات کے ساتھ ذکر کر دیا تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام صاحب کی روایات کس قدر ہوں گی' سترہ کا غلط ہونا تو بالکل بدیہی ہے مگر میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم ابن خلکان کے اس قول کی تردید کیوں کرتے ہو اس سے تو ہمارے امام کی منقبت نکلتی ہے۔ منقصت نہیں نکلتی کیونکہ امام صاحب کا مجتہد ہونا تو سب کو مسلم ہے اس کا تو کسی کو انکار نہیں اور انکار ہو کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ ہر باب میں امام صاحب کے اقوال موجود ہیں اور ہر مسئلہ میں وہ دخل دیتے ہیں اور مخالفین بھی اکثر مسائل میں امام صاحب کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ مخالفین گو امام صاحب کو محدث نہ تسلیم کریں مگر مجتہد ضرور مانتے ہیں۔ علاوہ ازیں صراحت کے ساتھ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ آئمہ ومحدثین نے ابوحنیفہ کے فقیہ ومجتہد ہونے کا اقرار کیا ہے اور نہ صرف مجتہد ہونا بلکہ تمام

نقہاء کا فقہ میں عیال ابوحنیفہ ہونا تسلیم کیا ہے تو ایک مقدمہ تو یہ لے لیا جائے اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملالیا جائے کہ امام صاحب کو حدیثیں کل سترہ ہی پہنچی تھیں ۔ اب دونوں مقدموں کو ملا کر دیکھو! کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے' وہ نتیجہ یہی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فہم بہت ہی عالی تھی کہ صرف سترہ حدیثوں سے اس قدر مسائل استنباط کیے کہ دوسرے آئمہ باوجود لاکھوں احادیث کے حافظ ہونے کے بھی ان کے برابر مسائل مستنبط نہ کر سکے اس سے زیادہ فہم کی کیا دلیل ہوگی؟ معلوم ہوا کہ بہت ہی بڑے مجتہد تھے تو ہمارے احباب حنفیہ ابن خلکان کے اس قول سے فضول چیں بچیں ہوتے ہیں اس پردہ میں تو وہ امام صاحب کی اتنی بڑی مدح کر گئے جس کی کوئی حد نہیں ۔ خواہ مخواہ ہم اس قول کی تردید کے درپے کیوں ہوں ہمیں مان لینا چاہیے کہ اچھا صاحب امام صاحب کو سترہ ہی حدیثیں کل ملی تھیں مگر کس قدر عالی فہم تھے کہ چند حدیثوں سے لاکھوں جزئیہ اور مسائل سمجھ لئے خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا ۔ اس قول کے غلط ہونے کا تو خود محدثین کو بھی اقرار ہے مگر اس میں شک نہیں کہ روایت میں حنفیہ کا پلہ دوسرے آئمہ محدثین کے برابر نہیں مگر روایت میں یہ اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حدیث وقرآن کو پڑھا پڑھایا تو سب نے مگر گنا حنفیہ ہی نے ہے ۔ ایک عالم اہلحدیث کا قصہ ہے کہ وہ مجھ سے اکثر معاملات کے متعلق مسائل پوچھا کرتے تھے' میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے علماء سے یہ مسائل کیوں نہیں پوچھتے' مجھ سے کس لیے پوچھتے ہو تو حالانکہ وہ اپنے مسلک میں بہت ہی پختہ ہیں مگر انصاف کی بات چھپی نہیں رہا کرتی' زبان سے بے ساختہ یہی نکلا کہ ہمارے علماء تو آمین ورفع یدین کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھتے یہ مسائل ان کو نہیں آتے آپ ہی سے پوچھ کر تسلی ہوتی ہے ۔ غرض معلوم ہو گیا کہ کسی بات کا پڑھنا سننا اور ہے' گننا اور ہے ۔ بس اسی طرح "وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ" (جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھ کے کیے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے) کو سنا تو سب نے ہے مگر گنا نہیں یعنی سمجھا نہیں اس لیے اس وقت پھر اس کے بیان کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ آج کل ہر طرف بیماری کا زور ہے اور جا بجا لوگوں میں اس وقت اسی کا چرچا ہے مگر جو اس کی اصل تدبیر ہے اس سے سب غافل ہیں' الا ماشاء اللہ ۔ تو اس وقت میں اس مضمون کو مختصر طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں تا کہ اب تک جو نہیں سمجھے تھے وہ اس وقت سمجھ لیں اور یہ مضمون تو ایسا ہے کہ اکثر کانوں میں پڑ بھی چکا ہے مگر دوسرا تیسرا مضمون جو اس کے بعد مجھے بیان کرنا ہے اور وہ اس دعوے کے متعلق شبہات کے جواب ہیں وہ جس طرح آج بیان ہوگا اس طرح شاید کبھی کانوں میں نہ پڑا ہوگا ۔

نزول مصائب

سو اول اصل مضمون سنئے۔حق تعالیٰ صاف فرماتے ہیں کہ جو کچھ مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے: وَمَآ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَیَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ o معلوم ہوا کہ ہماری ہر خطا پر مواخذہ نہیں فرماتے بلکہ بہت سے گناہوں سے درگزر بھی فرما دیتے ہیں مگر جب ہم بہت ہی گناہوں میں منہمک ہو جاتے ہیں اس وقت مصائب کا نزول ہوتا ہے تا کہ ہم کچھ اپنی حالت پر توجہ کریں اور سنبھل جائیں مگر ہم اتنے غافل ہیں کہ تنبیہ سے بھی متنبہ نہیں ہوتے اور جب مصیبت آتی ہے تو سوچتے ہیں کہ ہم سے ایسا کیا قصور ہو گیا جو یہ بلائیں ہمارے اوپر نازل ہوئیں مگر حق تعالیٰ کے ارشاد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بلائیں ہمارے گناہوں ہی کی بدولت ہیں۔اس آیت میں تو سب کو خطاب ہے۔دوسرے مقام پر خاص صحابہ کو ارشاد ہوتا ہے: "اَوَلَمَّآ اَصَابَتۡکُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَیۡهَا قُلۡتُمۡ اَنّٰی هٰذَا قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ" کیا جس وقت تم کو ایسی ایک مصیبت پہنچی کہ جس سے دو چند تم کفار کو پہنچا چکے ہو تو (انجان بن کر) تم یوں کہنے لگے کہ یہ مصیبت کہاں سے آ گئی۔آپ ان سے کہہ دیجئے کہ یہ تمہارے ہی پاس سے آئی ہے۔تو ایک آیت میں بطور قاعدہ کلیہ کے یہ بات معلوم ہو چکی کہ سب مصائب بوجہ گناہوں کے نازل ہوتے ہیں۔دوسری آیت میں خاص حضرات صحابہ کو ارشاد ہوتا ہے کہ تم کو جو اس وقت مصیبت کے آنے کے وقت یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ یہ کہاں سے آ گئی اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمہارے ہی سبب سے یعنی تمہارے اعمال کے سبب سے آئی جن کا منشاء خود تمہاری ذات ہے اس دوسری آیت کے پڑھنے سے میرا مقصود آپ کا ایک عذر بھی بیان کرنا ہے اور یہ بات نذرانہ لے کر بیان کرنا چاہیے تھی کیونکہ عذر کا اثر تخفیف جرم ہے سو اس سے آپ کو کتنا بڑا نفع پہنچا جس کی آپ کو خبر بھی نہ تھی۔سو خبر کرنا نذرانہ کا کام ہے یا نہیں؟ مگر لیجئے! میں مفت ہی بتلائے دیتا ہوں۔

علوم صحابہؓ

وہ بات یہ ہے کہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین امت میں سب سے زیادہ اعمق علماء ہیں اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر صحابی ہر امتی سے باعتبار علم کے اعمق ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فقہاء صحابہ کا علم تمام فقہاء امت سے عمیق ہے اور عوام صحابہ کا علم عوام امت کے علم سے عمیق تر ہے ورنہ یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ صحابی بدوی جنہوں نے مسجد نبویؐ میں آ کر پیشاب کر دیا تھا ان کا علم امام ابو حنیفہؒ کے علم سے زیادہ عمیق تھا۔ظاہر ہے کہ امام ابو حنیفہ کا علم ان سے بڑھا ہوا

تھا ان کے علم کا حال تو اسی واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ ایک نہ دو اکٹھے تین کام فقہ کے خلاف کیے' اول تو پیشاب سب کے سامنے کیا' بدن برہنہ ہوا پھر پیشاب بھی مسجد میں کیا اگر ان کو امام ابوحنیفہ سے زیادہ افقہ علماء کہا جائے تو اس میں امام ابوحنیفہ کی بھی تنقیص ہوگی اور خود ان کی بھی تنقیص ہوگی۔

نسبت کمال

شاید آپ تعجب کریں گے کہ ان صحابی کی تنقیص کس طرح لازم آئے گی۔ سنئے! ان صحابی کی تنقیص اس وجہ سے ہوگی کہ جس شخص میں جو کمال واقع میں نہیں اس کی طرف اس کمال کو منسوب کرنا اس کے ساتھ مسخرا پن کرنا ہے۔ ایک شخص جس میں حسن ظاہری نہیں ہے اگر آپ اس کو یوسف ثانی کہنے لگیں تو یہ مسخرہ پن ہوگا یا نہیں؟ کسی ان پڑھ دیہاتی آدمی کو اگر کوئی مولانا یا مولوی صاحب کہہ کر پکارنے لگے تو یہ اس کا مذاق اڑانا ہے یا نہیں؟ اسی طرح ان کو بھی سمجھ لیجئے کہ ایک اعرابی صحابی کو افقہ الناس کہنا ان کی شان میں گستاخی کرنا ہے مگر اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ امام ابوحنیفہ ان صحابی سے افضل ہو گئے' نہیں ہرگز نہیں' امام ابوحنیفہ ان سے افضل کبھی نہیں ہو سکتے اور وہ اس حالت میں بھی امام ابوحنیفہ سے بدرجہا افضل ہیں۔ اگرچہ ابوحنیفہ فقہ میں ان سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں مگر مرتبہ اور فضیلت میں وہ صحابی تمام فقہاء سے بڑھ کر ہیں کیونکہ امام صاحب کا علم اور فقہ ان کے لیے کمال تھا مگر ان صحابی کا کمال فقہ میں نہ تھا ان کا کمال اس سادگی ہی میں تھا' ہر چیز کی ایک ادا ہوتی ہے جو اسی میں پھبتی ہے۔ دوسری جگہ وہ نہیں پھب سکتی' دیکھو زیور عورتوں کے لیے باعث زیب و زینت ہے۔ بھلا اگر کوئی مرد سر سے پیر تک زیور میں لد جائے تو اس میں کہیں وہ شان پیدا ہو سکتی ہے اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بیوقوف شخص نے کسی ولایتی کو دیکھا کہ وہ گھوڑے کو توبرے میں دانہ کھلا رہا تھا اور گھوڑا شوخی میں آ کر کبھی ادھر کو منہ مارتا تھا کبھی اُدھر کو وہ ولایتی خوش ہو کر اس کو چمکارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ بیٹا کھاؤ اور وہ شوخی میں منہ مارتا تھا۔ ان حضرت کو خیال پیدا ہوا کہ یہ شخص اپنے گھوڑے کو بہت ہی چاہتا ہے کہ اس طرح اس کو دانہ کھلا رہا ہے' میری بیوی میری بہت ہی بے قدری کرتی ہے کہ میرے سامنے کھانا رکھ کر چل دیتی ہے تو ہم سے گھوڑا ہی اچھا' اب ہم بھی گھوڑا بنیں گے چنانچہ گھر پہنچے اور بیوی سے کہا کہ آج ہم گھوڑا بنیں گے ہمارے لیے دانہ توبرے میں لاؤ اور ایک اگاڑی اور ایک پچھاڑی ہمارے باندھو اور روم کی جگہ ایک جھاڑو باندھو اور ہم کو دانہ کھلاؤ اور جب ہم انکار اور اعراض کریں تو کہنا کھاؤ بیٹا کھاؤ۔ چنانچہ اس غریب نے ان کے سب حکموں کی تعمیل کی شام ہوئی تو وہ خود گھوڑے کی طرح جھک کر کھڑے ہوئے منہ میں توبرہ' اگاڑی پچھاڑی بندھی ہوئی تھی' کبھی ادھر کو منہ مارو یا کبھی اُدھر کو

منہ مار دیا اور وہ اسی طرح بیٹا کھاؤ! کہتی ہوئی کھلا رہی تھی وہ جو بہت اچھلے کودے اور پیچھے تھا چراغ وہ جھاڑو میں لگ گیا' اب لگے جلنے خود تو اس لیے نہ بجھا سکے کہ ہاتھ پاؤں سب بندھے ہوئے تھے آخر وہ عورت محلّہ کے مردوں کو چلاتی ہوئی پکارنے لگی کہ ارے دوڑیو میرا گھوڑا جلا میرا گھوڑا جلا۔ لوگ سمجھے کہ کمبخت جھوٹ بولتی ہے' کھانے کو پیٹ بھر روٹی ملتی نہیں اس کو گھوڑا کب میسر ہوا تھا' اتنی دیر میں وہ گھوڑا صاحب جل بھن کر سرد بھی ہو گئے تو اس بیوقوف کو اتنی عقل نہ تھی کہ ہر چیز اپنی جگہ ہی بھلی معلوم ہوا کرتی ہے ہرچند نہیں گھوڑے کا تو دانہ کھاتے ہوئے منہ مارنا اچھا معلوم ہوا کرتا ہے ہر شخص کا تھوڑا ہی اچھا معلوم ہو سکتا ہے۔ سچ ہے:

ناز را روئے بباید ہمچو ورد　　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد
عیب باشد چشم نابیناؤ باز　　　زشت باشد روئے نازیبا و ناز

(ناز کرنے کے لیے گلاب جیسے چہرے کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس نہ جاؤ' آنکھ اندھی ہو اور کھلی ہو' یہ عیب ہے چہرہ بدصورت ہو اس پر ناز ہو یہ بری بات ہے)

یہ تو ایک ہنسی کی بات تھی مگر یہ بات ہے بالکل صحیح کہ جس چیز کی جو ادا ہے وہ اسی میں پیاری معلوم ہوتی ہے۔ دوسری چیز میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی تو اب آپ سمجھئے کہ ہر شخص کے لیے فقیہ ہونے ہی میں کمال نہیں بعضوں کی یہی ادا پیاری ہوتی ہے کہ وہ ان پڑھ ہیں' دیکھئے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم نہ تھے مگر ان میں بدون پڑھے ہی ایک ایسی ادا تھی جس نے ہزاروں پڑھے لکھوں کو ان کے سامنے جھکا دیا تھا۔ خوب فرماتے ہیں عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ:

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد　　　بندہ طلعت آں باش کہ آں نے دارد

(معشوق وہ نہیں کہ اچھے بال اور پتلی کمر رکھتا ہو' حسین وہ ہے کہ اس میں کچھ آن ہو)

مقام صحابہؓ

غرض صحابہؓ کا کمال یہ نہیں تھا کہ وہ امام ابوحنیفہ کی طرح اصول وفروع کی تحقیق کرتے ان کا تو کمال ہی دوسرا تھا ان کے سامنے یہ سارے علوم فنون ہیچ ہیں ان کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے ان آنکھوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ) کے جمال جہاں آراء کی زیارت کی تھی۔ یہ وہ کمال ہے کہ اس میں ان کی کوئی برابری نہیں کر سکتا نہ عمر بن عبدالعزیز جو کہ اپنے زمانہ کے مجدد اور قطب وقت تھے اور بوجہ عدل کامل واتباع سنت کے خامس الخلفاء الراشدین شمار کیے جاتے ہیں نہ اویس قرنی جو افضل التابعین ہیں جن کے بارے میں علماء امت کا خیال یہی ہے کہ وہ گو صحابی نہیں مگر ثواب میں

صحابہ کے قریب قریب ہیں مگر پھر بھی ان جیسے نہیں کیونکہ حضرت اویس قرنی کے پاس وہ دو آنکھیں کہاں تھیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کی زیارت کی ہو۔ اگر چہ ان کے فضائل بے شمار ہیں کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ودیگر صحابہؓ کو ارشاد فرمایا تھا کہ ایک شخص یمن کا رہنے والا اویس قرنی نام آئے گا اگر ان سے ملو تو میرا اسلام پہنچا دینا اور ان سے اپنے لیے دعا کروانا اللہ اکبر اتنے بڑے درجے کے شخص ہیں مگر صحابہؓ کے برابر پھر بھی نہیں۔ بس افضل التابعین ہیں۔ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیسے ہیں، حضرت غوث اعظم کو اس سوال سے بہت جوش آیا فرمایا کہ اگر امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھوڑے پر سوار ہوں اور ایڑ مار کر اللہ کے راستے میں اس کو دوڑائیں تو جو خاک معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک میں رینٹ سے ملی ہوئی ہوگی۔ عمر بن عبدالعزیز اور اویس قرنی جیسے ہزاروں سے وہ خاک بھی افضل ہے واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو وہ رتبہ بخشا ہے کہ بڑے سے بڑے ولی بھی حتیٰ کہ امام مہدی علیہ السلام بھی ایک ادنیٰ صحابی کے برابر نہیں ہو سکتے اور یہ حق تعالیٰ شانہ کا بہت ہی بڑا فضل واحسان اُمت محمدیہ کے حال پر ہے کہ ہمارے خلف پر صحابہ کی فضیلت کو پوری طرح منکشف کر دیا کہ سب نے اس پر اجماع واتفاق کرلیا کہ **الصحابة كلهم عدول و افضل الخلق بعد الانبياء اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم۔**

یعنی صحابہ سب کے سب معتبر اور ثقہ ہیں۔ ان میں کوئی شخص غیر معتبر نہیں اور تمام مخلوق میں بعد انبیاء علیہم السلام کے سب سے زیادہ افضل صحابہ ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس مسئلہ کا انکشاف ہمارے حق میں بہت ہی بڑی رحمت ہے اور وہ رحمت یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حق تعالیٰ شانہ کو اس دین کی حفاظت ہی منظور ہے۔ اگر حضرات صحابہ کے متعلق ہمارا یہ اعتقاد نہ ہوتا بلکہ خدانخواستہ ان کے غیر معتبر ہونے کا یا ان کی نسبت خیانت کرنے کا کچھ بھی شبہ ہوتا تو شریعت کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ قرآن واحادیث کی بابت طرح طرح کے خیالات وشبہات پیدا ہوتے اور کسی طرح دل کو اطمینان نصیب نہ ہوتا اور صحابہ کی نسبت حضرات سلف صالحین کا یہ اجماع محض حسن اعتقاد ہی کی بناء پر نہیں بلکہ خود ان کے احوال واعمال سے ان کی دیانت اور راست بازی وپرہیز گاری ایسی کھلی ہوئی نظر آتی ہے کہ موافق تو موافق مخالف تک اس کا اقرار کیے ہوئے ہیں جس پر تاریخ گواہ ہے جس کے بعد اس قول میں کچھ بھی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ الصحابۃ کلہم عدول۔ حضرات صحابہ کی اس فضیلت کے انکشاف سے صرف یہی نہیں کہ دین کی حفاظت ہوگئی بلکہ سچ تو یہ

ہے کہ ان کی فضیلت کے اقرار کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت بڑھ گئی جس قدر صحابہ کے ساتھ اعتقاد بڑھتا ہے اسی قدر حضور کے ساتھ محبت بڑھتی ہے اور جس قدر صحابہ سے کسی کو بے اعتقادی ہوتی ہے اسی قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت میں کمی ہو جاتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جس مدرسہ کے سارے طلبہ بد استعداد ہوں وہاں مدرسین کی بد استعدادی کا بھی شبہ کیا جاتا ہے سو اگر ہمارے اعتقاد صحابہ کے ساتھ اچھے نہ ہوں گے تو معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت بھی اچھا خیال نہ ہو سکے گا بلکہ یہ وسوسہ پیدا ہوگا کہ بس جی جیسی روح ویسے ہی فرشتے اور یہ حالت ہماری بہت ہی خراب و ناگفتہ بہ ہوتی۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جن کو صحابہ کے ساتھ بے اعتقادی و بدگمانی ہے سو ان کی دینی حالت دیکھ لی جائے کہ کس قدر کمزور ہو رہی ہے۔

فضیلت حضرت معاویہؓ

تو حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اس سائل کو کیسا دنداں شکن جواب دیا کہ تو معاویہؓ کی بابت سوال کرتا ہے عمر بن عبدالعزیز و اویس قرنی کو حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک کی خاک سے بھی تو نسبت نہیں۔ آج کل بھی بعض لوگوں کو اس قسم کے سوالات کا خبط سوار ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک عالم سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ ان دونوں میں سے کون حق پر تھے انہوں نے خوب جواب دیا کہ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ قیامت کے روز یہ مقدمہ تمہارے اجلاس میں نہیں بھیجا جائے گا اور اگر بھیجا گیا تو میں تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ مقدمہ خارج کر دینا اور کہہ دینا کہ مقدمہ میرے حدود اختیار سے باہر ہے' پھر میں واقعات سے بھی بے بہرہ ہوں اور میں نے علماء سے اس کی تحقیق بھی کرنی چاہی تھی مگر انہوں نے مجھ کو جواب نہیں دیا' تمہاری گردن تو اس جواب سے چھوٹ جائے گی۔ پھر اگر ہم سے سوال ہوا کہ تم نے اسے کیوں نہیں بتلایا تو ہم خود نمٹ لیں گے۔ واقعی اچھا جواب دیا بھلا اپنے حوصلہ سے زیادہ بڑھنا حماقت ہے یا نہیں؟ پہلے ہم اپنے گھر کا تو فیصلہ کر لیں' پیچھے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ کے جھگڑے میں پڑیں' دنیا میں اس کی نظیر دیکھ لیجئے کہ اگر کوئی مقدمہ وائسرائے کی عدالت کے متعلق ہو جس کی بابت یقین ہے کہ تحصیلدار صاحب کی کچہری میں کبھی نہ آئے گا اور تحصیلدار اس کے فیصلہ و قوانین معلوم کرنے کے درپے ہو اور نہ معلوم ہونے سے پریشان ہو تو یہ حماقت ہے یا نہیں' ہر شخص یہی کہے گا کہ آپ کو اپنی تحصیل کے قواعد معلوم کرنے چاہئیں ان میں اگر کوتاہی ہوگئی تو آپ سے بازپرس ہوگی' آپ سے یہ سوال کوئی نہ کرے گا کہ تم نے وائسرائے کے اجلاس کے قوانین کیوں نہیں یاد کئے۔

افضل و اعلم کا فرق

غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا کمال ان علوم و فنون سے نہیں تھا بلکہ ان کا کمال ایک دوسری چیز سے تھا تو فقہ میں امام ابوحنیفہ گو ان صحابی سے بڑھے ہوئے ہوں جنہوں نے مسجد میں پیشاب کر دیا مگر درجہ میں اور مقبولیت عنداللہ میں وہ صحابی ہی بڑھے ہوئے ہیں اور یہ عجیب قصہ ہے کہ بعض باتوں میں ایک تابعی صحابی سے بڑھا ہوا ہے اور اس سے ان کی تنقیص بھی لازم نہیں آتی' بعضے لوگ یہ بات سن کر گھبرا جاتے ہیں مگر اس سے وحشت کرنا بڑی بے عقلی کی بات ہے۔ دیکھئے اگر بادشاہ کی طرف سے وائسرائے کو حکم ہو کہ تم اپنے ہاتھ سے ہمارے واسطے انڈوں کا حلوا پکاؤ اور ظاہر ہے کہ وائسرائے بہادر کو اس کا کب اتفاق ہوا تھا تو اب وہ اگر انڈوں کے حلوے کی ترکیب کسی باورچی سے پوچھیں اور اس کام میں اس کی شاگردی اختیار کریں تو اس سے کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ باورچی وائسرائے سے افضل ہو گیا۔ نہیں بلکہ ہر شخص یہی کہے گا کہ وائسرائے کا کمال انڈوں کا حلوا پکانے سے تھوڑا ہی ہے اس کے کمالات دوسرے ہیں جن کی باورچی کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اسی طرح اس کو سمجھ لیجئے کہ امام ابوحنیفہ بعض صحابی سے فقہ میں بڑھے ہوئے ہیں اگر وہ امام صاحب کے زمانہ میں موجود ہوتے تو ان کے ذمہ فقہ میں امام ابوحنیفہ کے فتویٰ پر عمل کرنا واجب ہوتا اور امام صاحب کو ان سے یہ کہنے کا حق حاصل ہوتا ہے کہ گو درجہ میں آپ مجھ سے بڑے ہیں مگر چونکہ آپ فقیہ نہیں ہیں اس لیے آپ کو میرے فتویٰ کی مخالفت جائز نہیں اور اگر میرے کہنے کے خلاف کریں گے تو آپ کو گناہ ہوگا۔ امام صاحب کو یہ سب کچھ کہنے کا حق حاصل ہوتا مگر بایں ہمہ فضیلت میں وہ صحابی ہی بڑھے ہوئے رہتے تو کسی بات میں چھوٹوں کا بڑوں سے بڑھ جانا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مرتبہ کے اندر بھی ان سے بڑھ جائیں۔ اس اخیر زمانہ میں جن لوگوں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ اور حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہم کو دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب مسائل میں مولانا سے پوچھ پوچھ کر عمل کرتے تھے اور علوم باطنیہ میں مولانا حاجی صاحب کے محتاج تھے مگر کیا اس سے مولانا حاجی صاحب کے مرید نہیں رہے؟ حاجی صاحب جب بھی شیخ ہی تھے اور مولانا مرید تھے' بعض مسائل میں حاجی صاحب کا عمل مولانا کے فتویٰ کے خلاف تھا جس سے بعض لوگوں کو مولانا پر اعتراض تھا کہ یہ اپنے پیر کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں مگر مولانا صاف فرمادیا کرتے تھے کہ ان مسائل جزئیہ میں حاجی صاحب کو ہمارے فتویٰ پر عمل کرنا واجب تھا' ہم کو ان کی تقلید جائز نہیں تھی ہم ان مسائل کی وجہ سے حاجی صاحب کے تھوڑا ہی مرید ہوئے ہیں وہ دوسرے کمالات ہیں جن کی وجہ سے ہم نے حاجی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے۔

قانون سازی

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کہ خلافت صدیقیہ وخلافت عمریہ کہ بعض ظاہر بیں لوگ خلافت عمریہ کو بوجہ کثرت فتوحات کے خلافت صدیقیہ سے افضل سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے زمانہ خلافت میں جدید فتوحات کچھ زیادہ نہ ہوئی تھی بلکہ ان کی خلافت کا زیادہ زمانہ خود مسلمانوں کے سنبھالنے میں صرف ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعض قبائل مرتد ہو گئے تھے' کچھ لوگوں نے زکوۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ خلافت اس فتنہ ارتداد کے فرو کرنے اور مسلمانوں کی حالت سنبھالنے میں صرف ہوا۔ مخالفین کے ملک فتح کرنے کی زیادہ نوبت نہ آئی اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں شاید کوئی دن بھی جدید فتوحات سے خالی نہیں رہا' روزانہ یہی خبریں آتی تھیں کہ آج فلاں شہر فتح ہو گیا اور کل فلاں شہر پر حملہ ہے یہاں تک کہ دس سال کے عرصہ میں حکومت اسلامیہ شرقاً وغرباً پھیل گئی اس لیے بعض کم فہم خلافت عمریہ کو خلافت صدیقیہ سے افضل شمار کرتے ہیں مگر عقلاء خوب جانتے ہیں کہ مکان کی خوبصورتی میں زیادہ کمال اس شخص کا ہے جس نے کہ اول نقشہ تیار کیا تھا اور بنیادیں قائم کی تھیں کیونکہ اس کو بہت دماغ سوزی سے کام کرنا پڑا ہے۔ مکان کا خوبصورت نقشہ بنانا اور بنیاد کا مستحکم کرنا یہ بڑا کام ہے' دیواریں قائم کرنے والے کا اتنا بڑا کمال نہیں کیونکہ وہ تو اینٹ پر اینٹ رکھتا چلا گیا ہے' اس کو کونسی دماغ سوزی کرنی پڑی۔ ظاہر بیں لوگ دوسرے معمار کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ مکان کو اسی نے مکمل کیا مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ اس مکان کی خوبصورتی میں بڑا کمال نقشہ بنانے والے اور بنیاد قائم کرنے والے کا ہے۔

اجراء قانون

اسی طرح جو اسرار شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ خلافت صدیقیہ سے خلافت عمریہ کو کوئی بھی نسبت نہیں کیونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکومت اسلامیہ اور خلافت کی بنیاد قائم کرنے میں جو تعب برداشت کرنا پڑا ہے اس کا عشر عشیر بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہیں پیش آیا۔ یہ کام اسی عالی حوصلہ خلیفہ کا تھا کہ ایسے فتنے کے زمانہ میں جبکہ خود اپنی ہی جماعت قبضہ سے باہر ہوا چاہتی تھی تمام فتنوں کا مقابلہ کر کے اور ان کو ایک دم نیست و نابود کر کے اڑھائی سال کے عرصہ میں خلافت اسلامیہ کے کھونٹے گاڑ دیئے اور نظام حکومت کو ایسے مستحکم اصول پر قائم کر دیا کہ بعد کے خلیفہ کو کوئی پریشانی ہی پیش نہ آ سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت میں وہ اصول

جاری ہوگئے اور وہ نظام صدیقی شائع ہوگیا تو بڑا کمال حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے اور جس قدر فتوحات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ہوئی ہیں ان سب کا ثواب حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صحیفہ اعمال میں داخل ہوگا۔ اہل تمدن و سیاست اس کو خوب سمجھتے ہیں کہ قانون جاری کرنے سے زیادہ مشکل قانون بنانا ہے۔ قانون بنانے والے کو جس مشقت کا سامنا ہوتا ہے جاری کرنے والے کو اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں آتا۔

اجتہاد فی الاصول

اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ یہ جو ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ بعد چار سو برس کے اجتہاد نہیں رہا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چار سو برس کے بعد کسی کو اجتہاد کے قابل دماغ نہیں ملا کیونکہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ علاوہ ازیں یہ مطلقاً صحیح بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ ہر زمانہ میں ہزاروں ایسی جزئیات نئی نئی پیش آتی ہیں جن کا کوئی حکم آئمہ مجتہدین سے منقول نہیں اور علماء خود اجتہاد کر کے ان کا جواب بتلاتے ہیں۔ پس اگر اجتہاد کا باب بالکل بند ہوگیا ہے اور اب کسی کا دماغ اجتہاد کے قابل نہیں ہوسکتا تو کیا ایسے نئے نئے مسائل کا جواب شریعت سے نہیں ملے گا؟ یا ان مسائل کے جواب کے لیے کوئی نیا نبی آسمان سے اترے گا؟ اگر یہی بات ہے تو خدا خیر کرے کہیں قادیان والے نہ سن لیں۔ کہیں یہ بات ان کے کانوں میں پڑگئی تو مسیح موعود کی دلائل نبوت کی فہرست میں ایک اور دلیل کا اضافہ کرلیں گے پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے: "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" (آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی تکمیل ہو چکی سو دروازہ اجتہاد اگر بالکل بند کر دیا جائے تو پھر شریعت کی تکمیل کس طرح مانی جائے گی کیونکہ ظاہر ہے کہ بہت سے ایسے مسائل ہیں کہ ان کا جواب کتب فقہ میں مذکور نہیں نہ آئمہ مجتہدین سے کہیں منقول۔ پچھلے دنوں میں ایک سوال آیا تھا کہ ہوائی جہاز میں نماز ہوسکتی ہے یا نہیں اب بتلایئے اگر اجتہاد بعد چار سو برس کے بالکل جائز نہیں تو اس مسئلہ کا شریعت میں کوئی بھی جواب نہیں پہلے زمانہ میں نہ ہوائی جہاز تھا نہ فقہاء اس کو جانتے تھے نہ کوئی حکم لکھا اب ہم لوگ خود اجتہاد کرتے ہیں اور ایسے نئے مسائل کا جواب دے دیتے ہیں تو فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ چار سو برس کے بعد اجتہاد بالکل بند ہوگیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اجتہاد فی الاصول کا دروازہ بند ہوگیا اور اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا اگر اجتہاد فی الفروع بھی اب نہ ہوسکے تو شریعت کے نامکمل ہونے کا شبہ ہوگا جو کہ بالکل غلط ہے شریعت میں کسی قسم کی کمی نہیں۔ قیامت تک جس قدر صورتیں پیش آتی رہیں گی

سب کا جواب علماء ہر زمانہ کے شریعت سے نکالتے رہیں گے کیونکہ یہ جزئیات اگر کتب فقہ میں نہیں تو اصول وقواعد تو سب پہلے مجتہدین بیان کر چکے جن سے قیامت تک کے واقعات کا حکم معلوم ہوسکتا ہے۔ البتہ قرآن وحدیث سے اصول مستنبط کرنا یہ اب نہیں ہوسکتا۔ یہ خاص اجتہاد فی الاصول بعد چار سو برس کے ختم ہوگیا کیونکہ اول تو جس قدر اصول وقواعد شریعت کے تھے وہ سب آئمہ مجتہدین بیان کر چکے انہوں نے کوئی قاعدہ چھوڑ نہیں دیا' دوسرے ان کے بعد اگر کسی نے اصول مستنبط بھی کیے تو وہ مستحکم نہیں کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد فی الاصول کے لیے اب دماغ قابل ہی نہیں رہے۔ یہ حضرات مجتہدین ہی کا خاص حصہ تھا کہ انہوں نے نصوص سے اس خوبی سے اصول مستنبط کیے جو کہیں نہیں ٹوٹ سکتے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ہدایہ کے اصول مسلم نہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہدایہ غیر معتبر کتاب ہے۔ اس میں اصول غلط نقل کر دیئے گئے ہیں بلکہ شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے بعض اصول خود شریعت سے مستنبط کیے ہیں جن میں وہ ناقل نہیں ہیں سو وہ معتبر نہیں باقی جزئیات اس کی سب معتبر ہیں تو اب دیکھ لیجئے! کہ صاحب ہدایہ باوجودیکہ بہت ہی بڑے شخص ہیں ان کی علمی شان ہدایہ ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ واقعی اس کتاب میں بھی انہوں نے کمال کر دیا' ہر مسئلہ کی دو دلیلیں بیان کرتے ہیں ایک عقلی ایک نقلی' کیا ٹھکانا ہے وسعت نظر کا کہ جزئیات تک کو حدیث سے ثابت کرتے ہیں پھر حدیثیں گو بلا سند بیان کرتے ہیں مگر تفتیش کرنے سے کہیں نہ کہیں ضرور ملتی ہیں چاہے مسند بزاز میں ہوں یا مسند عبدالرزاق میں' بیہقی میں ہوں یا مصنف ابن ابی شیبہ میں کہیں ضرور ملیں گی۔ ایک دو اگر نہ ملیں تو ممکن ہے مگر جس شخص کی نظر اتنی وسیع ہو تو ایک دو حدیث جو ہم کو نہ ملی ہو اس سے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی اصل ہی نہیں یہ تو وسعت نظر کا حال ہے فہم کا تو کیا ٹھکانا ہے۔ مخالفین کے دلائل کو بیان کرنا ان کا جواب دینا پھر اپنے مذہب کی دلیل بیان کرنا یہ ان کا خاص حصہ ہے مگر بایں ہمہ جو اصول کہ وہ خود حدیث وقرآن سے نکالتے ہیں ان کی بابت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فیصلہ فرمادیا کہ وہ معتبر اور مسلم نہیں ہیں' کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹتے ہیں تو آج کل جن لوگوں کی وسعت نظر وفہم کو صاحب ہدایہ سے کچھ بھی مناسبت نہیں وہ کیا حدیث وقرآن سے اصول مستنبط کریں گے؟

اجتہاد فی الفروع

ہاں البتہ اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آسکتا کہ ہم بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وامام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مجتہد ہوگئے کیونکہ اصحاب سیاست خوب

جانتے ہیں کہ قانون بنانا قانون جاری کرنے سے بہت زیادہ دشوار ہے ہم لوگ سوائے اس کے
کہ ان حضرات کے استنباط کردہ اصول کو حوادث الفتاویٰ میں جاری کردیں اور کیا کر سکتے ہیں؟
کمال انہیں حضرات کا تھا کہ انہوں نے حدیث وقرآن میں سے غور کر کے ایسے اصول وقواعد سمجھے
جو قیامت تک کے جزئیات کے لیے کافی ہیں' کوئی مسئلہ ایسا پیش نہیں آسکتا جس کا حکم جواز وعدم
جواز ان اصول سے نہ نکلتا ہو بلکہ ان حضرات نے صرف اصول وقواعد ہی پر اکتفا نہیں کیا جزئیات
بھی اس قدر نکال کر بیان کر گئے کہ بہت ہی کم کوئی مسئلہ ایسا ہوتا ہے جس کو وہ صراحۃً یا دلالۃً بیان
نہ کر گئے ہوں اور اگر کوئی شاذ ونادر ایسا مسئلہ معلوم ہوتا ہے جو فقہاء نے نہیں بیان کیا تو کبھی تو مفتی
کی نظر کی کوتاہی ہوتی ہے کہ اس کو سب مواقع پر عبور نہیں ہوتا یا فہم کی کمی ہوتی ہے کہ وہ مسئلہ عبارت
سے نکل سکتا ہے مگر مفتی صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا اور اگر بالفرض جزئیہ انہوں نے نہیں بیان کیا تو
اصول سے تو وہ ضرور ہی مستنبط ہوتا ہوگا۔ پس آج کل یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے کو آئمہ مجتہدین کے
برابر کہہ سکے جو فرق کہ خلافت صدیقی وخلافت عمری میں ہے وہی فرق آئمہ مجتہدین وفقہاء
متاخرین میں سمجھنا چاہیے۔ قانون کا جاری کرنا اور چیز ہے قانون کا بنانا کچھ اور ہی ہے اور ہم
لوگوں کو تو ان سے خاک بھی نسبت نہیں ہوسکتی۔ غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ حضرات صحابہ کا کمال
علم وفنون کی تکمیل میں نہ تھا ان کا بڑا کمال تو یہ تھا کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا
جس کی وجہ سے ان کے قلوب ہمارے قلوب سے زیادہ منور اور ان کا علم ہمارے علم سے اعمق تھا تو
اس تقریر سے تو یہ ثابت ہوگیا کہ صحابہ کا علم ہمارے علم سے بدر جہا بڑھا ہوا تھا۔

تمہید عذر

اب آگے وہ عذر سنئے! پہلی آیت میں تو عام خطاب تھا اور اس آیت میں خاص حضرات
صحابہ کو خطاب ہے۔ فرماتے ہیں:

"اَوَلَمَّآ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْهَا قُلْتُمْ اَنّٰی هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ" الایة

شان نزول اس کا یہ ہے کہ غزوہ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوگئی تھی اور شکست بعد میں ہوئی
پہلے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگیا تھا۔ قصہ اس کا یہ ہوا کہ غزوہ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہٗ)
پچاس صحابہ کی جماعت کو جو کہ تیر انداز تھے ایک درہ کوہ پر یعنی گھاٹی پر مقرر کیا تھا اور ان سے یہ فرمادیا تھا
کہ تم یہاں سے ہرگز نہ ہٹو! چاہے ہم کو فتح نصیب ہو یا خدانخواستہ شکست ہو چاہے ہماری بوٹی بوٹی الگ

ہوجائے مگر تم یہیں جمے رہیو! اس انتظام کے بعد جو مسلمانوں نے کفار پر حملہ کیا تو کفار کو شکست ہوگئی اور وہ ایسے بے تحاشا بھاگے کہ ان کی عورتوں کی پنڈلیاں بھاگتے ہوئے نظر آتی تھیں۔ اس وقت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کفار کی طرف تھے وہ اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے اس وقت تک وہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نہ تھے۔ مگر ہم تو اس واقعہ کے تذکرہ کے وقت بھی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہیں گے کیونکہ بعد میں بڑے جلیل القدر صحابی ہوئے' سیف اللہ کا لقب پایا۔ غرض وہ اس وقت لشکر کفار کی کمان کر رہے تھے بھاگتے بھاگتے ان کے جاسوس نے ان کو اطلاع دی کہ گھاٹی خالی ہے۔ یہاں یہ قصہ ہوا کہ جب کفار کو شکست ہوگئی تو بعض نوجوان صحابہ نے اپنے افسر سے کہا کہ اب تو مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگیا اور سب غنیمت کا مال لوٹ رہے ہیں ہم کو بھی لوٹنا چاہیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد تھا وہ مبالغہ کے طور پر تھا اور مقصود صرف یہ تھا کہ جب تک ہم کو فتح حاصل نہ ہو اس وقت تک تم یہاں سے نہ ہٹنا۔ کچھ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی رائے کے خلاف کیا کہ نہیں مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ بھی ہو مگر ہم کو صریح ممانعت کے بعد یہاں سے نہ ہٹنا چاہیے۔ غرض دو فریق ہوگئے کچھ تو لوٹنے میں مشغول ہوگئے اور کچھ دس پانچ اسی جگہ جمے رہے' جب گھاٹی پر تھوڑے سے آدمی رہ گئے تو خالد بن ولید نے اپنے بھاگنے کا رخ گھاٹی کی طرف بدل دیا اور چند مسلمان جو وہاں جمع ہوئے تھے ان کو تہ تیغ کر کے پشت کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے' انہوں نے پشت کی طرف سے حملہ کیا اس کے بعد جو کفار بھاگ رہے تھے وہ بھی پلٹ پڑے اور سامنے کی طرف سے انہوں نے مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کر دیا' مسلمان بیچ میں آگئے' بہت آدمی مارے گئے اور مسلمانوں کو شکست ہوگئی' بہت سے صحابہؓ بھاگ گئے' تو یہ شکست اس وجہ سے ہوئی کہ گھاٹی والوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی مخالفت کی۔ اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ ترجمہ یہ ہے کہ کیا جب تم پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جس سے دو چند تم (غزوہ بدر میں کفار کو) مصیبت پہنچا چکے ہو تو تم یوں کہتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی؟ آپ فرما دیجئے! کہ یہ تمہارے ہی نفسوں کی وجہ سے آئی۔ یعنی تم نے اپنے آپ اپنے سر مصیبت لی کہ ہمارے پیغمبر کے حکم کی مخالفت کی اور مال لوٹنے کی طمع کی یہ تمہید تھی۔

عذر گناہ

اب وہ عذر سنئے! اس آیت میں جو حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا قول ہے انی ھذا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کبھی حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی ایسا موقع پڑا ہے کہ ان کو یہ کہنے کی نوبت آئی کہ یہ بلا کہاں سے آگئی حالانکہ ان کی بصیرت ہماری بصیرت سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی

تھی۔ جیسا کہ اوپر مفصلاً ثابت ہوا مگر اس کے باوجود وہ بھی کبھی اپنی کوتاہی کو بھول جاتے تھے اور یہ خیال ان کو بھی نہ ہوا کہ یہ مصیبت ہمارے فلاں فعل کی وجہ سے آئی تو اب اگر آپ لوگ بھی اپنی خطاؤں کو بھول جائیں تو کچھ زیادہ تعجب نہیں۔ لیجئے! میں نے آپ کا عذر بھی بیان کردیا۔ معلوم ہوا کہ مصیبت کے وقت علی التعیین کسی خطا پر نظر نہ ہونا طبعی بات ہے جو صحابہؓ کو بھی پیش آئی کہ وہ بھی نہ سمجھے کہ ہماری کونسی خطا پر یہ سزا مرتب ہوئی مگر پھر بھی صحابہ مطلقاً نفس مسئلہ سے غافل نہ تھے اور آپ کو تو خود مسئلہ ہی کی خبر نہیں کہ گناہ کو بھی مصیبت میں کچھ دخل ہے یہ تو دلیل نقلی تھی اس بات کی کہ جو کچھ مصیبت آتی ہے وہ گناہ کی وجہ سے آتی ہے۔ دوسری بات عقلی ہے گرچہ دلیل نقلی کے بعد اس کی حاجت نہیں رہی مگر آج کل عقل کا ہیضہ بہت پھیل رہا ہے اس لیے بعض لوگوں کو بدون دلیل عقلی کے تسلی نہیں ہوتی۔ عورتوں کو حیض آتا ہی تھا مگر آج کل مردوں کو بھی ہیضہ ہو گیا عورتوں سے بڑھ گئے۔ مگر اتنا فرق اب بھی ہے کہ وہاں بڑی حاء ہے اور یہاں چھوٹی ہا۔

گرفت بر گناہ

وہ دلیل یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ بہت بڑے رحیم ہیں ان کی رحمت ورافت اپنی مخلوق کے ساتھ اس درجہ ہے کہ نہ کسی باپ کو اپنی اولاد سے ہوسکتی ہے نہ کسی ماں کو۔ شاید آپ کہیں کہ یہ بھی تو دلیل نقلی ہوئی کیونکہ حق تعالیٰ کا اس درجہ رحیم وکریم ہونا یہ بھی تو نصوص ہی سے معلوم ہوا ہے۔ تو لیجئے! میں اس کو بھی عقل سے ثابت کیے دیتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر خدا کی رحمت آپ کو محسوس نہیں ہوتی تو یہ تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ ماں اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے۔ جانوروں تک اپنے بچوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں خود آپ کو بھی کسی سے ضرور محبت ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ ہماری ایک صفت جو کہ وجود کی فرع ہے' وجود ہی اگر نہ ہوتا تو یہ محبت کہاں سے پیدا ہوتی اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ وجود ہمارا اپنے گھر کا نہیں خدا کا دیا ہوا ہے تو یہ تمام صفات بھی اسی کی عطا کردہ ہیں اس کے بعد دوسر مقدمہ یہ ملا لیجئے کہ یہ باتفاق عقلاء کے ایک کمال ہے اور حق تعالیٰ کسی کمال سے خالی نہیں تو ان میں صفت محبت کا ہونا عقلاً ثابت ہو گیا تو جب وہ اتنے بڑے رحیم ہیں اور پھر بندوں پر مصیبتیں بھیجتے ہیں تو یہ کب خیال ہوسکتا ہے کہ اتنا بڑا چاہنے والا خواہ مخواہ اپنی مخلوق کو پریشان کرتا ہوگا بلکہ ضرور کوئی قصور آپ کی طرف سے بھی ہوا جبھی تو اس رحیم وکریم نے یہ مصیبتیں آپ پر نازل کی ہیں۔ غرض عقلاً ونقلاً یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو کچھ مصیبت آتی ہے ہمارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے اس کے بعد تعجب ہے کہ اب بھی بعض لوگ ایسے وقت میں یوں کہتے ہیں کہ اے اللہ

کس گناہ میں پکڑے گئے۔ میں کہتا ہوں کہ ہائے اللہ کیا اب بھی آپ کو اپنے تقدس کا اعتقاد ہے جو لوگ نماز روزہ کرتے رہتے ہیں اور گناہوں سے بچتے ہیں وہ اگر یہ بات کہیں تو ان کو تو اس کہنے کا کچھ منہ بھی ہے مگر بے نمازی بھی تو یوں کہتے ہیں کہ ہائے کس گناہ میں پکڑے گئے۔ اب یا تو یہ لوگ اپنے گناہوں کو گناہ ہی نہیں سمجھتے مگر مسلمان کی نسبت یہ خیال تو نہیں کیا جاسکتا کہ وہ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتا کیونکہ یہ تو کفر ہے مگر میں اس کا منشاء آپ کو بتلانا چاہتا ہوں۔

تکرارِ گناہ

اس کا منشاء یہ ہے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں اور اکثر باتوں میں جاہل لوگ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کیا کرتے ہیں جیسا کہ ایک بڑھیا نے کہا تھا کہ جب سارے آدمی جانور مر جائیں گے قیامت میں تو اللہ تعالیٰ کا اکیلے جی نہیں گھبرائے گا؟ اور بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا خاصہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے اسی طرح جو لوگ کہ رات دن گناہوں میں مبتلا ہیں وہ اپنے آپ کو دیکھتے ہیں کہ پہلے پہل گناہ جب صادر ہوتا ہے تو دل کڑھتا ہے پھر کرتے کرتے عادت سی ہو جاتی ہے کہ اس سے دل بھی نہیں برا ہوتا تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جن گناہوں کی ہم کو عادت ہوگئی ہے خدا تعالیٰ کو بھی (نعوذ باللہ) ان کی تو عادت ہوگئی ہوگی کیونکہ قاعدہ ہے کہ پہلی مرتبہ خطا پر زیادہ غصہ آیا کرتا ہے۔ جب اس وقت سزا نہیں دی تو دوسری مرتبہ پر غصہ کم آیا کرتا ہے اور پھر جب بار بار ایک کام خلاف منشاء ہوتا ہے ایک مساوات سی ہو جاتی ہے جس طرح کسی کی بیوی بد مزاج ہو تو پہلے پہل تو اس کی باتوں پر غصہ آیا کرتا ہے جب دیکھتے ہیں کہ اس کی عادت ہی اس طرح کی ہے تو اچھے اچھے دنیا داروں کو بھی مساوات ہو جاتی ہے اور بے چارے اللہ والے تو پہلے ہی سے صبر کر لیتے ہیں مگر دنیا داروں سے صبر دشوار ہے وہ خوب مرمت کرتے ہیں اور انہی سے عورتیں سیدھی بھی ہو جاتی ہیں۔ سچ کہا ہے کہ کسی نے "یغلبن الحازم و یغلبھن الجاھل" لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مولوی بیویوں سے دبتے ہیں خیر کوئی یوں ہی سمجھ لے مگر وہ حقیقت میں دبتے نہیں بلکہ کمزور پر بہادری ظاہر کرتے ہوئے غیرت کرتے ہیں جس طرح دنیادار اپنی بیویوں کو کوٹتے ہیں ان سے یہ نہیں ہوسکتا تو بعض تو غیرت کی وجہ سے اس کی کج خلقی کو نبھاتے ہیں اور بعضے اللہ کے بندے اس سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ ایک بزرگ کی بیوی بہت کج خلق تھیں اور ان کو اس کے ہاتھ سے بہت اذیت تھی ایک مرتبہ کسی خادم نے عرض کیا کہ حضرت اس کا رسہ کیوں نہیں کاٹ دیتے جب یہ باز نہیں آتی تو طلاق دے کر الگ کر دیجئے! ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاں! بھائی سچ کہتے ہو واقعی خیال تو مجھے بھی

ہوا تھا کہ اس کو طلاق ہی دے دوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ اگر میں نے اس کو طلاق دے دی تو یا تو یہ دوسرا نکاح نہ کرے گی تو اس صورت میں اس کو تکلیف ہوگی اس کے نان نفقہ کی کون خبر لے گا اور اگر اس نے دوسرا نکاح کسی سے کرلیا تو اس کے ساتھ بھی یہ اس طرح رہے گی جس کے سر پڑے گی اس کے لیے وبال جان ہو جائے گی اس لیے میں ہی سب مسلمانوں کی طرف سے تکلیف برداشت کرنا گوارا کرتا ہوں دوسرے مسلمانوں کو اس سے تکلیف نہ پہنچے تو میں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ میں مسلمانوں کے لیے وقایہ بنا ہوا ہوں کہ امت محمدیہ میں سے کسی شخص کے پیچھے یہ بلا نہ پڑے۔ ماشاء اللہ ان حضرات کی کیسی نیتیں تھیں، دنیاداروں سے اول تو صبر نہیں ہوتا، خوب مرمت کرتے ہیں اور جو اس سے باز نہ آئے کھانا کپڑا بند کر دیتے ہیں اور بعضے طلاق ہی دے ڈالتے ہیں مگر اللہ والوں سے تو یہ نہیں ہوسکتا اس لیے سب ان کو یہ کہتے ہیں کہ بیویوں سے دبتے ہیں کوئی کچھ ہی کہے مگر وہ تو اس تحمل و برداشت میں ثواب کی امید کرتے ہیں۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی نازک مزاج تھے ان کا ایسا شاہانہ مزاج تھا کہ ایک مرتبہ آپ کو رات بھر نیند نہ آئی صبح کو جو تشریف لائے تو آنکھوں میں نیند نہ آنے کا اثر تھا، سرخی ہوگی۔ خدام نے دریافت کیا کہ آج کیسا مزاج ہے؟ فرمایا: رات بھر نیند نہیں آئی لحاف میں نگندے ٹیڑھے پڑے ہوئے تھے اس سے رات بھر الجھن رہی۔ نہ معلوم رات کو لحاف میں منہ لپیٹ کر نگندوں کا ٹیڑھا ہونا کیسے معلوم ہوگیا ہوگا۔ نہایت لطیف مزاج تھے آپ کی بیوی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا بہت ہی ٹیڑھے مزاج کی تھیں۔ مرزا صاحب کو کوری کوری سناتی تھیں آپ کو کشف میں بتلایا گیا تھا کہ فلاں عورت سے نکاح کرلو تمہارے درجے بلند ہوں گے اس لیے آپ نے ان سے نکاح کرلیا تھا۔ (چنانچہ انہوں نے ساری نزاکت کی کسر نکال دی تھی ۱۲ جامع) اور آپ نے ساری عمر ان کو نبھایا اور کبھی ان کے کہنے کا برا نہیں مانا۔ جب مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال قریب آیا تو آپ نے ان سے فرمایا کہ میرے بعد تم پانی پت قاضی ثناء اللہ صاحب کے پاس چلی جانا وہ تمہاری ناز برداری کرلیں گے اور کوئی تمہاری خدمت نہیں کرے گا۔ چنانچہ وہ پانی پت چلی آئیں اور قاضی صاحب نے ان کی ہمیشہ خدمت کی اور اپنے وصیت نامہ میں جہاں اور وصیتیں لکھی تھیں ان کے واسطے بھی کچھ زمین کی وصیت کر دی تھی کہ اس کی آمدنی میرے بعد ان کو دی جائے۔ غرض وہ بہت ہی سخت مزاج تھیں مگر مرزا صاحب کا معمول تھا کہ روزانہ صبح کے وقت ایک خادم کو ڈیوڑی پر بھیجتے تھے کہ بیگم صاحبہ کا مزاج پوچھ کر آؤ جب خادم مزاج پوچھنے جاتا وہ اس کو بھی اور مرزا صاحب کو بھی خوب سخت سخت سناتیں۔ ایک دفعہ آپ نے کسی ولایتی مرید کو مزاج پرسی کے لیے بھیجا۔ انہوں نے پھر ویسی ہی سنانا شروع کیں اور اس ولایتی کو بہت ناگوار ہوا اور انتقام لینا چاہا مگر یاد آ گیا کہ

مرزا صاحب کی متعلقہ بیں خاموش ہو کر منہ بنا کر آ بیٹھیں مرزا صاحب سمجھ گئے ہنس کر فرمانے لگے کیا ہوا؟ ایسے کیوں ہو رہے ہو! انہوں نے عرض کیا حضرت کچھ پوچھئے نہیں! اور سب قصہ بیان کیا اور اپنی ناگواری اور رنج کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا بھائی برا نہیں ماننا چاہیے وہ ہماری محسن ہے اس سے نفس کی اصلاح ہوتی رہتی ہے غرض وہ ایسی تھیں۔

برکت تعلق

باقی ہماری تو وہ مخدومہ ہی ہیں ہم تو ان کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہا ہی کہیں گے کیونکہ وہ ایک بزرگ کی بیوی ہیں انشاء اللہ حضرت کی برکت صحبت سے وہ بخش ہی دی جائیں گی۔ اگر کسی بزرگ کی اہل کا برتاؤ ان بزرگ کے ساتھ اچھا نہ ہو تو چھوٹوں کو ان کی شان میں گستاخی نہ کرنا چاہیے۔ تمہاری تو وہ بہر حال مخدومہ ہی ہیں۔ یاد رکھئے! جس طرح آپ کو ان بی بی صاحبہ کی گستاخیاں ان بزرگ کے ساتھ ناگوار ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان بزرگ کو آپ کی گستاخی ان کی بی بی کی شان میں ناگوار ہوتی ہے اور بزرگوں کو تکلیف پہنچانا تھوڑی بات نہیں اس لیے بزرگوں کی اہل کے ساتھ بھی گستاخی نہ چاہیے۔ یہ بزرگ اپنے متعلقین کو چھوڑیں گے نہیں انشاء اللہ سفارش کر کے بخشوا ہی لیں گے کیونکہ اہل اللہ کے حوصلے بڑے ہوتے ہیں اگر اپنی بیوی سے یا کسی عزیز وغیرہ سے ان کو تکلیف پہنچی ہوگی تو وہ اس کا اثر دل میں نہ رکھیں گے فوراً سب کو معاف کر دیں گے اور آخرت میں حق تعالیٰ سے ان کے واسطے سفارش بھی کریں گے۔ ایک کفن چور کا قصہ ہے اس کی ایک بزرگ سے دوستی تھی ایک دفعہ ان بزرگ نے اس سے کہا کہ بھائی ہم کو اندیشہ ہے کہ تم ہمارا کفن بھی چراؤ گے اس نے کہا توبہ توبہ آپ سے ایسی گستاخی بھی نہیں کروں گا۔ انہوں نے فرمایا ہم کو اطمینان نہیں البتہ ایک صورت اطمینان کی ہے کہ ہم سے تم کفن کی قیمت لے لو اور وعدہ کر لو! اس نے اس سے انکار کیا۔ انہوں نے اصرار کر کے قیمت سپرد کر دی اور فرمایا بس اصل مقصود تمہارا یہی روپیہ ہے سو تم کو یہ حاصل ہی ہو گیا اب مت چرانا اس نے کہا اول تو اس کی حاجت نہ تھی مگر خیر اب تو کوئی احتمال ہی نہ رہا۔ اتفاق سے ان بزرگ کا انتقال ہو گیا' یہ صاحب وہاں پہنچے اور وہی حرکت شروع کی' ان بزرگ کی کرامت ظاہر ہوئی کہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب یہی ٹھہری تھی؟ یہ خوف سے وہاں ہی گر گیا اور دم نکل گیا' کسی خلیفہ نے ان بزرگ کو خواب میں دیکھا فرماتے ہیں کہ ہم نے تو ہنسی میں اس سے یہ کہا تھا ورنہ کفن چرانے سے ہمارا کیا ضرر تھا مگر وہ ایسا بزدل نکلا کہ مر ہی گیا گو وہ فاسق ہے مگر ہم نے اس کا بازو پکڑ لیا ہے اس کی لاج آتی ہے اب میں اس کی سفارش کر کے بخشوانے کی کوشش کرتا ہوں اور تم اس کی تجہیز و تکفین کرو۔

مہلت توبہ

غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ عوام کا خیال یہ ہے کہ جس طرح ہم کو گناہ کرتے کرتے عادت ہو جاتی ہے اسی طرح معاذ اللہ حق تعالیٰ کو بھی ایک گناہ کو بار بار دیکھتے دیکھتے عادت سی ہو جاتی ہوگی اس پر زیادہ غصہ نہ آتا ہوگا۔ ہاں! جب کوئی نیا گناہ ہوتا ہوگا تب حق تعالیٰ کو غصہ آتا ہوگا اسی لیے جب مصیبت آتی ہے تو عوام یہی کہتے ہیں کہ نہ معلوم ہم سے کون سا گناہ ہو گیا تھا۔ افسوس مہلت اور ڈھیل دینے کا یہ مطلب نہیں نکالا گیا کہ وہ گناہ گناہ ہی نہ رہا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ یوں سمجھتے کہ ہم ہر وقت زمین میں گاڑ دیئے جانے کے قابل ہیں اور جو گھڑی سلامتی کے ساتھ گزر جاتی ہے یہ خدا کی عنایت ہے کہ توبہ واستغفار کی مہلت اور ڈھیل دے دی مگر جب اس مہلت کی یہ قدر کی گئی کہ اس کی وجہ سے وہ گناہ گویا گناہ ہی نہ رہے تو اب ادھر سے جو کچھ بھی ہو تھوڑا ہے۔ صاحبو! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم مصیبت کے آنے پر کیا تعجب کرتے ہو یہ تو کچھ تعجب کے قابل بات نہیں اگر ہم کو سزا ملے یہ تو قاعدہ کے موافق ہے' مجرم کو سزا ملا ہی کرتی ہے اور ہم نے اپنے اوپر نہ معلوم تعزیرات الٰہی کی کتنی دفعات قائم کر رکھی ہیں تو مصیبت کا آنا کوئی تعجب خیز نہیں بلکہ خدا کی قسم ہم کو ذرا سی راحت اگر مل جائے تو وہ تعجب کی بات ہے۔ آپ مصیبت آنے پر حیرت کرتے ہیں کہ یہ بلا کس گناہ کا بدلہ ہے۔

پاکی داماں

میں کہتا ہوں کہ تم کھانا کھاتے ہوئے یہ سوچا کرو کہ آج ہم نے کونسی طاعت اور کونسا نیک کام کیا ہے جو یہ کھانا ہم کو مل گیا۔ عشاق کا مذاق پیدا ہو جائے تو پھر منہ سے کبھی یہ بات نہ نکل سکے کہ یہ بلا کس گناہ کی وجہ سے آئی ان کا تو مذاق یہ ہے ؏

؏ وجودک ذنب لا یقاس بہ ذنب

(تیرا وجود خود گناہ ہے' گناہ کے سوا اسے قیاس نہیں کیا جا سکتا)

کہ خود ہمارا موجود ہونا ہی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کے برابر کوئی گناہ نہیں موجود' حقیقی کے سامنے ممکن معدوم کی ہستی کیا ہے کہ یہ بھی وجود میں اس کے ساتھ شریک ہو۔ یہ تو ہر وقت نیست و نابود کر دیئے جانے کے قابل ہے' لیجیے عارفین تو آپ کے وجود ہی کو گناہ بتلا رہے ہیں جس سے آپ بچ ہی نہیں سکتے۔ اس شعر کا یہ مطلب نہیں کہ وجود فی نفسہ گناہ ہے کیونکہ وجود فی نفسہ ہمارے اختیار میں کب ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے کو موجود سمجھنا اور اپنی ہستی پر نظر کرنا گناہ ہے۔ سو واقعی جس کی نظر ۔۔ جو د حقیقی کی ہستی پر ہے وہ تو اس کے سامنے اپنے آپ کو موجود کہتے ہوئے بھی شرمائے گا:

ہمہ ہرچہ ہستد ازاں کمترند کہ باہستیش نام ہستی برند

(جو چیزیں موجود ہیں موجود حقیقی کے سامنے اتنی کمتر ہیں کہ ان کا نام بھی نہیں لے سکتے کہ ان کا وجود ہے)

وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو شیخ نے کتنی دو مختصر اور آسان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ جتنی چیزیں ہست نظر آتی ہیں گو ہست تو ہیں مگر پھر بھی یہ سب موجود حقیقی کے سامنے اس سے بھی کمتر ہیں کہ ہستی کا نام بھی لے سکیں یعنی اس قابل بھی نہیں ہیں ان کا وجود اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ جب ان کے نزدیک وجود بھی گناہ ہے تو سارے نیک اعمال بھی ان کے نزدیک حسنات نہیں بلکہ ان کی نظر میں وہ بھی سیئات ہیں اور جو واقعی سیئات ہیں ان کو تو نہ معلوم وہ کس درجہ میں شمار کرتے ہوں گے۔ اب آپ کو معلوم ہوا کہ یہ کہنا کہ ہم کس گناہ میں مارے گئے یہ اپنے کو مقدس سمجھنا ہے۔ یہی خود بہت بڑا گناہ ہے اور گناہوں کو تو کیا پوچھتے ہو! پہلے اسی کی خبر لو! کہ خود اسی وقت عجب و دعویٰ کے گناہ میں مبتلا ہو رہا ہے۔

معصیت طاعت

صاحبو! سچ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہماری پردہ پوشی فرماتے رہتے ہیں ورنہ پہلی امتوں کی طرح اگر گھر کے دروازے پر گناہ لکھ دیئے جایا کرتے جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا کہ رات کے گناہ دن میں دروازہ پر لکھے ہوتے تھے اور دن کے گناہ تو سب دیکھتے ہی تھے۔ اس وقت معلوم ہوتا کہ ہم کس قدر گناہ کرتے اور کتنے رسوا اور ذلیل ہوئے ہیں مگر اس نعمت کی ہم نے یہ قدر کی ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو ہمارے گناہ چھپائے تو ہم خود بھی اپنے کو مقدس سمجھنے لگے۔ اے صاحبو! دوسروں ہی سے تو ہمارے گناہ چھپے ہوئے ہیں خود ہم سے تو نہیں چھپا دیئے گئے؟ پس یہ کتنی حماقت ہے کہ دوسروں کے حسن ظن سے ہم نے خود بھی اپنے ساتھ حسن ظن کر لیا۔ ہم کو چاہیے کہ جب طاعت کریں تو اس کو دیکھیں کہ ہم نے اس کو کس طرح ادا کیا۔ پھر یہ سوچیں کہ ہم سے کیسی طاعت مطلوب تھی اور ہم نے ادا کیسی کی ہے۔ ایسی ہی طاعت ہم سے مطلوب ہے جیسی ہم ادا کرتے ہیں؟ ایک نماز ہی کو لے لو! کہ ہم اس کی کیسی بری گت بناتے ہیں نہ طریقہ کے ساتھ وضو کیا جاتا ہے نہ قاعدہ کے موافق قرأت ہے نہ اطمینان سے رکوع اور سجدہ ہے ایسی ٹکریں مارتے ہیں جیسے کوئی بیگار سر سے ٹالتا ہو اور خشوع و خضوع کا تو پتہ ہی کہیں نہیں ہوتا نہ معلوم دل کہاں کہاں ٹکریں مارتا پھرتا ہے پھر اس پر سمجھتے ہیں کہ ہم نمازی ہیں' نماز کے پابند ہیں اور اسی طرح ہر کام کو دیکھئے! اور سوچئے! واللہ

اگر ہم اس طرح کسی دنیا کے آقا کا کام کریں تو ہمارے سر پر سو جوتے روزانہ پڑا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ عارفین اپنی طاعات کو نہیں سمجھتے وہ تو یوں کہتے ہیں:

خود ثناء گفتن زمن ترک ثناست کیں دلیل ہستی و ہستی خطاست

(خود ثناء کرنا میری طرف سے ترک ثناء ہے یہ ہستی کی دلیل ہے اور ہستی خود خطاء ہے)

اور طاعات بھی ایک قسم کی ثناء ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا ثناء کرنا یعنی طاعت بجالانا یہ خود ترک طاعت ہے یعنی وہ بھی ایک گناہ ہے کیونکہ ہم اس پر نظر عجب سے نگاہ کرتے ہیں۔

امام غزالیؒ کی حکایت

خشوع کے اوپر مجھے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا اور ان کے بھائی کا قصہ یاد آیا۔ امام ابو حامد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی احمد غزالی جماعت سے نماز نہ پڑھتے تھے۔ مغلوب الحال زیادہ تھے ایک مرتبہ امام غزالی نے والدہ سے اس کی شکایت کی۔ انہوں نے ان کو سمجھایا بجھایا' خیر جماعت میں آ کر کھڑے ہوئے۔ امام غزالی امام بنے نماز پڑھنی شروع کی' بس تھوڑی ہی دیر میں ان کے بھائی صاحب نیت توڑ کر جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو جو معلوم ہوا کہ نیت توڑ کر چلے گئے بہت ناگوار ہوا آ کر والدہ صاحبہ سے اس کی شکایت کی' والدہ نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت تھی وہ کہنے لگے اگر کسی کے کپڑے میں حیض کا خون لگ جاوے تو نماز نہیں ہوتی' ان کے قلب میں حیض کا خون لگ رہا تھا' بس میں اقتداء سے جدا ہو گیا اور ہوا یہ کہ اس زمانہ میں ایک فقہ کی کتاب لکھ رہے تھے تو اس وقت ایک خاص جزئیہ اس باب کا ان کے قلب میں گزرا ان کو مکشوف ہو گیا۔ اب دیکھئے کہ ان کی والدہ صاحبہ کیا فیصلہ فرماتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ محمد (امام غزالی کا نام ہے) واقعی تم نے نماز کا حق ادا نہ کیا' مسائل کے حل کے لیے دوسرا وقت ہے نماز میں کیوں ادھر التفات کیا اور دوسرے سے فرمایا کہ احمد تم نے بھی خطا کی تمہارا حضور بھی کامل نہ تھا تم کو حق تعالیٰ سے توجہ ہٹا کر ادھر کیوں التفات ہوا؟ کہ امام کیا کر رہا ہے کیا سوچ رہا ہے دونوں کے حضور میں نقصان ہے۔ واقعی کیا اچھا فیصلہ کیا۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ نماز میں ایسی حالت ہونی چاہیے:

دلارامے کہ داری دل دروبند دگر چشم از ہمہ عالم فروبند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہو تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کر لو)

اے صاحبو! اگر ہم کو ہر وقت یہ حالت نصیب نہیں تو کم از کم نماز میں تو ایسا ہو جانا چاہیے کہ تمام عالم سے آنکھیں بند کر لیں جس نے نماز میں بھی عالم سے آنکھیں بند نہیں کیں وہ پھر اور کس

وقت خدا کی طرف لگے گا' تب احمد سمجھے کہ واقعی ہم کچھ نہیں ہیں' خشوع و خضوع کا ہمارا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ والدہ صاحبہ ہم سے بھی بڑھی ہوئی ہیں' کتنی بڑی غلطی پر متنبہ کیا جس کو ہم غلطی بھی نہ سمجھتے تھے ہم تو بھائی صاحب ہی کو الزام دیتے تھے کہ وہ نماز میں خشوع نہیں کرتے۔ اب معلوم ہوا کہ ہم خود بھی خشوع سے خالی ہیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس وقت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے خشوع میں پھر بھی بہت زیادہ نقصان نہ تھا کیونکہ ان کو تو ایک شرعی مسئلہ ہی کا خیال آیا تھا اور مسائل شرعیہ اگرچہ غیر خدا ہیں مگر پھر ان کو خدا کے ساتھ ایک گونہ تعلق ہے تو خدا کی طرف سے اگر دھیان ہٹا تھا تو اسی کے احکام میں لگا ہوا بھی تھا اور شیخ احمدؒ کا دھیان خدا کی طرف سے ہٹ کر امام کی حالت پر متوجہ ہوا اور ایک خاص واقعہ کا ان کو انکشاف ہو گیا تو ان کو خدا کی طرف خیال نہ رہا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ کا خدا کے احکام کی طرف تو یہ تھا تشتت ان کے تشتت سے اوراودون تھا' اب اس واقعہ کو سن کر فرمایئے! کہ ہم میں خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز پڑھنے والے آدمی ہیں؟ غرض نماز ہی کو دیکھ لو! تو معلوم ہو جائے کہ ہماری کوئی طاعت طاعت کہنے کے قابل نہیں۔

رفع اشکال

اس جگہ بظاہر یہ ایک شبہ ہوتا ہے میں اس کو بھی رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "اجهز جیشی وانا فی الصلوٰۃ" کہ میں نماز کے اندر لشکر بھیجنے کا سامان کیا کرتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں نماز کے اندر لشکر کا خیال آتا تھا اور ایک آن میں دو چیزوں کی طرف التفات نفس محال ہے تو یقیناً لشکر کے خیال کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف خیال نہ رہتا ہوگا یا کم رہتا ہوگا تو اب یا تو یہ مانا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز میں خشوع نہ کرتے تھے یا یہ کہا جائے کہ خدا کے سوا دوسرے خیالات میں مشغول ہونا خشوع کے منافی نہیں۔ اشکال ہے ہر ظاہر میں سخت۔ اسی لیے ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس دو عالم جھگڑتے آئے تھے ایک تو خطرات کو آنے کو خشوع کے منافی سمجھتے تھے دوسرے اس کو خشوع کے منافی نہ سمجھتے تھے اور اس قصہ سے استدلال کرتے تھے۔ پہلے شخص کو اس کی حقیقت نہ معلوم ہونے سے کوئی جواب نہ پڑا تھا۔ اس لیے بعضے لوگ اس واقعہ سے خشوع کے عدم وجوب کے قائل ہوئے ہیں کیونکہ ان پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ کی حقیقت واضح نہیں ہوئی۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے اس کی حقیقت کو منکشف فرمایا' آپ نے جواب دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تجہیز جیش خشوع کے منافی نہیں کیونکہ وزیر جب بادشاہ

کے دربار میں آتا ہے تو اس کا خشوع یہی ہے کہ سرکاری کاغذات کو دیکھے اور بادشاہ کے سامنے پیش کرے۔اس سے احکام دریافت کرے اور اس کے موافق فرمان شائع کرے تو ایک شخص تو وہ ہے جو بادشاہ کے دربار میں محض حاضری دینے آتا ہے اس کا کام یہ ہے کہ بادشاہ کی عظمت وجلال ظاہر کرنے کے لیے دست بستہ اس کے سامنے کھڑا رہے۔چنانچہ دربار شاہی میں بہت سے خدمت گار صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے دست بستہ کھڑے رہیں۔دوسرا کوئی کام ان کے ذمہ نہیں ہوتا۔سو اس کا خشوع تو یہی ہے کہ ہاتھ باندھے سر جھکائے بادشاہ کے سامنے کھڑا ہے کسی چیز کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے اور ایک وزیر ہے جس کا کام یہ ہے کہ سلطنت کا انتظام کرے اور بادشاہ کے حکم کے موافق فرمان نافذ کرے اس کا خشوع یہی ہے کہ تمام کاغذات کو دیکھے بھالے ڈاک کو پڑھے ان کے جواب کو لکھ کر بادشاہ کو سنائے۔پس ظاہر میں اگرچہ پہلے شخص کا خشوع بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظر بادشاہ کے سوا کسی چیز میں نہیں اور وزیر بظاہر دوسری چیزوں کی طرف متوجہ معلوم ہوتا ہے وہ دست بستہ بادشاہ کے سامنے یکسو ہو کر نہیں کھڑا ہوتا مگر کون نہیں جانتا کہ وزیر کا مرتبہ پہلے شخص سے کس قدر بڑھا ہوا ہے اور اس کی اطاعت اور خشوع یہی ہے کہ دوسرے کاموں میں مشغول ہو جو بادشاہ نے اس کے سپرد کیے ہیں اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے جن کے سپرد انتظام عام کا کام کیا گیا تھا ان کا خشوع یہی تھا کہ نماز میں کھڑے ہو کر حق تعالیٰ سے لشکر وغیرہ کی بابت احکام دریافت کریں اور نماز میں جو بات ان کے دل پر القاء ہو اس کے موافق عمل کریں اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ نماز میں جو کچھ القاء ہوتا ہے وہ اکثر صحیح ہوتا ہے۔پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تجہیز جیش کی وہی مثال ہے جو وزیر کی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر حالت ہوتی ہے۔حضرت عمر کو تجہیز جیش میں بھی حضورِ حق ہی حاصل ہوتا تھا اس لیے ان کی یہ حالت کسی طرح خشوع کے منافی نہ تھی بلکہ عین خشوع تھی بلکہ مثال سے واضح ہو گیا کہ دوسروں کے خشوع سے آپ کا خشوع اس حالت میں بھی بڑھا ہوا تھا۔غرض معلوم ہو گیا کہ یہ حالت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خشوع کی منافی کسی طرح نہیں اس سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم ہو گئی جو اس واقعہ سے خشوع کے عدم وجوب کے قائل ہوئے ہیں۔

قابلِ مواخذہ اطاعت

اور خشوع ضروری کیونکر نہ ہو جبکہ حق تعالیٰ خشوع نہ کرنے پر بہت زور کے ساتھ شکایت کے طور پر فرماتے ہیں: "اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا

نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ" کیا مسلمانوں کے لیے (ابھی) اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے قلوب خدا کی نصیحت کے سامنے اور جو دین حق (منجانب اللہ) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں؛ خشوع اگر چہ صحت صلوۃ کا موقوف علیہ نہ ہو یعنی نماز کی صحت اگر چہ خشوع پر موقوف نہیں اس کے بدون بھی نماز درست ہے اور فرض ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے مگر صاحب روح المعانی نے علماء کا اس پر اجماع لکھا ہے کہ خشوع قبول صلوۃ کا موقوف علیہ ہے کہ بدون اس کے نماز قبول نہیں ہوتی اب آپ خود غور فرمالیں کہ نماز سے مقصود کیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قبول ہی مقصود ہوتا ہے جو طاعت قبول نہ ہوئی وہ طاعت ہی کیا ہے اس سے آپ کو خشوع کی ضرورت معلوم ہوگئی ہوگی۔ رہا فرض کا ذمہ سے ساقط ہو جانا۔ یہ کوئی چنداں قناعت کی بات نہیں۔ دیکھئے! دو شخص بادشاہ کی خدمت کرتے ہوں ایک تو اچھی طرح اس کی مرضی کے موافق کرتا ہو کہ بادشاہ اس کی خدمت سے خوش ہوتا ہو اور دوسرا بری طرح کرتا ہوں جس سے بادشاہ کو غصہ آتا ہو تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ دربار میں حاضر ہو جانا اور غیر حاضر نہ ہونا ہی کافی ہے؟ ہرگز نہیں! سب عقلاً اتفاق کے ساتھ یہی کہیں گے کہ ایسی خدمت سے کچھ نفع نہیں بلکہ ہر روز چونکہ وہ بادشاہ کو ناراض کرتا ہے اندیشہ ہے کہ کہیں ایک دن دربار سے بالکل ہی نہ نکال دیا جائے۔ افسوس کہ بادشاہوں کی خدمت میں تو سب کا اس پر اتفاق ہے کہ بے ڈھنگی طرح کرنا بالکل فضول ہے اور خدا تعالیٰ کی عبادت میں آ کر سب کی عقلیں مسخ ہو گئیں کہ بدوں خشوع خضوع کے نماز پڑھ کر بھی خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے بڑا کام مارلیا۔

بے سلیقہ حاضری

حقیقت یہ ہے کہ ہماری طاعت تو سزا کے قابل ہے۔ اس کی بالکل وہی مثال ہے جیسے کوئی غلام زور زور سے بادشاہ کو پنکھا جھلتا ہو کہ کبھی کان پر لگ جاتا ہے کبھی سر پر کبھی ٹوپی اڑ جاتی ہے کبھی ماتھے پر لگ جاتا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ بادشاہ کی خدمت کر رہا ہے؛ یہ خدمت نہیں یقیناً بے ادبی ہے پھر اس طرح پنکھا جھلنے پر اگر وہ غلام ناز کرے کہ میں نے بڑی جانفشانی اور محنت سے بادشاہ کو پنکھا جھلا ہے میں انعام کا مستحق ہوں وہ احمق ہی نہیں؟ وہ انعام کا مستحق تو کیا ہوتا انعام میں باندھے جانے کے قابل ہے۔ یعنی اس لائق ہے کہ چوپاؤں اور جانوروں کے ساتھ باندھا جاوے کہ اس کو خدمت شاہی کا کچھ بھی سلیقہ نہیں نہ آداب شاہی کا خیال ہے مگر اس کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ جب خشوع کے بغیر نماز کوئی چیز نہیں تو اس سے فائدہ ہی کیا لاؤ آج سے نماز ہی کو طلاق دو! یہ مطلب

ہرگز نہیں بلکہ مطلب میرا یہ ہے کہ نماز پڑھتے رہو مگر ساتھ ساتھ خشوع حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتے رہو پھر اگر خشوع نصیب ہو گیا اور انشاء اللہ کوشش کرنے سے حاصل ہو ہی جاوے گا۔

صدق طلب

ایسا ہوتا ہی نہیں کہ کوئی خدا کی طلب کر کے محروم رہ جاوے تب تو مقصود حاصل ہو گیا اور اگر فرض کر لو کہ تم نے خشوع حاصل کرنے کی باقاعدہ پوری کوشش کی پھر بھی حاصل نہ ہوا تو آپ بے فکر رہیں انشاء اللہ قیامت میں خشوع کے نہ ہونے پر آپ سے مواخذہ نہ ہوگا کیونکہ جو کام آپ کا تھا یعنی کوشش اور طلب وہ آپ کر چکے اب آگے کامیابی ہونا یا نہ ہونا یہ خدا کے قبضہ میں ہے' کوشش کے بعد ناکام رہنے سے مواخذہ نہیں ہوتا' مواخذہ اسی پر ہوتا ہے کہ تم نے کوشش کیوں نہیں کی مگر یہ بات میں نے فرض کے طور پر کہی ہے ورنہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ طلب اور کوشش کے بعد انسان ناکام نہیں رہتا اور جو ناکام رہتے ہیں وہ کوشش ہی نہیں کرتے یا کم کرتے ہیں۔ پس جب تک خشوع نہ حاصل ہو آپ بلاخشوع ہی کے نماز پڑھتے رہیں اور خشوع حاصل ہونے کی طلب اور کوشش میں لگے رہیں اور ہر نماز کے بعد حق تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتے رہیں اور دل سے یہ بھی دعا کرتے رہیں کہ یا اللہ ہم کو خشوع کامل عطا فرما دے۔ اس توبہ واستغفار کی برکت سے امید ہے کہ نماز میں خشوع نہ ہونے سے جو کمی رہ گئی تھی حق تعالیٰ اس کو بھی پورا کر دیں گے۔ اب تو آپ کو شریعت کی قدر ہوئی ہوگی! دیکھئے کس قدر آسانی ہے کہ اول تو خشوع سے نماز پڑھو اگر خشوع حاصل نہ ہو تو بلاخشوع ہی پڑھو اور ہر نماز کے بعد دعاء واستغفار کرتے رہو! اگر ساری عمر کوشش کرنے سے بھی خشوع حاصل نہ ہو تو بلاخشوع ہی پڑھتے رہو! مگر استغفار ضرور کرتے رہو' انشاء اللہ خشوع والوں کے برابر ہو جاؤ گے' یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے۔ غرض یہ کہ جب ہماری طاعات کی یہ حالت ہے تو پھر مصیبت آنے کے وقت یہ کہنا کہ ہائے کس گناہ میں پکڑے گئے سخت بے حیائی ہے' گناہ سے ہمارا کونسا وقت خالی ہے ہم تو سرتاپا گناہ ہو رہے ہیں' ہم کو تو اس پر تعجب ہونا چاہیے کہ اب تک صحیح سالم کیسے بیٹھے ہیں۔

اہتمام توبہ

جب یہ معلوم ہو گیا کہ مصائب کا سبب ہمارے گناہ ہیں تو اب اس کا علاج کیا ہونا چاہیے؟ اس لیے کہ کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا نہ ہو گناہوں کا علاج بھی ہے۔ حدیث میں ہے: "کُلُّکُم خَطَّاؤُنَ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ"[1] (تم سب خطا کرنے والے ہو اور اچھے خطا کرنے والے توبہ کرنے والے ہیں) کیا تسلی آمیز علاج فرماتے ہیں کہ گناہوں کی وجہ سے ناامید

---

[1] (سنن الترمذی ۲۴۹۹، الدر المنثور ۳: ۱۹۰)

نہ ہو مایوس نہ ہو خطا ہو جانا انسان سے کچھ بعید نہیں خطا وارتم سب ہو ملائکہ انبیاء علیہم السلام کے سوا گناہوں سے معصوم کوئی نہیں اپنے اپنے درجہ کے موافق گناہ ہر شخص سے ہوتے ہیں مگر خیر الخطاء میں التوابون یعنی خطا کاروں میں اچھے وہ ہیں جو بہت توبہ کرتے رہیں خطا ہو جانا کچھ زیادہ تعجب نہیں مگر اس کے بعد ندامت اور انفعال بھی نہ ہو اپنی اصلاح کی فکر بھی نہ ہو یہ زیادہ محل شکایت ہے اگر خطا کے بعد ندامت اور انفعال ہوتا رہے اور اصلاح کی کوشش جاری رہے تو پھر دن میں سو بار بھی خطا ہو تو حق تعالیٰ معاف فرمادیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاؤں کے مقابلہ میں توابون فرمایا جس میں باعتبار صیغہ کے اشارہ اس طرف ہے کہ جتنی بار خطائیں کرتے ہیں اتنی ہی بار توبہ کرتے ہیں۔ غرض جو ہر گناہ سے توبہ کرتے رہتے ہیں وہ دوسرے خطا کاروں سے اچھے ہیں مگر توبہ کے یہ معنی نہیں کہ صرف زبان سے توبہ توبہ کہہ لیا جائے۔ نہیں توبہ یہ ہے کہ دل میں شرمندگی اور ندامت ہو اور آئندہ کے لیے اصلاح کا عزم ہو اور پچھلے حقوق کے ادا کرنے کا اہتمام شروع کردیں ورنہ زبانی توبہ سے کیا ہوتا ہے۔

حق استقامت

اس تقریر پر یہ شبہ ہوگا کہ جب مصائب گناہوں کے سبب سے آتی ہیں تو ہم تو بعضے اولیاء اللہ کو بھی مصائب میں مبتلا ہوتے دیکھتے ہیں تو کیا وہ بھی گنہگار ہیں؟ اس کے چند جواب ہیں اول یہ کہ اولیاء اللہ ہی کہاں کے معصوم ہیں ان کے درجہ کے موافق گناہ ان سے بھی ہوتے ہیں۔ یوں کہیے! کہ وہ بھی اندھوں میں کانے راجا ہیں وہ دوسروں کے اعتبار سے نیک ہیں ولی ہیں سب کچھ ہیں مگر خدا کے عظمت وجلال کے سامنے تو وہ بھی خطا کار ہیں خدا کے لائق اطاعت کوئی نہیں کرسکتا ان کی بھی کشتی استغفار اور توبہ ہی سے پار ہو سکتی ہے۔ حضرت شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں:

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش — عذر بدر گاہ خدا آورد
ورنہ سزا وار خداوندیش — کس نتواند کہ بجا آورد

(بندہ وہی بہتر ہے جو اپنی کوتاہی کا عذر دربار خداوندی میں لائے ورنہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ کی عظمت کے لائق کوئی کام بجالائے)

اگر کوئی یہ چاہے کہ دین کا پورا حق ادا کردے اور سرمو شریعت سے تجاوز کسی بات میں بھی نہ ہو تو یہ عادۃً ہرگز نہیں کرسکتا بڑے سے بڑے ولی خطا سے معصوم نہیں کبھی نہ کبھی کوئی لغزش خطا سے یا سستی سے ہو ہی جاتی ہے۔ حدیث میں ہے: "لَنْ یُشَادَّ الدِّیْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ اِسْتَقِیْمُوْا

وَلَنْ تُحْصُوْا'' (الصحیح للبخاری ۱: ۱٦ ' سنن النسائی کتاب الایمان باب: ۲۸)
کہ کوئی شخص کبھی دین کا مقابلہ نہ کرے گا مگر وہ مغلوب ہو جائے گا اور دین ہی غالب رہے گا' بس سیدھی راہ پر چلتے رہو اور تم ہرگز پورا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اس پر بظاہر یہ اشکال ہوگا کہ جب احصاء نہیں ہو سکتا تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم استقامت کا حکم کس لیے فرماتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ استقامت کا حق تو ادا نہیں ہو سکتا مگر جس قدر ہو سکے اور جتنا اپنی وسعت میں ہے استقامت کی کوشش کرنی چاہیے مگر کسی وقت یہ مت سمجھو کہ استقامت کا حق ہم سے ادا ہو گیا۔ رہی یہ بات کہ ہماری ہمت میں کتنی استقامت ہے اس کو سرمد فرماتے ہیں:

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دوکار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد

(سرمد شکایت کو مختصر کرو اور دو کاموں میں سے ایک کام کرو یا تو تن کو محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وقف کر دو یا محبوب سے قطع نظر کرو)

فرماتے ہیں کہ گلہ اور شکایت چھوڑو! بس دو کام میں سے ایک کام کرو! یا تو دوست کی رضا میں جان وتن کھپا دو یا محبوب سے قطع نظر کر لو! اگر جان وتن عزیز ہے اور اس کا کھپانا منظور نہیں تو اور کہیں جاؤ یہ خدا تو ایسے ہی ہیں وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ بس اپنے کو مٹا دو! ''اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ'' [۱]
(اس آیت میں لو انا بیننا سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل نفس مطلوب نہیں پھر یہ دلالت مذکورہ فی المتن کیسی؟ جواب یہ ہے کہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل امر تو یہی تھا مگر رعایت کے سبب تخفیف فرما دی گئی کہ اس کی ہمت نہ کریں گے ورنہ اگر مکلفین میں اس کی ہمت دیکھی جاتی تو اس کو ضرور مشروع فرماتے کیونکہ قابل مشروعیت کے ہے تو اس طرح مطلوب ہونا اس کا مدلول آیت ہوا ۱۲ اشرف) کا یہی مدلول ہے بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی مطلب ہے کہ اپنی جان کھپا دو خدا کے راضی کرنے میں مگر پھر بھی یہ مت سمجھو کہ تم نے حق ادا کر دیا۔ بس اسی طرح چلتے رہو تم حق ادا نہیں کر سکتے اپنی کوشش میں لگے رہو اسکے بعد اپنا معاملہ خدا کے حوالہ کرو! کہ یا اللہ! جتنا مجھ سے ہو سکتا تھا وہ میں نے کیا اب آپ میرے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ فرمائیے! میری کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمائیے! پھر میں کہتا ہوں کہ خدا کو چھوڑ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے' کوئی دوسرا در ہو تو کہیں جائے ان کی تو یہ شان ہے:

عزیزیکہ از در گہش سر بتافت بہر درکہ شد ہیچ عزت نیافت

یعنی خدا کا دروازہ چھوڑ کر کہیں عزت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آئی۔ حضرت شیخ شیرازیؒ نے بوستاں میں لکھا ہے کہ ایک شیخ رات کو ہمیشہ تہجد کے لیے اٹھتے تھے۔ ایک رات غیب سے آواز آئی کہ یہاں کچھ قبول نہیں کچھ بھی کرتے رہو اور یہ آواز ایک مرید نے بھی سنی۔ دوسری رات کو اس نے دیکھا کہ شیخ پھر لوٹا بدھنا لے کر نماز کو اٹھے اور جائے نماز پر کھڑے ہوگئے' مرید نے عرض کیا کہ جب وہاں کچھ قبول نہیں تو آپ ہی کیوں سر مارتے ہیں' پڑ کے سو رہیے! اس محنت سے کیا فائدہ' شیخ نے جواب دیا کہ بھائی یہ تو سچ ہے کہ وہاں قبول نہیں مگر کوئی دوسرا دروازہ تم بتلا دو جہاں قبول ہو میرا تو ایک ہی دروازہ ہے چاہے وہ قبول کریں یا نہ کریں میں تو اس در کو نہیں چھوڑ سکتا' اپنی سعی کرتا رہوں گا اور کہا:

تو دانی ازاں دل پر داختن   کہ دانی کے بے اوتواں ساختن

(کیا اس سے دل خالی کر سکتے ہو جس کے متعلق معلوم ہو کہ بغیر اس کے گزارہ کر سکتے ہو)

پس یہ کرنا تھا کہ دریائے رحمت جوش میں آیا اور غیب سے دوسری آواز آئی:

قبول است گرچہ ہنر نیستت   کہ جزما پناہے دگر نیستت

(قبول ہے اگرچہ کمال کی کوئی بات اس میں نہیں سوائے اس بات کے کہ تم نے یہ کہہ دیا کہ ہمارے سوا پناہ کی اور کوئی جگہ نہیں)

یعنی اگرچہ عبادت قابل قبول نہیں تھی مگر چونکہ کوئی دوسری پناہ بھی نہیں اس لیے سب قبول ہے کیے جاؤ! دیکھیے! یہ مذاق ہوتا ہے عشاق کا کہ ان کو طلب سے کام ہوتا ہے اپنی طرف سے طلب میں کمی نہیں کرتے اور قبول و نا قبول کی کچھ پروا نہیں کرتے' بادشاہ کے دروازے پر بھیک مانگنے جانا چاہیے ہر دن جاتا رہے اگر سو بار دھکے ملیں گے کسی دن تو رحم آ جاوے گا کہ اس غریب کے واسطے یہی ایک دروازہ ہے آخر اسے چھوڑ کر کہاں جائے' لاؤ! اس کی مراد پوری کر دیں۔ چنانچہ خسرو فرماتے ہیں:

خسرو غریب است گدا افتادہ در کوئے شما   باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

اور اگر ایک دن بھی کچھ نہ ملے تو ہمارا کوئی حرج تو نہیں عبادت کرنے میں طلب کرنے میں دروازہ پر ناک رگڑنے میں کیا نقصان ہے؟ اجی جب وہ پوچھتے ہی نہیں کرو جب اور نہ کرو جب' دونوں حالتوں میں محرومی ہے تو کرتے رہنا اور محروم رہنا یہ اس سے اچھا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر بیٹھ جاؤ پھر محروم رہو کیونکہ چھوڑ کر بیٹھ جانے میں ہماری طرف سے بے رخی ہوگی اور عاشق کی شان

سے بے رخی مستبعد ہے اور محبوب بے رخی کرے یہ اس کا ناز ہے اگر ہم کو بھیک نہ ملے تو ہمارا کوئی قرض تو نہیں تھا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی طرف سے کمی نہ کرو جان کھپا دو اور پھر یہی سمجھتے رہو کہ ہم سے کچھ حق ادا نہیں ہو سکتا اپنے کو قبول اور قرب کے لائق ہرگز مت سمجھو! آخر تم کو حضرت حق سے مناسبت ہی کیا ہے جو تم اس کے قرب کے لائق ہو! وہ بالکل مبرا اور منزہ اور تم سراپا عیوب ونقصان پھر جب اتنا بعد ہے تو تم کسی حال میں قرب کے لائق نہیں ہو سکتے اور اگر وہ اپنا قرب عطا فرماویں یہ محض ان کی عنایت ورحمت اور فضل ہے۔

انکشاف عبدیت

اسی کو ایک مجذوب فرماتے ہیں خدا وہ ہے جو سمجھ میں نہ آئے اور سمجھ وہ ہے جو خدا کو پاوے' یہ مجذوب ایسے ہی آزاد ہوتے ہیں ان کے الفاظ ظاہر میں بے ربط ہوتے ہیں ان کے مطلب کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا اور چونکہ ہدایت کا کام ان کے سپرد نہیں ہوتا اس لیے ان کو اس کی پروا بھی نہیں ہوتی کہ ہماری بات کا مطلب کوئی سمجھا یا نہیں' مطلب ان مجذوب صاحب کا یہ ہے کہ خدا وہ ہے جس کی کنہ ذات تک کسی کی سمجھ نہیں پہنچ سکتی اس کی حقیقت کا ادراک کوئی نہیں کر سکتا۔ اس مضمون کو حدیث میں ان الفاظ سے کیا گیا ہے:

ماعرفناک حق معرفتک لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک.[1]

یا اللہ ہم نے آپ کو پوری طرح (جیسا کہ آپ کے شایان شان ہے) نہیں پہچانا ہم آپ کی پوری طرح تعریف نہیں کر سکتے آپ ویسے ہی ہیں جیسے کہ آپ نے خود اپنی تعریف فرمائی ہے۔ اسی لیے عارفین فرماتے ہیں کہ خدا کے متعلق جس قدر علم ہم کو حاصل ہوتا ہے خدا اس سے بھی بالا وبرتر ہے اس کو کسی کا علم احاطہ نہیں کر سکتا اور یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ جب ہم کو خدا تعالیٰ کا علم بھی کامل طور پر حاصل نہیں ہو سکتا تو ہم قرب خداوندی کے خود کیسے لائق ہو سکتے ہیں ہمارے میں اور خدا تعالیٰ میں بہت زیادہ بعد ہے۔ بس انسان کی بڑی معرفت اور منتہائے قرب یہ ہے کہ اس کو یہ بات منکشف ہو جائے کہ ہم خدا کے علم وادراک سے عاجز ہیں۔ یہ بات عقیدہ کے طور پر ہر شخص جانتا ہے مگر اس کا انکشاف ہر شخص کو نہیں ہوتا۔ جب عارفین کو حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کا حسب قابلیت مشاہدہ ہوتا ہے اس وقت ان کو اپنا عجز اور ضعف اور اپنی عبدیت کا انکشاف ہوتا ہے اسی مطلب کو ان حضرت مجذوب صاحب نے ان لفظوں سے ظاہر کیا ہے کہ خدا وہ ہے جو سمجھ میں نہ

---

[1] ولہ احد الحدیث فی "موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف)

آوے اور جو تمہاری سمجھ میں آ جاوے وہ خدا نہیں۔ خدا اس سے پاک اور بالا و برتر ہے مگر باوجود عقل سے کام یہ لینا چاہیے کہ خدا کو معلوم کرے پس اس جملہ میں اور پہلے جملہ میں بظاہر تعارض ہے کیونکہ جب خدا تعالیٰ تک عقل کی رسائی نہیں ہوسکتی تو پھر اس کے کیا معنی کہ سمجھ وہ ہے جو خدا کو پاوے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ سمجھ سے خدا کو پاسکتے ہیں۔ سو اس جملہ کا یہ مطلب ہے کہ سمجھ وہ ہے جو خدا کو پانے کی کوشش کرے۔ جیسا کہ ہم کہا کرتے ہیں کہ چاند دیکھا تھا' اس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ چاند دیکھا تھا اور اس کو دیکھ بھی لیا۔ دوسرے یہ کہ چاند دیکھا تھا مگر نظر نہیں آیا۔ اس وقت چاند دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح پانے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ پالیا' دوسرے یہ کہ پانے کی کوشش کی۔ پس مطلب مجذوب کا یہ ہے کہ سمجھ وہ ہے جو خدا کی طلب میں رہے اگرچہ اس کی ذات تک رسائی نہیں ہوسکتی۔

صالحین پر مصائب

پس حدیث میں جو آتا ہے: "اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا"[1] اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ اپنی سعی کوشش کرتے رہو اگرچہ تم سے پورا حق ادا نہیں ہوسکتا اور یہ مسئلہ عقلاً بالکل سچ ہے کیونکہ خدا کی عظمت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کمالات کا حق ادا کیا جاوے اور کمالات الٰہی غیر متناہی ہیں تو ہم سے ان کا حق کیونکر ادا ہوسکتا ہے؟ متناہی غیر متناہی کے حقوق کو کب ادا کرسکتا ہے؟ کیونکہ ہماری زندگی اگر ہزار سال کی بھی ہو تب بھی محدود ہے اگر ہزار سال تک کوئی شخص ہر دم عبادت کرتا رہے کسی وقت راحت و آرام میں مصروف نہ ہو جب بھی وہ ایک محدود زمانہ ہے جس میں غیر متناہی کمالات کے حقوق ادا نہیں ہوسکتے اور جس صورت سے ہم لوگ عبادت کرتے ہیں کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے تین چار گھنٹے عبادت میں اور باقی دنیوی مشاغل یا راحت و آرام میں صرف ہوتے ہیں اس صورت سے تو ہمارا کیا منہ ہے کہ ادائے حقوق الٰہی کا دعویٰ کریں۔ غرض جب حق تعالیٰ کے حقوق کا ادا ہونا محال ہے تو کوئی ولی چاہے کتنا ہی بڑا ولی ہو اس سے بھی اپنے درجہ کے موافق گناہ ہوتے ہیں اس لیے اگر نیک لوگوں پر بھی مصائب آئیں تو اشکال کیا ہے پس یہ مسئلہ کہ بیماری گناہوں سے آتی ہے یہ تو صاف تھا کیونکہ بار بار بیان ہو چکا ہے اور جن تین مضمونوں کا میں بیان کرنا چاہتا ہوں ان میں یہ ایک ہے اور اب میں دو مسئلے اور بیان کرتا ہوں جو کہ درحقیقت اسی تقریر کے متعلق شبہات کے جوابات ہیں اور وہ دوسرا تیسرا مضمون یہی ہے۔ ایک تو یہی شبہ ہے جو

---

[1] (سنن ابن ماجہ ۲۷۷' مسند احمد ۵: ۲۷۷' سنن الدارمی ۱: ۱۶۸' مشکوۃ المصابیح ۲۹۲)

ابھی مذکور ہوا تھا کہ نیک لوگوں کو بیماری وغیرہ کیوں آتی ہے حالانکہ آیت سے اور بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماری گناہوں سے آتی ہے اور اس کا جواب میں ابھی دے چکا ہوں۔

دفع مصائب

اور اس وقت اسی کے متعلق ذرا کسی قدر تفصیل کرنا چاہتا ہوں اور ایک دوسرا سوال ہے جو اس سے بھی سخت ہے اس کو میں بعد میں حل کروں گا تو پہلے شبہ کا جواب تو یہ ہے جو ابھی گزرا کہ گناہ ان سے بھی ہوتے ہیں، گناہوں سے خالی کوئی نہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ علاج بالضد ہوتا ہے جب بیماری اور وباء اور تمام مصائب گناہوں کے سبب سے ہیں تو ان کا علاج بھی بس یہی ہے کہ آئندہ کے لیے تو گناہوں کو چھوڑ دو اور پہلے گناہوں کی توبہ واستغفار ومعافی حقوق وغیرہ سے تلافی کرو۔ مگر آج کل ہماری عجب حالت ہے کہ بجائے اپنی اصلاح کے اس بیماری اور مصیبت کو بھی ایک مشغلہ بنالیا ہے چنانچہ بعضے لوگ اموات گنتے پھرتے ہیں اور اس میں آپس میں جھگڑتے بھی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آج دس اموات ہوئی ہیں دوسرا کہتا ہے کہ میاں کو خبر تو ہے ہی نہیں بارہ تو میں نے گنی ہیں اور بھی ایک دو ہوگئی ہوں گی کیونکہ فلانے کی حالت بھی خطرناک تھی فلانے کا سانس چل رہا تھا۔

فضول سوال

صاحبو! یہ حالت اور بھی زیادہ خطرناک ہے کہ گناہوں کی سزا دی جاوے اور اس کو سزا نہ سمجھا جاوے بلکہ اس کو ایک تفریح کا مشغلہ بنایا جائے۔ اپنی اصلاح کرو دنیا بھر کی فہرست گننے سے کیا نفع۔ میرے پاس بھی بعض خطوط اس مضمون کے آتے ہیں کہ یہاں بیماری کا بہت زور ہے۔ آپ کے وطن میں کیا حال ہے تو میں سب کے جواب میں ایک شعر لکھ دیا کرتا ہوں:

ما قصہ اسکندر و دارا نخواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر اور دارا کے قصے پڑھے ہوئے ہیں ہم سے سوائے محبت اور وفا کے قصوں کے اور کچھ نہ پوچھو)

کہ ہمیں ان قصوں کی خبر نہیں اور واقعی مجھے بعض دفعہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ آج کل بیماری کم ہے یا زیادہ کیونکہ اپنے مشاغل سے ہی فرصت نہیں اس کی تحقیق اور تفتیش کون کرے اس لیے میں لکھ دیتا ہوں کہ بستی کے حالات کسی نامہ نگار سے پوچھو مجھ سے تو شریعت کی اور خدا کی باتیں دریافت کرو۔ بعض لوگوں کو فضول سوالات کرنے کا مرض ہوتا ہے بھلا ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ تمہیں

ساری دنیا کی خبروں سے کیا لینا کہ وہاں بھی بیماری ہے یا نہیں جو تمہارے ذمہ ضروری ہے پہلے اس کو تو انجام دو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر لوگوں کو ضروریات کا اہتمام ہو جائے تو ان فضولیات کے لیے وقت ہی نہ ملے۔ چنانچہ میں نے ابھی یہ قصہ بیان کیا ہے کہ ایک عالم کے پاس ایک شخص حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت سوال کرنے آیا کہ دونوں میں سے کون حق پر تھے انہوں نے فرمایا: کہ بھائی! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ تم سے اس کی بابت کچھ دریافت نہ فرمائیں گے اور نہ اس پر مواخذہ فرمائیں گے کہ تم نے اس کی تحقیق کیوں نہیں کی کہ ان دونوں میں سے کون حق پر ہے نہ یہ مقدمہ فیصلہ کے لیے تمہارے پاس آئے گا اور اگر بالفرض آئے بھی تو میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ مقدمہ خارج کر دینا اور کہہ دینا کہ مجھے کچھ تحقیق نہیں اور اگر کسی نے وہاں تم سے یہ سوال کیا کہ تم نے تحقیق کیوں نہ کی تو صاف کہہ دینا کہ میں نے علماء سے پوچھا تھا انہوں نے نہیں بتلایا پھر ہم جانیں اور خدا تعالیٰ۔ تم تو یہ کہہ کر چھوٹ جاؤ گے پھر اگر ہم سے سوال ہوا تو ہم جو چاہیں گے جواب دے دیں گے۔ واقعی خوب جواب دیا۔ مجیب کو چاہیے۔ سائل کا تابع نہ ہو بلکہ اس کو اپنا تابع بنائے اول تو ہر شخص ہر بات کا جواب نہیں سمجھ سکتا' دوسرے جواب دینا اسی بات کا ضروری ہے جس پر کوئی دین کا کام اٹکا ہوا ہو اور جس بات پر دین کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں اس کا جواب دینا وقت کا ضائع کرنا ہے اور وقت ایسی چیز نہیں کہ اس کو اس طرح فضول کھویا جائے۔

آثار رحمت

انسان کو اپنے اندر غور کرنا چاہیے اگر کوئی اپنے اندر غور وفکر کیا کرے تو اس کو معلوم ہو کہ انسان خود ایک عالم ہے۔ ایک پوری اقلیم ہے جس میں کچھ زندہ ہوتے ہیں کچھ مرتے ہیں' کچھ بیمار ہوتے ہیں کچھ تندرست ہیں' کہیں بہار ہے کہیں خزاں ہے۔ غرض ایک عجیب دنیا آپ کے اندر بسی ہوئی ہے جس کے عجائبات کے سامنے اس عالم کے عجائبات ہیچ ہیں اگر ایسا ہی سیر اور تفریح کا شوق ہے تو اپنے دل کی سیر کیجئے۔ ایک صوفی موسم بہار میں جنگل کی سیر کرنے آئے اور سر جھکا کر مراقب بیٹھ گئے۔ ایک شخص نے کہا فانظروا الی اثار رحمۃ اللہ یعنی گردن جھکائے کیا بیٹھے ہو ذرا آنکھیں اوپر اٹھا کر خدا کی قدرت ورحمت کے آثار کا مشاہدہ کرو! ان صوفی نے جواب دیا کہ میں آثار رحمت ہی کو دیکھ رہا ہوں اور جن کو تم آثار رحمت سمجھتے ہو وہ آثار الآثار ہیں' آثار رحمت وہ نہیں ہیں کیونکہ دراصل رحمت کا منشاء ایمان ہے اور غضب کا منشا کفر ہے اور ایمان وکفر کا تعلق قلب سے ہے۔ پس اصل مقام رحمت کا قلب ہے پھر مومن کو ایمان کے صلہ میں جنت دی جائے گی جو کہ ایمان کا ثمرہ ہے اور دنیا کی نعمتیں

اور لذتیں جنت کا نمونہ ہیں اس لیے ان کو بھی آثار رحمت کہہ دیتے ہیں مگر حقیقت میں وہ آثار الا ثار ہیں اصل آثار رحمت تو باطن میں ہیں جس کو سنائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

آسمانہا ست در ولایت جاں　　　کار فرمائے آسمان جہاں

(ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرما ہیں)

مولانا فرماتے ہیں:

غیب را ابرے و آبے دیگرست　　　آسمانے آفتابے دیگرست

(عالم غیب کیلئے ابر اور بادو دوسرے ہیں اور آسمان اور آفتاب وہاں کے دوسرے ہیں)

عالم غیب کا بادل اور پانی دوسرا ہے اس کا آسمان بھی جدا ہے آفتاب بھی جدا ہے جب قلب پر سکینہ نازل ہوتا ہے اور انوار و تجلیات چمکتی ہیں اس وقت اس بادل کا اور بارش کا اور آسمان و آفتاب کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدہ و دل کشا چمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو)

ایک اور صاحب فرماتے ہیں:

خلوت گزیدہ راتما شاچہ حاجت است　　　چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت است

(خلوت نشین کو تماشا کی کیا ضرورت ہے جب محبوب کے کوچہ میں ہے صحرا کی کیا ضرورت ہے)

محبوب کے کوچہ کے ہوتے ہوئے جنگل کی سیر کی کیا ضرورت ہے خلوت میں بیٹھ کر اس کا تماشا دیکھو کوئے دوست سے مراد قلب ہے کہ وہ محل نزول انوار الہیہ ہے اسی کو کہتے ہیں:

اے ورائے عقل یک دم باخود آر　　　دمبدم در تو خزان ست و بہار

(اے عقل سے ماوراء اپنی ذات کے بارے میں سوچ تیرے خود دمبدم بہار اور خزاں ہے)

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ طائف جاتے ہیں کہ وہاں ذرا سبزی اور سردی ہے مگر طائف میں کیا رکھا ہے ذرا قلب سے زمہریر کی طرف توجہ کرو سردی معلوم ہونے لگے گی تو طائف آ گیا۔ ذرا قلب سے حرارت کا تصور کرو گرمی معلوم ہونے لگے گی اور یہ کلام حضرت کا تنزل کے طور پر تھا کہ اگر کسی کو ایسا ہی سردی گرمی کا شوق ہو تو سب چیزیں اس کے اندر موجود ہیں ورنہ کیا رکھا ہے زمہریر کے تصور میں جتنی دیر زمہریر کا تصور کیا جائے محبوب کا تصور کیوں نہ کیا جائے۔

تصورِ شیخ

اسی لیے محققین نے تصورِ شیخ کو بھی منع کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تصورِ شیخ میں کیا رکھا ہے' ہمہ تن شیخ کے تصور میں مشغول ہونا ان کو غیرت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایسا تصور حق تعالیٰ کا حق ہے غیر کی طرف کیوں توجہ کی جائے' اتنی دیر محبوب ہی کا تصور کیوں نہ کیا جائے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ تصورِ شیخ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔ "مَاهٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ" گویا تصورِ شیخ کو بتوں کے ساتھ تشبیہ دیتے تھے اور وجہ اس کی یہ تھی کہ اول تو عوام اس میں حد سے بڑھنے لگے تھے وہ شیخ کو حاظر و ناظر سمجھنے لگے تھے جو کہ عقیدہ شرک ہے دوسرے بالکل مشابہ مورت پرستی کے ہے اس لیے آپ نے اس کو بتوں کے ساتھ تشبیہ دی۔ بس محققین کا مسلک یہ ہے کہ از خود تکلف کے ساتھ شیخ کا تصور کرنا نہ چاہیے البتہ شیخ کے ساتھ محبت وعشق کامل ہونا چاہیے۔ جب محبت ہوگی تو بلا تکلف خود بخود اس کا خیال دل پر جم جائے گا تو جس طرح محبوب کا حال خود بخود بار بار دل میں آتا ہے اسی طرح شیخ کا خیال آنے لگے گا' یہ حالت اگر نصیب ہو جائے تو یہ مفتاح طریق ہے کیونکہ مربی کی محبت سے جلدی کامیابی ہو جاتی ہے اور اگر کسی کو خود بخود یہ حالت پیدا نہ ہو تو کوشش کر کے اس کا پیدا کرنا اور تکلف کے ساتھ تصور جمانا کچھ ضرور نہیں البتہ بعض دفعہ مگر بہت کم اس کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے جبکہ مرید کی طبیعت پلید ہے کہ اس کو ترقی نہ ہوتی ہو خیالات پریشان رہتے ہوں' یکسوئی حاصل نہ ہوتی ہو تو اس کے لیے یکسوئی پیدا کرنے کے لیے تصورِ شیخ کی تعلیم کی جاتی ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ مبتدی کو ابتداء میں حق تعالیٰ کا تصور آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ان کو دیکھا نہیں ہے اور شیخ کو چونکہ دیکھا ہے اور اس کے ساتھ محبت بھی ہے اس کا تصور آسانی سے جم جاتا ہے اور اس سے یکسوئی جلدی نصیب ہو جاتی ہے۔ پھر جب یکسوئی قلب کو حاصل ہو جائے گی اس کے بعد پھر اس کا امالہ تصورِ حق کی طرف آسان ہوگا اور حق تعالیٰ کے ساتھ یہ حالت ہو جائے گی:

ہر چہ بینم درجہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(تمام عالم آپ کے صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر وجود ہی نہیں آپ کا ظہور ہے)

پس اصل مقصود تو یہی ہے کہ تصورِ حق میں یکسوئی حاصل ہو جائے اسکے لیے بعض اوقات تصورِ شیخ تو آلہ بنایا جاتا ہے ورنہ غیر کی طرف توجہ کرنا خود کوئی مقصود نہیں نہ اس پر مقصود موقوف ہے اگر کوئی شخص عمر بھر بھی تصورِ شیخ نہ کرے اس کو ذرا بھی نقصان نہ ہوگا بلکہ بعض طبائع کو اس سے

نقصان ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے تصور شیخ کی مگر بعد میں لوگوں نے اس میں بہت غلو کر دیا کہ اس کو مقصود سمجھنے لگے۔ چنانچہ اب بھی بعض اہل سلسلہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ بدون رابطہ یعنی تصور شیخ کے مقصود حاصل نہیں ہو سکتا بس جو ان کے یہاں پہنچتا ہے اول اس کو رابطہ کی تعلیم ہوتی ہے یہ نہیں دیکھتے کہ اس کو ضرورت بھی ہے یا نہیں، فہم سلیم بھی ہے یا نہیں، ہر کس و ناکس کو اس کی تعلیم کر دیتے ہیں جس سے بعض لوگوں میں گمراہی پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے بعد میں محققین کو پیدا کیا اور ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی محقق ایسا پیدا ہوتا ہے جو طریق کی اصلاح کرتا ہے۔ چنانچہ مولانا رومی نے اپنے زمانہ میں طریق کی بہت اصلاح کی اور میں تحدثاً بنعمۃ اللہ کہتا ہوں کہ اس اخیر زمانہ میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں مجدد تھے ہم لوگ ان کے دیکھنے والے تھے اس لیے یہ جو کچھ علوم ہم بیان کرتے ہیں سب حاجی صاحب کا صدقہ ہے۔ یہ بھی حاجی صاحب ہی کے علوم کی برکت ہے کہ ہم ان چیزوں کو کچھ نہیں سمجھتے ورنہ اور لوگ تو اس کو کمالات میں شمار کرتے ہیں۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق ہے کہ تصور شیخ اور وحدت الوجود کا شغل آج کل اکثر طبائع کو مضر ہوتا ہے۔ تصور شیخ میں تو اکثر نا سمجھ اس کو حاضر و ناظر سمجھنے لگتے ہیں اور وحدت الوجود کے تصور میں جب اس کا انکشاف ہوتا ہے کہ تمام خیر و شر اور مصیبت و راحت حق تعالیٰ کی طرف سے ہے حقیقت میں وجود ایک ہی ہے، دوسری چیزوں کا وجود محض مضمحل اور فانی ہے تو جب اسباب ظاہری سے نظر اٹھ جاتی ہے اور ہر چیز میں بلا واسطہ حق تعالیٰ کا فعل نظر آتا ہے تو اگر حق تعالیٰ کی محبت کم ہو چنانچہ اکثر قلوب میں کم ہے تو اس سے حق تعالیٰ کی جانب سے ناگوار واقعات میں انقباض پیدا ہو جاتا ہے اور یہ حالت سخت مضر ہے اس لیے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ محققان حال نے وحدت الوجود کے شغل کو منع فرما دیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ حاجی صاحب اس فن کے امام تھے، ہر چیز کی حقیقت خوب سمجھتے تھے اور اس زمانہ کے قلوب کی کیفیت کا حال اچھی طرح جانتے تھے اس لیے ان چیزوں کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ یہ تو محض وسائل ہیں مقصود نہیں۔ اگر ایک وسیلہ مضر ہونے لگے اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ الغرض ان صوفی صاحب نے فرمایا کہ یہ سبزہ اور بہار در حقیقت آثار رحمت نہیں ہیں بلکہ آثار الآثار ہیں، حقیقی آثار رحمت قلب کے اندر ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

روبر سلطان و کاروبار بیں ۔۔۔ حسن تجری تحتہا الانہار بیں

(بادشاہ کے پاس جاؤ اور کاروبار دیکھو، عمدہ باغ کہ اس کے نیچے نہریں جاری دیکھو)

یعنی اپنے اندر نظر کرو باغ اور نہریں نظر آئیں گی اور فرماتے ہیں:

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشاں بچمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو)

معرکہ عظیم

موسیٰ و فرعون در ہستی تست

یعنی جیسے ظاہر میں ایک موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا مقابلہ تھا اسی طرح تمہارے باطن میں بھی ایک موسیٰ (یعنی روح) اور ایک فرعون (یعنی نفس) موجود ہے اور ان دونوں میں جنگ رہتی ہے ان کا تماشا دیکھو! صاحبو! تم بھی اس مضمون سے کام لو دنیا بھر کی لڑائیوں کو کیا دیکھتے ہو ذرا اپنے اندر بھی نظر کرو دیکھو کتنا قتال عظیم ہو رہا ہے نفس چاہتا ہے کہ روح کو مغلوب کر دے۔ اس مضمون میں ہمارے حاجی صاحبؒ کا بھی ایک رسالہ ہے جس کا نام جہاد اکبر ہے کمال کر دیا ہے آپ نے باطن میں ایک جنگ قائم کی ہے روح اور نفس کو دو بادشاہ مانا ہے اور ہر ایک کے لیے ایک ایک وزیر اور لشکر تیار کیا ہے۔ یہ رسالہ نظم میں ہے مگر بہت ہی عجیب ہے کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض شاعری مضمون ہے کسی شاعر کی کیا طاقت ہے کہ ایسے مضامین سوچ بھی سکے۔ نہیں اس کا مضمون بالکل سچا مضمون ہے اس سے کام لو پھر اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ جب آپ کو اپنے اندر ایک معرکہ عظیم نظر آئے گا تو دنیا کی لڑائیوں اور بیماریوں کے قصوں میں آپ نہ پڑیں گے۔ آپ کو خود اپنی ہی بیماری سے فرصت نہ ہوگی نفس اور روح کی جنگ میں وہ لطف آئے گا کہ روم وروس کی جنگی کہانیوں میں بھی نہ آیا تھا۔

فراق کا غم

غرض اس میں کیا فائدہ کہ یہاں بیماری ہے یا وہاں بیماری ہے آج کتنے مرے کل کتنے مرے بلکہ ان خبروں کی وحشت سے تو بعض آدمی بیمار ہوگئے تو ان باتوں سے کچھ نفع نہیں بلکہ دوسرے معنی میں یہ لوگ چھری مار ہیں کہ ان خبروں سے لوگوں کو پریشان کرتے ہیں حتیٰ کہ بہت سے انہی خبروں سے بیمار بھی ہو جاتے ہیں اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ بیماری شہر میں ہو اور اس کا تذکرہ نہ ہو نہ مرنے والوں کا حال معلوم کیا جائے یہ تو اس وقت ہو سکتا ہے جب ان واقعات کا خوف نہ ہو نہ غم حالانکہ یہ امور طبعی ہیں پھر جس چیز کا خوف ہوگا اس کا تذکرہ بھی ضرور ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اہل اللہ کو ایک دوسرا خوف اور غم ایسا ہے جس کی آپ کو ہوا بھی نہیں لگی

ان کے دل پر ہر وقت آرے چلتے رہتے ہیں جن کی آپ کو خبر بھی نہیں' پھر ان کو اتنی مہلت کہاں جو وہ ان باتوں میں پڑیں ان کو اس غم سے فرصت ہو تو یہ غم لے کر بیٹھیں:

اے ترا خارے بپانہ شکستہ کے دانی کے چیست　　حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں لگا' تم ان لوگوں کی حالت کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا و مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

اور اگر آپ کو وہ غم نصیب ہو جائے تو واللہ سارے قصوں سے چھوٹ جاؤ وہ غم کیا ہے فراق محبوب یعنی حق تعالیٰ کی جدائی یہ وہ غم ہے جس نے ان کو موت کا مشتاق بنا دیا ہے پھر ان کو بیماری یا موت سے خوف یا غم کیوں ہوگا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں رہ کر حق تعالیٰ کا دیدار نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس عالم میں وہ حق تعالیٰ کو بے حجاب نہیں دیکھ سکتے اس حجاب کا ان کو وہ صدمہ ہے جس کے سامنے تمام تکالیف ہیچ ہیں اب آپ سمجھے ہوں گے کہ وہ کس قدر رنج و غم میں مبتلا ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بے فکر ہیں مگر ان کے دل کا حال معلوم ہو تب پتہ لگے کہ بے فکر کون ہے اسی کو کہتے ہیں:

گفت مکشوف و برہنہ گو کہ من　　می نہ گنجم با صنم در پیرہن

(مشکوف و برہنہ ہو کر کہنے لگا کہ میں معشوق کے ساتھ لباس میں نہیں سما سکتا)

انسان جب تک اس پیکر ہیولانی میں ہے غرض یہاں بے حجاب نہیں ہو سکتا اور وہ جو کہا جاتا ہے۔

اشتیاق لقاء

بے حجابانہ درآ از در کاشانہ ما　　کہ کسے نیست بجز درد تو درخانہ ما

(ہمارے کاشانہ محبت میں بے حجابانہ آ' اس لیے کہ ہمارے خانہ قلب میں بجز درد محبت کے اور کوئی خبر نہیں ہے)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل بے حجاب ہو کر یہاں دیدار حق کو تمنا کرتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لاکھوں حجابات میں سے کسی قدر حجابات کم ہونے کی وہ تمنا کرتے ہیں ورنہ یہاں بالکل بے حجاب ہونا دشوار ہے اس کی تائید جبرئیل علیہ السلام کے واقعہ سے ہوتی ہے کہ ایک بار جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان سے ایک مسئلہ کی تحقیق فرمائی وہ واپس ہو گئے کہ حضرت حق سے تحقیق کر کے بیان کروں گا' دوبارہ آئے تو بہت خوش تھے کہ آج مجھ کو حق تعالیٰ سے جس قدر قرب عطا ہوا کہ اتنا قرب کبھی نصیب نہ ہوا تھا آج صرف ستر ہزار پردے باقی رہ گئے۔ لیجئے! ستر ہزار پردے باقی رہ جانے پر وہ خوش تھے کہ بہت قرب نصیب ہو گیا' بس اسی کو اس شعر میں کہا ہے:

بے حجابانہ درآ از در کاشانہ ما

(ہمارے کاشانہ محبت میں بے حجابانہ آ)

یعنی تمنا یہ کرتے ہیں کہ کسی قدر حجابات کم ہو جائیں' یہ مقصود نہیں کہ اس عالم میں بالکل بے حجاب ہونا ممکن ہے بالکل بے حجاب دیدار تو آخرت ہی میں نصیب ہوگا تو اہل اللہ اور عشاق موت سے نہیں ڈرتے وہ تو اس کے مشاق اور متمنی ہوتے ہیں اور موت کی تمنا اشتیاق لقاء اللہ میں جائز ہے بلکہ عین ولایت ہے پھر وہ بے فکر کیونکر ہو سکتے ہیں ان کو تو وہ فکر ہے جس نے موت جیسی چیز کو جس کو آپ تلخ زہر سمجھتے ہیں ان کے لیے خوشگوار بنادیا ہے۔ عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جاں طلبم و زپے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسرایں غم روزے — تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(وہ دن بہت اچھا ہوگا کہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جاؤں' جان کو آرام مل جائے اور محبوب کے دیدار کے لیے چلا جاؤں' میں نے یہ نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش و خرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

دیکھیے غم حجابات کے ختم ہونے کے لیے وہ نذریں مانتے ہیں' کہتے ہیں کہ اگر کسی دن یہ غم ختم ہو تو میں نذر کرتا ہوں کہ دربار محبوب کی طرف خوش و خرم غزل پڑھتا ہوا جاؤں گا۔ چنانچہ ایک بزرگ نے مرتے ہوئے وصیت بھی کی ہے کہ ہمارے جنازہ کے ساتھ یہ شعر پڑھتے ہوئے چلیں:

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو — شیئاً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما — آفریں بردست و بربازوئے تو

(آپ کے دربار میں ہم مفلس ہو کر آئے ہیں' اپنے جمال کے صدقہ میں کچھ عطا کیجئے' ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھایئے' آپ کے دست و بازو پر آفریں)

وہ قبر کی طرف کیا جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی عید میں جا رہا ہو۔ گویا موت کیا آئی تمنائے دلی پوری ہوگئی جیسے ساری عمر اسی کے اشتیاق میں بیٹھے تھے۔ صاحبو! یہ مستیاں اہل اللہ ہی کو سوجھ سکتی ہیں اگر آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ موت آسان ہو جائے اور اس سے وحشت نہ رہے اس کا اشتیاق ہو جائے تو خدا کی محبت اور اطاعت حاصل کیجئے۔ بھلا کسی مجرم کو یہ مستیاں سوجھ سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں! ان کو لقاء اللہ کا اشتیاق ہوتا ہے اس لیے ان کو موت خوشگوار ہوگئی تو بدون محبت و اطاعت کے یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی اکثر طبائع پر تو موت کا خوف ہی غالب ہے اس سے طبعاً وحشت

ہوتی ہے اور اس طبعی وحشت میں کوئی گناہ بھی نہیں مگر اس کی ضرور کوشش کرنی چاہیے کہ یہ طبعی وحشت موت کے وقت نہ رہے اس وقت اشتیاق کی کیفیت غالب ہو جائے اسوقت اگر شوق غالب رہا تو موت کی ذرا بھی تکلیف نہ ہوگی۔ غرض اہل اللہ بے فکر نہیں ہیں ان کے دلوں پر فکر و غم کا ایک پہاڑ ہے جس نے ان کو تمام افکار سے جدا کر دیا ہے اور دوسرے تعلقات سے گھبراتے ہیں۔

گوشہ گیری

مولانا فرماتے ہیں:

خود چہ جائے جنگ و جدل نیک و بد　　　کیں ولم از صلحہا ہم می رمد

یعنی عداوت اور دشمنی واختلاف سے تو ہر شخص گھبراتا ہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میرا دل تو صلح سے بھی گھبراتا ہے یعنی اس سے بھی وحشت ہوتی ہے کہ ہمارے احباب اتنے ہیں وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ بس دنیا میں اس طرح بسر کر جائیں کہ نہ کوئی ان کو جانتا ہو نہ پوچھتا ہو ایک گوشہ میں پڑ کر محبوب کے خیال میں ختم ہو جائیں۔ یہاں اس سے بھی طبیعت گھبراتی ہے کہ فلاں آپ کا معتقد ہے لوگ اس کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ معتقدوں کی جماعت بڑھے اور بعض لوگ فخر کیا کرتے ہیں کہ ہمارے اتنے مرید ہیں بعض جگہ مریدوں کی فہرست اور رجسٹر بنے ہوئے ہیں جس میں سب کے نام لکھے جاتے ہیں مگر یہ اس کی دلیل ہے کہ ان کے دل میں حضرت حق کی طلب اور اس کی دھن نہیں ہے ورنہ ان جھگڑوں سے وحشت ہوتی۔ ہمارے ایک دوست ہیں عالم ہیں مگر یک من علم را دہ من عقل باید انہوں نے ایک خط میں کچھ بے عنوانی کی تھی میں نے اس پر دارو گیر کی تو آپ دوسرے خط میں اپنا اعتقاد و محبت جتانے بیٹھے کہ ہم تو آپ کے معتقد ہیں آپ سے محبت رکھتے ہیں محبین و معتقدین کے ساتھ یہ برتاؤ نہ ہونا چاہیے میں نے ان کو لکھ دیا کہ اگر آپ کو محبت واعتقاد اپنی کسی مصلحت سے ہے تو پھر مجھ پر کیا احسان؟ اور اس کے جتلانے کی کیا ضرورت تھی؟ مصلحت تو اپنی اور اپنا فائدہ مدنظر اور دباؤ ڈالا جائے میرے اوپر اور اگر میری مصلحت کے واسطے اعتقاد و محبت پیدا کی ہے تو چھوڑ دو کیونکہ میری اس میں کوئی مصلحت نہیں بلکہ مجھے تو اور اس سے وحشت ہوتی ہے اس پر ان کا دوسرا خط معافی کا آیا اس پر میں نے ایک چرکہ یہ لگا دیا کہ ان کو لکھا کہ معاف تو کر دیا مگر دل میں دکھن باقی ہے اس کو میں اپنے اختیار سے دور نہیں کر سکتا کچھ دن تہذیب سیکھوں جب تمہاری تہذیب سے دل کو خوشی اور راحت پہنچے گی اس وقت یہ دکھن خود بخود جاتی رہے گی باقی جتنا میرے اختیار میں ہے میں نے پہلے ہی معاف کر دیا تھا میں دل میں کسی کی بات نہیں رکھتا اور دل میں وہ

رکھے جو زبان سے نہ کہے میں تو زبان سے بہت کچھ کہہ لیتا ہوں دل میں کچھ نہیں رکھتا۔

کفر ست در طریقت ما کینہ داشتن　　　آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

(راہ طریقت میں دل میں کینہ رکھنا کفر کی بات ہے آئینہ کی طرح دل کو صاف وشفاف رکھنا چاہیے)

تو واللہ ہم تو ان قصوں سے گھبراتے ہیں کیسا اعتقاد کیسی محبت حق تعالیٰ نے پردہ پوشی کر رکھی ہے کہ لوگوں کو ہمارے عیوب نظر نہیں آتے جو محبت واعتقاد رکھتے ہیں اگر اصلی حالت دیکھ لیں تو ہزار کوس دور بھاگیں اس لیے بس جی یہ چاہتا ہے کہ سب سے الگ ہو کر حق تعالیٰ کے ساتھ لو لگائی جائے اور سب جھگڑوں کو حذف کیا جائے۔ ایک مرتبہ کان پور میں ایک قصہ ہوا کہ ابتداء ابتداء میں قانون طاعون کا جاری ہوا اس وقت چند آدمی میرے پاس جمع ہو کر آئے اور کہا کہ اس کے متعلق ہم جلسہ کرنے والے ہیں تم بھی چلو میں نے انکار کیا کہ ہم طالب علموں کو جلسہ سے کیا تعلق لوگوں نے زیادہ اصرار کیا میں نے کہا اچھا ذرا ٹھہر جاؤ میں حضرت حافظ کا دیوان کھولتا ہوں دیکھیے وہ کیا فرماتے ہیں: بسم اللہ کہہ کر جو دیوان کھولا تو سر ورق پر یہ شعر نکلا:

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش　　　رموز مملکت خویش خسرواں دانند

(اے حافظ تم گدائے گوشہ نشین ہو تم کو شور وغل زیبا نہیں اپنی سلطنت کے رموز واسرار بادشاہ خوب جانتے ہیں تم اپنے کام میں لگے رہو)

میں نے کہا کہ لو بھائی! یہ تو یوں کہتے ہیں کہ شور نہ مچاؤ گوشہ میں بیٹھے رہو لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ عجب مضمون مناسب وقت نکلا میں نے کہا صاحبو! میں تو ان قصوں سے پہلے ہی گھبراتا ہوں مگر میری رائے یہ ہے کہ آپ لوگ بھی اس قصہ میں نہ پڑیں بلکہ اس مصیبت کی تدبیر دوسری کریں۔

قلوب حکام

ابن ابی الدنیا نے روایت کی ہے کہ بادشاہوں کو برا مت کہو انا ملک الملوک و بیدی قلوبھم او کماقال۔ بادشاہوں کے دل خدا کے ہاتھ میں ہیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے راضی کرو! میں سب کو ٹھیک کر دوں گا۔ سب سے بڑے بادشاہ وہ ہیں ان چھوٹے بادشاہوں کے پیچھے کیوں پڑتے ہو یہ سب اس کے مقرر کیے ہوئے ہیں ہم نے خدا کو ناراض کر رکھا ہے تو اس نے بادشاہوں کے دل بدل دیے اس کو راضی کر لو! وہ ان کے دلوں کو درست کر دے گا اور اللہ تعالیٰ نے اس کارخانہ ظاہری کو ایک باطنی کارخانہ کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک مرتبہ انتظام خراب ہو گیا تھا لوگوں نے حضرت سے اس کی وجہ دریافت کی آپ نے فرمایا کہ آج کل صاحب خدمت

ایسے ہی ایک حضرت ہیں جو بالکل ڈھیلے ہیں اور جن کے یہاں کچھ ڈھنگ نہیں' لوگوں نے پوچھا وہ کون ہیں' فرمایا کہ ایک کنجڑا ہے جو جامع مسجد کے نیچے بیٹھتا ہے' ایک شخص ان کا امتحان کرنے گئے وہ خربوزے بیچ رہے تھے' انہوں نے بھاؤ کیا اور کہا کہ کاٹ کر چکھ کر لیں گے، بولے بہت اچھا۔ انہوں نے قصداً سب خربوزے کاٹ ڈالے اور چکھ چکھ کر کہہ دیا سب خراب ہیں ہم نہیں لیتے' کہنے لگے بہت اچھا۔ یہ منظر دیکھ کر چلے آئے پھر ایک مرتبہ دیکھا گیا تو انتظام بہت عمدہ ہوگیا' تمام عملہ ٹھیک چل رہا تھا ہر شخص ڈرتا تھا کہ کام میں خرابی نہ آنے پائے' سب لوگ ٹھیک ٹھیک خدمتیں انجام دیتے تھے پھر اس شخص نے حضرت شاہ صاحب سے دریافت کیا کہ آج کل تو انتظام بہت عمدہ ہے آپ نے فرمایا کہ جی ہاں آج کل صاحب خدمت دوسرے مقرر ہوئے ہیں وہ بڑے تیز اور منتظم ہیں' دریافت کرنے پر فرمایا کہ ایک سقہ ہے چاندنی چوک میں پانی پلاتا پھرتا ہے۔ وہ صاحب ان کا بھی امتحان کرنے چلے' شاہ صاحب نے فرمایا: کہ ایک دمڑی ساتھ لے جانا' ایک دمڑی کا پیالہ دیتے ہیں' یہ دمڑی لے کر گئے' دیکھا کہ کٹورا بجاتے ہوئے سبیل سبیل پکار رہے ہیں' یہ بھی پہنچے اور ایک پیالہ پانی کا مانگا' انہوں نے پوچھا کہ دمڑی بھی ساتھ لایا ہے' انہوں نے دمڑی پیش کر دی' انہوں نے ایک پیالہ دے دیا اس نے پانی پھینک دیا کہ یہ تو خراب تھا ایک پیالہ اور دو! انہوں نے کہا کہ دمڑی اور ہے؟ کہا نہیں' انہوں نے ایک طمانچہ رسید کیا کہ کنجڑا سمجھا ہوگا! جا ایک دمڑی اور لا تب پیالہ ملے گا یہ بڑے گھبرائے کہ واقعی انہی حضرت نے سارے عملہ کو نچا رکھا ہے تو صاحبو! حکام کے دل اہل خدمت کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ ظاہری حکام بھی درست ہو سکتے ہیں جب وہ ان کی درستی کی طرف متوجہ ہوں اور وہ بالکل مثل سقہ کے مشیت الٰہی کے تابع ہیں بس خدا کو خوش کر لو وہ اصحاب خدمت کو متوجہ فرما دے گا پھر یہ سارا ظاہری عملہ درست ہو جائے گا۔

بلاؤں کی دوا

تو میں نے ان لوگوں سے کہا توبہ و استغفار کرو! اور ہر روز پانچ سو مرتبہ کم از کم "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" (نہیں نیکی کرنے کی ہمت اور نہ گناہوں سے بچنے کی طاقت سوائے اللہ تعالیٰ کے جو بلند و بالا اور عظمت والا ہے (کی توفیق سے) کا وظیفہ مقرر کر لو! انشاء اللہ ایک ہفتہ میں سب مصیبت دور ہو جائے گی۔ یہ میں نے کوئی کشف سے نہیں کہا تھا بلکہ حدیث میں آیا ہے: "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ كَنْزٌ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ بخته وَهُوَ دَوَاءٌ لِسَبْعِيْنَ دَاءٍ اَيْسَرُهَا الْهَمُّ" کہ "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ"[1] یہ جنت کا ایک خزانہ ہے اور ستر بلاؤں کی دوا

---

[1] (الصحیح للبخاری ۵: ۲۰۱۰، الصحیح لمسلم کتاب الذکر والدعاء باب ۱۳، رقم: ۴۴)

ہے جس میں سے ادنیٰ فکروغم ہے (رواہ فی الحصن جامع ۱۲) اس بھروسہ پر میں نے کہہ دیا تھا اور عدد کی تعیین اتفاق سے میرے منہ سے نکل گئی' ان لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور عمل شروع کیا' واقعی ایک ہفتہ گزرنے نہ پایا تھا کہ وہ حکم منسوخ ہو گیا اور امن چین ہو گئی پھر ان لوگوں کو اس عمل سے ایسا اعتقاد ہوا کہ کان پور کی جامع مسجد میں اب تک نماز عصر کے بعد اس کا ورد چلا جا رہا ہے۔ غرض مصائب سے نجات چاہتے ہو تو ایک ذات[1] سے تعلق پیدا کرو! وہ کون ہے:

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار — بگذارندو خم طرہ یارے گیرند

(میں بڑی مصلحت یہ دیکھتا ہوں کہ دوست سب کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائیں)

یعنی حق تعالیٰ شانہ سے تعلق پیدا کرو! اس کے سوا سب سے نظر قطع کرو! کیونکہ راحت وکلفت سب اسی کے ہاتھ میں ہے اس کو راضی کرو! انشاء اللہ وہ تمام مصائب کا انتظام فرما دیں گے:

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّاتَذَكَّرُوْنَ۝

''یا وہ ذات جو بے قرار آدمی کی سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور اسکی مصیبت کو دور کرتا ہے اور تم کو زمین میں صاحب تصرف بناتا ہے کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود ہے مگر تم لوگ بہت ہی کم یاد رکھتے ہو۔''

ہاں! وہ کون ہے؟ جو کہ مضطر کی دعا قبول کرتا ہے اور مصیبت کو دور کرتا ہے اور تم کو زمین میں یکے بعد دیگرے قائم مقام بناتا ہے (وہ صرف خدائے عزوجل ہے) کیا (اب بھی) خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) مگر پھر جو بعض لوگ خدا کی طرف نہیں جھکتے اس کا یہ سبب نہیں کہ وہ اس مضمون کو جانتے نہیں بلکہ وہ لوگ (محض کورانہ تقلید سے) خدا کے ساتھ دوسروں کو برابر کرتے ہیں۔

---

[1] (جامع عرض کرتا ہے کہ اس وقت جو مسلمانوں کو مصائب پیش آ رہے ہیں جن کے دفع کرنے کے لیے بہت لوگ خلافت کی حمایت میں سرگرم ہیں ان کو چاہیے کہ سب سے پہلے خدا کو راضی کرنے کی فکر کریں پھر کوئی اور تدبیر کریں بدون خدا کو راضی کیے اور اس کے ساتھ تعلق پیدا کیے کامیابی دشوار ہے مگر افسوس اب بھی مسلمانوں کو ہوش نہیں آیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ گناہوں ہی کی وجہ سے یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا ہے تو اس کا علاج خدا کی اطاعت سے کرنا چاہیے وہ اب بھی ایسی تدابیر کر رہے ہیں جو خدا کی ناراضی کا پہلے سے زیادہ سبب ہو رہی ہیں۔ ہندوؤں کے جوش اتحاد میں مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں پر قشقے لگانے شروع کر دیے جو کہ سراسر کفر ہے۔ قربانی گاؤ جو کہ شعار اسلامی ہے بند کرنا چاہتے ہیں' ہندوؤں کی دوستی میں ان پر آیات واحادیث کو نثار کرتے ہیں' افسوس جس بات کی وجہ سے یہ مصائب پیش آ رہے ہیں اسی کو کامیابی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں' یعنی خدا کی نافرمانی سے یہ بلائیں آتی ہیں تو نافرمانی ہی کے ذریعے سے ان کو دفع کرنا چاہتے ہیں۔ (ایں خیال است ومحال است وجنوں) ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی ✩ کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است۔ ظفر احمد عفا اللہ عنہ)

وصال حبیب

صاحبو! خدا کے ساتھ تعلق ہو جائے تو اول تو مصیبت آوے ہی گی نہیں اور اگر آوے گی تو وہ مصیبت مصیبت نہ رہے گی حتیٰ کہ جس موت سے آپ کو اب وحشت ہے اس وقت اس سے محبت ہو جائے گی اور معلوم ہو جاوے گا کہ موت وحشت کی چیز نہیں' پھر وحشت ایک تو موت سے ہوتی ہے خیر یہ تو کسی قدر ظاہراً معقول بھی ہے کہ مرنے والا تمتعات سے محروم ہو جاوے گا۔ دوسرے اس سے وحشت ہوتا کہ ایک دم سے بہت سے آدمی مر جاویں گے یہ تو بڑی ہی بیوقوفی کی بات ہے کیونکہ ایک مرنے والے پر دوسروں کے مرنے کا کیا اثر ہوگا؟ غرض اول تو خود موت ہی کوئی بری چیز نہیں خدا کے وصال کا ذریعہ ہے اس کے بغیر خدا سے ملنا نصیب نہیں ہو سکتا' پس حیرت ہے کہ ایک شخص تو فراق کی مصیبت سے چھوٹ کر وصال حبیب سے مشرف ہوتا ہے اور تم یہ چاہتے ہو کہ یہ تمہارے ہی پاس رہتا' اسی رنج و فراق میں گرفتار رہتا جس میں تم گرفتار ہو' یہ ہے اگر سلامت فہم نہ ہو تو یہی ہوتا ہے کہ جب قید خانہ میں سے کسی قیدی کو رہائی ہوتی ہے تو دوسرے قیدیوں کو رنج ہوا کرتا ہے کہ یہ کیوں چھوٹ گیا۔ یہ بھی ہماری طرح یہیں رہتا' گویا یہ چاہتا ہے کہ سارا جہان گنجا ہو جائے مگر کوئی اس چھوٹنے والے کے دل سے پوچھے۔ واللہ جو لوگ مر گئے ہیں ان کو دوبارہ اگر دنیا میں جانے کو کہا جاوے تو وہ کبھی اس کو منظور نہ کریں۔ جیسا کہ قیدی چھوٹ جانے کے بعد پھر قید خانہ میں جانا خوشی کے ساتھ کبھی نہیں چاہا کرتا۔

عجائب برزخ

دوسرے یہ کہ جب ان کو مرنا ہی ہے تو اکٹھے مرے تو کیا! متفرق مرے تو کیا! بلکہ یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ بہت سے ساتھ مل کر جاویں۔ مگر انبوہ جشنے دارد یہ تو حدیث میں بھی آیا ہے کہ مرنے کے بعد روحیں آپس میں جمع ہوتی ہیں تو اچھا ہے کہ یہیں سے سب مل کر جاویں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مردہ یہاں سے جا کر قبر میں اکیلا گھبراتا ہوگا تو صاحبو! یہ قبر تو لغوی قبر ہے ورنہ حقیقی قبر تو عجیب چیز ہے یعنی عالم برزخ وہ اتنا تنگ اور چھوٹا نہیں وہ خود ایک مستقل عالم ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی مرتا ہے اور اس کی روح آسمان پر جاتی ہے تو اس سے ملنے کو اس کے اعزا و اقربا دوست احباب کی روحیں آتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں اور دنیا کی باتیں پوچھتی ہیں کہ فلاں شخص کس حال میں ہے وہ کیسا ہے پھر ایک کہتا ہے کہ بس ابھی اس کو زیادہ بات چیت میں نہ لگاؤ یہ تھکا ہوا آیا

ہے ذرا راحت لینے دو! غرض وہاں وحشت نہیں نہ وہاں تنہائی ہے گو لوگ اس کو وحشت کدہ گمان کرتے ہیں مگر خلاف گمان وہ ایسا نہیں جیسے مولانا آگ کے متعلق فرماتے ہیں:

اندر آ اسرار ابراہیم بیں کو در آتش یافت در و دو یاسمیں

(اندر آ اور تو دیکھ لے کہ یہ آگ نہیں ہے گلزار ابراہیمی ہے)

یہ ایک قصہ میں مولانا فرمارہے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ایک کافر بادشاہ نے بہت سی آگ جلا کر مسلمانوں کو مجبور کیا کہ بت کو سجدہ کریں ورنہ آگ میں ڈال دیے جائیں گے۔ چنانچہ انہیں مسلمانوں میں ایک عورت بھی تھی جس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا اس کو بت کے آگے سجدہ کرنے کے لیے کہا گیا اور انکار کرنے پر ظالموں نے اس کی گود میں سے بچہ چھین کر آگ میں ڈال دیا' اس وقت قریب تھا کہ اس کی ماں کا قدم لڑکھڑا جائے کہ حق تعالیٰ نے اس کی امداد کی اور بچہ کو گویائی دی اس نے اپنی ماں کو پکارا کہ:

اندر آ اسرار ابراہیم بیں کو در آتش یافت در و دو یاسمیں

(اندر آ اور تو دیکھ لے کہ یہ آگ نہیں ہے گلزار ابراہیمی ہے)

یعنی اندر آ کر دیکھ یہ آگ نہیں ہے گلزار ہے۔ اسی طرح عالم برزخ بہت دلچسپی کا مقام ہے۔

روبرو سلطان و کاروبار بیں ! حسن تجری تحتہا الانہار بیں !

(بادشاہ کے پاس جاؤ اور کاروبار دیکھو' عمدہ باغ جس کے نیچے نہریں جاری ہیں' ان کو دیکھو)

یعنی بادشاہ کے پاس جا کر کاروبار دیکھو' تجری تحتہا الانہار کا حسن دیکھو:

خواہر انت ساکن چرخ سنی تو بمردارے چہ سلطانی کنی

تو موت سے وحشت اس واسطے ہے کہ لوگوں نے اس گڑھے کو قبر سمجھ لیا ہے وہ عالم برزخ کے عجائبات سے ناواقف ہیں۔ شوق وطن میرا ایک رسالہ ہے اس کو دیکھو موت کا شوق ہو جائے گا۔ بیماری اور مصائب کے وقت اس رسالہ سے بہت سکون ہوتا ہے۔ میں اس وقت اس کی کوشش نہیں کرتا کہ ایک دن میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے اور نہ یہ ایک دن میں پیدا ہو سکتی ہے:

صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جامی بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے' پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

اسرارِ عشق

پختہ ہونے کے لیے تو بہت خاک چھانی پڑتی ہے۔ میرا مقصود اس وقت یہ ہے کہ آپ اس کیفیت کے حاصل کرنے کی کوشش کریں جس دن یہ کیفیت نصیب ہو جائے گی آپ کی زندگی اور موت (دونوں پرلطف ہو جائیں گے) واللہ ثم واللہ ثم باللہ یہ سب باتیں بنائی ہوئی نہیں ہیں یہ سب حقائق ہیں لیکن اگر عنین مادر زاد کو جماع کی لذت نہ آئے تو کیا سارے ہی نامرد ہو جاویں گے ہرگز نہیں بلکہ اسی کو کہا جاوے گا کہ قوت مردانگی سے محروم ہے سارا جہان نامرد نہیں ہو سکتا اسی طرح اگر آپ کو یہ حقائق نہ معلوم ہوں تو کیا یہ ساری باتیں بنی ہوئی ہو جائیں گی۔

اگر آپ بےخبر ہوں تو کیا خبر کہنے والے بھی ان حقائق کو نہ کہیں؟ وہ بھی اپنی آنکھیں پھوڑ لیں۔ اہل اللہ کے سامنے عوام کی وہی حالت ہے جو عنین کی مرد کے سامنے ہوتی ہے۔ اگر نامرد کسی مرد کے سامنے لذت جماع کا انکار کرنے لگے تو اس کو جوش نہ آئے گا۔ برا نہ مانے گا! بلکہ اس کے حال پر اسے تو ترس آئے گا کہ یہ غریب اس لذت سے کیسا بےخبر ہے اسی طرح اہل اللہ کے علوم کو اگر کوئی ناسمجھ بنی ہوئی باتیں کہنے لگے تو اس سے وہ برا نہیں مانتے ان کی مثال تو کیمیاگر جیسی ہے اگر تمام دنیا کیمیاگر سے کہنے لگے کہ تجھے خاک نہیں آتا تو کچھ نہیں جانتا یہ کیمیا کی باتیں ہی باتیں ہیں تو وہ اس سے برا نہیں مانے گا بلکہ یہی کہے گا کہ تم مجھے ایسا ہی سمجھتے رہو تم خود ہی محروم رہو گے۔ اسی کو فرماتے ہیں:

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   بگذار تا بمیرد از رنج خود پرستی

(مدعی کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کرو اس کو خود پرستی اور رنج میں مرنے دو)

فرماتے ہیں کہ مدعی سے اسرار عشق بیان نہ کرو! اس کو خود رائی اور خود پرستی ہی کے رنج میں رہنے دو! آنکھوں پر پردہ پڑا ہے اس لیے یہ حقائق نظر نہیں آتے لیکن اگر یہ باتیں محض بنائی ہوئی ہیں تو پھر اہل اللہ کے کلام میں اثر اور درد کہاں سے آ گیا؟ جھوٹی باتوں میں بھی کہیں اثر ہوا کرتا ہے؟

سینہ کی آگ

آخر کوئی تو بات ہے جس نے اہل اللہ کو تمام لذات و شہوات سے الگ کر دیا کہ جن چیزوں کے لیے عام لوگ مرتے کھپتے ہیں وہ ان سے بالکل بیزار اور مستغنی ہیں نہ ان کو طلب مال کی ہے نہ لباس کی فکر ہے نہ عزت و جاہ کی خواہش ہے۔ آخر کوئی چیز تو ان کے پاس ہے جس کی لذت میں وہ ان چیزوں کو چھوڑ کر الگ ہو گئے کوئی تو آگ ان کے سینہ میں ہے جو پاس بیٹھنے والوں کو بھی بیقرار کر دیتی ہے۔ یہ خود اس کی دلیل ہے کہ ان کے یقیناً وہ خفا ہیں جن کی مخلوق کو خبر نہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

گر نبودے نالہ نے را اثر نے جہاں راپر کردے از شکر

(اگر نالہ کرنے کا ثمرہ جو طلب ہے جس سے معرفت پیدا ہوتی ہے نہ ہوتا تو دنیا میں ہزاروں عارف کہاں سے آتے)

عارفین کے یہ علوم قرآن وحدیث میں موجود ہیں مگر کوئی سمجھنے والا بھی ہو۔ نمونہ کے طور پر سنئے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ'' کہ ہر چیز حق تعالیٰ کی تسبیح وحمد کرتی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ لوگ قرآن وحدیث کو سمجھے نہیں بس تاویل کرنے لگے کہ مراد تسبیح حالی ہے۔ عارفین کہتے ہیں کہ یہ حقیقت پر محمول ہے کیونکہ وہ کھلی آنکھوں ہر چیز کو تسبیح کرتے دیکھتے ہیں اور کانوں سے ان کی تسبیح سنتے ہیں لیکن اہل ظاہر کی آنکھیں چونکہ بند ہیں وہ اس میں تاویل کرنے لگے۔ مولانا اس کی شکایت فرماتے ہیں:

برہوا تاویل قرآن می کنی پست وکج شداز تو معنائے سنی

چوں ندارد جان تو قندیل ہا بہر بینش می کنی تاویل ہا

کردہ تاویل لفظ بکر را خویش را تاویل کن نے ذکر را

خواہش نفسانی کے مطابق قرآن میں تاویل کرتے ہو جس سے اس کے روشن معنی پست اور کج ہو جاتے ہیں تمہارے اندر قرآن کے سمجھنے کا فہم ہی نہیں ہے اس لیے تاویلات کرتے ہو قرآن سمجھنے کا فہم پیدا کرو اور تاویلات چھوڑ دو)

عارفین اپنی رائے سے تاویل نہیں کرتے وہ قرآن وحدیث کی تمام باتوں کو حقیقی سمجھتے ہیں ان کا تو یہ مذہب ہے:

فکر خودرائے خود در عالم رندی نیست کفرست دریں مذہب خود بینی وخودرائی

(اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں ہے اس راہ میں خود بینی اور خودرائی کفر ہے)

اگر آنکھیں کھلی ہوں تو سارا جہاں ذکر اللہ سے پر نظر آتا ہے۔

دردِ طلب

پس اگر آپ بھی ان حقائق کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اہل اللہ کا دامن پکڑ لیجئے وہ بخیل نہیں ہیں البتہ مستغنی ضرور ہیں جو ان سے اعراض کرتا ہے وہ ہزار بار اس سے اعراض کرتے ہیں اور جو ان کی طرف آتا ہے وہ اس کے نفس سے زیادہ اس پر شفیق ہیں۔ بشرطیکہ طلب صادق ہو کیونکہ بدون سچی طلب کے کامیابی مشکل ہے دوا وہیں اثر کرتی ہے جہاں بیماری ہو پانی وہیں جاتا ہے جہاں پستی ہو اونچے پہاڑ پر پانی نہیں چڑھا کرتا۔

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود   ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود   ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں پستی ہوتی ہے وہیں پانی جاتا ہے جہاں اشکال ہوتا ہے وہیں جواب دیا جاتا ہے' جہاں مرض ہوتا ہے وہاں دوا استعمال کی جاتی ہے جہاں رنج ہوتا ہے وہیں شفاء پہنچتی ہے)

تو پہلے طلب کا درد اپنے اندر پیدا کیجئے! اس کے بعد اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیجئے اور خودرائی اور خود بینی کو طاق پر رکھئے! جس طرح وہ چلائیں اس طرح چلئے! اپنی عقل کو دخل نہ دیجئے! محض عقل سے مقصود حاصل نہیں ہوسکتا' دیکھئے! فلاسفہ یونان کیسے کیسے عقلاء تھے مگر مقصود تک نہ پہنچ سکے' ہزاروں ٹھوکریں کھائیں عقل نے ان کو مقصود سے بہت ہی دور ڈال دیا اس طریق میں صرف عقل سے کام نہیں چلتا حال کی بھی ضرورت ہے۔ جب حال نہ ہو تو تنہا عقل سے قساوت بڑھ جاتی ہے۔ دل کا قفل نہیں کھل سکتا۔ فلاسفہ یونان کو عقل ہی کا ہیضہ ہو گیا تھا اسی لیے ان میں سے بعضوں نے انبیاء کو بھی پایا مگر اتباع نہ کیا یہ کہہ دیا کہ بیشک یہ نبی ہیں' مگر جاہلوں کے واسطے ہیں ہم عقلاء ہیں ہم کو نبی کی ضرورت نہیں تو بات کیا تھی کہ ان میں حال نہ تھا اگر حال ہوتا تو مقصود کا پتہ چل جاتا اور سمجھ جاتے کہ اس مقصود کو ہم اپنی عقل سے نہیں پا سکتے اس کے لیے کسی مقبول بندہ کی دستگیری بھی شرط ہے پھر انبیاء کی حقانیت اور مقبولیت دیکھ کر ضرور ان کا اتباع کرتے مگر ان کے دل میں محبت کی آگ نہ تھی عشق کا حال غالب نہ تھا اس لیے وصال محبوب کی خواہش نہ ہوئی ورنہ ایسا کہیں ہوسکتا ہے؟ کہ محبوب کے وصال کی طلب ہو اور ایک پہنچانے والا سامنے ہو اور وہ خود بلا رہا ہو کہ آؤ میں تم کو محبوب سے ملا دوں اور پھر بھی عاشق کو اس کی رہبری کی اتباع سے انکار ہو؟ ہاں! عشق ہی نے تو سب کچھ ممکن ہے۔ غرض بدون طلب کے کام نہیں چل سکتا:

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ   جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(فہم و خاطر کو تیز کرنا راہ سلوک نہیں بلکہ شکستگی پیدا کرنا ہے اللہ کا فضل سوائے شکستگان اور کسی پر نہیں ہوتا)

اور شکستگی عشق و طلب ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہے اگر یہ شکستگی پیدا ہو جائے تو مطلوب بہت نزدیک ہے۔ حدیث میں ہے: "اَنَا عِنْدَ الْمُنْکَسِرَۃِ قُلُوْبُھُمْ"[1] کہ میں دل شکستہ لوگوں کے پاس ہوں اس لیے اگر وصال محبوب کی تمنا ہے تو اول یہ شکستگی پیدا کیجئے پھر کسی کے ہاتھ میں اپنے آپ کو سپرد کر دیجئے۔

---

[1] (الاسرار المرفوعۃ لعلی القاری: ۱۰۷' کشف الخفاء للعجلونی ۱: ۲۳۴)

سپردگی کامل

بتلایئے! آخر صحابہؓ کس چیز سے راہ پر لگے ہیں اسی سپرد کر دینے سے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں اپنے آپ کو سپرد کر دیا تھا اسی سے ان کا کام بن گیا، علم و عقل سے ان کا کام نہیں بنا چنانچہ بعض متاخرین فقہ وغیرہ میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بہت آگے ہیں مگر کیا وہ اس سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر فوق ہو گئے؟ ہرگز نہیں۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ایک ایسی بات ہے جو کسی امتی کو نصیب نہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں اپنے آپ کو سپرد کر دیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے وہ وہاں پہنچے جہاں ہزار برس کے مجاہدوں سے بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا اور سپردگی بھی ایسی کامل تھی کہ ایک بار ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پکارا وہ نماز پڑھ رہے تھے اس لیے نہ بولے نماز سے فارغ ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا عذر بیان کیا کہ میں نماز میں تھا' آپ نے فرمایا:

قول اللّٰہ تعالیٰ اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ ۝

کیا تم نے حق تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنا؟ کہ جب رسول تم کو پکاریں فوراً جواب دو! تو صحابہ کے ذمہ نماز میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دینا ضروری تھا' آگے اس پر علماء کا اختلاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دینے سے نماز فاسد ہو جاتی تھی یا نہیں' بعض نے کہا ہے کہ فاسد نہ ہوتی تھی خیر نماز کا جو بھی حکم ہو مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دینا نماز میں بھی ان کے ذمہ فرض تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے لیے اس میں تفصیل ہے کہ فرض نماز کا توڑنا تو کسی حال میں جائز نہیں بجز اس صورت کے کہ کسی مسلمان پر جان کا خطرہ ہو تو لازم ہے کہ نماز توڑ کر اس کی امداد کرے یا اپنا نقصان ایک درہم سے زیادہ کا ہوتا ہو تو جب بھی نماز توڑ دینا جائز ہے۔ باقی اگر جان کا خطرہ نہ ہو تو فرض نماز نہ توڑے۔ رہی نفل نماز تو اس کا توڑنا غیر والدین کے لیے تو جائز نہیں اور والدین کے لیے اس وقت جائز ہے کہ ان کو یہ معلوم نہ ہو کہ نماز پڑھ رہا ہے اور اگر یہ معلوم ہو گیا پھر بھی پکاریں تو نماز توڑنا جائز نہیں کیونکہ اب وہ پکارنے والا خود گنہگار ہے اس کی بات نہ مانی جائے گی۔ یہ تفصیل میں نے اس لیے بیان کر دی کہ بعض لوگ پیروں کے پکارنے پر اب بھی نماز کا توڑنا مطلقاً جائز سمجھتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ پیر کا درجہ شرعاً باپ سے زیادہ نہیں۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے کو کسی عارف محقق کے ہاتھ میں سپرد کر دو اور اپنی رائے اور عقل کو بالائے طاق رکھو۔

اندازِ تربیت

اور اس سے مت ڈرو کہ وہ بڑے بڑے مجاہدے کرائیں گے کیونکہ محقق ہر شخص کے مناسب دستور العمل تجویز کرتا ہے سب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکتا جو لوگ ضعیف ہیں مجاہدات کے متحمل نہیں ہیں ان کی پرورش جمال سے کرتے ہیں کہ خوب کھاؤ خوب پیؤ اچھا پہنو راتوں کو سوؤ اور مختصر کام بتلا دیتے ہیں جس کا وہ تحمل کر سکیں اور کسی کی تربیت جلال سے کرتے ہیں کہ تمام شہوات و لذات جو ضروریات سے زیادہ ہوں چھوڑا دیتے ہیں۔ حضرت عارف شیرازی ان مشائخ کی شکایت کرتے ہیں جو ضعفاء کے حال پر رحم نہیں کرتے:

خستگاں راچو طلب باشد و قوت نبود   گر تو بیداد کنی شرط مروت نہ بود

یعنی مروت اور شفقت سے یہ بات دور ہے کہ ضعیف و ناتواں لوگ جن میں طلب ہے اور قوت نہیں ان کو بھی تم محنت و مشقت کے طریق سے پرورش کرو۔ مولانا فرماتے ہیں:

چار پارا قدر طاقت بار نہ   بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ
طفل راگرناں دہی برجائے شیر   طفل مسکیں ازاں ناں مردہ گیر

ظاہر ہے کہ شیر خوار بچہ کو اگر دودھ کے بجائے روٹی کھلانے لگو تو چار دن میں اس کا خاتمہ ہے۔ آج ضعیف کو اگر وہ کام بتلا دیا جائے جو اقویاء کے مناسب ہے تو وہ چار دن میں تمام ہو جائے گا۔ پس اہل اللہ ہر شخص سے اس کے مناسب معاملہ کرتے ہیں۔ ضعیف کے حال پر وہ بہت شفقت کرتے ہیں۔ ہاں! مگر حرام زدگی کے ساتھی نہیں کہ ایک شخص اچھا خاصا ہو اور پھر کم ہمت بن جائے تو اس کے لیے وہ سخت بھی بہت ہیں۔ اگر اہل اللہ پر اعتماد ہے تو ان کو اپنے سے زیادہ واقف طریق اور خیر خواہ سمجھ کر ان کے قدموں سے لگ جاؤ! ہاں اگر ان کی تشخیص پر اعتماد نہ ہو تو چھوڑ دو مگر جب ایک بار کسی کو محقق سمجھ کر اپنے اوپر اختیار دے دیا تو پھر اس کی رائے میں دخل نہ دو کہ یہ خود رائی سد راہ ہے اس طریق میں اعتماد بہت ضروری ہے بلکہ اسی طریق میں کیا ہر علم میں اعتماد کے بغیر کام نہیں چل سکتا پھر اس تفویض میں آپ ہی کا نفع ہے کیونکہ اپنے آپ کو دوسرے کے سپرد کر دینے سے بڑی راحت ہوتی ہے اور دوسرے کو پوری توجہ ہوتی ہے اور بدون تفویض کے نہ اپنے آپ کو جمعیت نصیب ہوتی ہے نہ دوسرے کو توجہ ہوتی ہے۔

دستور العمل

غرض جب آپ صحابہ کی طرح اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دیں گے اس وقت معلوم ہوگا کہ یہ باتیں بنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ حقائق ہیں پھر آپ کو موت سے وحشت نہ ہوگی بلکہ اس کا اشتیاق

پیدا ہو جائے گا اور یہی حسن خاتمہ کی دلیل ہے کہ خدا سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو جائے۔

عارفین کی موت کے قصے سن کر معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ان لوگوں کی موت پر ہزار زندگی قربان ہے ایک مرتبہ شیخ نجم الدین کبریٰ کے سامنے کسی نے ایک غزل گائی جس کے ایک شعر کے اخیر میں یہ تھا:

جاں بدہ و جاں بدہ و جاں بدہ

آپ کے اوپر کیفیت شوق کا غلبہ ہوا فرمایا کہ محبوب جان مانگ رہا ہے اور کوئی اپنی جان نہیں دیتا اس کے بعد فرمایا کہ ''جاں دادم و جاں دادم جاں دادم'' بس یہ کہہ کر ختم ہو گئے۔ ایک اور صوفی کا قصہ ہے کہ وہ حج کو جا رہے تھے شوق میں ناچتے کودتے اشعار پڑھتے جاتے تھے کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ کس درجہ کا عاشق ہے لوگ ان کو معمولی آدمی بلکہ مسخرہ سمجھتے تھے مگر جس وقت مکہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ پر نظر پڑی ہے اور مطوف نے کہا کہ یہی بیت اللہ ہے بس ان پر ایک حالت ہو گئی اور بے ساختہ زبان سے نکلا:

چوں رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر   کہ مبادا بار دیگر نرسی بدیں تمنا

پھر گرتے ہی جاں دے دی۔ صاحبو! کیا ایسی موت تمنا کے قابل نہیں کیا اس کے لیے کوشش نہ ہونی چاہیے شاید کوئی یہ کہے کہ صاحب یہ تو حکایات ہی حکایات ہیں پہلے زمانہ میں کسی کو موت کا ایسا اشتیاق ہوتا ہوگا آج کل ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو میں کہتا ہوں کہ نہیں صاحب اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور نہ ہونے کی وجہ؟ جس طریقہ سے ان کو یہ حالت نصیب ہوتی تھی وہی طریقہ اب بھی اگر اختیار کیا جائے تو یہ حالت پیدا ہو جائے گی اور وہ طریقہ کیا ہے؟ کثرت ذکر اور کثرت اطاعت اور اجتناب معصیت بس ان تینوں چیزوں کو اختیار کر لیجئے! انشاء اللہ موت کا اشتیاق اور خدا سے ملنے کی تمنا پیدا ہو جائے گی۔

حیات اعلیٰ

اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایسے نمونے دکھلا دوں' تو لیجئے میں بتلاتا ہوں کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں ہمارے مدرسہ میں دو شخصوں کا انتقال ہوا جو کہ ذاکر و شاغل تھے۔ ایک بوڑھے تھے' ایک جوان تھے' بوڑھے کا قصہ تو یہ ہوا کہ وہ رات کو حسب معمول تہجد کے لیے اٹھے اور مٹی کا لوٹا تیمم یا وضو کے لیے لینا چاہتے ہوں گے بس لوٹے پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے اسی طرح ختم ہو گئے۔ دوسرے صاحب کا یہ قصہ ہوا کہ ان کو بخار میں سرسام ہو گیا تھا کیونکہ جوان آدمی

تھے حرارت غالب تھی اور سرسام میں عقل نہیں رہا کرتی مگر ذکر کا اثر دیکھئے کہ موت کیسی اچھی ہوئی رات کو وہ بھی خود ہی اکیلے ختم ہو گئے کسی کو خبر نہیں ہوئی' جب صبح کے قریب ان کو دیکھا گیا تو ہاتھ پر تسبیح لپیٹے ہوئے مراقبہ کی شکل میں گردن جھکائے بیٹھے ہیں' لوگ سمجھے کہ زندہ ہیں مگر وہ کہاں تھے' نہ معلوم کب کے ختم ہو چکے تھے۔ تو دیکھئے! یہ ثمرہ ہے ذکر کا جو دنیا ہی میں نصیب ہوتا ہے کہ موت کے وقت خدا کا اشتیاق ہو جاتا ہے اس کی یاد کو جی چاہتا ہے آخر وہ کیا چیز تھی جس نے ان کو اخیر وقت میں بھی جس میں انسان بالکل عاجز اور کمزور ہو جاتا ہے تسبیح اٹھانے اور مراقبہ کرنے کی ہمت دے دی اور دوسرے صاحب کو اخیر وقت تک تہجد کا خیال رہا اس کے لیے اپنی ہمت کے موافق کوشش بھی کی اور نماز ہی کے اہتمام میں ختم ہو گئے وہ محض اشتیاق لقاء اللہ کی کیفیت تھی جو اخیر وقت میں ان پر غالب ہو گئی تھی۔ لیجئے اب تو میں نے بالکل پتہ بتلا دیا اب تو آنکھیں کھولو! اور اس حالت کے حاصل کرنے کی کوشش کرو! سچ بات یہ ہے کہ ایسی موت قابل رشک ہے اس پر ہزار زندگی قربان ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جس کا دل عشق سے زندہ ہو وہ مرا نہیں کرتا جریدۂ عالم پر ہمارا دوام لکھا ہوا ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کا مرنا صرف ظاہری ہے حقیقت میں ان کو بہت اعلیٰ درجہ کی حیات نصیب ہو گئی۔

دوامِ حیات

اور اسی حیات کا ایک اثر یہ ہے کہ اہل اللہ کا تذکرہ بعد موت کے بھی باقی رہتا ہے ورنہ ہزاروں مرتے ہیں کوئی چند دن کے بعد نام بھی نہیں لیتا اور یہ حیات برزخیہ اگرچہ ہر شخص کو مرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے مگر اہل اللہ کی حیات دوسروں کی حیات سے قوی ہوتی ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں ''ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما'' اور اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کی صفات ہمیشہ باقی رہتی ہیں اور یہ حضرات مظہر صفات الٰہی ہیں اس لیے ان کو بھی کسی قدر دوام و بقاء سے حصہ ملتا ہے۔

استقامت اعمال

اور حق تعالیٰ کی صفات پر مجھے ایک بات یاد آئی جو بہت ہی کام کی بات ہے۔ ایک علم عظیم ہے جو حق تعالیٰ نے آج عطا فرمایا ہے' اس کی قدر وہ جانے جس پر گزرتی ہے۔ مجھ سے اگر پوچھئے! تو لاکھوں کی بات ہے وہ یہ کہ بعض سالکوں کو یہ بات پیش آتی ہے کہ ان میں تاثر کم ہوتا ہے نہ خوف نہ

غلبہ نہ زیادہ غلبہ محبت پس ان کی طبیعت خالی خالی معلوم ہوتی ہے اور بعضوں پر احوال ومواجید کا بہت غلبہ ہوتا ہے ذرا ذرا سی بات پر رقت اور خوف طاری ہو جاتا ہے گریہ غالب ہو جاتا ہے کبھی شوق ومحبت میں سکر کی سی کیفیت رہتی ہے تو جن سالکوں پر ان احوال کا غلبہ نہیں ہوتا وہ پریشان رہتے ہیں کہ ہم کو ذکر سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ لیجئے! آج میں اس کی حقیقت بتلاتا ہوں اور وہ علم ایک نیک بی بی کے خط کے آنے سے حاصل ہوا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہاں موت کثرت سے ہو رہی ہے جس سے یہ تمام کاموں کو طبیعت چاہتی ہے مگر مجھے خوف نہیں معلوم ہوتا نہ کچھ رقت طاری ہوتی ہے، یہ حالت کیسی ہے ان کو تو میں نے یہی لکھ دیا کہ حالات مقصود نہیں ہیں بلکہ اعمال مقصود ہیں اگر اعمال میں کوتاہی نہ ہو تو ان حالات کے ہونے یا نہ ہونے کی کچھ بھی پروانہ کرنی چاہیے مگر اس کی حقیقت جو اسی وقت میرے دل پر منکشف ہوئی وہ ان کو نہیں لکھی کیونکہ وہ بات ان کی فہم سے زیادہ تھی اور اس حقیقت کے سمجھنے سے پہلے دو مقدمے سمجھ لیجئے ایک یہ کہ تمام سلوک کا مقصود حضرت حق میں فنا ہے یعنی اپنی صفات کو صفات حق میں فنا کر دینا اور متخلق باخلاق اللہ ہونا یہ مقصود ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ حضرت حق میں جو صفات ہیں ان سے مراد غایات ہیں مبادی نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہماری صفات کے دو درجے ہیں ایک مبدا ایک منتہی مبدا انفعال ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے اندر رحمت وشفقت کا مادہ ہے تو اس کا ایک مبدا ہے ایک منتہی ہے مبدا یہ کہ کسی کی حالت اور مصیبت کو دیکھ کر دل دکھتا ہے دل پر اثر ہوتا ہے یہ انفعال ہے اور منتہی یہ ہے کہ دل دکھنے کے بعد ہم نے اس شخص کے ساتھ ہمدردی کی اس کی اعانت کی یہ فعل ہے اور یہی مقصود بھی ہے۔ صفت رحمت سے اسی طرح حیا اور علم ورغبت وغیرہ تو حق تعالیٰ چونکہ انفعال اور تاثر سے پاک ہیں اس لیے ان کو جو رحمٰن الرحیم عفو غفور وغیرہ کہا جاتا ہے تو ان کی صفات میں صرف غایات مرد ہیں مبادی مراد نہیں ایک مقدمہ یہ ہوا۔ اب سمجھئے! کہ خوف اور محبت غیرہ جو صفات ہیں ان کے اندر بھی دو درجے ہیں ایک مبدا دوسرا منتہی۔ مبدا وہی تاثر اور انفعال ہے کہ خدا کی عظمت وجلال کے خیال سے دل پر اثر ہوا رقت طاری ہوئی اور منتہی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی سے رک گئے یہ فعل ہے محبت کا مبدا یہ ہے کہ دل میں عشق کی دھن پیدا ہوا اور محبوب کے خیال میں محو ہو جائے یہ انفعال ہے اور منتہی یہ ہے کہ محبوب کی رضا جوئی اور خوشنودی کی طلب میں لگ جائے تو جس شخص کے اوپر خوف اور محبت کی کیفیت غالب نہ ہو مگر استقامت حاصل ہو کہ معاصی سے پوری طرح بچنے والا اور طاعات کا بجالانے والا ہو اس میں صفات کے مبادی نہیں پائے گئے بلکہ صرف غایات پائے گئے تو یہ شخص اصل متخلق باخلاق اللہ ہے اور جس پر ان کی کیفیات کا غلبہ ہو اس میں اول مبادی پائے گئے پھر غایات

پائے گئے تو یہ شخص اس درجہ کا متخلق باخلاق اللہ نہیں ہے اس حقیقت کے انکشاف کے بعد سالکین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جن احوال و کیفیات کے فقدان سے وہ پریشان ہوتے ہیں ان کا فقدان کوئی نقص نہیں بلکہ کمال یہی ہے کہ بدون غلبہ احوال کے استقامت حاصل ہو جو کہ مقصود ہے اس لیے اب ان چیزوں کی خواہش اور تمنا میں نہ پڑنا چاہیے اس میں حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ کسی کو غلبہ احوال عطا فرمایا اور کسی کو بدون اس کے ہی استقامت عطا فرمادی کسی پر خوف کا غلبہ ہے وہ رو رہا ہے کسی پر رجاء کا غلبہ ہے وہ ہنس رہا ہے کسی پر طلب اور شوق غالب ہے وہ بے چین ہے اور کسی پر کوئی حال غالب نہیں وہ سادگی کے ساتھ اعمال مقصودہ میں لگا ہوا ہے یہ سب خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں ایک کو دوسرے کے حال کی طلب نہ کرنا چاہیے:

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است　　　بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

(پھول کے کان میں کیا فرمادیا کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرمادیا کہ نالاں ہے)

اگر حق تعالیٰ نے صاحب اضطراب بنایا ہے تو سکون کے طالب نہ بنو! اور صاحب سکون بنایا ہے تو اضطراب کے طالب نہ بنو! اب جو لوگ کام کرتے ہیں ان سے پوچھو کہ یہ علم کس قدر عظیم ہے اس سے ان کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی اور پریشانی اور غم کا پہاڑ دل سے ہٹ گیا ہوگا کیونکہ سالکین کو ذرا ذرا سی بات سے رنج و غم ہونے لگتا ہے اگر کچھ بھی شبہ اس کا ہو جائے کہ ان کی محبت میں یا طلب میں کمی ہے تو بس ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔

بردل سالک ہزاراں غم بود　　　گرز باغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل میں ہزاروں غم ہوتے ہیں اگر باطنی حالت میں ذرا برابر کمی پاتا ہے)

یہ علوم اور حقائق وہ چیزیں ہیں کہ سالکین ان کے سامنے ہفت اقلیم کی بھی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اب میں غور کرتا ہوں اگر میرے پاس ہزار گاؤں ہوتے تب بھی جو مسرت اس وقت مجھ کو اس علم کے حاصل ہونے سے ہوئی میں سچ کہتا ہوں کہ ہزار گاؤں کے اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ اگر کسی پر خوف و شوق کا غلبہ نہ ہو مگر استقامت اعمال نصیب ہو گئی ہے اس کو بے فکر رہنا چاہیے مگر سامان کرنے کے بعد۔

حقیقت استقامت

کیونکہ اگر اعمال کے اہتمام کا سامان نہ کیا تو پھر استقامت فوت ہو جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کی یہ کیفیت ہے کہ اس کی آنکھ تہجد کے وقت بلا ناغہ کھل جاتی ہے اس کے دل میں کیفیت

شوقیہ ایسی ہے کہ وقت پر مجبوراً اٹھا کر بٹھا دیتی ہے اور دوسرے شخص پر یہ کیفیت غالب نہیں مگر وہ ہر روز تہجد کا سامان کر کے لیٹتا ہے لوٹا اور جانماز پاس رکھ لیتا ہے شام کو کھانا بھی کم کھاتا ہے تا کہ اٹھنے میں اعانت ہو عشاء کے بعد فوراً ہی سو بھی رہتا ہے۔ اذکار ادعیہ پڑھ کر سوتا ہے اگر اس کی نماز تہجد کی کسی دن قضا بھی ہو جائے تو یہ استقامت کے خلاف نہیں اور نہ یہ شخص پہلے شخص سے کچھ ثواب میں کم ہے کیونکہ ہمیشہ بلا ناغہ اٹھنا اس کے اختیار سے نہیں ایک کیفیت شوقیہ اس پر مسلط ہے وہ اٹھا دیتی ہے اور یہ شخص کیفیت سے خالی ہے مگر جتنا سامان کرنا اس کے قبضہ میں تھا وہ سب کر لیتا ہے پھر بھی اگر کسی دن تہجد اس کا ناغہ ہو جاوے تو یہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔ امید یہ ہے کہ اس کو اس دن بھی تہجد کا ثواب ملے گا اور کبھی کبھی تہجد کا ناغہ ہو جانا بشرطیکہ سامان اٹھنے کا ہمیشہ کرتا ہو استقامت کے منافی نہیں بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر ایک شخص جاگنے کا سامان کر کے سو جائے یا اس کی فرض نماز بھی قضا ہو جائے تب بھی اس پر ملامت نہیں نہ یہ بات استقامت کے خلاف ہو گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون صاحب استقامت ہو گا۔ لیلۃ التعریس میں حضور صلی اللہ کی فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی واقعہ یہ ہوا کہ ایک بار قافلہ رات کو چل رہا تھا اور گرمیوں کے موسم میں اہل عرب اکثر رات کو سفر کرتے ہیں۔ اخیر شب میں آپ منزل پر پہنچے اور اس وقت تک صبح ہونے میں ذرا دیر تھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص ایسا ہے جو صبح کی نماز کے لیے ہم کو جگا دے اور ہم سو رہیں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وعدہ کیا آپ جاگنے کا پورا سامان کر کے بے فکر سو رہے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے کجاوہ سے پشت لگا کر مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھے رہے کہ صبح ہوتے ہی اذان دوں گا کہ حق تعالیٰ نے ان پر نیند غالب کر دی وہ بھی بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے۔ یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا اور کوئی نہ جاگا سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی آپؐ نے سب کو جگایا، صحابہ کو صبح کی نماز قضا ہونے کا قلق ہوا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قلق نہیں ہوا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ جتنا کام ہمارے قبضہ کا تھا وہ ہم کر چکے تھے کہ ایک معتبر شخص کو جگانے کے لئے مقرر کر دیا اس پر بھی اگر نماز قضا ہو گئی اور اتفاق سے وہ شخص بھی سو گیا تو یہ محض تقدیری امر ہے اب اس پر قلق کرنا مشیت الٰہی کا مقابلہ کرنا ہے۔ ہاں! اگر طبعی قلق ہے تو مضائقہ نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ فرما کر تسلی کی: "لَا تَفْرِيطَ فِي النَّوْمِ إِنَّمَا التَّفْرِيطُ فِي الْيَقْظَةِ"[1] کہ نیند میں اگر کچھ کوتاہی ہو جائے وہ کچھ کوتاہی نہیں کوتاہی وہی ہے جو کہ بیداری میں ہو اور یہ نماز تمہاری بیداری میں قضا نہیں ہوئی سوتے ہوئے میں قضا ہوئی اس پر کوئی ملامت نہیں کیونکہ سونے

[1] (مسند احمد ۵: ۲۹۸، البدایۃ والنہایۃ ۶: ۱۱۳، سنن الدار قطنی ۶: ۱۴۴)

کی حالت میں انسان بے اختیار ہو جاتا ہے۔ البتہ سونے سے پہلے جاگنے کا سامان اپنی وسعت کے موافق کرنا ضرور تھا۔ سو وہ تم کر چکے تھے سامان کرنے کے بعد بھی جب نماز قضا ہو گئی تو اس پر قلق کی ضرورت نہیں یہ تقدیری امر تھا۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند تو اونگھ کے مشابہ تھی آپ کو گہری نیند نہ آتی تھی۔ حتیٰ کہ آپ کا وضو بھی سونے سے نہ ٹوٹتا تھا کیونکہ آپ کی آنکھیں سوتی تھیں اور دل جاگتا تھا تو پھر آپ کی نماز کیسے قضا ہو گئی؟ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے اس روز حق تعالیٰ نے قضا نماز کے احکام مشروع فرمانے کے لیے آپؐ کے اوپر کوئی کیفیت استغراقیہ غالب فرمادی ہو کہ مشاہدہ جمال حق میں وقت کی خبر نہ ہوئی اور آپؐ کی نماز قضا ہو جانے میں بہت سی حکمتیں تھیں ایک تو یہی حکمت ہوئی کہ آپ نے قضا نماز کے احکام مقرر فرما دیئے۔ دوسرے بعد والوں کو تسلی ہو گئی کہ اگر کسی کو اتفاقی طور پر امت میں ایسی صورت پیش آ جائے تو وہ غم سے ہلاک نہ ہو جائیں۔ اس واقعہ سے ان کو تسلی ہو جاوے گی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسا اتفاق پیش آیا ہے۔ غرض اس طریق میں ناامیدی اور مایوسی کا نام نہیں' قدم قدم پر تسلی موجود ہے اور مولانا تو دل کھول کر فرماتے ہیں:

کوئے نومیدی مرو کامید ہاست　　　سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں' تاریکی کی راہ نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں)

ہاں! جہل کا کچھ علاج نہیں کہ کوئی خواہ مخواہ اس غم میں پڑے کہ ہائے میرے اندر خوف کا غلبہ نہیں شوق اور اضطراب نہیں۔ بس مقصود یہ ہے کہ اعمال میں مشغول ہونا چاہیے ان میں کمی نہ کرو پھر اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ رونا آتا ہے یا نہیں' خوف کا غلبہ ہے یا نہیں' بس کام میں لگو اور زیادہ کاوش مت کرو! اب لوگ یہ تو کرتے نہیں فضول کاوشیں کرتے ہیں جن سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ اور پریشانی بڑھتی ہے۔

صورت مصیبت

اب میں اصل اشکال کے جواب کی طرف عود کرتا ہوں۔ اشکال یہ تھا کہ گناہ نہ کرنے والوں کو بھی بلاء اور مصیبت پیش آتی ہے اور آیت: "مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ" سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت گناہوں سے آتی ہے اس کا ایک جواب تو میرے پہلے بیان سے معلوم ہو چکا کہ گناہ سب کرتے ہیں جن کو تم بے گناہ سمجھتے ہو ان سے بھی ان کے درجہ کے موافق گناہ ہوتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جو گناہ بھی نہیں کرتے وہ مداہنت کرتے ہیں کہ دوسروں کو گناہ کرتے دیکھتے ہیں اور ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے اگر ان سے اور کوئی گناہ نہیں

ہوا تو مداہنت بھی ایک گناہ ہے جس میں نیک لوگ اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ نصیحت اور صاف گوئی کا مادہ آج کل نیک لوگوں میں بہت کم ہوگیا ہے اور جو ایسے بھی نہ ہوں تو ان کے لیے تیسرا جواب یہ ہے کہ وہ "مَآ اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ" میں داخل ہی نہیں ہیں جس کو آپ مصیبت سمجھتے ہیں وہ اس کو مصیبت ہی نہیں سمجھتے اس میں ان کو وہ لذت آتی ہے کہ انہی کا دل جانتا ہے۔ بس ان کے لیے صورت مصیبت ہوتی ہے حقیقت مصیبت نہیں ہوتی کیونکہ مصیبت کی حقیقت یہ ہے کہ دل میں الجھن اور پریشانی ہو اور ایسے لوگوں کو تکلیف میں بھی سکون و اطمینان اور روحانی لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر محبوب چٹکی لے عاشق کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے وہ تو اس کی چٹکی کی لذت میں ایسا مست ہوگا کہ یوں چاہے گا کہ یہ بار بار چٹکی لیے جائے تو اہل اللہ کو دیکھو لوکہ ان کو مصائب میں ذرا بھی پریشانی نہیں ہوتی وہ تو زبان حال سے کہتے ہیں:

درد از یارست و درماں نیز ہم   دل فدائے اوشد وجاں نیز ہم

(درد محبوب کی طرف سے ہے اور علاج بھی انہی کی طرف ہے دل ان پر فدا ہے اور جان بھی)

پس اس آیت کے مخاطب گنہگار لوگ ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جہاں مصیبت ہے وہاں گناہوں کی وجہ سے ہے اور جہاں گناہ نہیں وہاں مصیبت بھی نہیں۔ گو ظاہر میں دیکھنے والوں کو مصیبت نظر آ دے مگر خود اس شخص کو وہ نعمت اور لذت معلوم ہوگی اس اعتراض کا جواب تو بخوبی ہوگیا اور یہ دوسرا مضمون تھا۔

زیادتی عتاب

اب ایک اور اعتراض کا جواب دینا چاہتا ہوں اور وہ تیسرا مضمون ہے اور یہ اعتراض بظاہر سخت ہے وہ یہ کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ یہ بیماری و مصیبت گناہوں سے آتی ہے اگر یہ بات ہے تو پھر مسلمانوں میں بیماری زیادہ کیوں ہے؟ کیونکہ سنا جاتا ہے کہ اس سال مسلمانوں میں بیماری زیادہ ہے۔ ہندوؤں میں کم ہے ہمیں تو خبر نہیں مگر سنا ہے ممکن ہے کسی نے شمار کیا ہو کہ مسلمانوں میں زیادہ ہے اس کا جواب اگر چہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ثبوت بیان کرو اور جس نے شمار کیا ہو اس سے پوچھو کہ کیا تو نے تمام شہروں میں جا کر شمار کیا ہے کہ مسلمان اس بیماری میں زیادہ مرے ہیں مگر ہم ایسا جواب دیتے ہیں جس کے لیے شمار کی ہم کو ضرورت ہی نہیں ہے مگر جواب سے پہلے میں یہ ضرور کہوں گا کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں ان کو خدا کے معاملات کی تو کیا خبر ہوگی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے معاملات کی بھی خبر نہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک شخص تو وکیل ہے اگر وہ کچہری میں پیشاب

کردے تو سخت معتوب ہوگا کیونکہ بعید نہیں کہ وکالت سے معزول کردیا جائے اور ایک عام شخص ہے وہ اگر پیشاب کردے تو بہت سے بہت حاکم دو روپیہ جرمانہ کردے گا مگر وکیل کے برابر معتوب نہ ہوگا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہی فعل وکیل نے بھی کیا اور اجنبی شخص نے بھی کیا مگر وکیل پر اس درجہ عتاب اور اجنبی پر اس کا آدھا بھی نہیں؟ فرق یہ ہے کہ وہ حاکم کا مقرب اور خاص تھا' یہ حرکت اس کی شان سے بہت نازیبا تھی' وہ حاکم کے مزاج اور قوانین سے بخوبی واقف تھا اور دوسرا ایک اجنبی غیر آدمی تھا وہ تو رات دن میں اس وقت کی بدتہذیبی دن میں پچاس دفعہ کرتا رہتا ہے اور اس پر اتنا عتاب نہیں ہوتا تو اس سے اگر کوئی یہ سمجھنے لگے کہ وکیل بہت بڑا مجرم ہے اور یہ دیہاتی مجرم نہیں تو یہ سراسر حماقت ہے۔ مجرم تو وہ دیہاتی وکیل سے بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کم بخت کو حاکم کی عظمت وقعت کا حال کچھ معلوم نہیں۔ یہی اس کی بڑی خطا ہے اور اس معرفت و تعظیم کے وصف میں وکیل اس سے افضل ہے مگر خصوصیت کی وجہ سے اس پر عتاب زیادہ ہوا۔

نفع عتاب

اسی طرح یہاں سمجھئے! کہ اگر بیماری اور مصیبت مسلمانوں میں زیادہ بھی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آ سکتا کہ مسلمان ان سے زیادہ گنہگار ہیں ہرگز نہیں' کفار کا سب سے بڑا جرم ایک یہی ہے کہ ان کو حق تعالیٰ کی عظمت کی خبر نہیں مگر بیماری اور مصیبت مسلمانوں پر اس لیے زیادہ آئی کہ یہ خدا کے خاص بندے ہیں پھر خاص ہو کر اگر کوئی کام خلاف مرضی کریں گے تو ان پر عتاب زیادہ ہوگا لیکن مسلمانوں کی اس خصوصیت سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ ان کو یا ان کے بزرگوں کو خدائی کارخانہ میں بھی کچھ تصرف کرنے کا حق ہوگا۔ جیسا کہ دنیاوی حکام کے خاص دوستوں کو ان کے مزاج میں دخل ہوا کرتا ہے کہ وہ حاکم سے بعض دفعہ کہہ سن کر جو چاہے کرا لیتے ہیں۔ سو بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت اور عنایت سب اختیار سے ہے۔ اضطرار سے نہیں ہے اس لیے ان پر کسی کی خصوصیت اور تقرب کا اثر نہیں ہو سکتا کہ وہ جو چاہیں تصرف کرا لیں اور دنیوی حکام کو بعض دفعہ اپنے مخصوصین سے اضطراری تعلق ہو جاتا ہے اس لیے وہ مزاج میں دخیل ہو جاتے ہیں۔ پس یہاں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوگئی جو بعض بزرگوں کو یوں سمجھتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ سے کہہ کر جو چاہے کرا لیتے ہیں اور معاذ اللہ اولاد یا رزق وغیرہ ان کے اختیار میں ہے یہ بالکل غلط ہے۔ خدا پر کسی کو کچھ اختیار نہیں یہ بھی حق تعالیٰ کی عنایت ہے کہ وہ کسی کو اپنا مقرب بنا لیں ورنہ اس میں بھی کسی کا کچھ زور نہیں۔ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون مقبول و مقرب ہوگا؟ حق تعالیٰ نے بعض دفعہ

ان کی بھی دعا قبول نہیں فرمائی۔ ایک جواب اس کا اور بھی ہے کہ کفار کے لیے بہت سخت مصیبت تجویز کی گئی ہے مگر ان کو مہلت دیدی گئی ہے یہاں ان کو راحت و آرام میں چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ اچھی طرح پیٹ بھر کے نافرمانی اور گناہ کر لیں پھر اکٹھی سزا ہوگی۔ مسلمانوں کو مہلت نہ دینا اور کفار کو مہلت دے دینا یہ بھی اس کی دلیل نہیں کہ کفار مسلمانوں سے اچھے ہیں۔ دیکھئے! ایک بچہ سے استاد کو محبت ہوتی ہے اس کی ذرا ذرا سی بات پر تنبیہ اور روک ٹوک کرتا رہتا ہے اور جس سے محبت نہیں ہوتی اس کی ہر بات پر روک ٹوک نہیں کرتا' غصہ آتا ہے مگر خاموش رہتا ہے کہ کسی دن اکٹھی خبر لے لوں گا۔ اب اگر یہ بیوقوف یوں سمجھے کہ میاں جی فلاں کو تو روز دھمکاتے رہتے ہیں اور میں اتنی خطائیں کرتا ہوں مجھے کچھ نہیں کہتے تو مجھ سے ان کو زیادہ محبت ہے یہ اس کی حماقت ہے کیونکہ جب یہ اس سے زیادہ جرم کر رہا ہے تو زیادہ محبوب کیسے ہو سکتا ہے۔ یقیناً اسے کچھ نہ کہنا اس کی دلیل سمجھی جائے گی کہ اس سے میاں جی کو محبت نہیں اس لیے ہر بات پر روک ٹوک نہیں کرتے تاکہ عین وقت پر اس کے جرائم زیادہ ثابت ہوں اور اس کی پوری خبر لیں۔

حکمت تنبیہ

حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان کی ایسی مثال ہے جیسے گیہوں وغیرہ کا درخت کہ وہ اول اول کمزور ہوتا ہے پھر بڑھتا ہے تو باریک تنا پر کھڑا ہو جاتا ہے' ہواؤں کے جھونکے سے کبھی گر بھی جاتا ہے پھر سیدھا ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمان پر طرح طرح کے مصائب آتے رہتے ہیں جن سے اس کو تنبیہ ہوتی رہتی ہے تاکہ وہ توبہ و استغفار کر کے پھر سیدھا ہو جاوے اور کافر کی مثال درخت صنوبر جیسی ہے کہ وہ جب سے پیدا ہوتا ہے مضبوطی کے ساتھ سیدھا رہتا ہے یہاں تک کہ لمبا ہو جاتا ہے مگر جب کبھی گرتا ہے تو جڑ تک اکھڑ جاتی ہے' پھر نہیں اٹھ سکتا اسی طرح کافر کو دنیا میں مصائب کم پیش آتے ہیں اس لیے اس کو توبہ استغفار کی نوبت نہیں آتی' پھر جب آتی ہے تو ایسی آتی ہے کہ اٹھنا نصیب نہیں ہوتا' اوندھے منہ جہنم میں پہنچتا ہے۔ اہل سیر نے لکھا ہے کہ فرعون کو چار سو برس کی عمر میں ایک دن درد سر بھی نہیں ہوا' ہمیشہ راحت و آرام میں رہا' کمبخت کو خدا کی یاد کا ایک دن بھی خیال نہ آیا کیونکہ اکثر خدا کو مصیبت ہی میں یاد کیا جاتا ہے پھر حق تعالیٰ نے اس کو ایک دم سے پکڑا اور تمام قوم کو مع فرعون کے دریا برد کر دیا۔ اس کو فرماتے ہیں: "وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ" تمہارے پروردگار کی پکڑ جبکہ وہ کافر بستیوں کو پکڑتا ہے ایسے ہی دفعتاً ہوتی ہے بیشک خدا کی پکڑ بہت دردناک اور سخت ہوتی

ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں: "اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ" تو مسلمانوں کے اوپر جو زیادہ مصیبتیں آتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ان کو دفعتاً پکڑنا نہیں چاہتے بلکہ منظور یہ ہے کہ وہ اپنی غلطیوں پر بار بار متنبہ ہو کر اپنی اصلاح پوری کر لیں اور کافروں کو ایک دم سے پکڑنا منظور ہے اس لیے ان پر مصائب کم آتے ہیں ایک راز کفار پر کم مصیبتیں آنے کا یہ بھی ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کفر کی وجہ سے دائمی عذاب جہنم کا تیار ہے تو ان کے واسطے کفر ہی کی سزا اتنی سخت ہے کہ اب ان کی دوسری خطاؤں پر سزا دینے کی ضرورت نہیں۔ دیکھئے! ایک شخص سرکاری باغی ہو جس کے لیے پھانسی کا حکم تجویز ہو گیا اور کسی مصلحت سے چند روز کے لیے اس کو قید خانہ میں بھیج دیا جائے اور وہاں جا کر وہ قیدیوں سے لڑے کسی کو گالی دے کسی کو مارے پیٹے تو اس کو جس وقت پھانسی دی جائے گی اس وقت قیدیوں سے لڑنے کی الگ سزا نہ دی جائے گی اور نہ جرم اس پر قائم کیا جائے گا کیونکہ اس کے اوپر بغاوت ہی کا جرم اتنا سنگین قائم ہے کہ اس کی سزا میں جان لی جاوے گی تو اس کے ان چھوٹے چھوٹے جرائم پر نظر نہیں کی جاتی اسی لیے اکثر باغی لوگ قید خانہ میں جا کر بڑے فرعون بے سامان ہو جاتے ہیں اور یہی راز ہے علماء حنفیہ کے اس قول کا کہ کفار مخاطب بالفروع نہیں یعنی کفار کو آخرت میں نماز پڑھنے اور زکوٰۃ نہ دینے اور زنا وغیرہ کرنے کے سبب سے مستقل عذاب نہ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا ان کے زنا وغیرہ سے راضی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کی ساری خطائیں کفر کے اندر داخل ہیں ایک کفر ہی کا عذاب اتنا سخت ہے کہ اسی میں سب خطاؤں کو سزا ہو جائے گی ان کے عوض میں جداگانہ سزا نہ ہوگی اور مسلمانوں کے لیے چونکہ ایمان کی وجہ سے آخرت میں ہمیشہ کے لیے جنت اور راحت لکھی ہوئی ہے اس لیے دوسرے احکام میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے ان کو دنیا ہی میں سزا دے دی جاتی ہے تاکہ ان سے توبہ کر کے پاک صاف ہو کر جنت میں چلا جاوے اور اگر کسی مسلمان کو باوجود گناہوں کے دنیا میں مصیبت پیش نہ آئے تو یہ حالت اندیشہ ناک ہے اس کے واسطے خوف ہے کہ کچھ عذاب جہنم کا بھی ہو لیجئے۔ اب تو آپ تمنا کرتے ہوں گے کہ جو کچھ سزا ہونی ہو دنیا ہی میں مصیبتیں آ جائیں آخرت میں جہنم کا عذاب نہ ہو۔ حدیث میں ہے کہ آخرت میں جب مصیبت والوں کو بڑے بڑے درجے ملیں گے تو اس وقت راحت و آرام والے تمنا کریں گے کاش دنیا میں ہماری کھال قینچیوں سے کاٹی جاتی تاکہ آج ہم کو بھی یہ درجے ملتے۔ الحمدللہ کہ سب اشکالات کا جواب کافی طور پر ہو گیا۔

خلاصہ

اب میں بیان ختم کرنے والا ہوں اور چند باتیں خلاصے کے طور پر بیان کرتا ہوں سارے بیان کا خلاصہ یا باتیں ہیں۔ نمبر۱: گناہوں کی وجہ سے مصائب آتے ہیں جس کا بیان اس آیت میں کیا گیا ہے۔ "مَآ اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ" (جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھ کے کیے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے) جس سے میں نے بیان شروع کیا تھا۔ نمبر۲: گناہوں کا علاج توبہ واستغفار ہے مگر گناہ کا طریقہ استغفار جدا ہے جو فوت شدہ طاعات ہیں ان کی قضا کریں جیسے کسی کے ذمہ قضا نماز یا قضا روزے ہوں یا پچھلے سالوں کی زکوٰۃ ذمہ ہو ان کو ادا کریں اور جو ذنوب ہیں ان سے خالص توبہ کریں اور آئندہ کے لیے چھوڑ دینے کا پختہ ارادہ کریں اور حقوق العباد اگر ضائع ہوئے ہوں تو ان کو ادا کریں یا اہل حق سے معافی چاہیں اور خدا سے بھی ان کے بارے میں سچی توبہ کریں اور یہ پہلا مضمون تھا۔ نمبر۳: گناہوں سے مصیبت آنے پر دو شبہات تھے ان کے جواب دیئے گئے تھے ایک شبہ یہ تھا کہ نیک لوگوں پر کیوں مصائب آتے ہیں اس کے چند جواب دیئے گئے ایک یہ کہ گناہ ان سے بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے اگر گناہ بھی نہ ہوں تو ان سے مداہنت ہو جاتی ہے۔ تیسرے اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر وہ مصیبت ان کے حق میں صورت مصیبت ہوتی ہے۔ حقیقت میں مصیبت نہیں ہوتی کیونکہ اس سے ان کو پریشانی لاحق نہیں ہوتی، جسم کو گو تکلیف محسوس ہو مگر روح کو لذت اور دل کو سکون ہوتا ہے اور یہ دوسرا مضمون تھا۔ نمبر۴: ایک شبہ یہ تھا کہ کفار کو مصیبت کیوں نہیں آتی یا کم کیوں آتی ہے اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ان کے لیے ایک سخت مصیبت تیار ہے مگر یہاں ان کو مہلت دی گئی ہے اور یہ تیسرا مضمون تھا۔ اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ مسلمانوں کے اوپر سے سب بلاؤں اور مصیبتوں کو دفع فرمائیں اور ہم کو پچھلے گناہوں سے توبہ واستغفار کی توفیق عطا ہو اور آئندہ کے لیے اتباع احکام اور ترک معاصی کی ہمت نصیب ہو۔ آمین ثم آمین

وصلّی اللّٰہ تعالیٰ وسلم علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد صلوۃ تنجینا بھا من جمیع الاھوال والآفات و تقضی لنابھا جمیع الحاجات و تبلغنا بھا اقصی الغایات من جمیع الخیرات فی الحیات و بعد الممات انک علی کل شئ قدیر. وعلی الہ واصحابہ کما یحب و یرضی ربنا امین.

عرض جامع

جامع وعظ ہذا احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ یہ وعظ جن ایام میں بیان ہوا تھا اس وقت موسمی بخار بلائے عام کی طرح تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا اور جس ہفتہ میں یہ بیان ہوا اسی ہفتہ میں حضرت حکیم الامتہ دامت برکاتہم کی بھتیجی محترمہ زبیدہ خاتون مرحومہ کا انتقال ہو گیا تھا اس وقت حضرت کے دل پر بھی ایک خاص صدمہ تھا اس لیے سامعین پر بھی اس بیان کا بہت گہرا اور اچھا اثر ہوا۔ گویا موت کا سب کو اشتیاق معلوم ہوتا تھا بعض احباب نے اسی وقت تقاضا کیا تھا کہ یہ وعظ جلد صاف ہو جائے تو اس مصیبت عام میں مسلمانوں کے لیے باعث سکون ہو۔ چنانچہ میں نے اسی وقت اس کو صاف کرنا شروع کر دیا تھا اور قریب نصف کے صاف بھی کر لیا تھا مگر بعض عوارض کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا' پھر میں ہمشیرہ مرحومہ مذکورہ الصدر کا حج بدل کرنے چلا گیا' خدا اس کو ان کے لیے قبول فرمائے۔ اس لیے زیادہ تاخیر ہو گئی۔ چنانچہ اب ذوالحجہ سنہ ۳۸ھ میں اس کو پورا کیا اور اتفاقی بات کہ اس وقت بھی مسلمانوں کو عام مصائب کا سامنا ہو رہا ہے اس لیے امید ہے کہ موجودہ مصائب میں بھی انشاء اللہ یہ وعظ مسلمانوں کے لیے بہت کچھ سکون و اطمینان کا باعث ہوگا اور جو طریقہ مصائب کے دفع ہونے اور بلیات سے بچنے کا اس میں بتایا گیا ہے امید ہے کہ سب مسلمان اس کو اپنا نصب العین بنائیں گے اور اس پر کاربند ہوں گے کیونکہ جو تدبیر اس میں بتلائی گئی ہے وہ ہمارے اختیار میں ہے اور دوسری جن تدابیر میں مسلمان اس وقت مشغول ہو رہے ہیں وہ ان کے اختیار سے باہر ہیں۔ اور حدیث میں آیا ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. لَايَنْبَغِيْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ يُذِلَّ نَفْسَهٗ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يُذِلُّ نَفْسَهٗ قَالَ تَحَمِلُ مِنَ الْبَلَاءِ مَالَايُطِيْقُهٗ فَيُذِلُّ نَفْسَهٗ۝

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو یہ نہ چاہیے کہ اپنے آپ کو (خواہ مخواہ) ذلیل کرے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدمی اپنے آپ کو (خود) کیوں کر ذلیل کیا کرتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ (بعض دفعہ) ایسی بڑی بلا اپنے اوپر لاد لیتا ہے جس کی برداشت کی اس میں طاقت نہیں ہوتی تو (خواہ مخواہ) اپنے آپ کو ذلیل کر دیتا ہے۔ پس جو تدابیر آج کل عام مسلمان مصائب کے دفع کرنے کے لیے کر رہے ہیں ذرا غور کر لیا کریں کہ یہ باتیں ان کے اختیار میں بھی ہیں جو وہ تجویز کر رہے ہیں اور جن بلاؤں کو اپنے اوپر لاد

۱؎ (سنن الترمذی: ۲۲۵۴، سنن ابن ماجہ: ۴۰۱۶، مجمع الزوائد ۷: ۲۷۴)

رہے ہیں ذرا سوچ لیں کہ ان کے تحمل کی بھی طاقت ہے یا نہیں اگر تحمل کی طاقت نہ ہو تو خواہ مخواہ اپنے آپ کو ذلت میں نہ ڈالیں اور اس وعظ کی تدابیر کو جو کہ اختیاری ہیں حرز جان بنائیں۔ اخیر میں یہ درخواست ہے کہ حضرت حکیم الامۃ کی بھتیجی مرحومہ کے لیے سب ناظرین دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ ان کی مغفرت کاملہ فرمائیں اور درجات عالیہ عطا فرمائیں۔

مغفرت ہو اور خاطر خواہ ہو قرب ازواج رسول اللہ ہو
وہ ہوں اور نعمائے جنت بالدوام وہ ہوں اور آغوش رحمت والسلام

اور اس احقر کے لیے بھی دعاء حسن خاتمہ و تاحیات توفیق مرضیات و استقامت علی الطاعات واجتناب معاصی کی دعا فرمائیں اور نیز یہ کہ حق تعالیٰ ہم سب کو اپنی کامل محبت اور کامل اتباع شریعت اور شرور و فتن سے حفاظت دنیا میں' سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت آخرت میں اور حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی اور تمام مشائخ کرام کا سایہ عاطفت ہمارے سروں پر ہمیشہ رہے۔ آمین والحمد للہ رب العالمین والسلام علی المرسلین۔

تفاضل الاعمال

یعنی طاعات و معاصی

۱۴ صفر المظفر ۱۳۳۰ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں دو گھنٹہ تک بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ مولوی سعید احمد صاحب مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۷۰ یا ۸۰ تھی۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآاِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلَّمَ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَجَاھَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَایَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ. وَاللّٰہُ لَایَھۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ؈ (التوبہ آیت نمبر ۱۹)

ترجمہ: ''خدا تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم نے حجاج کے پانی پلانے اور مسجد حرام کی تعمیر کرنے والوں کو ایسے لوگوں کے برابر ٹھہرا دیا جو ایمان لائے اللہ پر اور آخرت پر ، اور خدا کے راستہ پر جہاد بھی کیا۔ خدا کے نزدیک وہ لوگ برابر نہیں ہو سکتے اور اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتے۔''

تمہید

میں آج ایک ضروری مسئلہ بیان کرتا ہوں جس کی طرف اس کے قبل کبھی التفات نہ ہوا تھا اور غالباً لوگوں کے خیال میں بھی یہ بات کم آئی ہوگی لیکن مسئلہ نہایت ضروری اور منصوص ہے اور چونکہ مسئلہ مختصر ہے لہٰذا اس وقت کا بیان بھی مختصر ہی ہوگا اور آج اس کے بیان کرنے کی ضرورت علاوہ مسئلے کے ضروری الاظہار ہونے کے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے جمعہ کو جو مضمون بیان کیا گیا تھا اس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے اور اس مسئلے کے ذہن میں آجانے کے بعد وہ شبہ مندفع ہو جائے گا تو اس حیثیت سے یہ مضمون سابق مضمون سے بھی مرتبط ہوگا اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا ترجمہ کرنے سے پیشتر مستقلاً اس مسئلہ کو بیان کر دوں تا کہ تفصیل ذہن نشین کرنے کے بعد آیت کے ترجمہ ہی سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ مسئلہ اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

تفاوت حسنات

یہ بات تو ہر خواص وعوام کو معلوم ہے کہ جس قدر بھی نیک کام ہیں سب کے سب ایک درجہ اور ایک پایہ کے نہیں بلکہ متفاوت ہی۔ مثلاً نماز پڑھنا' روزہ رکھنا' مسجد بنوانا' حج کرنا' مظلوم کی مدد کرنا وغیرہ وغیرہ بہت سے نیک کام ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو ثواب نماز پڑھنے میں ملتا ہے اسی قدر مسجد بنوانے میں بھی ملتا ہے یا حج کا ثواب ایک پیسہ خیرات کرنے میں بھی اس کے برابر ہے۔ علیٰ ہذا گناہ بھی سب برابر نہیں' چوری' ڈکیتی' زنا' قتل' شراب خوری کبائر ہیں اور آپس میں متفاوت۔ اسی طرح بہت سے صغائر ہیں لیکن کوئی بہت ہلکا ہے کوئی اس سے زائد۔ نیز یہ تفاوت حسنات میں منصوص ہے۔ حدیث میں ہے کہ:

اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً اَفْضَلُهَا قَوْلُ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَدْنٰهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ ؀[1]

''ایمان کے کچھ اوپر ستر درجے ہیں سب سے افضل کلمہ لا الہ الا اللہ ہے اور سب سے کم مرتبہ موذی چیز کو راستہ سے ہٹا دینا ہے اور شرم وحیا بھی ایمان ہی کا ایک درجہ ہے۔''

یعنی ایمان کے متعلق بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے زیادہ کامل تو لا الہ الا اللہ ہے اور سب سے ادنیٰ درجے کا کام یہ ہے کہ رستے سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دے۔ مثلاً رستہ میں کانٹے پڑے ہوں یا کوئی بڑی لکڑی پڑی ہو جیسا کہ اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ وہ سڑک پر ایسی چیزیں ڈال دیتے ہیں یا چھوڑ دیتے ہیں جن سے رستہ چلنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ مثلاً بعض لوگ بہلی یا چھکڑے رستے میں کھڑے کر دیتے ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نابینا شخص وہاں سے گزرتا ہے اور اس سے ٹکر کھا جاتا ہے۔ ہاں! اگر کسی ایک کنارے پر ہو تو مضائقہ نہیں لوگوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شریعت نے ان باتوں کے متعلق کوئی قانون مقرر نہیں کیا۔ صاحبو! ہر ہر کام کے لیے شریعت میں ایک حکم موجود ہے' دیکھو جب اماطة الاذیٰ (تکلیف دہ چیز کو ہٹانا) کو شعبہ ایمان قرار دیا ہے تو اس کے خلاف گناہ ہوگا یا نہیں؟ یہ مسئلہ اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قریب بصراحت ہے غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بصراحت بتلا دیا کہ حسنات باہم متفاضل ہیں ایمان اعلیٰ ہے حیا اس سے کم ہے اماطة الاذیٰ (تکلیف دہ چیز کو ہٹانا) اس سے کم ہے بلکہ اگر عادات ناس میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اور

---

[1] (سنن الترمذی: ۲۶۱۴' مسند احمد ۲: ۴۱۴' کنز العمال: ۵۶)

لوگ بھی عملاً اعمال کو متفاوت مان رہے ہیں۔ دیکھئے! اگر کسی شخص کے پاس دس روپیہ ہوں اور وہ ان کو کسی مصرف خیر میں لگانا چاہتا ہے تو اول اس کی تحقیق کرتا ہے کہ سب مصارف میں بہتر مصرف کون ہے اور اگر خود معلوم نہیں ہوتا تو علماء سے رجوع کرتا ہے اور ان کے بتلائے ہوئے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اگر وہ مدرسہ میں خرچ کرنے کو افضل بتاتے ہیں تو مدرسہ میں خرچ کرتا ہے۔ مسجد میں خرچ کو افضل بتاتے ہیں تو مسجد میں دیتا ہے۔ پس اگر اس متجسس کو معتقد تفاضل نہ مانا جائے تو اس کی چھان بین کیوں ہے؟ پس ہر طرح سے تفاضل بین الحسنات متیقن ہے دلیل سے بھی، تسلیم ناس سے بھی۔ یہ تو اجمالی مسئلہ ہے اور بالکل مطابق واقع کے ہے۔

تعیین افضل الاعمال

لیکن اس کی تفاصیل میں اکثر نے غلطی کی ہے عوام نے بھی اور علماء نے بھی اس لیے اس کی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ غلطی یہ ہے کہ لوگ افضل کی تعیین اپنی رائے سے کرتے ہیں یا اگر بعض لوگ کسی دلیل شرعی سے تعین کرتے ہیں تو وہ لوگ اس دلیل شرعی میں غور نہیں کرتے کہ یہ دلیل اس دعوے کے لیے کافی ہوگی یا نہیں اور انطباق ہوا یا نہیں ہوا چنانچہ عوام الناس جب تفاضل کی تحقیق کرتے ہیں اول تو اکثر اپنی رائے سے کرتے ہیں اور اس تفاضل کا معیار بھی ایک مقرر کرلیا ہے کیونکہ ہر تفاضل کے لیے کوئی نہ کوئی معیار تو ضرور ہونا چاہیے' ایک چاندی کو دوسری چاندی پر یا ایک کپڑے کو دوسرے کپڑے پر اگر ترجیح دیں تو اس ترجیح کا کوئی معیار ضرور ہوگا۔

پس اسی بناء پر عوام نے بھی اس تفاضل کے لیے ایک معیار مقرر کرلیا ہے کہ جس عمل کو وہ صورۃً عبادت سے زیادہ تلبیس دیکھتے ہیں اس کو افضل سمجھتے ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں کہ جس طرح وہ واقع میں عبادت ہیں۔ اسی طرح صورت بھی وہ عبادت ہیں یا عبادت سے ان کو تلبیس ہے۔ مثلاً نماز پڑھنا کہ یہ حقیقتاً اور صورۃً دونوں طرح عبادت ہے یا مسجد تیار کرانا کہ اس کو صورت عبادت سے تلبیس ہے دوسرے وہ اعمال ہیں کہ واقع میں وہ عبادت ہیں لیکن ان کی ظاہری صورت عبادت نہیں معلوم ہوتی نہ ان کو کسی عبادت سے ایسا ظاہری تلبس ہے کہ ہر شخص کی نظر میں آ جائے جیسے کسی طالب علم کی مدد کرنا' کھانے یا کپڑے سے (کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے کسی طالب علم کا کھانا مقرر کرانا ہے ہرگز نہیں) کیونکہ طالب علم کا کھانا مقرر کرنا جو عبادت ہے تو اس لیے کہ یہ خدمت دین ہے اور اس کا خدمت دین ہونا اس وقت سمجھ میں آ سکتا ہے کہ جب طالب علم فارغ ہو کر خدمت دین میں مصروف ہو تو یہ دونوں قسم کے اعمال عبادت ہیں

لیکن دونوں میں تفاوت یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر صورۃً بھی عبادت ہے کہ اس کے ساتھ عبادت کو تلبس ظاہر ہے یعنی اس میں لوگ نماز پڑھتے ہیں اور تلبس بھی بلاواسطہ ہے اور اسی وجہ سے یہ تلبس بہت ظاہر ہے اور عبادت بھی ایسی کہ وہ بصورتہا عبادت ہے یعنی اس کا عبادت ہونا نظری نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نماز پڑھنا عبادت ہے۔ لہٰذا اس کو یوں سمجھا جاتا ہے کہ بناء مسجد یا اس میں تیل بتی دینا بھی بہت بڑی عبادت ہے۔

برخلاف تقرر طعام طالب علم کے کہ یہ جس سے متلبس ہے اول تو وہ ایسی ظاہر عبادت نہیں کہ عوام بھی فوراً سمجھ لیں، دوسرے اطعام کو اس عبادت سے تلبیس بھی بوسائط ہے کیونکہ امداد طلبہ میں علم دین کی مدد ہے اور وہ اتنی ظاہر عبادت نہیں کیونکہ اگر ایک شخص میزان الصرف یا درس کی کوئی کتاب بالخصوص فلسفہ یا ہیئت پڑھتا ہے تو کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ یہ عبادت کر رہا ہے اس لیے کہ اس کا عبادت ہونا مآل اور انجام کے اعتبار سے ہے یعنی اگر دس برس تک یہ شخص مثلاً اسی میں لگا رہے اور فراغت حاصل کرے تو وہ اس قابل ہوگا کہ دین کی خدمت کر سکے اور خدمت دین افضل العبادات ہے۔

مرتبہ خدمت دین

اسی خدمت دین کی بدولت شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے افضل کہا جاتا ہے ورنہ عبادت کی کثرت اور قلت کسی کی مدون نہیں اور اگر کسی نے ظاہری فضائل کی چھان بین کی بھی ہے تو اس کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کثیر الفضائل ہونا معلوم ہوا ہے۔ محدثین نے اس کی تشریح کی ہے۔ اب یا تو دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اس قسم کے فضائل اس قدر مدون کم ہوئے ہیں یا فی الواقع حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے فضائل میں دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے زائد ہوں لیکن پھر بھی محققین اور اہل نظر یہی کہتے ہیں کہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما جمیع صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے افضل ہیں۔

اور اس نظر کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالم شہادت اور برزخ دونوں سے ہوتی ہے۔ سو احادیث تو سب کے پیش نظر ہیں اور نہ ہوں تو وہ مدون ہیں ہر ایک دیکھ سکتا ہے ہاں برزخی اقوال سے ایک قول نقل کرتا ہوں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین باتوں کا حکم فرمایا اور یہ تینوں باتیں میری مرضی کے خلاف ہیں مگر ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میں نے اپنی مرضی کو چھوڑ دیا۔

ایک تو یہ کہ میرا رجحان حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفضیل کی طرف تھا لیکن حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو افضل الصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سمجھو۔
دوسرے میرا میلان ترک تقلید کی جانب تھا' ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوا کہ مذاہب اربعہ سے باہر نہ ہو۔
تیسرے میں ترک اسباب کو پسند کرتا تھا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روک کر تثبت بالاسباب کا حکم فرمایا۔
ان تینوں حکموں میں بہت سے راز ہیں لیکن یہ وقت ان کی تفصیل کا نہیں لہٰذا اس کو یہیں چھوڑا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ عالم برزخ میں بھی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یہی معلوم ہوا کہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل سمجھو! غرض حدیث سے' کشف سے محققین کی رائے سے ہر طرح شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور اگر کسی کو اس مسئلے کی زیادہ تحقیق منظور ہو تو (ازالۃ الخفاء) کا مطالعہ کرے وہ انشاء اللہ تعالیٰ خاص اسی متن کی پوری طرح شرح ہوگی۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ ان دونوں کے ہاتھ سے اسلام کی خدمت بہت زیادہ ہوئی۔ پس علم کی افضلیت کی تو یہ حالت لیکن باوجود افضل العبادات ہونے کے اس کی صورت عبادت کی نہیں ہے۔

اعانت طلبہ

پھر اطعام کو جو اس سے تلبس ہے وہ تلبس بلا واسطہ نہیں بلکہ بوسائط ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کس قدر ثواب ہے۔ مثلاً آپ نے ایک طالب علم کو کھانا کھلایا جس نے بدل ما یتحلل کا کام دیا اور اس نے مطالعہ و حفظ سبق کی قوت پیدا کی اور اس قوت سے اس نے کام لے کر ایک سبق یاد کیا اور اسی طرح مسلسل سات آٹھ برس تک یہ کرتا رہا اور اس مدت میں فراغ حاصل کر کے اس قابل ہو گیا کہ دین کی خدمت کرے اور اس نے دین کی خدمت شروع کر دی پس یہ خدمت دین اسی مدد اور اطعام کی بدولت ہے جو آٹھ برس تک اس کو پہنچتی رہی اور اس خدمت کا ثواب ان سب لوگوں کو ملے گا جو اس کی امداد میں شریک رہے ہیں۔ لیکن عوام الناس اس کو نہیں سمجھتے اور

بلا ضرورت تعمیر مسجد

اس لیے ان کے پاس جب کچھ روپیہ جمع ہو جاتا ہے اور ان کو خدا کی راہ میں دینے کا کچھ خیال پیدا ہوتا ہے تو مسجد بنواتے ہیں' اکثر ایسے لوگ ہیں کہ ان کے پاس وافر روپیہ ہے اور وارث ایک بھی نہیں یا وارث بھی ہیں مگر ان کو اس کی دنیا کی احتیاج نہیں تو اول تدبیر ان کی سمجھ میں یہی

آتی ہے کہ اپنے گھر کی مسجد بنا دیں آخر مسجد بنا کر اپنی زندگی بھر اس کے حجرے میں رہتے ہیں اور چھوڑ کر مر جاتے ہیں ایسے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس جدید مسجد میں جو نمازی آئیں گے وہ دوسری قدیم مسجد کے جانے والے اور وہاں کی جماعت کے ہوں گے اور جب قدیم مسجد کے لوگ یہاں آنے لگیں گے تو اس مسجد کی جماعت میں قلت ہو جائے گی۔ ہم نے اسی قصبے میں دیکھا ہے کہ چار پانچ مسجدیں بالکل ہی قریب قریب بنی ہیں ایسی کہ اگر ایک ہی وقت میں سب جگہ نماز شروع ہو تو ایک مسجد کا امام دوسری مسجد کے امام کی قرأت پوری طرح سن سکتا ہے بلکہ عجب نہیں کہ سب آوازیں مختلط ہونے کے سبب کسی کو بھول بھی ہو جائے۔ اس میں بعضے لوگوں کی نیت تو تفاخر کی ہوتی ہے ایسے لوگ تو کسی شمار ہی میں نہیں بلکہ بعض مخلص بھی ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ ثواب میں مفلس ہی ہوتے ہیں۔ (لطیفہ عوام الناس ان اطراف میں مفلس کو مخلص کہتے ہیں میرے پاس ایک دیہاتی دوست آئے' میں نے تذکرے میں کہا کہ تم بہت مخلص ہو' کہنے لگے نہیں تمہاری دعا سے میرے پاس سب کچھ ہے میں مخلص نہیں یعنی مفلس نہیں) غرض ایسے لوگوں کو باوجود اخلاص نیت کے کچھ ثواب نہیں ملتا بلکہ الٹا ضرر ہوتا ہے۔

حقیقت مسجد ضرار

لیکن ایسی مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان لوگوں کی نیت خراب نہیں ہوتی آج کل اکثر مستفتی چالاکی کرتے ہیں کہ صورت سوال ایسی بناتے ہیں جس میں مجیب کو خواہ مخواہ مسجد ضرار ہی کہنا پڑے اور اکثر مجیب بھی بالکل سائل کے تابع ہو کر جواب دے دیتے ہیں۔ صاحبو! کسی مسجد کا ضرار ہونا آسان نہیں کیونکہ مسجد ضرار ہونے کے لیے نیت کا خراب ہونا شرط ہے۔ پس ممکن ہے کہ بانی کی نیت اچھی ہو۔ اگرچہ اسکو غلطی ہوگئی ہو اور اگر فرض بھی کیا جائے کہ بانی کی نیت خراب ہی تھی تو اس مستفتی کو اس کا علم کیونکر ہو سکتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ایسی مسجد بنانی جائز ہے۔ مقصود یہ ہے کہ سائل کو اصل نیت کا پتہ کیسے لگ سکتا ہے کہ اس پر مسجد ضرار کا اطلاق کر دیا جائے۔ اس کے سوا ممنوعات بھی ایک درجے کے نہیں ہوتے تو زیادہ سے زیادہ مسجد ضرار کی مثل ہو جائے گی لیکن مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی مسلمان کافروں کی سی حرکت کرنے لگے تو اس کو متشبہ بالکفار کہیں گے لیکن کافر نہیں کہہ سکتے۔ الحاصل ایسی مسجد بنانا ناپسندیدہ ہے تو عوام کو ایک تو اس کا بہت شوق ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی صورت عبادت کی ہے۔

افضلیت عمل کا غلط معیار

اور اسی بناء پر قرآن کے وقف کرنے کو بہت ثواب سمجھتے ہیں بدایہ وقف کرنے کو کوئی ثواب نہیں سمجھتا۔ اگرچہ لینے والا قرآن کو پڑھے بھی نہ کیونکہ قرآن اس قدر طبع ہو گئے ہیں کہ کوئی ان کو پڑھتا بھی نہیں۔ اسی طرح جب کوئی مرتا ہے تو اس کے ترکہ میں سے قرآن وقف کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ اتنا غلط ہو کہ کوئی پڑھ بھی نہ سکے۔ ایک مرتبہ ایک شخص بہت سے قرآن مسجد میں لایا کہ میں ان کو وقف کرتا ہوں' دیکھا گیا کہ سب غلط تھے۔ آخر میں نے ان کو دفن کرایا تو ایسے قرآن وقف کرنے سے کیا نتیجہ؟ ہاں! کوئی اوراق ہی کے وقف کرنے میں وقف قرآن کا ثواب سمجھے تو دوسری بات ہے۔ بس ایک معیار تو عوام کے ذہن میں یہ ہے۔

دوسرا معیار یہ ہے کہ جس کام کا نفع فوراً ظاہر ہو اس میں زیادہ ثواب سمجھتے ہیں اور جس کا نفع بدیر ہو اس میں اتنا ثواب نہیں سمجھتے۔ اسی بناء پر پانی پلانے کا ثواب زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کا ارادہ کنواں بنوانے کا ہو اور اس سے کہا جائے کہ مسجد کا ایک حجرہ شکستہ ہو رہا ہے اس کو بنوادو تو وہ کنویں کو ترجیح دے گا۔

تیسرا معیار عوام کے نزدیک یہ ہے کہ جس چیز کا نفع عام ہو اس میں زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ چنانچہ کنواں بنوانا اس کی بھی مثال ہے۔ یہ نمونہ کے طور پر عوام الناس کے تجویز کردہ معیاروں کا ذکر تھا جو ان کے حالات میں غور کرنے سے سمجھ میں آئے کہ نفع عاجل ہو اور نفع عام ہو اور اس کام کی صورت عبادت کی ہو اور عوام الناس اس طرح اپنے لیے ان تین معیاروں سے کاموں کی تجویز کرتے ہیں۔

اسی طرح بزرگوں میں بھی موازنہ انہی تین معیاروں سے کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص تمام رات جاگتا ہے کسی سے بات بھی بہت کم کرتا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے جو کہ فرائض واجبات اور سنن ادا کرتا ہے رات کو گھنٹہ دو گھنٹہ جاگ لیتا ہے' حفاظت دماغ کی تدبیر بھی کرتا ہے' نصیحت و پند بھی کرتا ہے' خلق اللہ کی دلجوئی کے لیے لوگوں سے ملتا بھی ہے' بچوں سے مزاح بھی کر لیتا ہے تو عوام الناس اس کے مقابلہ میں پہلے شخص کو زیادہ کامل سمجھیں گے۔ چنانچہ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا عابد ہے بلکہ عابد کی جگہ معبد کہتے ہیں' خدا جانے یہ لغت کہاں سے ایجاد کی اور دوسرے شخص کو چونکہ دیکھتے ہیں کہ زیادہ عبادت نہیں کرتا اس لیے اس کو زیادہ کامل نہیں سمجھتے حالانکہ ممکن ہے کہ عابد واقع میں یہی شخص ہو کیونکہ عبادت عبد بننے کو کہتے ہیں اور عبدیت بجا آوری احکام کا نام ہے جس وقت بھی جو کلمہ ہو۔ پس اختلاط خلق اغراض صالحہ سے نیز عبادت میں داخل ہے۔

تحقیق عبدیت

اس کے متعلق حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تحقیق بیان کرتا ہوں۔ فرمایا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے: "مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ" (میں نے جنوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لیے پیدا کیا ہے) تو باوجود اس کے کہ ملائکہ اور حیوانات عبادات سے نباتات جواہر و اعراض سب کے سب عبادت میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بارے میں ارشاد ہے: "یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَایَفْتُرُوْنَ" (پاکی بیان کرتے ہیں رات اور دن اور اس سے نہیں تھکتے) حیوانات وغیرہ کے بارے میں فرماتے ہیں: "اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّاتَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ" (کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے کہ اللہ کی حمد و تعریف نہ کرتی ہو لیکن ان کی تسبیح کو تم لوگ نہیں سمجھتے) ان کے علاوہ اور متعدد آیات سے ہر ایک چیز کا عبادت میں مشغول ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پھر انسان اور جن کی تخصیص عبدیت میں کیوں فرمائی گئی؟ فرمایا: کہ وجہ یہ ہے کہ ایک تو نوکر ہوتا ہے ایک غلام ہوتا ہے نوکر کی خدمات ہمیشہ معین ہوا کرتی ہیں یعنی اگر چہ کتنے بھی مختلف کام نوکر سے لیے جائیں لیکن کوئی کام ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جس میں نوکر عذر کر دے اور کہہ دے کہ میں اس کام کے لیے نہیں ہوں۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے نوکر سے کہنے لگے کہ تو مہتر کا کام بھی کیا کر تو وہ ہرگز نہ منظور کرے گا اور عذر کر دے گا۔ علی ہذا اور بہت سے کام ایسے نکلیں گے جن میں نوکر کی جانب سے عذر ہوگا بلکہ اولاد بھی جس پر نوکر سے زیادہ قبضہ اور تسلط ہوتا ہے بعض کاموں میں انکار کر دیتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک خاندانی سید اور معزز دوست نے ایک ایسے موقع پر کہ سقوں نے پانی بھرنا چھوڑ دیا تھا' اپنے لڑکے کو کہا کہ بھائی سقوں نے تو پانی بھرنے سے جواب دیدیا ہے' اہل محلہ کو سخت تکلیف ہوتی ہے تم ہی لوگوں کے یہاں پانی بھر آیا کرو' وہ لڑکا بہت خفا ہوا' برخلاف غلام کے کہ اس کا کوئی خاص مقرر کام نہیں ہوتا بلکہ اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک وقت آقا کی نیابت کرتا اور زرق برق لباس میں ہوتا ہے اور دوسرے وقت آقا کے نجس کپڑوں کو صاف کرتا ہے' ایک وقت بھنگی کا کام کرتا ہے تو دوسرے وقت سفارت کا کام کرتا ہے۔ پس غلام نوکر بھی ہے مہتر بھی ہے' سفیر بھی ہے خلیفہ بھی ہے۔ پس انسان اور جن تو بمنزلہ غلام کے ہیں اور دوسری مخلوقات مثل نوکر کے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دوسری مخلوقات کی عبادت کو تسبیح و تقدیس وسجدہ وغیرہ الفاظ سے فرمایا اور انسان اور جن کی عبادت کو بلفظ عبدیت فرمایا اور جب انسان اور جن عبد اور غلام ہیں تو ان کی کوئی خاص خدمت نہ

ہوگی بلکہ ایک وقت نماز روزہ کرنا عبادت ہوگا تو دوسرے وقت سونا اور قضائے حاجت کرنا لوگوں سے ملنا وغیرہ وغیرہ کام عبادت ہوں گے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: "نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ اَنْ يُّصَلِّيَ حَاقِنًا او كما قال"[1] (قضا حاجت کی شدت کے وقت نماز ادا کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا) کہ جس وقت پیشاب پاخانہ کا دباؤ ہو اس وقت نماز پڑھنے کی ممانعت ہے اور دفع فضلہ واجب ہے۔ دیکھئے! ایک وقت انسان کے لیے ایسا نکلا کہ اس کو مسجد جانا حرام اور بیت الخلاء جانا واجب ہوا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اول وقت نماز پڑھنا چاہے اور اس کو شدت سے بھوک لگی ہو تو شریعت حکم کرے گی کہ نماز کو مؤخر کرو اور کھانا کھاؤ۔ اسی راز کو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نہایت پاکیزہ الفاظ میں فرماتے ہیں: "لَاَنْ يَّكُوْنَ اُكْلِيْ كُلُّهٗ صَلٰوةً خَيْرٌ مِّنْ اَنْ يَّكُوْنَ صَلٰوتِيْ كُلُّهَا اُكْلًا" (کھانا کھاتے رہنا اور خیال نماز کی طرف رہنا یہ بہتر ہے اس بات سے کہ نماز پڑھتا رہے اور نیت کھانے کی طرف رہے) کیونکہ جب کھانا کھانے میں نماز کا برابر خیال رہا تو یہ سارا وقت انتظار صلوٰۃ میں گزرا اور انتظار صلوٰۃ میں صلوٰۃ کا ثواب ملتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر بھوک میں نماز شروع کردی جائے تو جوارح تو نماز میں مشغول ہوں گے اور دل کھانے میں پڑا ہوگا تو نماز کھانے کی نذر ہوگی اور یہی فہم ہے جس کی بدولت ان حضرات کو فقیہ اور مجتہد کہا جاتا ہے۔ آج یہ فہم مفقود ہے ہم لوگ کتابیں ان سے زیادہ پڑھتے ہیں مگر وہ بات حاصل نہیں:

ع نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(ہر وہ شخص جو آئینہ رکھتا ہے ضروری نہیں کہ سکندری فن سے واقف ہو)

اور اسی راز کی بناء پر ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قبلہ نور اللہ مرقدہم فرمایا کرتے تھے کہ اگر جسم ہند میں رہے اور دل مکہ مکرمہ میں تو اس سے بہتر ہے کہ جسم مکہ مکرمہ میں رہے اور دل ہندوستان میں۔ غرض انسان کے لیے کوئی خاص عبادت مقرر نہیں کیونکہ اس کی شان عبدی ہے اور جب یہ ہے تو ایک تو وہ شخص ہے کہ نماز پڑھکر کسی دیہاتی سے باتوں میں مشغول ہے اور یہ کھیتی باڑی کے حالات پوچھ رہا ہے اور دوسرا شخص لا الہ الا اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے تو بظاہر یہ دوسرا شخص افضل اور اکمل معلوم ہوتا ہے۔

حقیقت عبادت

لیکن غور کریں تو معلوم ہو کہ اگر پہلے شخص کی نیت درست ہے۔ مثلاً مسافر کے انبساط خاطر کے لیے ایسا کر رہا ہے یا کوئی دوسری ایسی نیت ہے تو یہ باتیں زیادہ افضل اور مقبول ہیں کیونکہ ہر عمل اپنے آثار

[1] (لم اجد الحديث في "موسوعة اطراف الحديث النبوي الشريف")

اور غایت کے اعتبار سے افضل ہوتا ہے تو ہر عمل کی غایت دیکھنا چاہیے لیکن عوام الناس اس کو نہیں سمجھتے۔

حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ کی حکایت بیان فرماتے تھے کہ میں حضرت رحمۃ اللہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، بہت دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ آخر جب بہت دیر ہوگئی تو میں اٹھا اور عرض کیا کہ حضرت آج میں نے آپ کی عبادت میں بہت حرج کیا، حضرت فرمانے لگے کہ مولانا یہ کیا فرمایا، کیا نماز روزہ ہی عبادت ہے اور دوستوں کا جی خوش کرنا عبادت نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ بیٹھتے تھے اور حد جواز تک جس قسم کی باتیں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ شریک رہتے مگر عوام الناس کیا سمجھیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

(تجربہ کار آدمی کی حالت کو غیر تجربہ کار آدمی نہیں سمجھ سکتا، لہٰذا بات کو طول نہ دے)

(بڑوں کی شان میں اعتراض کرنے سے اپنی زبان کو تھامے رکھو اسی میں بھلائی و خیریت ہے)

عوام الناس کی حالت اور مذاق پر مجھے ایک حکایت یاد آتی ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب شیخ نہال احمد رئیس دیوبند کا نکاح ان کے والد نے کیا تو چماروں کو بھی زردہ پلاؤ، فیرنی وغیرہ کھلائی اور کھانے تو انہوں نے جس طرح ہوا کھائے مگر جب فیرنی سامنے آئی تو اس کو چکھ کر ان میں سے ایک شخص کیا کہتا ہے کہ یہ تھوک سا کیسا ہے یعنی کیا ہے واقعی جس نے ہمیشہ گڑ اور شیرا کھایا ہو وہ کیا جانے کہ قند میں کیا مزا ہے اور فیرنی کیسی ہوتی ہے۔ اسی طرح معانی کے عوام الناس کو خبر نہیں ہوتی۔

ولایت و بزرگی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ کھانے پینے حتیٰ کہ ایام جاہلیت کے تذکروں میں بھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ شامل رہتے تھے اور ان لوگوں کے تذکروں کو سن کر آپ تبسم فرماتے تھے اور آپ کا ہنسنا تبسم سے زیادہ نہ ہوتا تھا اور کبھی کسی نے آپ کی آواز قہقہہ کی نہیں سنی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ تجربہ ہے کہ جب کسی وجہ سے غم کا غلبہ ہوتا ہے تو ہنسی کی آواز نہیں نکلتی۔ اگر چہ کم و بیش تبسم کی حالت ہو جائے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا جو تجربہ سے ثابت ہوتا ہے اور ایک مقدمہ شمائل ترمذی سے ملایئے۔ شمائل میں ہے: "کان دائم الفکرۃ متواصل الا حزان" (حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فکرمند رہتے اور آپ پر غم یکے بعد دیگرے آتے رہے) اور وجہ اس کی خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ میں کیونکر چین سے رہوں حالانکہ صاحب صور تیار کھڑا ہے کہ اب حکم ہو اور صور پھونک دوں۔ گویا یہ حالت تھی کہ

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم　　　جرس فریاد می دارد کے بر بندید محملہا
(مجھے محبوب کے گھر پہنچ کر بھی امن وعیش نہیں ملا وجہ یہ ہے کہ گھنٹہ ہر وقت کوچ کی خبر دے رہا ہے)

ہنسی تو ان لوگوں کو آ سکتی ہے جو بالکل بے فکر ہوں۔ سو اللہ والوں کو بے فکری کہاں؟ البتہ دوسروں کی خاطر سے کبھی کچھ ہنس دیتے ہیں۔ اس کے مناسب حکایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ملاقات ہوئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کثیر التبسم تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کثیر البکا تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے یحییٰ! کیا تم خدا تعالیٰ کی رحمت سے بالکل ناامید ہو گئے ہو کہ کسی وقت تمہارا رونا ختم ہی نہیں ہوتا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے عیسیٰ علیہ السلام کیا تم خدا تعالیٰ کے قہر سے بالکل مامون ہو کہ تم کو ہر وقت ہنسی سی آتی رہتی ہے۔ آخر ایک فرشتہ آیا اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم تم دونوں میں فیصلہ کرتے ہیں کہ اے عیسیٰ علیہ السلام جلوت میں تو ایسے ہی رہو جیسے اب رہتے ہو لیکن خلوت میں یحییٰ کی طرح گریہ وزاری کیا کرو اور اے یحییٰ علیہ السلام خلوت میں تو ایسے ہی رہو جیسے اب ہو لیکن لوگوں کے سامنے کچھ تبسم بھی کر لیا کرو کہ لوگوں کو میری رحمت سے مایوسی نہ ہو جائے کہ جب نبی علیہ السلام کا یہ حال ہے تو ہم کو نجات کی کیا امید ہے۔

اور یہ حکایت اس لیے بیان کی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تبسم جو کچھ تھا وہ محض اس لیے تھا کہ آپ کے مصالح خلق کے وابستہ تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو شاید تبسم بھی نہ ہوتا، غرض جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم باتوں میں مشغول ہوتے تھے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال کی عام کو کیا خبر ہوتی ہوگی۔ اس لیے کافر کہتے ہیں: "مَالِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ...... الخ" (یہ کیسا رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہے کہ کھانا بھی کھاتا ہے (ان کے زعم میں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف تھا) اور بازار میں بھی چلتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد　　　کم کسی ز ابدال حق آگاہ شد
(تمام عالم اسی سبب سے گمراہ ہو گیا کہ بہت کم لوگ خدا کے نیک بندوں سے مطلع ہوتے ہیں)

ہمسری بانبیاء برداشتند　　　اولیاء را ہمچو خود پنداشتند
(اپنے کو انبیاء کے برابر رکھتے ہیں اولیاء اللہ کو اپنی ہی طرح سمجھتے ہیں)

گفت اینک ما بشر ایشاں بشر　　　ما و ایشاں بستہ خوابیم و خور

(کہتے ہیں کہ ہم بھی انسان اور یہ بھی انسان، ہم اور وہ دونوں خواب اور کھانے میں فطرتاً مجبور ہیں)

ایں خدانستند ایشاں ازعمی   درمیاں فرقے بود بے منتہا

(یہ ان کو عدم بصیرت کی وجہ سے پہچان ہی نہیں سکتے جبکہ دونوں میں بے انتہا فرق ہے)

ایں خورد گردد پلیدی زوجدا   واں خورد گردد ہمہ نور خدا

(یہ جو کچھ کھاتا ہے سب پلیدگی اور گندگی ہو جاتا ہے اور اللہ سے جدا ہو جاتا ہے اور وہ جو کچھ کھاتے ہیں سب خدا کا نور بنتا ہے)

کہ ایک کھاتا ہے تو اس سے پلیدی نکلتی ہے دوسرا کھاتا ہے تو اس سے نور خدا نکلتا ہے)

میں جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مثنوی پڑھا کرتا تھا تو اس شعر میں مجھے خیال ہوا کہ یہ فرق محض شاعرانہ طور پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرما دیا ہے کیونکہ واقعی فرق تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب اہل اللہ کے پیٹ سے فضلہ نہ نکلتا جب سبق شروع ہوا تو حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا کہ پلیدی سے مراد اخلاق ذمیمہ ہیں اور نور خدا سے مراد اخلاق حسنہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کھاتے ہیں تو ان کو اخلاق حمیدہ میں مدد ملتی ہے اور دوسرے لوگ کھاتے ہیں تو ان کو اخلاق ذمیمہ میں مدد ملتی ہے تو باوجود اس فرق عظیم کے کفار نے نہ سمجھا اور انبیاء علیہم السلام کو اپنی مثل کہا کیونکہ ان میں کوئی انوکھی بات نہ تھی، کھانا بھی کھاتے تھے پانی بھی پیتے تھے۔

علامت ولایت

آج کل بھی ایسے لوگوں کو جو کھانا چھوڑ دیں بہت بزرگ سمجھا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر پانی کے یا کھانے کے چھوڑنے پر بزرگی کا مدار ہے تو سرسری اور سانڈا اور سمندر میں جو جانور ہیں بہت بزرگ ہیں کیونکہ سرسری بالکل پانی نہیں پیتی اور سانڈا نہ کھانا کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے صرف ہوا اس کی غذا ہے۔ صاحبو! بزرگی تو وہ چیز ہے کہ:

میان عاشق و معشوق رمزیست   کراما کاتبیں راہم خبر نیست

(عاشق اور معشوق کے درمیان بعض راز ایسے پنہاں ہوتے ہیں کہ کرام کاتبین دو فرشتے ہیں جو نیکی اور بدی لکھتے ہیں کو بھی خبر نہیں ہوتی)

یعنی بزرگی نسبت مع اللہ کا نام ہے جس کی پوری حقیقت کا بعض دفعہ فرشتوں کو بھی پتہ نہیں لگتا۔ البتہ اس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام افعال اقوال حرکات میں زیادہ تشبہ ہو یعنی جس طرح نماز ادا کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری متابعت

کی کوشش کی جائے اسی طرح آپس کے برتاؤ روزمرہ کی باتوں میں سونے میں جاگنے میں۔ غرض ہر ہر بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی کوشش کی جائے اور یہ اتباع عادت ہوجائے کہ بے تکلف سنت کے موافق افعال صادر ہونے لگیں اور عادات کو اس عموم میں اس لیے داخل کیا گیا کہ حدیث میں "ما انا علیه واصحابی"[1] (جس راستے پر میں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے صحابہ ہیں) آیا اور ما عام ہے۔ عبادت اور عادت دونوں کو تو بزرگی اور نسبت کی علامت یہ ہے اور کم کھانے یا کم پینے کو اس میں کچھ دخل نہیں۔

دوسرے کسی شخص کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بہت کھاتا ہے یا کم کھاتا ہے تو قطع نظر بزرگی کی علامت ہونے سے خود اس کا حکم بھی مشکل ہے کیونکہ کم کھانا یہ ہے کہ بھوک سے کم کھائے تو ممکن ہے کہ جس کو تم بہت کھانے والا سمجھے ہو اس کی بھوک اس خوراک سے دونی ہو تو وہ تو کم کھانے والا ہوا۔ ایک شیخ سے ان کے مریدوں نے ایک دوسرے مرید کی شکایت کی کہ حضرت یہ بہت کھاتا ہے چالیس پچاس روٹیاں کھا جاتا ہے۔ شیخ نے اس کو بلا کر کہا کہ بھائی اتنا نہیں کھایا کرتے "خیر الامور اوسطها"[2] (تمام کاموں میں میانہ روی بہتر ہے) اس مرید نے کہا کہ حضرت ہر ایک کا اوسط الگ ہے یہ صحیح ہے کہ میں اتنی مقدار کھا جاتا ہوں لیکن یہ غلط ہے کہ میں زیادہ کھاتا ہوں کیونکہ میری اصلی خوراک اس سے بہت زیادہ ہے جب تک مرید نہ ہوا تھا اس سے دونی کھایا کرتا تھا۔

تجویز میں احتیاط

تو اس حکایت سے معلوم ہوا ہوگا کہ بعض آدمیوں کی خوراک ہی بہت زیادہ ہوتی ہے اور اصلی خوراک کے اعتبار سے وہ بہت کم کھانا کھاتے ہیں تو یہ معیار صحیح نہیں ہے۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ بزرگوں نے قلۃ الطعام اور قلۃ المنام کا حکم فرمایا ہے تو سمجھو کہ اول تو ہر ایک کی قلت جدا ہے۔ جیسا حکایت بالا سے معلوم ہوا دوسرے ہر ایک کے لیے قلت کو تجویز بھی نہیں کیا جاتا بلکہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے لیے کسی بڑے مفسدے کے دفع کرنے کے لیے کسی خفیف مکروہ کے ارتکاب کو بھی جائز رکھا جاتا ہے جبکہ اس کے ذریعے سے کسی گناہ کبیرہ سے بچانا منظور ہو۔

چنانچہ ایک چور کسی بزرگ سے بیعت ہوا اور چوری کرنے سے توبہ کی لیکن چونکہ مدت کی عادت پڑی ہوئی تھی اس لیے ہر شب چوری کرنے کا سخت تقاضا طبیعت میں پیدا ہوتا اور اس کو

---

[1] (اتحاف السادۃ المتقین ۱: ۱۵۱' تفسیر القرطبی ۴: ۱۶۰' تفسیر ابن کثیر ۴: ۲۳۰)

[2] (السنن الکبریٰ للبیهقی ۳: ۲۷۳' اتحاف السادۃ المتقین ۶: ۲۳۶)

دبانے کے لیے وہ یہ کرتا کہ تمام ذاکرین کے جوتے اٹھا کر گڑبڑ کر دیتا اس کے جوتے کے ساتھ اس کا اور اس کے جوتے کے ساتھ اس کا غرض کسی ایک کا جوتا بھی اپنے ٹھکانے پر نہ ملتا۔ آخر لوگوں نے دق ہو کر ایک شب بیدار رہ کر دیکھا' معلوم ہوا کہ یہ تو گرفتار ہیں' صبح ہوئی تو شیخ سے شکایت کی۔ انہوں نے بلا کر اس سے دریافت کیا اس نے کہا کہ حضور میں بیشک ایسا کرتا ہوں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ مدت سے مجھے چوری کرنے کی عادت تھی اب میں نے توبہ کر لی ہے لیکن رہ رہ کر طبیعت میں تقاضا پیدا ہوتا ہے جس کو میں یوں پورا کرتا ہوں۔ اب اگر آپ مجھے اس سے منع فرمائیں گے تو میں اضطراراً پھر چوری کروں گا۔ غرض میں نے چوری سے توبہ کی' ہیرا پھیری سے توبہ نہیں کی۔ شیخ نے کہا کہ بھائی تجھ کو اس کی اجازت ہے تم ہیرا پھیری کر لیا کرو۔ ان مراتب کو سمجھنا بڑی بصیرت پر موقوف ہے۔

قطع تعلقات

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ترک ملازمت اور قطع تعلقات کی ہرگز اجازت نہ دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اب تو صرف ایک بلا میں گرفتار ہے چھوڑ دے گا تو خدا جانے کیا کچھ کرے گا اور کس قسم کی آفات کا شکار ہوگا تو اتنی بلاؤں سے ایک ہی بلا اچھی ہے۔ اب لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ پیر صاحب لنگوٹہ بندھوا دیں اور بیوی بچوں کو چھڑا دیں۔ ایسے لوگوں کو تنخواہ پیر صاحب تو دینے سے رہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے اور یہ ہونا چاہیے کہ جب حوائج ضروری پوری نہیں ہو سکتی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا تو جھوٹی شہادتیں دینا جھوٹے مقدمے لڑانا قرض لے کر دبالینا' غرض اسی طرح کے صدہا آفات میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ملازمت ترک کرانے کی کیا ضرورت؟ خدا تعالیٰ کا نام جب دل میں جگہ کرے گا تو وہ خود ہی چھڑا دے گا کیونکہ

عشق آن شعلہ است کو چوں برفروخت   ہر کہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(عشق وہ شعلہ ہے جب بھڑک گیا' معشوق کے سوا باقی سب کا سب جلا دیتا ہے)

تیغ لا در قتل غیر حق براند   درنگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

(لا الہ کی تلوار غیر حق والوں کے قتل کرنے میں چلتی ہے' پھر دیکھو لا کے بعد کیا رہ جاتا ہے)

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت   مرحبا ای عشق شرکت سوز رفت

(صرف الا اللہ رہ گیا اور باقی تمام کا تمام ختم ہو گیا اے عشق اے سب شرکتوں کے جلا دینے والے تجھے شاباش)

مشہور ہے کہ آب آمد و تیمم برخاست تو آب تو آنے دو تیمم خود ہی جاتا رہے گا۔ یہی راز تھا جس کے لیے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ چھوڑانے کی کیا ضرورت ہے وقت پر خود ہی چھوٹ جائے گا اور حکم ایسے اشخاص کے لیے تھا جس کے کھانے پینے کی کوئی سبیل نہ ہو کہ ایں بلا دفع بلاہائے بزرگ اور اگر کسی کے پاس کوئی ایسا ذریعہ موجود ہو تو اس کو یہی مناسب ہے کہ اس پر قناعت کرے اور یادِ خدا میں مشغول ہو۔ مولانا نظامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

خوشا روزگارے کہ دارد کسے　　　کہ بازار حرصش نباشد بسے

(جو کام کسی شخص کو مل گیا ہے وہ اچھا ہے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کی حرص و ہوس محدود ہو جائے گی)

بقدر ضرورت بسارے بود　　　کند کار مردیکہ بود

(پھر بقدر ضرورت آسانی ہوگی پھر اگر وہ کام کا آدمی ہے تو بھلا کام بھی مل جائے گا)

یعنی اگر ضرورت کے لائق موجود ہو اور اس پر قناعت کر کے کام میں مشغول ہو جائے تو یہ بہت اچھا ہے۔

شانِ مشیخت

تو اس فرق کو دریافت کرنا اور لوگوں کے حالات اور طبائع کا اندازہ کرنا یہ کامل ہی کا کام ہے اور یہی شانِ مشیخت ہے ورنہ کسی بزرگ کے ملفوظات یاد کر لینے یا تصوف کے مسائل ازبر ہونے سے شیخ نہیں ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں:

حرفِ درویشاں بدزد زد مرد دوں　　　تا کہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(درویشوں کا کلام چراتا ہے دنیا دار کمینہ آدمی تاکہ جاہلوں کے سامنے جادو جیسا بیان کر کے انہیں اپنا گرویدہ کرے)

باتوں کے یاد کر لینے سے کچھ نتیجہ نہیں۔ اگر ایک شخص کو بہت سی مٹھائیوں کے نام یاد ہوں اور تصیب ایک بھی نہ ہو تو اس حفظ اسماء سے کوئی فائدہ بھی نہیں لیکن اگر نام ایک کا بھی یاد نہ ہو اور کھانے کو دونوں وقت ملتی ہوں تو سب کچھ حاصل ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

میم واؤ میم و نون تشریف نیست　　　لفظ مومن جز پئے تعریف نیست

(لفظ میم اور واؤ اور میم اور نون ان کے اندر خود بزرگی نہیں ہے یعنی لفظ مومن تو صرف پہچان کے لیے ہے)

کہ نام تو صرف پہچان کے لیے ہے ورنہ اس میں کیا رکھا ہے؟ اصل چیز معنی ہے اور وہ اس سے بفراسخ دور۔ آج یہ حالت ہے کہ دو چار تعویذ گنڈے یاد کر لیے کچھ جھاڑ پھونک سیکھ لی اور شیخ وقت بن گئے۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی   تاراہ بیں نباشی کے راہبر شوی

(اے بے خبر کوشش کرتا کہ خبر والا ہو تو جب تک راہ دیکھنے والا نہ ہو تو رہبر کیسے ہو سکتا ہے)

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق   ہاں اے پسر بکوش کہ روزی پدر شوی

(اور حقائق کے مدرسہ میں عشق سکھانے والے استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر! تاکہ ایک دن تو بھی استاذ کا درجہ پانے کے قابل ہو جائے)

تو پہلے پسر تو بن لیں اس کے بعد پدر بننے کی نوبت آئے گی۔ یہ تو پیروں کی حالت ہے۔

کمالات باطنی

مریدوں کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے انتخاب کی معیار عجیب وغریب اختراع کر رکھی ہے جس میں ذرا ہو حق پاتے ہیں اس کو بزرگ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ یہ محض گرمی طبع سے ہونے لگتا ہے۔

ایک شخص حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ حضرت میرا قلب جاری ہو گیا' آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ دل کے دھڑکنے کو قلب کا جاری ہونا نہیں کہتے' قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی یاد دل پر حاضر رہے۔

اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ کی بوٹیاں تھرکتی ہیں یہ بہت کامل ہیں اور جن لوگوں میں یہ بات نہیں ہوتی ان کی نسبت کہتے ہیں کہ نیک بخت یعنی ان میں کمالات باطنی نہیں حالانکہ کمالات باطنی بالکل مخفی ہیں اور ان کو بوٹیوں کے تھرکنے سے کچھ بھی تعلق نہیں۔

اور وہ کمالات یہ ہیں کہ فن میں ماہر ہو۔ امت کے لیے حکیم ہو' شریعت کا پورا پابند ہو' یہ باتیں نہ ہوں تو ہزار مجاہدہ' ریاضت ہو کچھ نہیں۔ جفاکش کہیں گے' محنتی کہیں گے لیکن بزرگی سے کوئی علاقہ نہیں۔ بہر حال عوام الناس اپنے اعمال میں بھی غلط معیار پر چلتے ہیں اور انتخاب بھی غلط معیار سے کرتے ہیں کہ ان کی بدولت اکثر حقوق واجبہ بھی تلف اور ضائع ہو جاتے ہیں۔

تلف حقوق

ایک سرحدی عابد کی نسبت سنا ہے کہ آخر شب میں تہجد ادا کرنے کے لیے مسجد میں آئے۔ اتفاق سے اس روز مسجد میں کوئی مسافر بھی سو رہا تھا۔ آپ نے نماز شروع کی لیکن مسافر کے خراٹوں

کے سبب نماز میں مرضی کے موافق یکسوئی اور اجتماع خیالات نہ ہوسکا آپ نے نماز توڑ دی اور مسافر کو خواب سے جگا دیا کہ ہماری نماز میں خلل پڑتا ہے اس کے بعد پھر آ کر نیت باندھ لی' مسافر چونکہ تکان سے بہت خستہ ہو رہا تھا' تھوڑی دیر میں پھر سو گیا اور خراٹوں کی آواز پھر شروع ہوئی' آپ نے پھر نماز توڑ کر اس کو بیدار کیا اور اس کے بعد نماز شروع کی۔ تیسری بار پھر ایسا ہی ہوا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور چھری لے کر اس غریب مسافر کو شہید کر دیا اور پھر بفراغت نماز پڑھی۔ صبح کو نماز کے لیے لوگ جمع ہوئے تو مسجد میں لاش کو دیکھا تعجب سے پوچھا کہ اس شخص کو کس نے قتل کیا تو عابد صاحب فرماتے ہیں کہ اس نے ہماری نماز میں خلل ڈالا اس لیے ہم نے قتل کر ڈالا یہ تو بالکل کھلی حماقت تھی اس لیے سب نے اس پر نفریں کی ہوگی۔ لیکن آج کل اس سے بہت بڑی بڑی حماقتیں لوگ کرتے ہیں اور ان کی طرف ذرا التفات نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس سے غامض ہوتی ہیں۔

افسوس ہے کہ آج دین کی سمجھ بالکل مفقود ہے ناواقفی سے ہم لوگوں کی بعض اوقات وہ حالت ہوتی ہے جیسے ایک سرحدی کی نسبت سنا ہے کہ وہ ہندوستان میں آیا ہوا تھا' اتفاقاً چوروں نے کسی موقع پر اس کو زخمی کر دیا۔ ایک شخص نے اس پر رحم کھا کر اس کا علاج کرایا' چند روز میں اس کو آرام ہو گیا۔ جب اپنے وطن جانے لگا تو اس شخص نے کہا کہ اگر تم کبھی ہمارے دیس میں آؤ گے تو ہم تمہارے احسان کی مکافات کریں گے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی ذریعہ سے وہ شخص اس کے وطن گیا اور یاد آیا کہ اپنے دوست سے ملے' دریافت کرتا ہوا اس کے گھر پہنچا' ملاقات ہوئی' نہایت عزت سے پیش آیا اور اپنے گھر پر لے گیا اور اس سے کہا کہ تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں' اس کے جانے کے بعد گھر والوں نے اس شخص سے پوچھا کہ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو اس نے سارا قصہ ان سے بیان کیا' انہوں نے کہا کہ خدا کے لیے تم فوراً یہاں سے بھاگو ورنہ وہ تم کو ہلاک کر دے گا کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کبھی ہمارا دوست ہمارے وطن آئے تو ہم اس کے احسان کی مکافات کریں گے۔ اس طرح کہ اول اس کو اسی قدر زخمی کریں گے جتنے ہم ہوئے تھے اور پھر اس کا علاج کر کے اس کو تندرست کریں گے۔ چنانچہ وہ ابھی چھرا لے کر آئے گا اور تم کو زخمی کرے گا' یہ غریب وہاں سے بھاگا اور اس طرح اس کی جان بچی۔

تو بہت لوگوں کی عادت ایسی ہوتی ہے جیسی اس کی مکافات تھی لیکن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا مثلاً بعض لوگوں کو مراقبہ کا ایسا شوق ہوتا ہے کہ اگر حالت مراقبہ میں کوئی شخص ان کے پاس آ کر نماز کے متعلق مسئلہ دریافت کرے اور نماز کا وقت نکلا جاتا ہو اور کوئی دوسرا آدمی مسئلہ بتلانے والا

بھی نہ ہو تو یہ ہرگز مراقبہ سے سر نہ اٹھائیں گے حالانکہ ایسے وقت میں فرض ہے کہ مراقبہ چھوڑ کر مسئلہ بتلا دیں۔ میں نے خود ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ ہر وقت تسبیح ہاتھ میں ہے لیکن نہ بیوی کی خبر ہے نہ بچے کی گویا ماسوی اللہ کو چھوڑ دیا۔

نسبت کی گرمی

اور سبب اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگ کیفیات کو مطلوب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ہم خدا کے مقبول نہ ہوتے تو ہم پر یہ کیفیات کیونکر طاری ہوتیں حالانکہ یہ کفار پر بھی ہوتی ہیں اس کی حقیقت ایک واقعہ سے سمجھ میں آئے گی۔ ایک سجادہ نشین نے مجلس عرس میں کلکٹر اور صاحب جج کو مدعو کیا وہ چونکہ خلیق تھے شریف ہو گئے آخر تن تن شروع ہوئی اور قوالوں نے گانا شروع کیا کچھ ایسا سماں بندھا کہ صاحب جج پر محویت کے آثار طاری ہونے لگے اور وہ بے اختیار ہو کر گرنے لگے تھوڑی دیر تو تحمل کیا جب نہ سنبھل سکے تو صاحب کلکٹر سے کہا کہ مجھ کو کیا ہو گیا کہ میں گرا جاتا ہوں صاحب کلکٹر نے کہا کہ میری بھی یہی حالت ہے۔ آخر دونوں وہاں سے اٹھ گئے اور چل دیے۔ تو صاحبو! کیا یہ صاحب کلکٹر اور صاحب جج بھی بزرگ تھے۔ معلوم ہوا کہ کیفیات کا مدار قبول اور بزرگی نہیں۔ وہ ایک انفعال ہے جو اکثر ذکر و شغل سے اور دوسرے اسباب سے بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح بعض اشغال سے ذکر میں یکسوئی بھی زیادہ ہوتی ہے اور خطرات کم ہونے لگتے ہیں کیونکہ ان اشغال سے رطوبات کم ہو جاتی ہیں تو یہ سب اسباب طبعیہ کے دخل سے ہوتی ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ کیفیات محض بیکار ہیں ہرگز نہیں کیفیات نافع بھی ہیں لیکن مقصود یہ ہے کہ ان میں زیادہ دخل اسباب طبعیہ کو ہے۔

ایک بزرگ کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے بڑھاپے میں روتے تھے سبب پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ جوانی میں نماز میں لذت زیادہ ہوتی تھی میں سمجھتا تھا کہ یہ نسبت کا اثر ہے لیکن اب وہ حالت نہیں رہی۔ معلوم ہوا کہ وہ سب جوانی کا نشاط تھا اب چونکہ وہ نہیں رہی اس لیے وہ کیفیت بھی نہیں رہی اور نسبت کی گرمی بڑھاپے میں جا کر اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے:

خود قوی تر میشود خمر کہن — خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب خود بخود زیادہ تر قوی ہو جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو میرے ساقی کے ہاتھ سے آئے)

دوسرے بزرگ کہتے ہیں:

ہر چند پیروخستہ و بس ناتواں شدم — ہرگہ نظر بروی تو کردم جواں شدم

(اگرچہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور کمزور و ناتواں ہوگیا ہوں مگر پھر بھی جب تیرے (پرکیف) چہرہ پر نگاہ ڈالتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں)

غرض یہ نفسانی کیفیات نہ محدود ہیں نہ مذموم ہیں البتہ اگر یہ آلہ مقصود کا بن جائیں تو پھر محمود ہو جاتی ہیں ورنہ ہیچ۔ مثلاً بعض کیفیات کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھی باقی رہتی ہیں اور اس لیے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم مقبول اور خاصان خدا ہیں لیکن یاد رکھو کہ وہ مذموم ہیں اور یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا کہ مخالف احکام پر بھی دعویٰ مقبولیت کا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے: "نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ" (ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں) یعنی ہم مثل بیٹے کے ہیں کہ جس طرح باپ اپنے بیٹے کو ہر حال میں چاہتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ ہم کو ہر حال میں چاہتے ہیں خدا تعالیٰ ان کے اس خیال کا رد فرماتے ہیں کہ: "قُلۡ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمۡ بِذُنُوۡبِكُمۡ" (آپ فرما دیجئے! کہ پھر کیوں وہ تم کو تمہارے گناہوں کی وجہ سے تم کو عذاب دیتا ہے) تو اس امت میں بھی بعض لوگ اس خیال کے موجود ہیں مگر سمجھ لینا چاہیے کہ قیامت میں ایسے لوگوں کی گردن ناپی جائے گی' ان اعمال کی وہاں کچھ بھی قدر نہ ہوگی کیونکہ مقصود عبادات ہیں مجاہدات و ریاضت مقصود نہیں لیکن چونکہ ہم لوگوں کی عبادات میں وہ خلوص مطلوب پیدا نہیں ہوتا اس لیے یہ مجاہدات کیے جاتے ہیں کہ ہماری نمازوں اور نیز دوسری عبادات میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان پیدا ہو جائے۔ پس یہ ریاضت مقصود بالغیر ہوئی۔ لکھا ہے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا' پوچھا کہ حضرت وہ تصوف کے نکات جو زندگی میں بیان ہوتے تھے یہاں بھی کچھ کام آئے' فرمایا کہ سب فنا ہو گئے۔ ہاں! کچھ نماز اخیر شب میں پڑھ لیتا تھا وہ البتہ کام آئی۔ "مانفعنا الا رکیعات فی جوف الیل" (نہیں نفع دیا ہم کو لیکن نیم شبی کی چند رکعتوں نے) لوگ خدا جانے ان کیفیات کو کیا کچھ سمجھے ہوئے ہیں۔

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے   حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(سردار گمان کرتا ہے کہ وہ مقصود حاصل کر چکا ہے حالانکہ خواجہ کا حاصل سوائے گمان کے اور کچھ نہیں)

لیکن اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض ظاہری اعمال کافی ہیں اور مجاہدات کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ ظاہری اعمال میں خلوص شرط ہے اور آج وہ مفقود ہے۔ یہ مجاہدات اس خلوص کا مقدمہ ہیں اور مقدمہ واجب کا واجب ہوتا ہے جیسے وضو مقدمہ ہے' صلوٰۃ کا خود مطلوب بالذات نہیں' لہٰذا بدون ان مجاہدات کے نرے اعمال اکثر کافی نہیں' یہاں تک عوام الناس کے مقرر کردہ معیاروں اور ان کے آثار کا بیان تھا۔

افضلیت عمل کا صحیح معیار

اب مناسب ہے کہ اصلی اور صحیح معیار بیان کر دیا جائے۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۝

"کیا تم حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کی تعمیر کرنے والوں کو ان لوگوں کے برابر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔"

اس کی شان نزول میں مختلف قصے آئے ہیں جن کی تفصیل اس وقت مستحضر نہیں اتنی قدر مشترک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض لوگوں میں گفتگو ہوگئی تھی کہ ایک جماعت اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے کو افضل سمجھتی تھی، دوسری جماعت اپنے تئیں۔ خدا تعالیٰ اس آیت میں افضلیت اعمال کا فیصلہ کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ کونسی جماعت افضل ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے:

"کیا تم حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد کی تعمیر کرنے کو اس شخص کے اعمال کے برابر کرتے ہو جو خدا پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اسنے دین کو نفع پہنچایا ہو یہ دونوں جماعتیں ہرگز برابر نہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ عمارت مسجد اور سقایہ حاج ایمان باللہ و اعلائے کلمۃ اللہ کی برابر نہیں ہے کیونکہ جعلتم کا مفعول سقایہ کو قرار دیا ہے جو کہ عمل ہے تو مقصود اعمال کا تفاضل بیان کرنا ہے۔ رہی یہ بات کہ ایک جانب میں تو جعلتم کا مفعول اعمال کو بنایا اور دوسری جانب میں کاف کا مدخول مومنین کی ذات کو قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے جو ابھی ذہن میں آئی کہ جو لوگ معمرین مسجد تھے وہ اس وقت کافر تھے اور عمل ان کا نیک تھا۔ اگرچہ خصوصیت محل کی وجہ سے اس پر کوئی ثمرہ مرتب نہیں تھا۔ تو اس جانب میں اعمال کو ذکر کر کے یہ بتلا دیا کہ اب بوجہ عامل کے مومن نہ ہونے کے یہ اعمال مقبول ہی نہیں لیکن اگر اس سے قطع نظر بھی کی جائے اور نفس اعمال کو دیکھا جائے تب بھی اپنے مقابل اعمال سے کم ہیں اور دوسری جانب میں ذات کو کاف کا مدخول بنا کر یہ بتلا دیا کہ ان اعمال کی یہ حالت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے خود عمل کرنے والا بھی مقبول ہو جاتا ہے۔ الغرض اس آیت میں افضلیت سقایہ وعمارت کے دعوے کی تغلیط ہے اور مبنی اس دعویٰ کا وہی تھا جو آج کل عوام الناس میں ہے یعنی عمل کا نفع عاجل ہو اور عام ہو اور عمل کی صورت عبادت کی سی ہو۔ سقایۃ الحاج میں تو نفع عام اور نفع عاجل تھا اور تعمیر مسجد کی صورت عبادت کی تھی۔ اس لیے ظاہراً معنی فضیلت کے اس میں زیادہ تھے اور اس کی تغلیط کر کے خدا تعالیٰ بتلاتے ہیں کہ فضیلت فلاں فلاں عمل میں ہے لیکن اس

میں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ جن اعمال کو اللہ تعالیٰ نے افضل بتایا ہے ان میں وجہ اس افضلیت کی کیا ہے؟ اور اس میں غور کرنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ نفع لازم سے نفع متعدی افضل ہے یا نہیں؟ اور تعدیہ یا لزوم پر افضلیت کی بنا ہو سکتی ہے یا نہیں؟

تو آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہ افضلیت کی اور اسکا معیار ایمان ہے یعنی جس چیز کو ایمان سے زیادہ تلبس ہوگا وہ زیادہ افضل ہوگی اور اسی وجہ سے ایمان کے ساتھ ایک دوسری صفت یعنی ''جاھد فی سبیل اللہ'' (اللہ کے راستے میں اس نے جہاد کیا) کو بھی ذکر کر دیا کیونکہ وہ اعلاء کلمۃ اللہ کا باعث اور اسلام کے پھیلانے میں معین ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ کوئی عمل ایسا نہیں کہ بدون اس کے دوسرے عمل بالکل مقبول نہ ہوں۔ مثلاً ایسا نہیں کہ نماز بدون زکوۃ کے قبول نہ ہو اور زکوۃ بدون حج کے بجز ایمان کے کہ اس پر تمام اعمال موقوف ہیں۔ پس اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ متعدی کو من کل الوجوہ افضل کہنا غلطی ہے۔ چنانچہ ایمان عمل متعدی نہیں اور پھر سب سے افضل ہے اور یہیں سے یعنی ایمان کے افضل الاعمال ہونے سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم ہوگئی جو کہ غیر اہل ایمان کو اہل ایمان پر فضیلت دیتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے فلاں قوم اچھی ہے۔ البتہ اگر ایسے مضامین سے مسلمانوں کو غیرت دلانا مقصود ہو تو مضائقہ نہیں۔ بعض لوگ بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص مسلمان ہو کر بھی فلاں عیب کو نہیں چھوڑتا اس سے تو مسلمان ہی نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ یہ سخت غلطی اور جہل ہے۔

مومن عیب دار

ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ رنڈیوں کو مسلمان نہ کرنا چاہیے اسلام کو ایسے مسلمانوں سے عیب لگتا ہے میں نے کہا اگر اسلام ایسے مسلمانوں کو نکالے تو تم کو ان سے پیشتر نکالدے گا تمہارے اعمال کہاں کے اچھے ہیں! بعضے لوگ چمار بھنگی کے مسلمان ہونے کو بوجہ تحقیر کے پسند نہیں کرتے مگر یاد رکھو جب قیامت کا دن ہوگا اس روز معلوم ہو جائے گا کہ ہم جن کو ذلیل سمجھے تھے ان کی کیا حالت ہے اور ہماری کیا گت۔

فسوف تری اذا انکشف الغبار افرس تحت رجلک ام حمار

(پس عنقریب تو اے مخاطب دیکھ لے گا جس وقت کہ غبار ختم ہو جائے گا کہ آیا تیرے پیروں کے نیچے گھوڑا ہے یا کہ گدھا' میدان جنگ میں کس قسم کے سوار پر فتح پائی ہے اسی طرح دنیا کی زندگی ایک قسم کا غبار ہے جب موت واقع ہوگی اور دنیاوی پردہ ختم ہو جائے گا اس وقت حقیقت حال ظاہر ہو جائے گی)

اسی طرح مومن عیب دار کو کافر باکمال کے مقابلے میں آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص جو صرف ایمان لایا تھا اور کوئی عمل اس نے اچھا نہیں کیا اس کو تھوڑی مدت کے بعد عذاب سے نجات ملے گی اور کہا جائے گا: "اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ" (جنت میں داخل ہو جاؤ! اب نہ تمہیں کوئی خوف ہوگا نہ کسی کا غم) اور اس کے مقابلہ میں ایک ایسا شخص جو کہ دنیا میں بڑا خلیق مہربان باکمال تھا لیکن دولت ایمان سے محروم تھا وہ ابدالاباد جہنم میں رہے گا اور کبھی اس کو نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

اس کو واضح طور پر یوں سمجھو کہ اگر گورنمنٹ کی رعایا میں دو شخص ارتکاب جرم کریں ایک تو چوری میں ماخوذ ہو اور دوسرا بغاوت میں تو اگرچہ سزا دونوں کو دی جائے گی لیکن چوری کی سزا محدود اور کم ہوگی۔ ایک دن ایسا ضرور ہوگا کہ وہ سزا بھگت کر پھر اپنے گھر آئے اور چین سے بسر کرے پر وہ باغی کبھی عذاب سے نجات نہ پائے گا اور زندگی بھر سزا کی تکالیف میں رہے گا یا فوراً پھانسی کا حکم ہوگا کہ زندگی ہی کا خاتمہ ہو جائے گو وہ کتنا ہی بڑا لائق فائق ہو اور وہ چور بالکل جاہل کندہ ناتراش ہو۔

کافر خوش اخلاق

صاحبو! ایمان ایک آفتاب ہے اگر ہزاروں بدلی کے ٹکڑے اس پر حائل ہوں تب بھی اس کا نور فائض ہو کر رہے گا اور جھلک جھلک کر روشنی پڑے گی اور کفر کی خوش اخلاقی آئینہ کی سی چمک ہے جو کہ بالکل عارضی ہے۔

دوسری مثال لیجئے! اگر ایک گلاب کی شاخیں کسی گملہ میں لگا دی جائیں اور اس کے مقابل کاغذ کے ویسے ہی پھول بنا کر رکھ دیئے جائیں تو اگرچہ اس وقت کاغذ کے پھولوں میں زیادہ رونق اور شادابی ہے اصل گلاب کی وہ حالت نہیں لیکن ایک چھینٹا بارش ہو جائے پھر دیکھئے کہ گلاب کیا رنگ لاتا ہے اور کاغذ کے پھول کیسے بدرنگ ہوتے ہیں۔ پس مسلمان اگرچہ دنیا میں کسی حالت میں ہو لیکن قیامت میں جب ابر رحمت برسے گا تو دیکھنا کہ اس کا اصلی رنگ کیسا کچھ نکھرتا ہے اور کافر کی زرق برق حالت پر کیا پانی پڑتا ہے۔ صاحبو! غیرت آنی چاہیے کہ مسلمان ہو کر اسلام کی حقیقت جان کر اپنے منہ سے کافر کو مسلمان پر فضیلت دو اور مسلمان کی مذمت اور کافر کی تعریف کرو۔

اشتباہ افضلیت

جب معلوم ہوا کہ ایمان ایسی بڑی چیز ہے تو اس کے ساتھ جن چیزوں کو زیادہ تلبس ہوگا وہ افضل ہوں گی لیکن تلبس بالایمان کو سمجھنا ذرا دشوار ہے کیونکہ بعض ایسے اعمال ہیں کہ وہ خود اسلام کا مبنیٰ ہیں بعض ایسے ہیں کہ وہ اسلام پر مبنی ہیں۔

تو معیار وہ اعمال ہیں جو کہ مبنی ہوں اسلام کا۔ چنانچہ آیت میں ایمان کے ساتھ اسی عمل کو ذکر کیا گیا ہے جس سے اسلام کو قوت پہنچتی ہے اور مسجد حرام کی تعمیر خود اسلام پر مبنی ہے۔ پس یہاں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسجد کی خدمت سے دین کی مدد اور اس کو قوی بنانا زیادہ افضل ہے اسی طرح اور جس قدر اعمال ہیں سب میں یہی دیکھنا چاہیے جیسے تعلیم و تعلم وعظ ارشاد یعنی اصلاح خلق پس وظیفہ وظائف سے اصلاح خلق میں زیادہ فضیلت ہوگی کیونکہ یہ مبنی ہے ایمان کی تکمیل کا مگر یہ افضلیت باعتبار مذکور کے فی نفسہ ہے ورنہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو عمل فی نفسہ افضل نہیں وہ کسی عارض کی وجہ سے زیادہ قابل توجہ ہو جائے اور کسی خاص وقت میں اس کی طرف توجہ کرنا زیادہ افضل ہو جیسے وضو کہ نماز سے افضل نہیں لیکن بعض اوقات بوجہ شریعت نماز کے زیادہ ضروری ہو جاتی ہے یا مثلاً وعظ کہنا کہ فی نفسہ تخلیہ للعبادۃ سے افضل ہے۔

بقاء نسبت

لیکن جبکہ وعظ پر مقصود بقدر ضرورت مرتب ہو چکے تو بلا ضرورت ہر وقت اس میں مشغول رہنے سے یہ بہتر ہوگا کہ کسی وقت عبادت کے لیے تخلیہ بھی اختیار کرے اور کسی وقت اپنی بھی فکر کرے اور خدا کی یاد میں لگے اور اسی کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے: "فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ" کہ ایک وقت ایسا بھی نکال لے کہ صرف خدا ہی کی یاد میں اس وقت مشغول ہوں، کوئی دوسرا کام نہ ہو۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روے — بہ ازانکہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

(ایک زمانہ فراغ دلی کے ساتھ نظر کرنا اس خوبصورت کی طرف بہتر ہے چتر شاہی سے اور تمام دن کی ہاؤ ہو سے) اور

خوشا وقتے و خرم روزگارے — کہ یارے برخورد از وصل یارے

(مبارک ہے وہ وقت اور وہ گھڑیاں جب ایک محب اپنے محبوب کے وصل سے سرفراز ہو)

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر شے کی بقاء کے لیے ایک سبب ہوتا ہے اور نسبت جس کی بدولت وعظ بھی مؤثر ہو گیا ہے اس کی بقاء کا سبب یہ ہے کہ کسی وقت صرف شغل مع اللہ رہے اور یہاں سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم ہو گئی ہو گی جو کہ مشیخت تک پہنچ کر اپنا کام بالکل چھوڑ دیتے ہیں اس سے ان کی نسبت ضعیف ہو جاتی ہے اور فیض بند ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو اعمال اسلام کا مبنیٰ ہوں وہ افضل ہوں گے۔ اس قاعدے کو محفوظ کر کے اعمال میں فیصلہ کر لینا چاہیے اور جس کو اس قدر قوت نہ ہو کہ خود فیصلہ کر سکے وہ کسی عالم سے پوچھ لے کیونکہ ہر شخص کچھ نہ عمل کرتا تو ضرور ہے اور ہر شخص کو اس کی تمیز نہیں ہو سکتی جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ بعض اوقات اعمال غیر فاضلہ بھی کسی عارض کی وجہ سے افضل ہو جاتے ہیں تو ایسے مواقع پر دریافت کر لینا چاہیے۔ البتہ اگر کوئی عمل ایسا ہو کہ اس کی ضرورت محسوس ہو اور کوئی دوسرا عمل اس وقت اس کے مقابلے میں ایسا ضروری نہ ہو تو اگر چہ یہ مفضول ہی ہو اس کو کرنا چاہیے۔ مثلاً ایک آباد مسجد گر گئی اور نمازی پریشان ہیں یا عیدگاہ گر گئی تو ایسے مواقع پر اس کا کرنا زیادہ ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن اعمال کی ضرورت متعین ہو اور وہ معلوم بھی ہو جائے وہاں تو اس کو کر لینا چاہیے۔ اگر چہ مفضول ہو اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں اپنی رائے سے ایک عمل کو دوسرے عمل پر ترجیح نہ دینا چاہیے بلکہ کسی عالم سے استفتاء کرنا چاہیے جیسے مثلاً بخاری شریف کا وقف کرنا یا کسی غریب کو کھانا کھلا دینا۔

تفاوت سیئات

اب اس کے مقابلے کے لیے یہ بھی بیان کر دینا مناسب ہے کہ جس طرح حسنات میں تفاضل ہے اسی طرح گناہوں میں بھی تفاوت ہے لیکن جس طرح حسنات میں استفتاء کرنے کی ضرورت ہے کہ کس عمل کو کیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے۔ اسی طرح سیئات میں استفتاء کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ سب کو چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ چھوٹے بڑے گناہ سب گناہ ہیں اور حرام ہیں۔ اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کیا فلاں کام بہت ہی گناہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر چھوٹا ہو تو ہم کر لیں۔ یاد رکھو! اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی ایک چنگاری کی نسبت پوچھے کہ کیا یہ چنگاری بہت بڑی ہے یا انگارا؟ تو صاحبو! جس طرح ایک بڑا انگارا مکان بھر کو پھونک دے گا اسی طرح ایک چنگاری بھی گھر بھر کو پھونک دے گی تو ایمان کے قصر کو ایک چھوٹا گناہ بھی ویسا ہی برباد کر دے گا جس طرح بہت بڑا گناہ۔ تو سب سے بچنا چاہیے۔ بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ رشوت لینا زیادہ گناہ ہے یا سود کھانا؟ میں کہتا ہوں کہ یہ کیوں نہیں پوچھا جاتا کہ پیشاب زیادہ گندہ ہوتا ہے یا پاخانہ؟ تاکہ جو کم گندہ ہو اس کو تناول فرمائیں۔ غرض یہ ہے کہ حسنات میں تو تفاضل کو دریافت کرو اور گناہ سب چھوڑ دو!

اب میں اس وعظ کا ربط سابق وعظ سے بیان کرتا ہوں کہ "عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ" (تم پر تمہاری جانوں پر) سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید دوسرے کو نفع پہنچانے کی اجازت نہیں تو آج کے بیان سے یہ شبہ جاتا رہا کیونکہ اس بیان سے اس کی فضیلت بھی ثابت ہوئی۔ پس وہ آیت نفع پہنچانے کے معارض نہیں ہے البتہ کسی کے پیچھے نہ پڑو کہہ کر ختم کردو!

مثلاً اس وقت میں نے وعظ کہا ہے یہاں تک تو مناسب ہے اب اگر میں ایک ایک کے درپے ہوں اور تحقیق کرتا پھروں کہ کس نے عمل کیا اور کس نے نہیں کیا اور پھر اس کی فکر و تدبیر میں لگوں یہ اکثر اوقات مضر ہے۔ دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے: "فَذَكِّرْ فَاِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ" (اور آپ نصیحت فرمایئے! اس لیے کہ آپ نصیحت کرنے والے ہیں) اور دوسرے موقع پر یہ بھی ارشاد ہے کہ "اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى" (اور جو شخص آپ سے بے پروائی اختیار کرتا ہے تو آپ اس کے درپے ہو جاتے ہیں) تو تذکیر تو مطلوب ہے مگر پیچھے پڑنا بیکار ہے۔ ہاں! جہاں اپنی پوری قدرت ہو وہاں ضروری ہے جیسے اپنی اولاد یا شاگرد اور کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اسی موقع پر یہ آیت بھی ذکر کرنی چاہیے تھی کیونکہ اصل مضمون تو معلوم ہو گیا گو آج معلوم ہوا۔ یہ مضمون دس بارہ دن سے میرے ذہن میں تھا' درمیان میں ذہول بھی ہو گیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج یہ بیان ہو گیا' یہ بالکل نیا مضمون ہے اس سے اپنے اعمال میں بھی تفاضل سمجھنے کا طریقہ باآسانی معلوم ہو سکتا ہے اور انتخاب بھی اس معیار سے باآسانی ممکن ہے۔ اب خدا سے دعا کیجئے! کہ وہ عمل کی توفیق دے۔

آمین یارب العالمین۔ تمام شد

حب العاجلہ

۱۸ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ کو جلسہ موتمر الانصار منعقدہ صدر میرٹھ پر ترجیح دنیا بر آخرت کی شکایت کے سلسلہ میں تقریباً تین گھنٹے تک کھڑے ہوکر بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً پانچ ہزار تھی۔ مولوی سعید احمد مرحوم نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ.

تحدیث نعمت

امابعد! مضمون مقصود کے شروع کرنے کے پیشتر دو باتیں جونہایت ضروری ہیں کہتا ہوں ان میں ایک بات تو کل گزشتہ تقریر کے بعض اجزاء کے متعلق ہے اور دوسری آج ہی کے متعلق ہے ان کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ مقصود شروع ہوگا۔ کل کی تقریر کے متعلق تو یہ کہنا ہے کہ سب صاحبوں کو جو کل کے بیان میں شریک تھے یاد ہوگا کہ میں نے یہ کہا کہ خدا کا احسان ہے کہ ہم اس جماعت میں ہیں جن کے چھوٹوں کو بھی میں اپنے سے بڑا سمجھتا ہوں۔ اس وقت ممکن ہے کہ بعض خواہ مخواہ کے معتقدین کو شبہ ہوا ہو اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی ہو مگر آج کی تقریر سے جو ابھی آپ لوگوں نے سنی میرے گزشتہ دعوے کی بدیہی دلیل آپ نے دیکھی ہوگی۔ یہ صاحب جنہوں نے تقریر پڑھی ہے اس جماعت میں سب سے چھوٹے ہیں مگر مجھ سے بڑے ہیں ان کی مدح نہیں کرتا محض تحدث بالنعمۃ کے طور پر بیان کرتا ہوں اور اس پر میں اس لیے مجبور ہوا ہوں کہ یہ قاعدہ ہے کہ جس شخص کے دل میں اسلام ہوگا اس کے دل میں اہل اسلام کے ساتھ دردا اور ان پر شفقت بھی ہوگی جو کہ اسلام کے آثار سے ہے۔ اسی قاعدہ کے مطابق چونکہ بحمد للہ مجھے بھی خدا تعالیٰ نے دولت اسلام سے مشرف فرمایا ہے اس لیے اس کے آثار مذکورہ ہمدردی و شفقت بھی عطا فرمائے اس لیے میں براہ شفقت سوچا کرتا تھا کہ یہ کام جو خدا تعالیٰ نے مجھ سے لیا ہے میرے بعد اس کی کیا حالت ہوگی اور کون شخص اس کو سنبھال سکے گا اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی تعریف کرتا ہوں یا اس کام کے

کرنے میں اپنا کوئی کمال یا اپنے کسی احسان کا اظہار کرتا ہوں بلکہ یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ چاہے چھوٹے سے بڑا کام لے لے اور اس میں خدا تعالیٰ ہی کا احسان ہے پس اگر ہم کو کسی کام کی توفیق ہوگئی ہے تو اس میں ہمارا کیا احسان ہے۔ خدا تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے توفیق دی۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمیں کنی ۔۔۔ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

(تو بادشاہ پر اس بات کا احسان مت رکھ کہ تو اس کی خدمت کر رہا ہے بلکہ احسان مان کہ اس نے تجھ کو اپنی خدمت کے لیے رکھ لیا)

تو میں نہ تواضعاً کہتا ہوں نہ تکبراً اور اگر یہ تکبر ہے تو پہلی تواضع سے اس کو برابر کر لیا جائے تو ان خدمتوں کو دیکھ کر جن کی خدا تعالیٰ نے مجھے توفیق دی اس بناء پر کہ جب علت میں کمی ہوتی ہے تو معلول میں بھی کمی ہوتی ہے یہ سوچا کرتا تھا کہ میرے بعد ان کاموں کا کیا انتظام ہوگا اور اس بناء پر میں ہمیشہ موت سے ڈرا کرتا تھا کیونکہ یہ خیال ہوتا تھا کہ جب میں نہ ہوں گا تو بعضے کام یوں ہی رہ جائیں گے اور سبب اس خیال کا وہی تھا کہ ان خاص خدمتوں کا بظاہر کوئی ذریعہ نظر نہ تھا۔ گو بڑے کام کے لیے بڑے حضرات موجود ہیں مگر یہ چھوٹے کام کون کرے گا۔ اگر چہ یہ اعتقاد بھی تھا کہ خدا تعالیٰ اپنا کام لینے کے لیے کوئی سبیل ضرور کر دیتے ہیں مگر پھر بھی سوچ طبعی تھی مگر اب بحمد للہ یہ سب خلجان رفع ہو گئے کیونکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ بہت سے نوجوان کام کر رہے ہیں جن سے امید ہے کہ وہ کام کو نباہ لیں گے۔ لہٰذا ہم اگر آج چلے جائیں تو کیا اور کل چلے جائیں تو کیا (جو صاحب اس وعظ کو مطالعہ فرمائیں ان سے جامع وعظ کا ملتجیانہ التماس ہے کہ وہ صدق دل سے جناب باری سے دعا کریں کہ خدا تعالیٰ حضرت مولانا دامت برکاتہم کو تا دیر بایں فیوض و برکات قائم رکھے اور تشنگان زلال شریعت کو اس سرچشمہ سے سیراب فرماتا رہے۔ آمین) انہی نوجوانوں میں ایک مولوی محمد مرتضیٰ حسن صاحب بھی ہیں۔ مولوی صاحب موصوف اگرچہ صورت سے بڈھے معلوم ہوتے ہیں لیکن طبیعت اور عمر کے اعتبار سے ابھی بالکل نوجوان ہیں بلکہ اگر بے ادبی نہ ہوتی تو کہتا کہ مولوی صاحب میری گود کے کھلائے ہوئے ہیں اور ابھی تو آپ نے دو ہی دیکھے ہیں ایسے بحمد اللہ بہت سے ہیں آپ سب صاحب دعا کریں کہ خدا تعالیٰ ان کی عمروں میں برکت دیں اور ان سے اپنے دین کی خدمت علی الوجہ الاتم لیں اور ان کی طبیعتوں میں استقلال اور پابندی پیدا کریں۔ ان مولوی صاحب میں (مولوی شبیر احمد صاحب کی طرف اشارہ فرما کر) ابھی اتنی کمی ہے کہ یہ پابند نہیں۔ دعا کیجئے! کہ خدا تعالیٰ ان کو پابندی عطا فرمائیں۔ (سب لوگ دست بدعا

ہوئے) اور اس کے ذکر کرنے کی مجھے ضرورت نہ تھی لیکن صرف اس خیال سے کہ شاید مجمع کے سامنے اس کو سن کر آئندہ مولوی صاحب پابندی کا خیال فرمائیں۔ میں نے ظاہر کر دیا باقی کام جیسا کچھ یہ کر سکتے ہیں وہ آپ نے دیکھ ہی لیا۔ دوسرا مختصر مضمون جو آج کے متعلق کہنا ہے وہ یہ ہے کہ جو وقت میرے لیے وعظ کا مقرر کیا گیا تھا اس میں سے کچھ حصہ گزر گیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ بہت اچھی حالت میں گزرا اب اگر میں پورا وقت لیتا ہوں تو بہت زیادہ دیر ہوگی اس لیے وقت کم لوں گا اور اپنی تقریر کو انتہائے جلسہ کے معین وقت ہی پر ختم کر دوں گا اور اس کمی کا ایک سبب بھی ہے اور وہ یہ کہ گزشتہ مضمون کے بعد اب میرے بیان کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں رہی اور شاید اس مضمون کی عظمت کے سامنے میں چل بھی نہ سکوں (حضرت مولانا نے یہاں تک فرمایا تھا کہ چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئیں' آپ جتنی دیر چاہیں بیان فرمائیں ہم لوگوں کو دیر ہونے کی ذرا پرواہ نہیں' آپ ہماری تکلیف کا ذرا خیال نہ کریں۔ للہ درمن قال (اللہ تعالیٰ اس کا بھلا کریں جس نے یہ بات کہی) ع قبول خاطر ولطف سخن خدا داد است) اب میں شروع کرتا ہوں اور اس طریقہ قدیم کے موافق خطبہ پڑھتا ہوں۔

خطبہ معمولہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ. قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی کَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ وَتَذَرُوۡنَ الۡاٰخِرَۃَ ۝ (القیمۃ: آیت نمبر ۲۰، ۲۱)

''اے منکرو! ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو ترک کیے دیتے ہو۔''

تمہید

جس مضمون کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ ایک نہایت ضروری مضمون ہے اور تتمہ ہے مولوی شبیر احمد صاحب کے مضمون کا۔ مشہور تو یوں ہے کہ اگر پدر نتواند پسر تمام کند (اگر باپ کسی کام کو پورا نہ کر سکے تو بیٹا پورا کرے گا) مگر اس وقت اس کا عکس پڑھ لیجئے۔ اگر پسر نتواند پدر تمام کند (اگر بیٹا کسی کام کو پورا نہ کر سکے تو باپ پورا کرے گا) مگر یہ میں نے از راہ بے تکلفی ان کی کم عمری کے اعتبار سے کہہ دیا ہے امید ہے کہ مولوی صاحب برا نہ مانیں گے کیونکہ واقع میں ان کو میں اپنے سے بڑا سمجھتا ہوں۔ غرض اس وقت میں جو کچھ بیان کروں گا وہ مولوی صاحب کے مضمون کا تتمہ ہوگا اور مولوی صاحب کا مضمون اگرچہ بالکل کافی تھا لیکن اس کے بعض اجزاء کی توضیح کی ضرورت ہے۔ میرا قصد پہلے سے بھی اس مضمون کو بیان کرنے کا تھا مگر اتفاق سے مولوی صاحب کے لیے بھی یہی مضمون تجویز کیا گیا مگر مولوی صاحب نے صرف اعتقادی حالت کو آخرت کے متعلق

زیادہ بیان کیا ہے چونکہ اس کے متعلق ایک دوسرا پہلو عمل کا بھی ہے اس لیے میں اس کو بیان کیے دیتا ہوں کہ دونوں بیانوں کا مجموعہ آخرت کے دونوں ضروری پہلوؤں کو حاوی ہو جائے۔

علم و عمل

ارشاد ہوتا ہے کہ اے لوگو! تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ ان دنیاداروں کی شکایت فرما رہے ہیں جو کہ آخرت کو چھوڑ کر دنیا کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ دنیا سے محبت کرنا اور آخرت کو چھوڑنا یہ دونوں باتیں عمل ہیں علم نہیں اور عمل کے بیان کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ ہر علم کے لیے عمل غایہ ہے اگرچہ ظاہر نظر میں بعض علم خود بھی مقصود و معلوم ہوتے ہیں مگر نظر غائر سے ان علوم کا ثمرہ بھی کوئی عمل ہے۔ چنانچہ آگے عنقریب معلوم ہوگا اور اس مسئلے کی بابت کہ ہر علم کے ساتھ عمل بھی ہے۔ علمائے شریعت کا قول تو سب کو معلوم ہے کہ وہ احکام میں ایک درجہ اعتقاد اور ایک درجہ عمل نکالتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ عقلاء حکماء اطباء وغیرہ ہر فرقہ اسی حکم پر ہے اور ہر جماعت ہر فن میں دو جز وضروری مانتی ہے ایک علم اور دوسرا عمل اور اپنے اپنے درجہ میں دونوں مطلوب سمجھے جاتے ہیں اور علوم تو بعض بظاہر ایسے بھی ہیں جن کو عمل سے کوئی تعلق نہیں یعنی ان علوم کا اثر مرتب ہونے میں کسی عمل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ محض علم ہی سے اس کا اثر اس پر مرتب ہو جاتا ہے۔ گو نظر غائر سے ان علوم سے بھی بعض اعمال کسی درجے میں مقصود ہیں لیکن عمل کوئی ظاہر میں بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ علم سے مستغنی ہو۔ مثلاً علم توحید ایک ایسا علم ہے کہ اگر کسی قسم کا عمل نہ کیا جائے تب بھی اس کا ثمرہ یعنی نجات اگرچہ بدیر ہی اس پر مرتب ہوگا اور اس کو کسی عمل کی ضرورت نہ ہوگی لیکن کسی عمل مثل نماز روزہ کی بابت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بغیر اعتقاد کے اس عمل کا اثر اس پر مرتب ہو جائے گا تو دونوں کے تعلق میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم تو کسی درجے میں عمل سے مستغنی ہے لیکن عمل علم سے اصلاً مستغنی نہیں۔

علم و معرفت

اور یہی راز ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عبادت کا مقابلہ کوئی عبادت نہیں کر سکتی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں علم اور معرفت درجہ کمال پر تھا اس کی تائید میں مرشدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کا ایک ارشاد نقل کرتا ہوں۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ عارف کی دو رکعتیں غیر عارف کی ہزار رکعتوں سے بھی زیادہ درجہ رکھتی ہیں۔ وجہ فرق کی یہ ہی ہے کہ عارف کو جو علم و معرفت حاصل ہے غیر عارف کو حاصل نہیں اور کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ حاجی

صاحب رحمۃ اللہ نے مبالغۃً ایسا فرمادیا ہوگا ہرگز نہیں۔ صاحبو! یہ بالکل واقع کے مطابق اور اس سے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ کا عمیق علم معلوم ہوتا ہے اور یہ ہی وہ علوم ہیں جن کی وجہ سے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے متبحر یوں فرماتے تھے کہ مجھے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو کچھ اعتقاد ہوا ہے وہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علم کی بدولت ہوا ہے تو اس میں اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ذرا مبالغہ نہیں فرمایا۔ خود حدیث شریف میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ اگر ایک صحابی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ایک مد یا نصف مد صدقہ دیں اور غیر صحابی جبل احد کے برابر صدقہ دیں تو غیر صحابی کا یہ صدقہ صحابی کے نصف مد کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اب ذرا مدینہ منورہ جا کر دیکھئے! کہ نصف مد غلہ کس قیمت کا ہوتا ہے اور اس قیمت کا کس قدر چاندی یا سونا آتا ہے اور وہ سونا جبل احد سے کیا نسبت رکھتا ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ بلاتوسط قیمت کے اگر خود نصف مد غلہ کا طول وعرض بھی لیجئے اور اس مقدار کو جبل احد کے مقابلہ میں دیکھئے کہ کیا نسبت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو جبل احد سے کوئی نسبت بھی نہیں تو اس کا مقتضا یہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ اس کو کروڑوں حصے سے زیادہ فرماتے۔ بہرحال مقصود واضح ہوگیا تو وجہ اس تضاعف کی یہ ہی علم اور معرفت ہے اور یہاں شاید کسی شخص کو یہ شبہ ہو کہ مولوی بھی عجیب چیز ہوتے ہیں ایک ہی چیز سے جو کام چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔ اس حدیث شریف سے اس وقت علم کی فضیلت ثابت کردی گئی اور اکثر اس سے صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے کہ صحبت سے ایسا خلوص میسر ہوا تھا کہ عمل میں یہ برکت ہوگئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں، ایک کا حصول دوسرے کا حصول ہے مقصود ہر طرح حاصل ہے اس تلازم وتجاذب کی وہ حالت ہے کہ:

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بہ کف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(اگر میری قسمت ساتھ دے تو میں اس کا دامن اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑلوں، پھر اگر وہ اپنی طرف کھینچ لے تب بھی میں خوش ہوں اگر میں اس کو اپنی طرف کھینچ لوں تو یہ بھی میرے لیے عزت کی بات ہے)

عباراتنا شتی و حسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر

(ہمارے مضمون تو الگ الگ ہیں مگر سب کا مقصد ایک ہی ہے اور ہمارے سب مضامین ان کے جمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں)

خواہ اس طرح کہہ دیجئے یا اس طرح۔ اگر خلوص صحبت کی برکت سے ہے تو علم خلوص کی برکت سے بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات میں علم کا مرتبہ صحبت وغیرہ سب سے مقدم ہے کیونکہ صحبت بھی علم ہی کی بدولت نصیب ہوئی۔ پس علم مستلزم ہوا صحبت کو اور صحبت مستلزم خلوص کو۔ پھر اس خلوص سے اور علم اور معرفت میں ترقی ہوئی۔

علم و صحبت

تفصیل اس کی کہ علم سے صحبت ہوئی یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام فرمائی تو تمام عرب بلکہ تمام انس و جن مخاطب تھے تو اس کی کیا وجہ کہ ان سب میں صرف انہی حضرات کی سمجھ میں آیا' دوسرے مخاطبین مثلاً ابوجہل' ابولہب کیوں نہیں سمجھ سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے پاس خدا تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ایسی دولت موجود تھی جو کہ ابوجہل کے پاس نہ تھی۔ اگرچہ ظلمات کفر میں اس کی چمک دمک چھپی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی اقرار رسالت کیا۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا ہے: "فَلَمَّا تَبَيَّنْتُ وَجْهَهٗ عَلِمْتُ اَنَّهٗ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ" کہ میں نے آپ کو دیکھتے ہی یہ معلوم کر لیا کہ یہ چہرہ جھوٹے کا نہیں ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب　　　گر دلیلت باید ازوے رومتاب

(دھوپ ہی سورج کے ہونے کی کافی دلیل ہے اگر دلیل ہی چاہتا ہے تو اس کی طرف سے منہ کو مت پلٹا اور نہ ہٹا)

مولانا رومیؒ کا یہ آئندہ شعر عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کا گویا پورا ترجمہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

نور حق ظاہر بود اندر ولی　　　نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(اللہ تعالیٰ کا نور اللہ کے ولی کے اندر خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو اچھی طرح دیکھ لے)

گفتگو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت ہے اس لیے بجائے ولی کے نبی بدل دینا چاہیے اور اسی کا ترجمہ مولوی ابوالحسن صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ کا شعر ہے:

مرد حقانی کی پیشانی کا نور　　　کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ

"ان کی عبادتوں کا نور ان کے چہرہ پر ظاہر ہو جاتا ہے۔"

تو ضرور یہ کوئی بات تھی جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں تھی، دوسروں کو نصیب نہیں اور صاحبو! وہ بات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے علوم اور ان کے معارف ہیں اور یہ اس وقت کے علوم ہیں کہ جب تک دولت ایمان بھی ان حضرات کے پاس نہ تھی، صرف اس کے حاصل ہونے کا احتمال تھا جس کے ساتھ ہی جانب مخالف کا احتمال بھی موجود تھا۔ گویا فیضان کا ایک ذرہ تھا کہ جس نے ہلا کر رکھ دیا تھا اسی کو فرماتے ہیں:

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　　صاف گر باشند ائم چوں کند

(مٹی ملی ہوئی ایک گھونٹ یعنی عشق مجازی جب مجنوں بنا سکتی ہے تو اگر صاف ہو یعنی عشق حقیقی ہو تو معلوم نہیں کیا سے کیا بنا دے)

جب اس پر علم کی یہ حالت تھی تو اسلام کے بعد اور فیض صحبت حاصل کر کے کیا حالت ہوئی ہوگی۔

فیضان معارف

شاید کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ اس مجموعی تقریر سے صحابہ کرام کی معارف وعلوم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے لیکن دوسروں کے علوم و معارف کی فضیلت کیسے ثابت ہوگئی کہ کسی ولی کی بھی یہ حالت ہو جائے کہ اس کی دو رکعت دوسرے کی ہزار رکعت سے بڑھ کر ہو سکیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولیاء کے معارف وعلوم انہی حضرات سے حاصل ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ برابر چلا جاتا ہے تو صحابہ کرام ہی کا فیض دوسرے اولیاء کو بھی پہنچا ہے اس کی توضیح کے لیے میں ایک محسوس مثال اختیار کرتا ہوں۔ ریل کو چلتے ہوئے سب ہی دیکھتے ہیں اب میں اس کے متعلق دریافت کرتا ہوں کہ ریل میں جس قدر گاڑیاں لگی ہوتی ہیں ان کے چلنے کی تدبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تدبیر اس کی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انجن میں آگ اور پانی سے اسٹیم تیار کی جائے اور گاڑیوں کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے۔ جب انجن کو حرکت ہوگی گاڑیاں خود بخود متحرک ہوں گی اس مثال میں متحرک بالذات صرف انجن ہے گاڑیاں محض وابستگی کی وجہ سے کھینچی چلی جارہی ہیں نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ انجن ہر ہر گاڑی کے ساتھ نہیں بلکہ انجن کے ساتھ صرف ایک گاڑی بلاواسطہ وابستہ اور دوسری گاڑیاں بوسائط اس سے وابستہ ہیں تو جب انجن کے ساتھ محض ظاہری وابستگی کی وجہ سے ساری گاڑیاں متحرک ہوگئی ہیں تو کیا حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متوسلین اور وابستگان میں حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے فیوض نہ آئیں گے اور ان میں حرکت پیدا نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی۔

سہل وصول

اور اسی تقریر سے یہ بھی ثابت ہوگا کہ اگر کسی کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنا مقصود ہو تو اس کو چاہیے کہ اپنی زنجیر ان انجنوں سے ملا دے جب ان کو حرکت ہوگی یہ بھی متحرک ہوگا اور پہنچ جائے گا۔ خوب کہا ہے:

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد　　　دست بر پائی کبوتر زود ناگاہ رسید

(ایک چیونٹی کو شوق ہوا کہ کعبۃ اللہ میں پہنچے اس نے کبوتر کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیا اور بہت جلد کعبۃ اللہ پہنچ گئی)

یعنی ایک چیونٹی کو اشتیاق ہوا کہ کسی طرح کعبۃ اللہ پہنچوں' لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ کعبہ تو بہت دور ہے اور بہت سی دقتوں کے بعد مدت میں وہاں پہنچنا ہوتا ہے۔ غریب مشتاق چیونٹی نے جب ان موانع کو سنا اور اپنے کمزور جثہ کو دیکھا نیز دھوپ کی تیزی' ہوا کی سختی' زمین کی تپش کی طرف نظر کی تو بہت مایوسی ہوئی۔ اسی حالت میں ناگاہ ایک رہبر پر اس کی نظر پڑی جس کے چہرے سے گویا آثار رہبری مترشح تھے جس کی صورت دیکھ کر پژمردہ دل کو تسلی ہوگئی جس کی یہ حالت تھی کہ:

اے لقاء تو جواب ہر سوال　　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(اے وہ ذات کہ تیری ملاقات ہی سے سب سوالوں کا جواب خود بخود حاصل ہوگیا' مشکل سے مشکل باتیں تجھ سے پوچھے بغیر ہی حل ہوگئی ہیں)

اس رہبر نے کہا کہ اطمینان رکھو میں تمہیں ایک سہل طریقہ منزل مقصود پر پہنچنے کا بتاتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ خود رائی اور تکبر کو آگ لگا دینی پڑے گی ورنہ اگر اس کو نہ چھوڑا تو پھر کوئی طریقہ نہیں۔ مشتاق چیونٹی نے تکبر کے چھوڑ دینے کا وعدہ کیا آخر تھوڑی دیر میں حرم شریف کے ایک کبوتر پر نظر پڑی' رہبر نے اسے دیکھ کر پہچانا اور چیونٹی سے کہا کہ مبارک ہو اب مقصود حاصل ہونے کا وقت قریب آیا۔ دیکھو! یہ کبوتر حرم شریف کا ہے اگر اس کی قدم بوسی ناگوار نہیں اور اس کو ذلت نہیں سمجھتی ہو تو بے تامل اس کے پیروں کو لپٹ جاؤ اس کو تو خبر بھی نہ ہوگی اور تم اس کی ایک پرواز میں کعبہ میں ہوگی۔ چنانچہ چیونٹی نے ایسا ہی کیا اور پہنچ گئی۔ ع دست در پائے کبوتر زود ناگاہ رسید۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ وابستگی کے ساتھ استنکاف کا نہ ہونا بھی ضروری ہے ورنہ اگر استنکاف باقی رہے گا تو مقصود سے ادھر ہی رہ جاؤ گے۔ صاحبو! یہ مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن نہایت توجہ سے سننے کے قابل ہے۔

سنگ راہ

ہمارے مسلمان بھائیوں میں اس وقت ایک بڑی کوتاہی یہ ہو رہی ہے کہ ان کو متحرکین سے اعتکاف اور استکبار ہے ایسے لوگوں کو نظر حقارت سے دیکھا جاتا ہے اور وجہ صرف یہ کہ ان کی آمدنی بہت کم ہے سامان آسائش ان کے پاس نہیں بہت سے خدم حشم نہیں رکھتے لباس بہت قیمتی نہیں پہنتے۔ جب اپنے لباس سے انکے لباس کا موازنہ کرتے ہیں تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے کیونکہ اہل دنیا کا لباس تن ذوسواڑھائی سوکا ہے اور وہاں لنگ کے زیر ولنگ کے بالا نے غم وزد نے غم کالا۔ نشست کی جگہ دیکھتے ہیں تو اپنے ہاں سینکڑوں روپیہ کے قیمتی فرش پاتے ہیں وہاں چار پیسے کی ایک چٹائی وہ بھی خستہ شکستہ میلی کچیلی اس لیے سمجھتے ہیں کہ جب ہمارے پاس سامان زیادہ ہے تو ہم بڑے ہیں۔ مگر صاحبو! یاد رکھو کہ اسی بڑے سمجھنے کی بدولت عزازیل برباد ہوا جس کے برباد اور خراب ہونے سے آج تم خراب ہو رہے ہو اس نے بھی یہی کیا تھا کہ اپنا ظاہری اعزاز یعنی ناری ہونا اور حضرت آدم علیہ السلام کی ظاہری حقارت یعنی خاکی ہونا دیکھ کر اپنے کو بڑا اور ان کو چھوٹا سمجھا اور ارشاد خداوندی سے معترضانہ انکار کر دیا۔ "اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ" آج بھی یہ مرض عام ہو رہا ہے۔ صاحبو! میں براہ شفقت کہتا ہوں کہ یہ سامان ظاہری تمہارے لیے رہزن ہو رہا ہے ظاہری حالت پر مدار نہ رکھو حقیقت میں بنو یاد رکھو کہ:

گر بصورت آدمی انساں بدے احمد و بوجہل ہم یکساں بدے

اینکہ می بینی خلاف آدم اند نیستند آدم غلاف آدم اند

(اگر ہر آدمی کی صورت والا انسان ہوا کرتا تو حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل دونوں یکساں ہوتے کیونکہ دونوں قریشی تھے اور مکہ مکرمہ کے رہنے والے تھے ہرگز ایسا نہیں ہے یہ جو کچھ تو دیکھ رہا ہے آدمیت کے خلاف ہیں بلکہ یوں سمجھ کہ آدمی نہیں ہیں آدمی کے اوپر کا غلاف ہیں)

لہٰذا صورت کو یا لباس کو چھوڑ دینا چاہیے اور اس کو معیار نہ بنانا چاہیے۔

ظاہر بینی

بعض لوگ اپنے دنیاوی سامان کو معیار بناتے ہیں اور چونکہ اہل اللہ کو ان سے علیحدہ پاتے ہیں اس لیے ان کو حقیر سمجھتے ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ:

نباشد اہل باطن در پئے آرائش ظاہر بہ نقاش احتیاج نیست دیوار گلستانرا

(جو اہل دل ہوتے ہیں وہ اپنے ظاہر کے سنوارنے کی فکر میں نہیں رہتے' باغ کی چہار دیواری کو نقش و نگار بنانے والے کی ضرورت نہیں)

ان حضرت کو ادھر توجہ بھی نہیں ہوتی' میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر شریعت کا حکم نہ ہوتا تو یہ حضرات پاجامہ بھی نہ پہنچتے ان کے لیے اتنا تعلق بھی بار ہے ان کی مذاق کی وہ حالت ہے جیسا کہ ذوق کہتا ہے:

عریاں ہی دفن کرنا زیر زمیں مجھے
اک دوستوں نے اور لگادی کفن کی شاخ

اور زینت اور لباس تو کیا چیز ہے ان حضرات کی نظروں میں سلطنت کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہوتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل سلطنت کی اطاعت بھی یہ لوگ نہیں کرتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے لیے اس کی تمنا نہیں ہوتی۔

پائجامہ کا عذاب

ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ وہ صرف ایک تہبند باندھے رہتے تھے اور کوئی کپڑا نہ پہنتے تھے ان کے بھائی بادشاہ وقت تھے ایک روز انہوں نے ان بزرگ سے کہا کہ اگر آپ پاجامہ پہن لیتے تو اچھا تھا' آپ کے اس حال میں رہنے سے میری بھی سبکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں پاجامہ پہنوں گا تو اس کے لیے کرتہ بھی ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا کرتہ بھی حاضر ہے' وہ بولے تو پھر ٹوپی جوتا بھی ہو' بادشاہ نے کہا وہ بھی کیا مشکل ہے۔ انہوں نے کہا تو پھر سواری کے لیے گھوڑا بھی ہو اور پھر کہا کہ سائیس بھی ہو اور اصطبل بھی ہو اور ان سب مصارف کے لیے گاؤں بھی ہو پھر اس شان کے موافق فلاں فلاں سامان بھی پھر اس کے لیے ایک گاؤں کافی نہ ہوگا' بہت سے دیہات ہوں حتیٰ کہ پھر سلطنت بھی ہو۔ بادشاہ ساری باتوں کو منظور کرتا گیا تو آپ فرماتے ہیں کہ یہ سارا جھگڑا ایک پاجامہ پہننے کی بدولت اکٹھا ہوا مجھے پاجامہ ہی پہننے کی کیا ضرورت کہ ان مصیبتوں میں پھنسوں۔ غرض ان حضرات کے نزدیک اس تمام ساز و سامان کی کچھ بھی وقعت نہیں ہے۔

سلطنت کی قیمت

ایک اور بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے ایک بادشاہ سے پوچھا کہ اگر تم کسی وقت شکار میں جاؤ اور اپنے ساتھیوں سے جدا ہو جاؤ اور پیاس کی شدت سے تمہارا برا حال ہو جائے

اس وقت ایک شخص تمہارے پاس پانی لے کر آئے اور کہے کہ اگر مجھ کو نصف سلطنت بخش دو تو میں تم کو یہ پیالہ پانی کا دوں تو اس وقت تم کیا کرو، بادشاہ نے کہا میں نصف سلطنت دے کر پیالہ خرید لوں اس کے بعد ان بزرگ نے کہا کہ اگر اتفاق سے تم کو بند پڑ جائے اور کسی طرح پیشاب نہ اترتا ہو تمام اطباء عاجز ہو جاتے ہیں اور اس وقت ایک شخص اس شرط پر پیشاب کرا دینے کا وعدہ کرے کہ باقی نصف سلطنت اس کو دے دو تو تم کیا کرو۔ بادشاہ نے کہا کہ میں بقیہ نصف سلطنت بھی دے دوں۔ فرمایا کہ اب تو تم کو اپنی سلطنت کی حقیقت اور اس کی قیمت معلوم ہو گئی ہو گی کہ صرف ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ پیشاب اس کی قیمت ہے۔ صاحبو! آج کل جو کچھ ترقی کی پکار ہو رہی ہے اور دلوں میں ترقی کی محبت ہے صرف اسی وجہ سے کہ آپ لوگوں نے ایک ہی چیز کو دیکھا اور پہچانا ہے اگر دوسری طرف بھی کچھ نظر ہوتی تو یقیناً آپ بھی وہی کہتے جو ہم کہتے ہیں کہ:

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند   فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

(جس شخص نے تجھ کو جان لیا وہ اپنی جان کو کیا کرے گا اور بیوی بچوں اور خاندان والوں کے خیال میں کس طرح رہے گا)

اہل دنیا اور ان کے شغفات کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے آپ نے بچوں کو دیکھا ہو گا کہ بہت سی بالو جمع کر کے پیروں پر اس کو جماتے ہیں اور گھروندہ تیار کرتے ہیں اور جب ان کے بزرگ اس لغو حرکت سے روکتے ہیں تو لڑکے اپنے دل میں بہت خفا ہوتے ہیں اور اپنے بزرگوں بڑوں کو اپنا دشمن اور مخالف سمجھتے ہیں اور اپنے کھیل پر اصرار کرتے ہیں۔ عقلاء ان کی اس حرکت کو دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں تو بچوں کی خفگی اور اپنے کھیل پر اصرار کرنے کی وجہ یہی ہے کہ ان کی نظر ابھی تک اسی گھروندے کی چند وہمی خوبیوں پر ہے ابھی تک عالی شان قصر اور پختہ محل ان کی نظروں میں نہیں آئے اور ان کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور اسی وجہ سے اپنے گھروندے کا ہیچ ہونا ہنوز ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جس دن اپنے گھروندے کی حقیقت اپنے ذہن میں آ جائے گی اس دن وہ بھی اپنے بزرگوں کے ہم آہنگ ہوں گے۔ اسی طرح عقلاء امت آپ کو ان عالیشان کوٹھیوں اور محلات میں پھنسا ہوا دیکھ کر دار آخرت کی ترغیب دیتے ہیں اور اس شغف پر ہنستے ہیں لیکن آپ اپنی حقیقت ناشناسی کی وجہ سے ان پر خفا ہوتے اور ان سے استنکاف کرتے ہیں ورنہ اگر آپ کو حقیقت کا علم ہوتا تو اپنی اس حالت پر افسوس کرتے اور یوں کہنے لگتے کہ:

ولاتا کے درین کاخ مجازی　　کنی مانند طفلاں خاک بازی
توئی آں دست پرور مرغ گستاخ　　کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا زاں آشیا بے گانہ گشتی　　چودوناں چغد ایں ویرانہ گشتی

(اے دل تو کب تک بچوں کی طرح اس مجازی گھر کے کھیل میں لگا رہے گا جو مٹی کے گھر بنا بنا کر کھیلا کرتے ہیں۔ اے نافرمان پرندے تو اسی کے ہاتھوں کا تو پالا ہوا ہے' اس دنیا کے محلوں سے تو علیحدہ تیرا گھر ہے تو اپنے اصلی گھر سے کیوں غافل اور بے پروا ہو گیا ہے اور کمینہ ذلیل جانور چکور کی طرح ویرانی جگہوں میں پھر رہا ہے)

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ بے گھر ہو جاؤ اور جو کچھ ہے برباد کر دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ محبت چھوڑ دو اور دل سے بے تعلق ہو جاؤ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ چونکہ ان لوگوں کے پاس کوئی چیز ہی نہیں اس لیے ان کو محبت اور تعلق بھی نہیں۔ عصمت بی بی از بے چادری کی حالت ہے تو میں کہوں گا جس کا جی چاہے جائیداد پیش کر کے بھی دیکھ لے۔ صاحبو! جائیداد کیا چیز ہے سلطنت تک کو لات ماردی ہے۔ سنجر شاہ نیم روز نے حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس التجا بھیجی کہ آپ کی خدمت میں کچھ حصہ سلطنت کا پیش کرنا چاہتا ہوں' قبول فرمایئے' آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد　　دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب　　من ملک نیمروز بیک نمے خرم

(جیسے کہ ملک نیمروز کے بادشاہ سنجر کا تاج سیاہ ہے اسی طرح میرا نصیبہ بھی سیاہ ہو جائے اگر خدانخواستہ میرے دل میں اس بادشاہ کے ملک کی خواہش پیدا ہو جائے جب سے مجھے آدھی رات کی لذت حاصل ہو گئی اور اس ملک کی خبر لگی ہے میں تو اس بادشاہ کے ملک نیمروز کو ایک جو کے بدلے بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوں)

یعنی اگر تمہارے پاس ملک نیم روز ہے تو میرے پاس ملک نیم شب موجود ہے اس میں یہ لطیفہ بھی ہے کہ بادشاہ کے ملک کا نام ملک نیمروز تھا۔ ایک اور عارف کہتے ہیں:

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے　　بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

(دل کے سکون واطمینان کے ساتھ اس چاند جیسے چہرے والے کی طرف تھوڑی دیر کے لیے دیکھتے رہنا ہی بادشاہ کے تاج اور تمام شان وشوکت سے بہتر ہے)

پستی و شکستگی

تو ان حضرات کی ظاہری شکستگی کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اس سامان کی مطلق قدر نہیں ہے نیز یہ بھی وجہ ہے کہ خود آقائے کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حالت پسند ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی ہے کہ "اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ"[1] یعنی میں ان سے قریب ہوں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔ مولانا رومی ارشاد فرماتے ہیں:

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ — جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(اپنے دل و دماغ سے زیادہ کام لینا یہ راستہ کا پالینا نہیں ہے عاجز اور ٹوٹے ہوئے دل کے سوا فضل الٰہی حاصل نہیں ہوتا)

کیوں؟ اس لیے کہ

ہر کجا پستی ست آب آں جارود — ہر کجا مشکل جواب آں جارود

(جس جگہ پستی (نیچا حصہ ہے) پانی اسی طرف کو بہتا ہے جہاں انسان کی سمجھ سے زیادہ مشکل سوال پیدا ہوتا ہے جواب اسی کو سمجھا جاتا ہے)

ہر کجا دردے دواں آں جارود — ہر کجا رنجے شفا آں جارود

(جہاں تکلیف اور بیماری ہوئی دوا وہیں کی جائے گی اور جہاں زخم لگا ہو شفا اسی طرف متوجہ ہوگی)

تو چونکہ یہ شکستگی ہی خدا تعالیٰ کو پسندیدہ ہے اس لیے ان حضرات کو بھی یہی پسند ہے۔ صاحبو! کیا سنا نہیں پیا جس کو چاہیں وہی سہاگن ہو۔ دیکھئے! اگر کسی بازاری عورت سے عشق ہو جائے اور وہ حکم کرے کہ سربازار لنگوٹا باندھ کر پھرو تو یقیناً عشق و محبت ایسا ہی کرنے پر مجبور کرے گی اور اگر ایسا نہ کیا تو عشق کامل نہ سمجھا جائے گا۔ اللہ اکبر جب ایک بازاری عورت کی محبت میں یہ حالت ہو جاتی ہے تو عشق خدا میں کیا کچھ حالت ہونی چاہیے اور بڑا مقام غیرت ان لوگوں کے لیے ہے جن کو اس کی حس نہ ہو خوب کہا ہے:

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود — گوئے گشتن بہراو اولیٰ بود

(کیا حق تعالیٰ کا عشق لیلیٰ سے کم ہے؟ نہیں بلکہ اس کے لیے گلی گلی اور کونہ کونہ پھرنا تو اور ہی بہتر ہے)

غرض ان حضرات کی شکستگی کو موجب حقارت نہ سمجھو اور استنکاف کو چھوڑ کر ان کا اتباع کرو اور اپنے میں طلب کی شان پیدا کرو جب یہ پیدا ہو جائے گی استنکاف خود بخود جاتا رہے گا۔ میں

---

[1] (الاسرار المرفوعۃ لعلی القاری: ۷۱۱، کشف الخفاء للعجلونی ۱: ۲۳۴)

اس کی ایک زندہ نظیر دیتا ہوں۔ آپ نے اکثر ایسے رئیس دیکھے ہوں گے جن کو کیمیا کی تلاش رہتی ہے اور اس تلاش میں جو شخص بھی کیمیا دانی کا مدعی ان کو ملتا ہے اس کو کیمیا گر سمجھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض مرتبہ اگر ذرا پختگی سے ان کے کیمیا گر ہونے کا یقین ہو جائے تو اپنا ننگ و نام مال و جائیداد سب ان کے پیچھے گنوا دیتے ہیں اور اگر کوئی ان کو کچھ کہتا اور ملامت کرتا ہے تو اس کو ہنستے ہیں تو یہ اتباع اور شغف کیوں ہے؟ صرف اس واسطے کہ ان کو کیمیا آنے کا گمان ہے۔ پس جب حصول کیمیا کے موہوم الیہ پر ظاہری کیمیا جاننے والوں کا اس قدر اتباع کیا جاتا ہے اور اپنی شان و شوکت کو طاق میں رکھ دیا جاتا ہے اور ذرا پروا نہیں کی جاتی جن لوگوں کو سچ مچ کیمیا آتی ہے کہ اگر لوہے اور پتھر کو کندن کر دیں تو کوئی تعجب نہیں ان کا اتباع کرتے استنکاف کیوں ہوتا ہے یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مقصود میرا یہ تھا کہ جب انجن میں یہ طاقت ہے کہ اس کے ساتھ وابستہ ہونے سے گاڑیاں منزل پر پہنچ جاتی ہیں تو کیا صحابہ کرام کے ساتھ وابستگی کا یہ اثر نہ ہوگا؟ بالخصوص جبکہ یہ بھی ثابت ہو کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد دیگر اولیاء اللہ پر بھی کبھی بلا واسطہ نزول انوار و برکات ہوتا ہے کیونکہ یہ سلسلہ منقطع ہوا نہ ہوگا:

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست ۔۔۔ خم و خمخانہ بامہر و نشاں ست

(ابھی وہ رحمت کا بادل موتی برسا رہا ہے شراب عشق کے مٹکے اور مے خانہ پر مہر اور نشان لگی ہوئی ہے)

اب تک وہی جام گردش میں ہے وہی دور چل رہا ہے ہر وقت یہی صدا بلند ہے:

حریفاں ہمہ ! مئے پرستی کنید ۔۔۔ بجوشید و نوشید و مستی کنید

(اے دوستو تم شراب عشق کی محبت میں لگے رہو خوب جوش میں آؤ خوب پیو اور خوب مست رہو)

غرض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی وابستگی کی بدولت کہیے یا وابستگی اور ذاتی حرکت دونوں کے سبب کبھی علم اور معرفت اب بھی عطا ہوتا ہے اور وہی ایسی چیز ہے کہ اس کی بدولت ان کی دو رکعت غیر عارف کی ہزار رکعت کے برابر ہے اسی علم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اس مرتبہ تک پہنچا دیا اور یہی علم و معرفت آج بھی ہزاروں کو اپنی اپنی استعداد کے موافق مراتب علیہ پر پہنچا رہا ہے۔

نورانیت توحید

غرض علم ایسی چیز ہے کہ عمل کوئی بھی علم سے مستغنی نہیں لیکن بعض علوم عمل سے مستغنی ہیں مگر بایں معنی کہ اس کی صحت کسی عمل پر موقوف نہیں گو کمال اس کا کسی عمل پر موقوف ہونا بایں معنی کہ اس علم کا ثمرہ بھی کوئی عمل نہیں نظر غائر سے جیسا کہ شروع ترجمہ آیت کے ساتھ عرض کیا گیا ہے اس کا ثمرہ

کوئی عمل بھی ضرور ہے۔ یعنی اس کی ایک غایت کوئی نہ کوئی عمل ضرور ہے۔ مثلاً قل ھو اللہ احد کا عقیدہ ہے کہ اس میں کسی عمل کی ضرورت بمعنی توقف نہیں ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عمل کی طرف سے بالکل توجہ ہٹالی جائے بلکہ اس علم کا کمال ضرور عمل پر موقوف ہے اور غایت بھی اس کی کوئی عمل ضرور ہے۔ مثلاً قل ھو اللہ احد ہی کو لیجئے کہ عقیدہ توحید کی صحت گو اعمال پر موقوف نہیں لیکن توحید میں نورانیت اعمال صالحہ ہی سے ہوتی ہے اور نیز اس کی غایت میں ایک عمل بھی مثلاً جب خدا کو کمالات اور تصرفات میں منفرد مانا تو غیر اللہ سے ایسا تعلق رغبت ورہبت کا نہ ہونا چاہیے جیسا کہ ہے۔ میں اپنے اس مضمون کا مخاطب خصوصیت کے ساتھ طلبہ کو بتاتا ہوں کہ ان میں اکثر کو اپنے علوم پر ناز ہوتا ہے۔ خصوصاً حصہ عقائد میں کہ میں خود اپنے کو دیکھتا ہوں کہ عقائد درست کرنے کی فکر تو ہے مگر عمل کی طرف توجہ نہیں ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ عقیدہ بوجہ اصل ہونے کے کافی سمجھتے ہیں اور حالاً یہ دل میں جمار کھا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ہاں عقیدے کی پوچھ ہوگی اس کے بعد اور کوئی باز پرس نہ ہوگی لہٰذا جو چاہو کرو۔ صاحبو! خدا کے لیے سنبھلو اور اپنی خبر لو۔ مجھ سے قنوج میں ایک تاجر عطر نے جو اہل حدیث تھے یہ کہا کہ ہم لوگوں کا جو کچھ تقویٰ ہے وہ چند مسئلوں میں ہے جن میں حنفیوں سے اختلاف ہے ورنہ ہمارے اعمال کی یہ حالت ہے کہ میں عطر کی تجارت کرتا ہوں اور اس میں تیل ملا کر فروخت کرتا ہوں۔ بیچارے سچے آدمی تھے صاف کہہ دیا کہ اس امر میں کبھی مجھے عمل بالحدیث کا خیال پیدا نہ ہوا اور ہمیشہ خلط کر کے فروخت کرتا رہا۔ ہم لوگ حنفی ہیں خدا کا شکر ہے مگر یہ افسوس ہے کہ ہم نے بھی اسی درستی عقائد پر قناعت کر لی ہے اور عمل کی ذرا فکر نہیں ہے سرتاپا دنیا میں منہمک ہیں اور محض علوم کو اور اعتقادات کو کافی سمجھتے ہیں بلکہ جو لوگ اپنے کہلاتے ہیں اور دخول سلسلہ رکھتے ہیں ان میں بھی تقویٰ کا اہتمام نہیں۔ خالی محبت وصحت عقیدہ پر کفایت کیے ہوئے ہیں تو اس مرض کو دیکھ کر خدا تعالیٰ نے مجھے ایک بات سجائی ہے بظاہر بالکل نئی جس کو اجمالاً بھی ذکر کیا ہے۔

سرمایہ تسلی

اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر چند بعض علوم کو عمل سے تعلق یعنی توقف نہیں ہے مگر قرآن شریف وحدیث کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان علوم کی غایت علاوہ نفس نجات کے کوئی عمل بھی ہے یعنی ایک غایت تو ان علوم کی یہ ہے کہ ان پر نفس نجات من العذاب مرتب ہو جائے گی۔ اگرچہ وہ چند روز کی تکالیف اٹھانے کے بعد ہو نیز اس غایت کے سوا اور بھی ایک غایت ہے جو کہ بدون عمل کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً علم تقدیر کی جہاں یہ غرض ہے کہ اس کے ماننے سے نجات ہوگی وہیں

یہ غرض بھی ہو جس کو اس آیت میں اشارہ فرماتے ہیں:

مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ○

یعنی جو کچھ آفاقی یا انفسی مصیبت تم کو پہنچتی وہ پہلے سے کتاب میں یعنی لوح محفوظ میں موجود ہے اور ہم نے کتاب مبین میں پہلے سے اس لیے لکھا اور تم کو یہ تعلیم اس لیے دی کہ تمام مافات پر مغموم اور پریشان نہ ہو...... الخ۔ اس آیت میں تصریح کر دی کہ ایک بڑی مصلحت مسئلہ تقدیر کی اطلاع میں یہ بھی ہے کیونکہ طبعی بات ہے کہ نقصان ہونے پر انسان کو رنج وصدمہ ہوا کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی عنایت کو ملاحظہ فرمایئے کہ باوجود غنی اور بے پروا ہونے کے ہماری مصلحت پر نظر فرما کر ہم کو ایسی بات بتلا دی جو کہ نہایت درجہ ہمارے لیے سرمایہ تسلی ہے اگر تمام جہان کے عقلاء متفق الرائے ہو کر اس کی تدبیر کرتے تو ایسی بات ہاتھ نہ آتی جو خدا تعالیٰ نے بتلا دی یعنی ہم کو مسئلہ تقدیر سکھلا دیا۔

صاحبو! یہی مسئلہ ہے جس کی بدولت ہم بڑے سے بڑے فکر اور مصیبت میں پڑ کر بھی اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں اور غم کو دھو لیتے ہیں اگر ہم کو اس مسئلہ کی تعلیم نہ کی جاتی تو کوئی سبیل ہمارے پاس نہ تھی کہ ہم اپنے رنج کو دھو سکیں اس کی حقیقت ایک مثال میں سمجھئے! فرض کیجئے کہ دو شخص ایسے ہیں جن کی حالت ہر پہلو سے بالکل یکساں ہے جو کچھ ساز و سامان روپیہ پیسہ ایک کے پاس ہو وہی دوسرے کے پاس بھی ہے جو سامان آسائش ایک کو میسر ہے دوسرے کو بھی ہے ایک ہی خاندان کے ایک ہی مزاج اور طبیعت کے ہیں اور دونوں کو خدا تعالیٰ نے ایک ایک لڑکا بھی عنایت فرمایا ہے اور دونوں نے اپنے اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت میں یکساں کوشش کی ہے اور دونوں لڑکے نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوئے ہوں اور عین ایسے وقت میں کہ جب سارے گھرانے کی امیدیں ان کے ساتھ وابستہ ہونے لگی ہوں اور ان کے پھلنے پھولنے کے دن آئے ہوں ان دونوں کا انتقال ہو جائے اور اتفاق سے ایک ہی مرض میں اور ایک ہی طبیب کی سوء تدبیر سے مرض بگڑ کر انتقال ہوا ہو اس وقت ان کے والدین کے غم اور رنج کا جو عالم ہوگا ظاہر ہے اور رنج بھی دونوں کا قریب قریب برابر ہوگا کیونکہ دونوں کی یکساں حالت فرض کی گئی ہے لیکن باوجود اس اتحاد حالات کے ایک یہی فرق دونوں میں تھا کہ ایک ان میں منکر تقدیر تھا اور دوسرا قائل تقدیر۔ اس لیے ضرور ہے کہ ان دونوں کے رنج میں باوجود اسباب رنج برابر ہونے کے فرق ہوگا یعنی اس شخص کا غم جو قائل

تقدیر ہے بہت تھوڑی دیر باقی رہے گا کیونکہ فوراً ہی اس کو یہ مضمون یاد آ جائے گا کہ:

قُلْ لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ○

کہ جو مصیبت آتی ہے وہ خدا کے حکم سے آتی ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ حکیم مطلق ہیں اور فعل الحکیم لا یخلوا عن الحکمہ (حکیم کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا) قضیہ مسلمہ ہے اس لیے یہ مصیبت بھی کسی مصلحت کو لیے ہوئے ضرور ہے اور اگر حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ قتل صبی کا یاد آ گیا جس کو قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے اور جس کو مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ:

آں پسر راکش خضرؑ ببرید حلق　　　سر آں را در نیابد عام خلق

(اس لڑکے کو حضرت خضر علیہ السلام نے مار ڈالا اور حلق کو کاٹ دیا مگر اس کا بھید عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا)

نیز خدا تعالیٰ کی رحمت واسعہ پر نظر گئی ان سب باتوں سے سمجھ گیا کہ کوئی مصلحت ضرور ہوگی جن میں ایک مصلحت وہ بھی ہے جس کو ایک اعرابی نے سمجھا۔ صاحبو! یہ مضمون سننے اور غور کرنے کے قابل ہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک اعرابی تعزیت کے واسطے آیا اور یہ دو شعر تعزیت میں پڑھے:

اصبر نکن بک صابرین فانما　　　صبر الرعیه بعد صبر الراس

(اے ابن عباس تم صبر کرو ہم بھی تمہارے ساتھ صبر کریں گے کیونکہ سردار کے صبر کے بعد ہی رعایا بھی صبر کر سکتی ہے)

یعنی آپ بڑے ہیں صبر کیجئے کہ ہم چھوٹے بھی صبر کریں۔ آگے کہتے ہیں:

خیر من العباس اجرک بعده　　　واللّٰه خیر منک للعباس

(حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر صبر کی وجہ سے جو تجھے ثواب ملے گا وہ تیرے لیے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہتر ہے اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ چکے تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تجھ سے بہتر یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات مل گئی ہے)

یعنی حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال سے تم کو ایسی چیز مل گئی جو تمہارے لیے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات سے زیادہ نفع رساں ہے یعنی ثواب کیونکہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات ان کے لیے اتنی کارآمد نہ تھی جتنا کہ ثواب آخرت کا کارآمد ہے اور

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ کو تم سے اچھی ایک چیز مل گئی یعنی خدا تعالیٰ کا قرب لہٰذا نہ تم خسارہ میں ہو نہ وہ۔ تو اگر کوئی اور حکمت سمجھ میں نہ آئے تو یہی حکمت تسلی کے لیے کافی ہے یہ تو قائل تقدیر کی حالت تھی۔ اب منکر تقدیر کو لیجئے کہ اس کے پاس تسلی اور تسکین کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے وہ تمام عمر اسی رنج میں رہے گا کہ افسوس میں نے فلاں تدبیر کیوں نہیں کی اور فلاں طبیب سے کیوں رجوع نہ کیا کبھی اپنی خطا تجویز کرے گا کبھی معالج کی بے پروائی سمجھے گا اور اس کو برا بھلا کہنا شروع کرے گا لیکن وہ ہزار شکایت کرے بلکہ معالج کو سزا بھی کرا دے لیکن اس کے دل کی حسرت کسی طرح کم نہ ہوگی کیونکہ اس کو ہمیشہ یہ خیال رہے گا کہ اگر میں فلاں تدبیر کرتا تو ضرور کامیاب ہوتا تو اس کا غم اس کی عمر کے برابر ہے کہ جب تک زندہ رہے گا غم و رنج ہی میں رہے گا اور قائل تقدیر کے غم کی عمر زیادہ سے زیادہ ہفتہ دو ہفتہ۔ اس مثال سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہر علم کی ایک نہ ایک غایت ضرور رکھی ہوئی ہے۔ اگر اہل علم غور کریں گے تو قرآن شریف و حدیث شریف میں بکثرت ان غایات کو پائیں گے غضب کی بات ہے کہ ان غایات کا اتنا بڑا ذخیرہ اور بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔

ترغیب عمل

صاحبو! قطع نظر اس سے کہ یہ علم کاذی غایت عملیہ ہونا فی نفسہ ایک علم ہے اور اس لیے قابل تحصیل ہے اس میں ایک بڑا نفع یہ ہے کہ اگر ان غایات پر نظر ہو تو بہت سے شبہات اور شکوک کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً مسئلہ تقدیر کی غایت معلوم ہونے سے یہ نفع ہوگا کہ اس مسئلہ پر جو بہت سے شبہات ہوتے ہیں وہ جاتے رہیں گے کیونکہ جو شخص غایت کو سمجھ کر کام میں لگے گا اس کو شبہ واقع ہونے کی نوبت ہی نہ آئے گی اسی طرح مثلاً نزول باری کے متعلق شبہ کیا جاتا ہے کہ نقل و حرکت اجسام کا خاصہ ہے لہٰذا کیونکر ہو سکتا ہے کہ خدا کے لیے خواص اجسام ثابت کیے جائیں۔ صاحبو! مجھے اسی کی شکایت ہے کہ اس شبہ کی نوبت ہی کیوں آتی ہے اصل وجہ اس نوبت آنے کی یہ ہے کہ ہم کو اس اطلاع دہی کی غایت کا علم نہیں اور جس دن اس غایت کی خبر ہو جائے گی اعتراضات پیدا ہی نہ ہوں گے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص قصبہ کے تحصیلدار کو یہ اطلاع کرے کہ صاحب کلکٹر یہاں سے چھ میل کے فاصلہ پر ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں اور تحصیلدار اس خبر کو سن کر اس خبر رساں پر اعتراض کرنے لگے کہ تم کو کیونکر معلوم ہوا کہ یہ مسافت چھ میل کی ہے اور تم نے کیسے پیچ تاکہ وہ کلکٹر ہے وغیرہ وغیرہ تو سمجھا جائے گا کہ تحصیلدار اپنی تحصیل کے کام کو ضروری نہیں سمجھتا۔ نیز اس کو معلوم نہیں کہ کلکٹر کس غرض سے دورہ کر رہا ہے کیونکہ اگر یہ کام کو ضروری سمجھتا اور اس دورہ کی غرض

معلوم ہوتی تو ہرگز اس کو ایسے اعتراض نہ سوجھتے بلکہ اپنے کام کی فکر ہوتی اور سب سے پہلے اپنے کام کی درستی کی فکر کرتا جب اس سے فراغت ہوتی اس کے بعد البتہ اس قسم کے سوالات کی گنجائش بھی تھی۔ پس خدا تعالیٰ کے نزول کی اطلاع سے بھی مقصود ہم کو یہ جتلانا ہے کہ وہ تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں تم ان کی طرف متوجہ ہو اور اس نے تم کو یہ شرف بخشا ہے کہ:

امروز شاہ شاہاں مہماں شدست مارا　　جبریل بالملائک درباں شدست مارا

(آج بادشاہوں کے بادشاہ ہمارے مہمان ہوئے ہیں آج جبرئیل علیہ السلام بہت سے فرشتوں کو لے کر ہمارے گھر کا پہرہ دے رہے ہیں)

یہ بات تھی جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد دلایا تھا جس سے مقصود یہ تھا کہ حاکم حقیقی کے قرب کی خبر سن کر جو کچھ کرنا ہے وہ کرلو! مگر افسوس کہ ہم نے کرنے کا کام تو نہ کیا۔ ہاں ترمذی شریف کی حدیث میں شکوک پیدا کردیئے' مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حدیث شریف پڑھا رہے تھے۔ ایک طالب علم نے اس حدیث میں کہ نماز میں حدیث النفس نہ کرنے سے گزشتہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اعتراض کیا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ حدیث نفس بھی نہ ہو' مولانا نے اس پر فرمایا کہ بھائی کبھی اس کا ارادہ تم نے کیا ہے؟ اگر کبھی ارادہ کیا ہوتا اور پھر حاصل نہ ہوسکا ہوتا تو یہ سوال زیبا تھا اور جب ارادہ ہی نہیں کیا تو کس منہ سے عسیر الحصول کہا جاتا ہے۔ خوب کہا ہے:

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن　　بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز　　اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

فرہاد اپنے عشق میں کامیاب نہ ہوسکا لیکن آج دفتر عشق میں سب سے اول اس کا نام ہے اس لیے کہ اس نے اپنی وسعت بھر کوشش تو کی لیکن اگر تم بھی کوشش کرتے اور ناکام رہتے تو تمہارے سوالات قابل قدر تھے۔

قیل وقال کی ممانعت

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا کی زندگی قیل وقال کے لیے نہیں وجد وحال کے لیے ہے۔ ہاں! اشکال کے حل کا وہ وقت ہے جب تمہیں ہر طرح اطمینان کلی نصیب ہوجائے اور یہ اس وقت ہوگا جس کی نسبت ارشاد ہے: "وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ" بہت سے چہرے اس روز (ایمان کی وجہ سے) روشن (اور مسرت سے) خنداں

شاداں ہوں گے) اس وقت فرصت میں جا کر پوچھ لیجئے گا کہ نزول کے کیا معنی تھے باقی نری الفاظ کی توجیہ سے تسلی نہیں ہوا کرتی اور دیکھئے صحابہ کرامؓ نے سب کچھ سنا لیکن کبھی نہ پوچھا کہ یہ کیونکر ہوتا ہے اور اس کو تو کیا پوچھتے' ایک ہلکی سی بات کو پوچھا تھا اس کی نسبت ارشاد فرمایا گیا کہ "یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ" (آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں' آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلۂ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لیے) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بیکار سوالات کے جواب کی ضرورت نہیں نہ اس قسم کے سوالات کی اجازت ہے اپنے کام میں لگا رہنا چاہیے۔ کسی شخص نے ایک عارف سے پوچھا کہ معراج میں کیا کیا باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ سے کیں چونکہ یہ غیر ضروری سوال تھا۔ جواب دیا کہ:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغبان ۔۔۔ بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(اب کس کا دماغ ہے اور کس کی ہمت ہے باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا پھول نے کیا سنا اور بادِ صبا نے کیا کیا)

اور صاحبو! ذات وصفات کے بارے میں حق کس کو ہے کہ وہ کچھ زبان کھول سکے اور دماغ کس کا ہے کہ وہ کچھ سمجھ سکے)

تو ندیدی گہے سلیماں را ۔۔۔ چہ شناسی زبان مرغاں راں

(جب تو نے حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کو نہیں دیکھا تو پرندوں کی بولیاں کیا سمجھ سکتا ہے)

نیز یہ بھی ہے کہ:

عنقا شکار کس نشود دام۔ باز چیں ۔۔۔ کیں جا ہمیشہ باد بدست ست دام را

(اے شکاری اپنا پھندا اٹھا لے عنقا (شبہ باز) کا شکار کوئی نہیں کر سکتا اس جگہ ہمیشہ ہوا ہی کے پھندے کو توڑ دیا ہے یا پھندے کے اندر ہوا ہی رہی ہے)

اور یہی وجہ ہے کہ علامہ غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصانیف میں علم کلام پر بہت انکار کرتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو اس شعر کا حاصل ہے:

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں ۔۔۔ کیں جا ہمیشہ باد بدست ست دام را

(اے شکاری اپنا پھندا اٹھا لے عنقا (شبہ باز) کا شکار کوئی نہیں کر سکتا اس جگہ ہمیشہ ہوا ہی کے پھندے کو توڑ دیا ہے یا پھندے کے اندر ہوا ہی رہی ہے)

غرض ذات وصفات کے متعلق احاطہ ہو سکنا ممکن نہیں اس لیے کہ "اَلَا اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ" اور جب وہ عالم بھر کو محیط ہے تو ایک ضعیف انسان اس کی ذات باصفات کو کما حقہ کیونکر علماً احاطہ کر سکتا ہے اگر ایک پانی کا کیڑا عالم بھر کے اسرار کی دریافت کی کوشش کرنے لگے اور چاند

سورج پر کہ جو اس کو پانی میں نظر آتی ہیں رائے زنی کرنے لگے تو کیا وہ ان کی پوری جسامت کو دریافت کر سکے گا ہرگز نہیں۔ ہماری وہ حالت ہے کہ:

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہان ست　　　　زمین و آسمان وے ہمان ست

(اس کیڑے کی طرح جو پتھر کے اندر چھپا ہوا ہے اس کا زمین وآسمان وہ ہی ہے)

تو اگر پتھر کا کیڑا اس کے اندر رہ کر سنے کہ بہت سی متحرک چیزیں دنیا میں ہیں اور وہ ان سب کی حقیقت وہاں ہی ڈھونڈنے لگے اور جب اس کی سمجھ میں نہ آسکیں تو قطعاً انکار کر دے اور سب کو ہیچ بتلا دے تو کیا اس کا ہیچ کہنا قابل التفات ہوگا یا اس کی جستجو قابل شمار جستجو ہوگی کبھی نہیں اور یاد رکھو کہ جن لوگوں نے کچھ سمجھ لیا ہے وہ یوں کہتے ہیں:

حدیث از مطرب و مے گو وراز دہر کمتر جو　　　　کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

(گانے بجانے والے اور شراب کے متعلق جو کچھ کہنا ہے کہو اور زمانے کے بھید معلوم کرنے کی فکر میں نہ رہو کیونکہ حکمت کے ذریعے کوئی بھی اس راز کو نہ سمجھ سکا اور نہ سمجھ سکتا ہے)

اے اہل سائنس! سائنس کی تحقیق اس وقت کیجئے کہ جب آپ کو اپنے ضروری مشغلوں سے فرصت ہو لے ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھئے آپ کس منجھدار میں پھنسے ہیں خود آپ کا ضروری مشغلہ ایسا عظیم الشان ہے کہ:

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست　　　　آنجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

(عشق کا دریا بڑا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں اس جگہ تو سوائے اپنی جان کو سپرد کر دینے کے اور کوئی علاج نہیں)

تو جب اس بحر عشق کے پیچ وخم لا متناھی ہیں تو اس کو چھوڑ کر کواکب کے اسرار میں کہاں جا پھنسے اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ کواکب وغیرہ کا ذکر خود قرآن شریف میں بھی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف میں محض خدا تعالیٰ کی ہستی اور اس کے مفرد من الکمال ہونے پر استدلال کرنے کے لیے ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس مقصود کے حاصل کرنے کے لیے ان چیزوں کا اجمالی علم کافی ہے جس کو ایک عامی بھی سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ ایک بدوی کا قول ہے:

البعرة تدل على البعير والاثر يدل على المسير فالسماء ذات الابراج والارض ذات الفجاج كيف لا يدل كان على اللطيف الخبير

(اونٹ کی مینگنیوں سے سمجھا جاتا ہے یہاں سے اونٹ گزرا ہے قدموں کے نشان دیکھ کر اس کے بنانے والے اللہ تعالیٰ کو نہیں سمجھا جا سکتا؟ جو لطیف بھی اور باخبر بھی ہے)

صاحبو! اس سے زیادہ اور کیا پاکیزہ استدلال ہوگا اب فرمایئے کہ اس بدوی نے سائنس اور ہیئت کی کونسی کتاب پڑھی تھی اور کس مدرسہ میں تعلیم پائی تھی صرف ایک چیز کو دیکھا اور خدا تعالیٰ کی ہستی پر استدلال کیا۔ پس قرآن مجید میں بھی بقدر ضرورت اجمالاً ایسے مضامین آئے ہیں ان کی فضول تحقیقات جن پر استدلال علی الصانع موقوف نہ ہو مذکور نہیں غرض ان امور میں پڑنا ایک شغل لایعنی ہے پھر آج اس سے بھی زیادہ یہ غضب کیا جارہا ہے کہ سائنس کے ان لایعنی مسائل کو قرآن شریف میں تلاش کیا جاتا ہے۔ صاحبو! اس قسم کے مسائل کا قرآن شریف میں تلاش کرنا ایسا ہے جیسے طب اکبر میں جوتیاں سینے کی ترکیب تلاش کرنا۔ غرض جو شخص کام میں لگے گا اس کو اس قسم کی خرافات کی طرف توجہ نہ ہوگی اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اس قسم کے سوالات نہ کرنا بتلا رہا ہے کہ یہ سوالات سب غیر ضروری اور بے کار ہیں صرف اس قدر اجمالاً سمجھنا کافی ہے کہ یہ مصنوعات ہیں لہٰذا ان کے لیے کسی صانع کا ہونا ضروری ہے۔

غایت توحید

اب توحید کی غایت کو لیجئے اس کو اہتمام کے لیے مکرر بیان کرتا ہوں کہ ہم کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ:

قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ۝
وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۝

کہ ”خدا کا کوئی شریک نہیں وہ بے نیاز ہیں نہ اس نے کسی کو جنا نہ کسی نے اس کو جنا نہ اس کے کوئی کفو ہیں۔“

اس تعلیم کی ایک غایت تو یہ ہے کہ اس اعتقاد سے ہم کو نجات حاصل ہو دوسرے ایک غایت اس کی یہ بھی ہے کہ غیر خدا پر کبھی طمعاً و خوفاً نظر نہ ہو کیونکہ طبعی امر ہے کہ جب کسی بہت بڑے سے تعلق ہو جاتا ہے تو چھوٹوں کی ہیبت یا احتیاج دل میں باقی نہیں رہا کرتی۔ اکبر شاہ کی حکایت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ شکار میں گیا اتفاقاً تن تنہا کہیں دور نکل گیا' ایک دیہاتی کے یہاں مہمان ہوا جب چلنے لگا تو اس دیہاتی سے کہا کہ اگر تم کو کبھی حاجت واقع ہو تو تم دارالسلطنت میں ہمارے پاس آنا چنانچہ وہ ایک بار آیا' اکبر اس وقت نماز پڑھ رہا تھا' نماز سے فارغ ہو کر اس نے دعا مانگی جب دعا سے بھی فراغت کر چکا تو اس دیہاتی نے پوچھا کہ تم کیا کر رہے تھے' اکبر نے کہا کہ میں خدا تعالیٰ سے دعا مانگ رہا تھا۔ دیہاتی نے کہا تم کو بھی مانگنے کی ضرورت ہے؟ اکبر نے کہا کہ بیشک مجھے بھی ضرورت ہے۔ کہنے لگا کہ پھر مجھے تم سے حاجت کہنے کی کیا ضرورت؟ جو شخص

تمہارے شاہانہ سوالات کو پورا کرے گا کیا وہ میرے غریبانہ سوالات کو پورا نہ کرے گا؟ تو یہ استغنا اس توحید ہی کے رنگ کی بدولت تھا جو کہ چھلک اٹھا اسی کو کہتے ہیں:

موحد چہ بر پائے ریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی برسرش

امید و ہراسش نباشد ز کس   ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(ایک اللہ تعالیٰ پر یقین اور بھروسہ رکھنے والا سونے چاندی کو ٹھوکر سے مارتا ہے خواہ تم اس کے قدموں میں زر و سیم رکھ دو یا اس کے سر پر ہندی لوہے کی مشہور تلوار رکھ دو)

اسی طرح عقائد کے ہر مسئلہ کی ایک غایت علاوہ نجات کے قرآن شریف وحدیث شریف میں ملے گی تو ان غایات کو بالکل نظر انداز کر دینا بڑا ظلم ہے ان کو بھی لینا چاہیے۔ اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جس طرح ہر عمل کو علم سے تعلق ہے اسی طرح ہر علم کو بھی عمل سے تعلق ہے۔ گو کیفیت تعلق کی مختلف ہو لہٰذا بڑی کمی ہوگی کہ صرف علم کو بیان کر کے چھوڑ دیا جائے اور اس کے متعلق عمل کو بیان نہ کیا جائے۔ یہاں تک تمہید تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بحث علمی کے بعد ضرورت اس کی بھی ہے کہ اعمال سے بحث کی جائے۔ اسی واسطے میں نے اس آیت کو اس وقت پڑھا ہے تاکہ مولوی شبیر احمد صاحب کے بیان علمی کے بعد اسی آیت کا بیان عملی بھی ہو جائے۔

مذمت حب دنیا

بالجملہ اس میں خدا تعالیٰ ایک شکایت کو ظاہر فرما رہے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ تم لوگ دنیا سے محبت کرتے ہو اور آخرت چھوڑتے ہو۔ یہاں "تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ" کے بعد "تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ" (تم جلدی سے ملنے والی چیز دنیا سے محبت کرتے ہو اور چھوڑ دیتے ہو آخرت کو) بڑھانے سے حب دنیا کی تفسیر بھی ہوگئی یعنی حب دنیا اس کو کہیں گے جس میں آخرت کا ترک ہو جائے اور اسی سے "حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ"[1] کے معنی بھی سمجھ میں آ گئے ہوں گے یعنی حب دنیا وہ ہے کہ اس کی بدولت آخرت چھوٹ جائے ورنہ اگر آخرت نہ چھوٹے تو وہ حب دنیا نہ سمجھی جائے گی اور وہ راس کل خطیئۃ میں میں داخل نہ ہوگی گو اس کی طرف طبعی میلان اور بقدر ضرورت اس کا اکتساب بھی ہو اس کے دریافت کرنے سے بہت سی اشکالات رفع ہو جائیں گی کیونکہ فدایان ترقی یہ سمجھتے ہیں کہ علماء ہم کو دنیا کے لینے سے بالکل روکتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ہم مسجد کے ملا ہو کر بیٹھ رہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس قسم کی ایک شکایت بھی گھڑی ہے کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ کے ہاں

---

[1] (اتحاف السادة المتقين ۳: ۱۳۱، کنز العمال ۶۱۱۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۱۳)

بہت سے مولوی جمع ہو گئے تھے سب نے اتفاق کر کے بادشاہ سے کہا کہ فوج پر روپیہ فضول خرچ ہو رہا ہے سب کو موقوف کر دو اس نے کہا کہ فوج اس ضرورت سے رکھی ہے کہ اگر کوئی غنیم آئے تو یہ اس کو دفع کریں۔ مولویوں نے کہا کہ اگر ایسا ہوگا تو اس کام کو ہم انجام دیں گے۔ غرض فوج موقوف کر دی گئی یہ خبر مشہور ہوئی تو کوئی غنیم آ چڑھا۔ بادشاہ نے مولویوں سے خبر کی یہ لوگ کتابیں لے کر پہنچے اور وعظ و نصیحت سنایا وہ کیوں سننے لگا تھا آخر ناکام واپس آئے اور بادشاہ سے کہا کہ صاحب وہ بڑا نالائق ہے مانتا نہیں خیر پھر آپ ملک چھوڑ دیجئے۔ آپ کا ملک گیا اس کا ایمان گیا اور اس حکایت کو پیش کر کے کہا کرتے ہیں کہ مولویوں کے کہنے پر چلیں تو گھر بار سب چھوڑ دیں۔

قدر تعلیم

صاحبو! اس افواہی حکایت کی تو کچھ اصل ہی نہیں ہے جس کا جواب دیا جائے لیکن اصل اعتراض کی نسبت کہتا ہوں کہ آپ لوگ کسی مولوی کے پاس رہے نہیں اس لیے آپ کو اس قدر وحشت اور اجنبیت ہے چند روز تک اگر کسی مولوی کے پاس رہیں تو ان شاء اللہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ مولوی کیا تعلیم آپ کو دیتے ہیں اور اگر کہیں کہ ہم اتنا وقت کہاں سے لائیں تو میں کہوں گا کہ آپ امراض جسمانی کی ضرورت سے رخصت لیتے ہیں یا نہیں اور اس رخصت میں تین تین چار چار مہینے گنوا دیتے ہیں یا نہیں؟ تو جب امراض جسمانی کے لیے ایک سول سرجن انگریزی کے کہنے سے چار مہینے فضول برباد کر دیے تو امراض روحانی کے علاج کے لیے ایک عربی سول سرجن کے کہنے سے بجائے چار مہینے کے چالیس دن ہی اس کے پاس فارغ ہو کر رہ لو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ معتقدانہ رہو بلکہ ممتحنانہ رہنے کی اجازت ہے۔ ہاں! معاندانہ طور پر نہ رہو۔ اب اس سے زیادہ اور کیا آسانی ہوگی کہ عمر بھر میں سے صرف چالیس دن مانگے جاتے ہیں واللہ اگر آپ ایسا کر لیں تو قریب قریب تمام سوالات کے جوابات خود بخود بدوں مناظرہ کے آپ کی سمجھ میں آ جائیں اور جب آپ چلنے لگیں اس وقت آپ سے پوچھا جائے گا آیا یہ کہنا صحیح تھا یا نہیں کہ:

اے لقائے تو جواب ہر سال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(اے وہ ذات کہ تیری ملاقات ہی سے سب سوالوں کا جواب مل جاتا ہے اور تیرے ذریعے ساری مشکلیں بغیر حجت کے پوری ہو جاتی ہیں)

اور اس وقت کہا جائے گا کہ دیکھ لو:

آفتاب آمد دلیل آفتاب گر دلیلت باید ازوے رومتاب

(آفتاب خود آفتاب کی دلیل ہے اگر تو اس کے وجود کی دلیل چاہتا ہے تو اس کی طرف سے چہرہ مت ہٹا)

اور چالیس دن کی تخصیص اپنی رائے سے نہیں کرتا بلکہ خود حدیث سے ہم کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اگر ہم چالیس دن تک کسی کام کو تباہ کے کرلیں تو پھر ہماری مدد ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا اَجْرَى اللّٰهُ مِنْ قَلْبِهٖ يَنَابِيْعَ الْحِكْمَةِ او كما قال"[1] (جس شخص نے چالیس دن خالص اللہ کے لیے کر دیئے اللہ تعالیٰ اس کے دل سے حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہو جایئے کہ ہر ہر ضرورت میں ہماری دستگیری فرمائی اور ایک معیار ہم کو بتلا دیا کہ اس کے موافق ہم باطمینان کام کر سکیں اور وہ معیار یہ ہے کہ اس میں اخلاص ہو ایسا چلہ نہ ہو جیسا کہ ایک گنوار نے کیا تھا کہ اس کو مولوی صاحب نے نماز پڑھنے کے لیے کہا اور چلہ بھر پڑھنے پر ایک بھینس دینے کا وعدہ کیا جب چلہ پورا ہو گیا تو یہ شخص مولوی صاحب کے پاس گیا اور کہا چالیس دن پورے ہو گئے لہٰذا بھینس دیجئے! مولوی صاحب نے کہا کہ بھائی میں نے تو اس لیے کہہ دیا تھا کہ اگر تو نے چلہ بھر جم کر نماز پڑھ لی تو عادت پڑ جائے گی اور پھر نہ چھوٹ سکے گی۔ کہنے لگا بہتر ہے نہ دیجئے جاؤ پھر یاروں نے بھی بے وضو ٹرخائی ہے۔ تو جیسے اس کو بے وضو پڑھنے کی وجہ سے اثر نہ ہوا اسی طرح اگر تم بھی مثلاً اس نیت سے رہو کہ مولوی صاحب کے پاس رہ کر خوب دعوتیں کھانے کو ملیں گی تو خاک بھی اثر نہ ہوگا بلکہ میں یہ بتلائے دیتا ہوں کہ اگر کسی کے پاس جا کر رہنے کا قصد ہو تو اپنے پاس ہی سے کھانا بھی ہوگا کہ خرچ کر کے تعلیمات کی قدر تو ہو کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز مفت آتی ہے اس کی کچھ قدر بھی نہیں ہوا کرتی لہٰذا اس تعلیم کا معاوضہ یہ ہے کہ چالیس دن تک اپنا خرچ کر کے رہو۔ مجھے حضرت حاجی صاحب قبلہ نے ایک کتاب چھپوانے کے لیے فرمایا' میں نے اس کے مفت تقسیم کرنے کا خیال ظاہر کیا' فرمایا کہ بھائی مفت تقسیم نہ کرنا کیونکہ لوگ دیکھیں گے بھی نہیں۔

مدت علاج

غرض علماء سے وحشت یا ان پر اعتراضات یا مسائل اسلام میں شکوک اسی وقت تک ہیں کہ جب تک آپ ان کے پاس جا کر نہیں رہتے مگر نہایت افسوس ہے کہ اظہار طلب اور شکوک ہونے کے باوجود بھی یہ نہیں ہوتا کہ چالیس دن کسی کے پاس جا کر رہ لیں۔ قصبہ کیرانہ میں ایک تحصیلدار صاحب نے ایک صاحب کو پیش کر کے کہا کہ ان کو بعض مسائل اسلام میں شکوک ہیں میں نے کہا

---

[1] (سنن الدارمی ۱: ۳۵۹ ' اتحاف السادۃ المتقین ۱۰: ۴۵)

ان شکوک کا علاج یہ نہیں کہ اس مختصر جلسہ میں یہ ان کو پیش کریں اور میں جواب دے دوں اور سن کر چلے جائیں۔ ان کا علاج یہ ہے کہ چند روز کے لیے میرے پاس تھانہ بھون میں آ کر رہیں اور میں جو کہا کروں اس میں یہ غور کیا کریں ان صاحب نے نہایت زور کے ساتھ تھانہ بھون آ کر رہنے کا وعدہ کیا تھا لیکن مدت گزرگئی اور ان کا وعدہ وفا نہیں ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگ اپنی اس حالت کو مرض نہیں سمجھتے حالانکہ یہ اتنا بڑا مرض ہے کہ کوئی مرض بھی اس کے برابر نہیں۔ نیز مرض بھی پرانا ہے لہٰذا ایک دو جلسہ میں اس کا ازالہ ممکن نہیں کم سے کم ایک چلہ تو ضرور طبیب کے پاس رہنا چاہیے۔ جیسا حدیث میں مذکور ہوا اسی حدیث کا حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے گویا ترجمہ کیا ہے:

شنیدم رہروی در سرزمینی   بہ بے گفت ایں معمارا قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف   کہ در شیشہ بماند اربعینے

(کسی ملک میں میں نے ایک راستہ چلنے والے شخص سے یہ بات سنی وہ اس بات کو بڑے قاعدے اور مزے سے کہتا تھا کہ اے صوفی شراب اس وقت صاف ہوتی ہے جبکہ شیشے کے اندر چالیس روز رہے)

شیشے سے مراد قلب ہے اور شراب سے مراد محبت الٰہی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک چلہ علاج کرنے سے ان شاء اللہ اصل مرض جاتا رہے گا اور پھر ان شاء اللہ عمر بھر مقویات پہنچتی رہیں گی۔ گویا مسہل تو طبیب کے پاس رہ کر ہو جائے گا اور ازالہ مرض کے بعد تقویت پہنچانے والی دوائیں دور رہ کر بھی پہنچتی رہیں گی۔ خدا کے لیے صاحبو! اس علاج کو آزما کر تو دیکھو اور چونکہ میں نے اصل علاج بتلا دیا ہے لہٰذا مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں لوگوں کے جزوی شکوک اور شبہات کا جواب دوں۔

انطباق آیت

لیکن تبرعاً خاص اس مقام کے اقتضاء سے اتنا کہتا ہوں کہ "تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ" (تم دنیا سے محبت رکھتے ہو) کے بعد بطور "تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ" (تم آخرت کو ترک کر دیتے ہو) بڑھا دینے سے "حُبُّ الدُّنْيَا رَاْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ"[1] کے متعلق شبہات کا جواب ہو گیا کہ حب الدنیا وہی ہے جس میں ترک آخرت ہو نہ کہ کسب دنیا پس کسب دنیا جائز ہے اور حب دنیا ناجائز۔ کسب اور حب میں وہی فرق ہے جو کہ غلیظ کے صاف کرنے اور کمانے اور اس کے کھانے میں کہ اول برا نہیں دوسرا برا اور معیوب ہے اور یہی وجہ ہے کہ "تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ" (تم دنیا سے محبت رکھتے ہو) فرمایا "تکسبون العاجلة"

---

[1] (اتحاف السادة المتقين ۳: ۱۳، کنز العمال: ۶۱۱۴، مشكوة المصابيح: ۵۲۱۳)

نہیں فرمایا اب اپنے اوپر منطبق کر لیجئے اور دیکھئے کہ آپ تحبون کے مصداق ہیں یا تکسبون کے۔ اس انطباق میں عوام سے تو کچھ خوف اور اندیشہ اس لیے نہیں کہ ان کو کچھ خبر ہی نہیں ان بیچاروں سے جو بات کہہ دی گئی انہوں نے سن لی اور عمل کر لیا اور علماء سے اس لیے خوف نہیں کہ ان حضرات کی نظریں اصل حقیقت تک پہنچی ہوئی ہوتی ہیں البتہ ان نیم خواندہ لوگوں سے جو بوجہ نیم ہونے کے تلخ بھی ہیں ڈر لگتا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ دیکھ کر یہ نہ کہہ دیں کہ ہم کو یہ آیت سن کر اپنی حالت پر منطبق کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ اس کے مخاطب ہی نہیں کیونکہ یہ آیت مکی ہے لہٰذا کفار اس کے مخاطب ہوں گے ہم مسلمان اس کے مخاطب نہیں ہو سکتے ہم سے اس آیت کو کیا تعلق۔ لہٰذا اس کے متعلق عرض کرتا ہوں اور میں نے اس مضمون کو متعدد مرتبہ اس کے قبل بھی بعض جلسوں میں بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اکثر لوگ آیات کے متعلق یہ سن کر کہ کفار کو خطاب کیا گیا تھا بے فکر ہو جاتے ہیں حالانکہ اس سے بے فکر نہیں ہونا چاہیے بلکہ زیادہ فکر میں پڑ جانا چاہیے اور زیادہ اثر لینا چاہیے کیونکہ جب کوئی آیت عتابیہ کفار کی شان میں نازل ہوتی ہے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس آیت کے مضمون کا خطاب کفار کو ان کی ذات کی وجہ سے ہوا ہے یا کسی صفت کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ذات کی وجہ سے یہ خطاب نہیں ہوا ورنہ ہر انسان کو گو وہ متقی ہی ہو اس کا خطاب ہوتا کیونکہ ذاتاً سب متحد ہیں اور لازم باطل ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کسی صفت کی وجہ سے یہ خطاب ہوا ہے اور کوئی حالت خاصہ اس مضمون کے ترتب کی علت ہے تو اگر وہ علت کفار کے علاوہ کسی دوسری جگہ بھی پائی جائے گی تو اس جگہ بھی یہ مضمون مرتب ہوگا۔ مثلاً اسی آیت میں وعید کا مدار حب العاجلہ ہے۔ لہٰذا اگر حب عاجلہ تمہارے اندر پائی جائے گی تو تم بھی وعید کے تحت میں داخل ہو گے۔ پس اب غور کر لو اور اگر اپنے اندر حب عاجلہ دیکھو تو بہت جلد اس کا علاج کر و اور اپنی حالت پر افسوس کرو کہ جو امور اس زمانے میں کفار میں ہوتے تھے وہ آج تمہارے یعنی مسلمانوں کے اندر موجود ہیں۔ اسی طرح حدیث "مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ"[1] (کسی نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کا کام کیا) میں تاویل کر کے لوگ بے فکر ہو گئے ہیں حالانکہ یہ سب بے فکری کی بات نہیں بلکہ اگر تاویل اس میں نہ ہوتی اور حقیقی معنی مراد ہوتے تو کچھ زیادہ مرن نہ تھی کیونکہ اگر کسی چمار کو چمار کہہ دیا جائے تو اس کو کچھ غیرت نہ آئے گی اور کسی شریف کو چمار کہہ دیا جائے تو اس کو مر رہنا چاہیے تو تاویل کرنے سے وعید میں من وجہ زیادہ شدت ہوگئی اور زجر بڑھ گیا مگر افسوس ہے کہ ہم لوگ فہم سے کام نہیں لیتے بحمد للہ نیم خوانوں کا شبہ تو رفع ہوا لیکن ایک شبہ تین پاؤ

---

[1] (اتحاف السادة المتقین ۳: ۱۰، کنز العمال: ۸۰۰۵)

خانوں کا رہ گیا ہے کہ محبون اور تذرون سے مطلق محبت اور ترک مراد نہیں بلکہ یہ دونوں لفظ خاص ہیں یعنی وہ ترک مراد ہے جو اعتقاداً ہو اسی طرح محبت سے وہ محبت مراد ہے جو اعتقاداً بقائے دوام کے ساتھ ہو اور ہم میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں کیونکہ ہم بحمد للہ قیامت کے قائل ہیں دنیا کو فانی جانتے ہیں اس کا جواب ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں کوئی قید نہیں اور تمہارے پاس اس قید کی کوئی دلیل نہیں اور بلا دلیل کوئی دعویٰ مسموع نہیں ہوتا پس اس قسم کی قید لگانا قرآن شریف کے مقصود کو باطل کرتا ہے اور ایسی مثال ہے کہ ایک شخص نے کسی مقام پر پہنچ کر ایک مجمع میں بیٹھ کر کہنا شروع کیا میں جب یہاں آیا تو ایک عورت سے میری آشنائی ہوئی اور میں اس کے گھر جایا کرتا تھا اور اس کا گھر ایسا ایسا تھا اور اس کا شوہر ایک بار آ گیا تھا اور اس نے مجھ کو اس طرح چھپا دیا تھا اور اس موقع پر اس عورت کا شوہر بھی تھا اور اس کے پکڑنے کی فکر میں تھا اب یہ اقراری مجرم مجمع کے سامنے ہو گیا' جرم ثابت ہونے میں کوئی حجت باقی نہ رہی اس عورت کو خبر ہوئی اور کچھ اشارہ کر دیا جس کو یہ سمجھ گیا اور تمام قصہ ختم کر کے اخیر میں کہہ دیا کہ بس اتنے میں آنکھ کھل گئی تو کچھ بھی نہ تھا' لوگوں نے کہا کہ کیا یہ سب خواب تھا' کہنے لگا اور نہیں تو بھلا میں غریب پردیسی مجھ کو کون پوچھتا ہے تو ایسی تاویل آپ حضرات ہی کو مبارک ہو۔ ہمارا مذہب تو یہ ہے کہ "المطلق یجری علی اطلاقہ" (جس میں کوئی شرط اور قید نہ ہو اور عام ہی رہے گا) البتہ اگر ترک عمل کی اباحت کہیں قرآن شریف یا حدیث شریف میں مذکور ہوتی تو البتہ رفع تعارض کے لیے اس موقع پر قید مذکور لگا کر تاویل کی جاتی اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مسئلہ اجرائے مطلق علی الاطلاق ہر جگہ نہیں بلکہ اس مقام پر ہے کہ جہاں مطلق کو اطلاق پر رکھنے میں کسی دوسری آیت یا حدیث سے تعارض واقع نہ ہو اور اگر تعارض ہوگا تو مطلق اپنے اطلاق پر نہ رہے گا۔ غرض یہ ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی مرضی کے موافق جہاں چاہیں اور جس طرح چاہیں کر لیں' مگر افسوس ہے کہ ہم کو اس کی ذرا پروا نہیں وہ حالت ہو رہی ہے کہ:

بر ہوا تاویل قرآں میکنی   پست و کژ شد از تو معنائے سنی
چوں ندارد جان تو قندیل ہا   بہر بینش میکنی تاویلہا
کردہ تاویل لفظ بکر را   خویش را تاویل کن نے ذکر را

(ہوا پر قرآن میں تاویل کرتے ہو جس سے اس کے روشن معنی پست و کج ہو جاتے ہیں' تمہارے اندر قرآن کے سمجھنے کا فہم ہی نہیں اس لیے تاویلات کرتے ہو' قرآن کے سمجھنے کا فہم پیدا کرو اور تاویلات چھوڑو)

(جو تیرے پاس روشنی کے لیے قندیلیں نہیں ہیں تو تو اپنی عقل کے لیے تاویلیں گھڑ رہا ہے)

تقاضائے محبت

اور میں علی سبیل التنزل کہتا ہوں کہ اگر یہ معنے مطلق نہ بھی ہوں اور تذروں مقید ہی ہو اعتقادی ترک کے ساتھ مرتب بھی آپ کو بے فکری نہ ہونا چاہیے کیونکہ جس دل میں درد ہوتا ہے اس کو تھوڑے سے التفات سے تنبیہ ہو جاتی ہے کو وہاں دوسری ہی کسی حالت کا بیان ہو مشہور ہے کہ ع عشق ست و ہزار بدگمانی۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سبزی فروش صدا لگاتا ہوا نکلا: ''الخیار العشر ۃ بدانق'' جس کے معنی یہ ہیں کہ دس ککڑیاں ایک دانق کی عوض۔ لیکن حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے سن کر ایک چیخ ماری اور رونے لگے اور فرمایا کہ جب دس پسندیدہ آدمیوں کی یہ قیمت ہے تو ہم گنہگار کس شمار میں ان کا ذہن منتقل ہوا خیار کے دوسرے معنی کی طرف یعنی نیک لوگ۔ ان لوگوں کے دل میں ہر وقت وہی ایک بات رچی رہتی ہے۔

حاجی جامی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی ہر کہ پیدامی شود از دور پیدارم توئی

(حقیقت یہ ہے میری جان میں جان ڈالنے والا اور میری کھلی آنکھ تو ہی ہے اور دور سے بھی جو کچھ مجھے دکھائی دیتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ بس تو ہی ہے)

ممکن ہے کہ کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ شعراء کے کلام سے مسائل پر استدلال کیا جاتا ہے اس لیے میں حدیث سے بھی اس کو ثابت کرتا ہوں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے اور صحابہ کرام کچھ کھڑے کچھ بیٹھے تھے اور کچھ آ رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اجلسوا یعنی بیٹھ جاؤ' اس ارشاد کو سن کر جو شخص جس جگہ تھا اسی جگہ بیٹھ گیا' حتیٰ کہ ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی وقت مسجد میں داخل ہوئے تھے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو سن کر فوراً جوتوں کے پاس بیٹھ گئے حالانکہ جانتے تھے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو جگہ پر پہنچ کر بھی بیٹھے نہیں لیکن محض اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور تمہارے کانوں میں پڑا ہے اگرچہ بظاہر تم مخاطب نہیں لیکن خطاب محبوب کو سننے والے تو ہو لہٰذا بیٹھ ہی جانا چاہیے تو آپ لوگ جامیؒ اور شبلیؒ کو بھی جانے دیجئے خود حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ درد دل کا اور محبت کا مقتضا یہ ہے کہ احتمال پر بلکہ مشابہت احتمال پر بھی اپنے کو مخاطب سمجھے اگرچہ اپنے مخاطب ہونے کا یقین نہ ہو بلکہ مخاطب نہ ہونے کا بھی یقین ہو مگر یہ سمجھ لیجئے کہ جامیؒ کو چھوڑ کر جام نصیب نہ ہوگا۔ غرض جس طرح آپ چاہیں ثابت سمجھیں۔ حدیث سے یا شعراء کے اقوال سے ہمارا مقصود ہر طرح حاصل ہے۔

مراتب حب دنیا

اب میں مقصود کی تفصیل کرتا ہوں کہ اس آیت میں حب عاجلہ پر ملامت فرمائی گئی ہے اور اس کے اب مراتب مختلف ہیں تو جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجہ کی ملامت بھی اس پر مرتب ہوگی۔

ایک درجہ تو محبت کا انتہائی ہے جس کو کفر کہتے ہیں اور اس پر ابدالاباد کی سزا اور ملامت مرتب ہوگی۔ بحمد للہ مسلمان اس سے تو پاک ہیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعتقاد تو صحیح ہے یعنی آخرت کے امکان اور وجود دونوں کا قائل ہے لیکن اس اعتقاد اور علم کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا کہ اعمال درست ہوتے خشیت کا غلبہ ہوتا' دنیا سے دل سرد ہوتا یہ بات نہیں ہے اس کے متعلق خدا تعالیٰ اس آیت میں ارشاد فرماتے ہیں: "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ" کہ قیامت کا دن جس میں حساب کتاب ہوگا اور ایک جزئی عمل کو جانچا جائے گا' سر پر آ گیا ہے مگر لوگ ابھی خواب غفلت میں مست ہیں جو لوگ صرف علم کو کافی سمجھ کر عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ اس میں غور کریں اور دیکھیں کہ اب بھی ان کی رائے صحیح رہتی ہے یا نہیں۔ صاحبو! یاد رکھو یہ مرجیہ کا مذہب ہے آپ لوگ اگرچہ درجہ اعتقاد میں اس کے قائل نہ ہونے کی وجہ سے اعتقادی مواخذے سے نجات پا جائیں لیکن بالکل بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ صاحبو! ہم لوگ خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم سے اہل سنت والجماعت ہیں' ہمارے نزدیک ہر ایک چیز اپنے درجے پر ہے' علم اپنے درجے پر ہے اور عمل اپنے درجے پر۔ ہے اور یہ نہ سمجھو کہ ترک عمل گناہ صغیرہ ہے اس لیے قابل توجہ نہیں کیونکہ اول تو یہ گناہ صغیرہ نہیں بلکہ کبیرہ ہے۔ دوسرے اگر بالفرض صغیرہ بھی ہوتا تب بھی قابل توجہ تھا اس لیے کہ گناہ صغیرہ اور کبیرہ کی مثال چھوٹی چنگاری اور بڑے انگارے کی سی ہے یعنی جس طرح ایک بڑا انگارا غفلت ہونے کی صورت میں قصر عالیشان کو خاکستر بنا دینے کے لیے کافی ہے اسی طرح اگر چنگاری بھی تھوڑی مدت میں اس انگارے کی برابر بلکہ اس سے زائد کام کر سکتی ہے اور اگر اب بھی کسی صاحب کو گناہ صغیرہ کے قابل ترک ہونے میں تامل ہو تو وہ مہربانی کر کے ایک چھوٹی چنگاری اپنے گھر کے چھپر میں رکھ کر دیکھ لیں۔ صاحبو! سچ کہتا ہوں کہ تمہارے قصر ایمان کے لیے گناہ صغیرہ ایسا ہی ہے جیسے چھپر کے لیے چھوٹی چنگاری اور یہ گفتگو علیٰ سبیل التنزل تھی ورنہ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے ترک عمل صغیرہ نہیں' کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ شریعت کے خلاف وضع رکھنا یا رشوت لینا عدل نہ کرنا چوری کرنا ہمیشہ داڑھی منڈوانا ٹخنوں سے نیچے یا ٹخنوں کی برابر پاجامہ پہننا معاصی صغیرہ ہیں۔ کبھی نہیں البتہ کفر سے کم ہیں لیکن جو چیزیں کفر سے کم ہوں ان سے بے فکری کی اجازت مل جانا ضروری نہیں۔

آسماں نسبت بعرش آمد فرود　　　　لیک بس عالیست پیش خاک تود

(عرش الٰہی کے لحاظ سے تو آسمان نیچے ہے مگر مٹی کے ڈھیر اور پہاڑوں سے بہت بلند ہے)

صاحبو! چھوٹا بڑا ہونا امر اضافی ہے لہٰذا ممکن ہے کہ جو امر دوسرے امر کی نسبت چھوٹا ہو وہ نظر الی ذاتہ بہت بڑا ہو۔ ہمارے عرف میں باپ کے بڑے بھائی کو تایا کہتے ہیں تو باپ تایا سے چھوٹا ہوتا ہے لیکن کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ تایا سے چھوٹا ہونے کیوجہ سے اپنے باپ کو اپنا صاحبزادہ سمجھنے اور کہنے لگا ہو بلکہ تایا کی برابر ہی اس کی عزت بھی کی جاتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ اگرچہ تایا کی نسبت چھوٹا ہے لیکن فی نفسہ تو چھوٹا نہیں اسی طرح عمل کا گناہ اگرچہ کفر سے چھوٹا ہے لیکن فی نفسہ وہ چھوٹا نہیں ہے اور عمل کو ضروری نہ سمجھنے کی بلا کہ عملی حب عاجلہ ہے ایسی عام ہے کہ اس میں عوام علماء بلکہ اہل باطن کم وبیش سب ہی مبتلا ہیں لیکن سب کا ابتلاء مختلف حیثیتوں اور مختلف مراتب کا ہے اسی لیے ممکن ہے کہ بعض فرقوں کا ترک عمل صغیرہ ہی کے مرتبہ میں ہو یا بعض خلاف اولیٰ ہی کے مرتکب ہو رہے ہیں لیکن جس طریق میں وہ ترک پیش آ رہا ہے اس کے اعتبار سے وہ کبیرہ یعنی مہتم بالشان ہی سمجھا جائے گا۔ پس سب سے بڑا درجہ تو کفر ہے اس کے بعد مسلمان دنیاداروں کی حالت۔

ترقی کا خبط

بالخصوص ان میں سے ایک خاص جماعت کی جس کو اس زمانہ کی نیرنگی جدت نے بے حد متاثر کیا ہے یہ لوگ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قائل نہیں اس کو برحق مانتے ہیں لیکن ایسا مانتے ہیں کہ وہ ماننا نہ ماننے کے برابر ہے۔ چنانچہ بعض یہاں تک کہتے ہیں کہ ضرورت مذہب مجبور کرتی ہے کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا جائے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ہم اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں اس لیے ہم کو بھی ماننا چاہیے اور اس اعتقاد و تسلیم کی جو حقیقت ہے ظاہر ہے نیز بعض لوگ ان میں ایسے بھی ہیں کہ محض قومیت کی وجہ سے مذہب اور مذہب کے مسائل کے قائل ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ترقی قومی ان لوگوں کے نزدیک اصل مقصود ہے اور ترقی بدون اتحاد کے حاصل نہیں ہو سکتی اور حصول اتحاد قومی کے لیے اتحاد مذہب سب سے اچھا ذریعہ ہے لہٰذا ہم سب کو ایک مذہب ماننا چاہیے تو چونکہ اتحاد مذہب ترقی قومی کا موقوف علیہ ہے اس لیے مجبوراً اس کو مانا جاتا ہے تا کہ ان کا تمدن اور ترقی محفوظ رہے۔ اس جماعت کے نزدیک اسلام کی جو وقعت ہے وہ بالکل ہی ظاہر ہے یعنی اس نے مذہب اسلام کو ایک دنیوی مطلوب کے حصول کا آلہ قرار دیا اور آلہ خود مقصود بالذات نہیں ہوا کرتا بلکہ اگر

کبھی مقصود کسی دوسرے طریقے سے حاصل ہونا ممکن ہو تو آلہ کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یقینی ہے کہ اگر بدون اتحاد فی المذہب کے کسی دوسرے طریقہ سے تمدنی ترقی ان لوگوں کو حاصل ہو سکے تو ہرگز یہ متحد فی المذہب نہ رہیں یا کم از کم اس اتحاد کو غیر ضروری سمجھنے لگیں یا اگر اتحاد پر تو موقوف ہو لیکن اتحاد فی الاسلام پر موقوف نہ ہو تو ہرگز یہ لوگ مسلمان نہ رہیں۔

توحید بلا رسالت

چنانچہ اسی جماعت کے ایک صاحب حال نے یہ رائے پیش کی تھی کہ دنیا میں سب کے لیے ایک مذہب ہونا چاہیے اور وہ مذہب توحید ہے غیر موحدین کو توحید اختیار کرنا چاہیے اور اہل توحید کو اعتقاد رسالت کی قید سے قطع نظر کرنا چاہیے اگر کوئی شخص رسالت سے مختلف الرائے ہو تو کچھ مضائقہ نہیں اس کو مذہب کا مخالف نہ سمجھنا چاہیے۔ (نعوذ باللہ من شرور انفسنا) اللہ تعالیٰ ہم کو ہمارے نفس کی برائیوں سے بچائے) صاحبو! یہ وہی مذہب ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے۔ ع

از مذہب من گیرد مسلماں گلہ دارد

اور لیجئے ایک مسلمان نے ایک مجمع میں کہا کہ توحید پر مدار نجات ہے۔ رسالت کا اقرار کوئی ضروری مسئلہ نہیں ہے اگر اس کا کوئی منکر بھی ہو تو اس کی نجات ہو جائے گی میں نے جواب میں کہا کہ توحید کو تو موقوف علیہ نجات کا مانا جاتا ہے اب سمجھو کہ توحید کی حقیقت کیا ہے؟ سو توحید کی حقیقت یہ ہے کہ ہم ایسا معبود ایک مانیں کہ نہ اس کا کوئی شریک و سہیم ہو نہ کمالات میں کوئی حالت منتظرہ اس میں باقی ہو نہ عیوب میں سے کوئی عیب اس کے اندر پایا جاتا ہو۔ اگر کوئی عیب خدا میں کوئی مانے وہ توحید کا منکر ہوگا اور من جملہ عیوب کے ایک عیب وقوع کذب بھی ہے لہٰذا جس میں کذب پایا جائے گا وہ خدا نہ ہوگا اور قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''محمد رسول اللہ'' تو جو شخص آپ کو رسول نہ مانے اس نے خدا کو کاذب کہا اور جو کاذب کہے وہ موحد نہیں۔ پس جو شخص آپ کو رسول نہ مانے وہ موحد نہیں پس انکار رسالت مستلزم ہے انکار خدا کو تو ثابت ہوا کہ منکر رسالت کو تمہارے ہی قاعدے سے نجات نہیں ہو سکتی اور میں نے کہا کہ قیامت تک اس کے جواب کی مہلت دیتا ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ غرض ان لوگوں کا مذہب محض ان کی قوم ہے۔

نامبارک بیداری

اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی کسی اسلامی خدمت سے مسلمانوں کا دل خوش نہیں ہوتا کیونکہ ان کی تمام خدمات قوم کی بنیادی ترقی کے لیے ہوتی ہیں' اسلام کے لیے نہیں ہوتیں۔ دلیل اسکی یہ

ہے کہ اگر یہ خدمات اسلام کے لیے ہوتیں تو اس کی غایت رضا خداوندی ہوتی جو کہ اسلام کی اصلی غایت ہے اور اگر یہ غایت ہوتی تو اس کے آثار بھی ضرور نمایاں معلوم ہوتے اور ہر ہر کام میں اسکی جھلک موجود ہوتی حالانکہ ہم اس کے برخلاف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اہل دین اور خادمین مذہب کو نہایت درجہ ذلیل سمجھتے ہیں اور ان پر تمسخر کرتے ہیں۔ نماز' روزہ عبادات میں شکوک پیدا کیے جاتے ہیں تو اگر یہ لوگ مذہب اسلام کو حق سمجھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی رضا کے جویاں ہیں تو ان حرکات کی کیا وجہ؟ معلوم ہوا کہ محض قوم کے لیے سب خدمات کی جاتی ہیں اور طرہ یہ کہ قوم کے لیے بھی جو کچھ نامبارک بیداری پیدا ہوئی وہ دوسری قوموں کو ہندوؤں' آریوں' عیسائیوں کو دیکھ کر اور نامبارک بیداری اس لیے کہا گیا کہ دین سے لاپروائی اور اعتراضات اسی بیداری کا نتیجہ ہیں ان کے لیے اس بیداری سے خواب ہی بہتر تھا۔

ظالمے را خفتہ دیدم نیم روز گفتم ایں فتنہ است خوابش بردہ بہ
آنکہ خوابش بہتر از بیداری است آں چناں بد زندگانی مردہ بہ

(میں نے ایک ظالم شخص کو دوپہر میں سوتے ہوئے دیکھا' میں نے دل میں کہا یہ ایک فتنہ ہے اس کا سونا ہی بہتر ہے اور جو شخص ایسا ہو کہ جاگنے سے اس کا سونا ہی بہتر ہو ایسی بری زندگی والے کا مر جانا ہی بہتر ہے)

اعتراف خطا

صاحبو! ہمارے پرانی وضع کے امراء اگرچہ بہت سے قبائح میں گرفتار ہیں' گنہگار ہیں' بدعمل ہیں لیکن ان میں اتنی بات اب بھی باقی ہے کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام یا ارشادات واحکام سن کر شرمندہ ہو جاتے ہیں اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں اپنے کو خطاوار سمجھتے ہیں' خدا کے نیک بندوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ وہ اگرچہ بھنگڑ ہی ہوں لیکن ان میں فروتنی عجز و انکسار نیک نیتی ضرور ہے تو ایسے لوگ عملی غلطی میں مبتلا ہیں اور ایسے قابل رحم ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کے ایک شہر کے متعلق میرے ایک بزرگ کہتے تھے کہ اس جگہ کے فقیر جہنمی اور امیر سب جنتی ہیں کیونکہ امراء تو فقراء کو اللہ والا سمجھ کر ان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور فقراء تحصیل مال و جاہ کے لیے امراء سے ملتے ہیں۔ آج کل کے پیروں کی حالت سوچ کر مجھے ایک شخص کا خواب یاد آتا ہے کہ اس نے اپنے پیر سے کہا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے یعنی یہ کہ میری انگلیوں میں نجاست لگی ہے اور آپ کی انگلیوں میں شہد لگا ہے۔ پیر صاحب نے کہا تو دنیا کا کتا گنہگار ہے ہم تارک

دنیا ہیں ایسا تو ہونا ہی چاہیے۔ مرید نے عرض کیا کہ حضور ابھی خواب ختم نہیں ہوا میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں آپ کی انگلیاں چاٹ رہا ہوں اور آپ میری انگلیاں۔ اس پر پیر صاحب بہت خفا ہوئے' خیر یہ خواب تو خواہ صحیح ہو یا غلط لیکن آج کل کے مکار اور طالب دنیا پیروں کی حالت تو واقعی ایسی ہی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ پرانی وضع کے لوگ اگر چہ رند بھی ہوں لیکن وہ دین کا جو کچھ کام کرتے ہیں دین کی نیت سے کرتے ہیں تو ان لوگوں میں اگر چہ بیدار مغزی نہیں بلکہ نری رندی ہے لیکن ان کی حالت پر یاد آتا ہے کہ:

گنہ آمرز رندان قدح خوار بطاعت گیر پیران ریا کار

(ان شراب خور آزاد لوگوں کے جو پیالے پر پیالے چڑھاتے ہیں اور نئے نئے گناہ ایجاد کرنے والے ہیں ریا کار پیروں کے اطاعت گزار ہیں گناہ معاف فرما!)

ایک بھنگڑ بھی اگر ان کے سامنے خدائی کا حکم بیان کرے تو وہ خوف زدہ ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ اگر چہ بدعمل ہیں لیکن ان میں قوت ایمانیہ ضرور ہے اور اس قوت ایمانیہ کی بدولت ایسے لوگ پیروں سے بھی تعلق رکھتے ہیں اگر چہ اپنی جہالت اور کم علمی کی وجہ سے پیر پرستی تک نوبت پہنچادی ہے بلکہ پیروں سے گزر کر قبر پرستی تک پہنچ گئے ہیں لیکن ان گنہگاروں میں اور بیدار مغز آزادوں میں موازنہ کر کے "رحم الله النباش الاول" (اللہ تعالیٰ پہلے کفن چور پر رحم کریں) یاد آتا ہے۔ یہ زبان عربی کی ایک مثل ہے جس کا قصہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک شخص نباشی کیا کرتا تھا۔ اہل شہر اس سے سخت عاجز تھے کہ یہ مر جائے' آخر ایک روز وہ مر گیا اسکے مرنے کے بعد اس کے لڑکے نے پدری کام انجام دینا شروع کیا لیکن اتنا اضافہ بھی اس کام میں کرلیا کہ کفن چرا کر مردہ کے ایک میخ ٹھوک دیتا تھا' اس پر یہ مثل جاری ہوئی اور عام ہو کر ہر ایسے موقع پر کہ دو برے آدمیوں میں سے دوسرا پہلے سے زیادہ برا ہو بولی جانے لگی تو نباشی کے اعتبار سے اگر چہ پہلا اور دوسرا دونوں قابل نفرت ہیں لیکن اضافہ کی رو سے دوسرا زیادہ قابل ملامت ہے اور پہلا اس کے مقابلے میں قابل مدح۔ اسی طرح نفس گناہ کے اعتبار سے دونوں فرقوں کی حالت افسوس کے قابل ہے لیکن پرانی وضع کے لوگ ابھی تک دولت ایمان سے بہرہ ور ہیں اور ان کی یہ حالت کسی درجے میں اب بھی یہ ہے کہ: "اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا" کہ جب ان کے سامنے خدا تعالیٰ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور اس کے احکام سنائے جاتے ہیں تو ان کے ایمان کو قوت ہوتی ہے اور اپنی بدعملی پر رنج اور افسوس ہوتا ہے۔ برخلاف اس نو پیدا جماعت کے کہ یہ لوگ اکثر عملی خرافات سے تو پرہیز

کرتے ہیں ناچ نہیں دیکھتے' فضول رسوم کو روکتے ہیں' بیوی کو فضول زیور بنانے سے روکتے ہیں وغیرہ وغیرہ اگرچہ یہ سب باتیں بھی ان لوگوں کی دوسروں ہی کے لیے ہیں۔ مثلاً بیوی کو تو فضول روپیہ خرچ کرنے سے روکتے ہیں اور خود سینکڑوں روپیہ ہارمونیم وغیرہ خرافات میں برباد کر دیتے ہیں اور ان لوگوں کی اس روک ٹوک کو دیکھ کر بھولے بھالے مولوی بہت خوش ہوتے ہیں حالانکہ یہ کوئی مسرت کے قابل نہیں اس لیے کہ یہ ممانعت خلاف شرع ہونے کی نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ اس قسم کی رسوم وغیرہ خلاف عقل ہیں اور اگر شریعت کے خیال سے ممانعت ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ رسوم شادی غمی کو تو روکا جائے اور سود و رشوت کی آمدنی کو حلال بنانے کی کوشش کی جائے۔ غرض یہ کہ یہ جماعت ظاہری حالت کے اعتبار سے سراپا مذہب ہے مگر مذہب سے بالکل الگ ہے اور ان کا سارا اسلام محض دنیا کی درستی ہے اور اسی لیے ان کی ذکاوت یا جدت بالکل قابل قدر نہیں ہے میرے نزدیک ان لوگوں کی سرحد بھی قسم اول بعض منکرین اسلام کی سرحد سے ملی ہوئی ہے' گو ملک الگ الگ ہیں لہٰذا ان کی حالت بھی نہایت خطرناک ہے اور چونکہ یہ لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اس لیے ہم بھی خاموش ہیں ورنہ انصاف یہ ہے کہ ان لوگوں میں کوئی بات بھی اسلام کی نہیں ہے بلکہ ہر ہر بات اسلام کے خلاف ہے۔

اہل ترقی کا علاج

اور اس کا علاج یہی ہے کہ چند روز کسی صاحب باطن کے پاس رہے۔ میں نہایت شفقت سے کہتا ہوں کہ اگر اپنی اصلاح کی فکر ہے اور اصلاح کو ضروری سمجھتے ہو تو چند روز کسی مولوی کے پاس رہ لو اگر کہو کہ مولوی تو سب کھانے پینے کے ہوتے ہیں ان کے پاس رہنے سے اصلاح کیونکر ہوگی تو میں کہتا ہوں کہ یہ خیال بالکل غلط ہے تم سب مولویوں کے پاس تھوڑا تھوڑا قیام کر کے دیکھ لو ان شاء اللہ تم کو اپنی غلطی خود معلوم ہو جائے گی اور دیکھ لو گے کہ سب ایک طرح کے نہیں ان میں تمہیں مصلح بھی ملیں گے اور اگر ایسا کرنا یعنی ایک کو دیکھ کر آزما کر پھر دوسرے کی طرف رجوع کرنا دشوار معلوم ہو تو میں کہوں گا کہ اگر کسی بازاری عورت سے محبت ہو جاتی ہے اور لوگ تم کو وصال کی امیدیں دلا کر رہبری کا وعدہ کرتے ہیں اور پھر دھوکے پر دھوکہ دیتے ہیں اس وقت ہر مدعی رہبری کے ساتھ کیوں ہو لیتے ہو اور یہ یارو عذر اس وقت کہاں چلے جاتے ہیں۔ صاحبو! خدا تعالیٰ کے ساتھ اتنی محبت بھی نہیں؟ اور اس کے طریق کی اتنی جستجو بھی نہیں ہو سکتی؟ مولانا نے خوب کہا ہے:

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود
(مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہوتا ہے بلکہ اس کے عشق میں کوچہ میں پھرنا زیادہ بہتر ہے)

صاحبو! اگر ہر تعطیل میں ایک ہفتہ ایک ایک بزرگ کے پاس قیام کرلو تو کیا بڑا حرج ہوجائے؟ پھر جب کوئی شافی کافی مل جائے پس اس کو لے لو۔ ایک مرتبہ اختلال عمل کا یہ ہے کہ اعتقادات سب درست ہوں مگر کاہلی اور حظوظ پرستی کی وجہ سے دنیا میں انہاک ہوا اور نفس پرستی درستی اعمال نہ کرنے دیتی ہو۔

مراقبہ موت

اس طبقے کا علاج یہ ہے کہ ان کو چاہیے کہ موت کو یاد کریں' موت وہ چیز ہے کہ اس کے یاد کرنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ ہر طرح حالت درست ہوجائے گی کیونکہ اعتقاد تو پہلے سے صحیح ہے صرف حظوظ کو کم کرنے کی ضرورت ہے اس کا علاج اس سے ہوجائے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے: "اَکْثِرُوْا ذِکْرَ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتَ"[1] (لذتوں کو ختم کردینے والی یعنی موت کا ذکر زیادہ کیا کرو) اس حدیث کے الفاظ خود غور کرنے کے قابل ہیں کہ اول موت کی صفت کو بیان کیا اس کے بعد موت کے نام کی تصریح فرمائی جس سے اس امر اکثروا کی حکمت دریافت ہوگئی۔ یعنی موت زیادہ یاد کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے لذات کی جڑ اکھڑ جاتی ہے ا: سہل ترکیب اس کے یاد کرنے کی یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کرکے مراقبہ موت کیا کرنے اور سوچا کرے کہ ایک دن میں مروں گا' دوزخ اور جنت میرے سامنے پیش کی جائے گی' اگر میں گنہگار مروں گا تو جنت کو مجھ سے چھپالیا جائے گا اور تا قیامت مجھ کو عذاب قبر ہوجائے گا' پھر قیامت آئے گی اور سب کے نامہائے اعمال ان کو دکھلائے جائیں گے' اس کے بعد حساب ہوگا' اگر خدانخواستہ میری ناشائستہ حرکات بڑھ گئیں تو فرشتے کشاں کشاں مجھے جہنم کی طرف لے جائیں گے وغیرہ وغیرہ اس مراقبے سے ان شاء اللہ تعالیٰ انہماک فی الدنیا کا مرض بالکل زائل ہوجائے گا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دن میں بیس دفعہ موت کو یاد کرے گا اس کو شہادت حاصل ہوگی مگر موت کے یاد کرنے کے یہ معنی نہیں کہ لفظ موت کو بیس دفعہ ہرالیا جائے اس لیے کہ موت کو یاد کرنے سے شہادت کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے آپ کو بالکل سونپ دے گا اور تسلیم کردے گا اور اس کے حظوظ نفسانی بالکل چھوٹ جائیں گے اور یہ ان لوگوں میں ہوگا کہ:

---

[1] (سنن الترمذی: ۲۳۰۷' سنن النسائی ۴: ۴' سنن ابن ماجہ: ۴۲۵۸)

کشتگان خنجر تسلیم را   ہر زماں از غیب جان دیگر است

(جو لوگ تسلیم و رضا یعنی عشق کی تلوار کے مارے ہوتے ہیں غیب کی جانب سے ہر گھڑی ان کو نئی زندگی حاصل ہوتی ہے)

بس موت کو یاد کرنا وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ یہ تقسیم تو اہل دنیا کے حالات کے اعتبار سے تھی۔

تقدس ظاہری

اب اہل دین کی خدمت میں متوجہ ہوتا ہوں۔ ان میں ایک تو اہل ظاہر ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ بعض اعمال جو عرفاً ان کی وضع کے خلاف نہیں ہیں اگرچہ شرعاً منہی عنہ ہیں وہ ان میں مبتلا ہیں اور جن اعمال سے ان کے ظاہری تقدس پر حرف آنے کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کرتے ہیں۔ مثلاً غیبت کہ بہت بڑا گناہ ہے مگر چونکہ عادتاً خلاف تقدس نہیں سمجھا جاتا اس لیے اکثر ایسے لوگ اس میں مبتلا ہیں اور جب بیکار چار آدمی بیٹھتے ہیں تو غیبت شکایت ضرور کرتے ہیں اور شراب پینا چونکہ تقدس کے خلاف ہے اس لیے اس کے پینے سے احتراز کرتے ہیں اور غضب یہ ہے کہ ایسے لوگ خود بھی اپنے کو مقدس سمجھتے ہیں۔ سبحان اللہ یہ عجیب تقویٰ ہے کہ کچھ ہی کر لیجئے پھر متقی کے متقی رہیے تو گویا ایسے لوگوں کا تقویٰ بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ اسے ایک مرتبہ کسی بزرگ نے وضو کرا دیا تھا پھر ساری عمر اسی ایک وضو سے اس نے نماز پڑھی تو جیسے بی بی تمیزہ کا وضو نہ پیشاب سے ٹوٹتا تھا اور نہ پاخانہ سے ایسا ہی ان متقیوں کا تقویٰ نہ غیبت سے ٹوٹتا ہے نہ شکایت سے' کچھ ہی کرلیں مگر یہ تاج الاتقیا بنے رہیں گے۔ صاحبو! اگر یہ اس کو گناہ نہیں سمجھتے تو یہ سخت غلطی ہے اور اگر گناہ سمجھتے ہیں اور پھر اس بے پروائی کے ساتھ مبتلا ہیں تو بہت ہی سخت غلطی ہے۔

فان کنت لاتدری فتلک مصیبة   وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

(اگر تو نہیں جانتا تھا اس لیے گناہ کیا تب تو گناہ ہے ہی اور اگر جانتا ہے اور پھر گناہ کیا تو بہت بڑا گناہ ہے)

اس کا علاج یہ ہے کہ:

قال را بگذار مرد حال شو   پیش مرد کامل پامال شو

(باتیں بنانا چھوڑ دو اہل حال بنو اور اس کام کے لیے کسی مرد کامل ولی کی خدمت کرو!)

تاثیرِ صحبت

آج تک آپ لوگوں نے قال یقول کی خدمت کی ہے اس لیے شریعت کا رنگ نہیں چڑھا۔ اب ذرا تھوڑے دنوں کے لیے اس کو چھوڑ کر حال پیدا کیجئے! مگر یہ بدون صحبت اہل اللہ کے نہیں ہوتا۔ چند روز تک ان کی صحبت کی نہایت ضرورت ہے اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ سب گناہ چھوٹ جائیں گے۔ اس مقام پر ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو کہ اہل حال سے خود گناہوں کا صدور ہوتا ہے تو ان کی صحبت سے دوسروں کے گناہ کیونکر چھوٹ جائیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ان حضرات سے گناہ بہت کم ہوتا ہے دوسرے اگر کبھی ابتلا ہو جاتا ہے تو فوراً ان کو تنبہ ہوتا ہے اور وہ ندامت و گریہ وزاری سے اسے معاف کرا لیتے ہیں ہم لوگوں کو نہ تنبہ ہوتا ہے نہ اس پر کڑھتے ہیں ہم کو شیطان نے سمجھا دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے اس لیے جو جی میں آئے کرو اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنے کو اس سے خارج سمجھتا ہوں' ہم ہی لوگوں کی بابت حافظ رحمۃ اللہ کہتے ہیں:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند   چوں بخلوت میر سند ایں کار دیگر میکنند

(تقریریں کرنے والے جو محراب و منبر پر بیٹھ کر بڑا شاندار وعظ کہتے ہیں جب خلوت اور تنہائی میں جاتے ہیں تو جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں)

مگر ہم واعظوں نے اس کے ایک نئے معنی گھڑے ہیں یعنی حافظؒ کا مطلب یہ ہے کہ جب خلوت میں جاتے ہیں تو ذکر اللہ میں مشغول ہو جاتے ہیں لیکن اس کے بعد کا شعر اس معنی کی گنجائش نہیں چھوڑتا:

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس   توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمترے کنند

(مجھے ایک مشکل یہ درپیش ہے کہ کوئی مجلس میں بیٹھنے والے عقلمند سے پوچھے کہ دوسروں کو توبہ کا حکم کرتے ہیں خود کیوں بہت کم توبہ کرتے ہیں)

یعنی دوسروں کو تو گناہوں سے روکتے ہیں اور طاعات کی ترغیب دیتے ہیں اور خود اس آیت کے مصداق بن رہے ہیں:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ○ اور اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ○

(اے مسلمانو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم خود نہیں کرتے؟ کیا تم لوگوں کو تو بھلائی کا حکم کرتے ہو؟ اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کو پڑھتے ہو)

یہاں بعض لوگوں کو اس میں یہ شیطانی دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ وعظ ہی چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب ہماری حالت خود ہی درست نہیں تو ہم دوسروں کو کس منہ سے کہیں حالانکہ یہ دوسرا جرم ہے کیونکہ انہوں نے ترک عمل بھی کیا اور ترک تبلیغ بھی کیا۔ ان نااہل ظالموں میں مذکورہ بالا کمی کے ساتھ ایک کمی یہ بھی ہے کہ چونکہ ان میں نسبت مع اللہ راسخ نہیں ہوتی اس لیے اس کے خواص و آثار سے بھی خالی ہوتے ہیں۔

تعلیم استغناء

اور اس سبب سے ایک گونہ محبت مال سے ان کو ہو جاتی ہے اور اس محبت مال کے سبب ایسے لوگ اہل دنیا کے پاس جا کر اپنی حالت ظاہر کرتے ہیں اور ان کی نظروں میں ذلیل ہوتے ہیں اور ان کی ذلت کی وجہ سے علم دین کی ذلت ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو یہ سمجھنا چاہیے: "**بئس الفقیر علی باب الامیر**" (وہ درویش بہت برا ہے جو امیر کے دروازہ پر جاتا ہے) ان کی تو یہ حالت ہونی چاہیے کہ ایک بزرگ کے پاس ایک بادشاہ گئے وہاں خدام کا پہرہ تھا۔ بادشاہ نے اندر جانے کی اجازت چاہی، خدام نے اجازت نہ دی اور کہا کہ اول میں شیخ سے دریافت کرلوں اگر وہاں سے اجازت ہوگئی تو اجازت دیدوں گا۔ چنانچہ شیخ سے جا کر عرض کیا اور شیخ کے اجازت دینے پر آ کر بادشاہ کو اجازت دیدی، بادشاہ کو چونکہ اس قسم کی روک ٹوک کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی، سخت ناگوار گزرا اور شیخ کے روبرو جا کر برہمی کے لہجے میں کہنے لگا کہ ع۔ در درویش را دربان نباید (درویش کے دروازہ پر دربان نہیں رہنا چاہیے) اس کو سن کر شیخ نے اس کے تکبر کے مقابلہ میں نہایت بے باکانہ انداز سے فرمایا کہ ع۔ بباید تا سگ دنیا نیاید (دربان ضرور چاہیے تاکہ کوئی دنیا کا کتا نہ گھسے) اور وجہ اس بے پروائی اور استغناء کی یہ ہوتی کہ ع۔ طمع بگسل و ہر چہ خواہی بگو (حرص اور لالچ کو چھوڑ دو پھر جو جی میں آئے کہو یعنی لالچی آدمی حق بات نہیں کہہ سکتا) حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ پیر پھیلائے ہوئے بیٹھے تھے کہ بادشاہ مع وزیر کے آیا، بادشاہ کو دیکھ کر آپ اسی طرح بیٹھے رہے، وزیر کو آپ کا یہ انداز گراں گزرا اس نے کہا کہ حضرت پیر پھیلا کر بیٹھنا کب سے سیکھ لیا۔ فرمایا کہ جب سے ہاتھ سمیٹ لیا ہے۔ اس کے بعد وزیر نے کہا کہ بادشاہ اولی الامر میں داخل ہے اس کی تعظیم آپ کو کرنی چاہیے۔ فرمایا بادشاہ تمہارے اولی الامر میں ہوگا میرے تو غلام کا غلام ہے۔ وزیر نے کہا کہ حضرت یہ کیسے؟ فرمایا کہ ہواؤ ہوس میرے غلام ہیں اور بادشاہ ہواؤ ہوس کا غلام ہے۔ لہذا میرے غلام کا غلام ہوا۔ مولانا شہیدؒ کا واقعہ ہے کہ جب آپ لکھنؤ تشریف لائے تو ایک شہزادہ خدمت میں حاضر ہوا

اور زمین بوس سلام کیا' آپ نے اس سلام کے جواب میں اس کو انگوٹھا دکھلایا' آج تو اگر کوئی معمولی زمیندار مرید ہو جائے تو بسا غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ آخر یہ کیا بات تھی؟ بات یہی تھی کہ ان حضرات کے دل میں دنیا کی نہ وقعت تھی نہ محبت اور پھر یہ بھی نہیں کہ ان حضرات کی زندگی تکالیف میں بسر ہوئی ہو بخدا ان کی زندگی ایسی آسائش میں بسر ہوتی ہے کہ دوسروں کو وہ آسائش نصیب بھی نہیں ہوتی۔ اگر کسی کو اس میں کلام ہو تو وہ آج بھی بزرگوں کی حالت کو جا کر دیکھ لیں کہ وہ کس قدر آسائش میں ہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان حضرات کو ظاہری بے لطفی کسی قسم کی ہوتی بھی ہے تو یہ سمجھ لو کہ ان کے دل میں ایک ایسی چوٹ لگی ہے کہ اس بے لطفی میں ہزاروں لطف ہیں۔ غرض اس فرقہ میں حب مال کا مرض ہے اس کا علاج بھی وہی ہے کہ اہل باطن کی صحبت سے ان کو مستفیض ہونا چاہیے۔

اصلاح مشائخ

دوسرا فرقہ اہل دین میں وہ ہے جو اہل باطن کہلاتے ہیں یہ لوگ اپنے دل میں بہت خوش ہوں گے کیونکہ سارے فرقوں میں تو کوتاہیاں اور عیب نکال دیئے گئے اب صرف یہی ایک فرقہ رہ گیا ہے کہ درجہ بدرجہ ترقی ہو کر یہی فرقہ ایسا نکلے گا جس میں کوئی عیب نہ ہو اور اپنے مقابلین میں سب سے اچھے یہی ثابت ہوں گے۔ سو غرض یہ ہے کہ یہ حضرات سب اچھے ہیں لیکن یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز زیادہ لطیف ہوتی ہے اگر وہ بگڑتی ہے تو دوسری سب چیزوں سے زیادہ بدبو اسی میں پیدا ہوتی ہے اور یہ حضرات دوسرے سب فرقوں سے لطافت اور نظافت میں بڑھے ہوئے ہیں اس لیے ان میں اگر کچھ خرابی پیدا ہو گئی تو سب سے زیادہ بدبو نما ہو گی۔ سو اس فرقے میں خدا کے فضل و کرم سے وہ عیوب تو نہیں ہیں جو مذکورہ بالا فرقوں میں تھے مگر انصاف یہ ہے کہ یہ بھی کوتاہیوں سے خالی نہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں میں یہ کوتاہی ہے کہ انہوں نے بالکل یکسوئی اختیار کر کے اس کو ایسا ضروری اور اپنا مابہ الامتیاز سمجھا کہ بیچارے دنیا داروں سے بد خلقی برتنی شروع کر دی حالانکہ یہ شریعت میں مطلوب نہیں' شریعت نے بدخلقی کی سخت ممانعت کی ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ فقراء کو بدخلقی نہ ہونا چاہیے۔

تعظیم امراء

اور فرماتے تھے کہ بزرگوں کا ارشاد ہے: "**بئس الفقیر علی باب الامیر و نعم الامیر علی باب الفقیر**" (برا ہے درویش کا امیر کے دروازہ پر جانا' وہ امیر بہت اچھا ہے جو درویش کے دروازہ پر جاتا ہے) تو جب کوئی امیر فقیر کے دروازہ پر جاتا ہے تو وہ نعم کا مصداق ہو کر رہ جاتا ہے اس

واسطے ہم کو اس نعم کی تعظیم کرنی چاہیے۔ اگرچہ من حیث الامیر اس کی تعظیم نہ ہو اور اسی بناء پر حضرت حاجی صاحبؒ امراء کی بہت تعظیم فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "انزل الناس علی قدر منازلھم" (مرتبہ کے اعتبار سے لوگوں سے پیش آ!) یہ تو نقل تھی حضرت رحمۃ اللہ کے ارشاد اور برتاؤ کی اس کے ماسوا ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ امراء کو جو وصف امارت حاصل ہوا ہے خدا تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوا ہے لہٰذا ہم کو ضروری ہے کہ اس کے حق میں رعایت کریں' البتہ ان سے تعلق نہ کرنا چاہیے بس یہ برتاؤ رکھنا چاہیے کہ جو تمہارے پاس آئے خوش ہو کر جائے۔ صاحبو! اگر آپ لوگ امراء کو اپنے پاس نہ آنے دیں گے اور ان سے بدخلقی سے پیش آئیں گے تو آخر وہ لوگ کہاں جائیں گے اور کس جگہ اپنا ٹھکانا تلاش کریں گے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ تم خود ان کے دروازے پر نہ جاؤ مگر اس میں بھی اس قدر تفصیل ہے کہ اگر تم سے اصلاح ناس متعلق ہو اور امراء تم کو خود بلائیں تو بشرط عدم تذلل چلے جاؤ اس میں انکار نہ کرو۔ مجھ سے بعض امراء نے یہ اعتراض پیش کیا کہ علماء ہماری خبر نہیں لیتے۔ میں نے کہا کہ جناب کبھی آپ بھی تو توجہ کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ علماء آپ کی دستگیری کرتے ہیں یا نہیں۔ صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ علماء پر دستگیری نہ کرنے کا الزام بالکل غلط الزام ہے۔ امراء توجہ تو خود نہیں کرتے حالانکہ یہ ان کا کام ہے اور الزام علماء پر رکھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان کو طلب حق ہی نہیں ورنہ ممکن نہ تھا کہ چین سے بیٹھ سکتے۔

توفیق ذکر

ایک کوتاہی ان میں یہ ہے (اور اسی کوتاہی کی وجہ سے یہ بھی من وجہ تحبون العاجلہ کے مصداق ہیں کہ ذکر کے آثار عاجلہ کو مطلوب سمجھتے ہیں۔ البتہ محققین اس سے مستثنیٰ ہیں۔ باقی محققین کے علاوہ اکثر اس کے منتظر رہتے ہیں کہ دل میں کچھ گرمی پیدا ہو یا کچھ نظر آنے لگے۔ صاحبو! یہ بہت کمی ہے اور یہ ایسا نقص ہے کہ اکثر اس پر نظر بھی نہیں جاتی اس کا علاج علمی تو یہ ہے جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی کوئی شخص آ کر شکایت کرتا اور کہتا کہ حضرت مجھے نفع نہیں ہوا تو فرمایا کرتے کہ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم اللہ کا نام لیتے ہو اور مثنوی سے استشہاد فرمایا کرتے تھے۔ مولانا کی مثنوی میں ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ روزانہ ذکر کیا کرتا تھا لیکن اس کو کوئی اثر مرتب ہوتا ہوا معلوم نہ ہوتا تھا۔ آخر ایک روز مایوس ہو کر ذکر کیے بغیر ہی سو گیا' خواب میں ایک فرشتے کو دیکھا اور اس نے یہ سوال کیا کہ آج تم نے ذکر کیوں نہیں کیا' کہنے لگا کہ کچھ نفع تو ہوتا ہی نہیں نہ وہاں سے کچھ جواب ملتا ہے ارشاد ہوا کہ:

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ویں نیاز و سوز و درد پیک ماست

(انہوں نے کہا کہ تیرا اللہ اللہ کہنا ہی ہماری طرف سے لبیک کہنا اور قبول کرنا ہے یہ تیرا نیاز اور سوزش اور درد سب ہمارے ہی تو دیئے ہوئے ہیں)

کہ تمہارا اللہ اللہ کہنا یہ ہی ہمارا لبیک کہنا ہے اور یہی جواب دینا ہے اور اس کو ایک مثال سے واضح فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم کسی صاحب اختیار رئیس کے پاس جاؤ اور اس کو تمہارا جانا ناپسند ہو تو وہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا۔ ظاہر ہے کہ دوسرے وقت گھسنے بھی نہ دے گا پس خدا تعالیٰ کا پانچوں وقت کی نماز کے لیے مسجد میں آنے کی قوت باقی رکھنا ذکر کی توفیق عطا فرمانا یہ دلیل ہے اس کی کہ تمہارا پہلا عمل ناپسند نہیں ہوا ورنہ کوئی ایسا سخت پہرا ہوتا کہ تم مسجد میں گھسنے بھی نہ پاتے اور پہرے سے مراد ظاہری پہرہ نہیں بلکہ وہ پہرا مراد ہے جو کہ ایک نوکر اور آقا کے قصے میں ہوا تھا کہ دونوں بازار کام کو چلے' راستہ میں نماز کا وقت آ گیا' نوکر نمازی تھا' آقا سے اجازت لے کر مسجد میں چلا گیا اور آقا دروازے پر بیٹھا رہا' جب بہت دیر ہوئی آقا نے پکارا کہ بھائی باہر کیوں نہیں آتا' نوکر نے کہا کہ آنے نہیں دیتا' آقا نے کہا کہ کون نہیں آنے دیتا' کہنے لگا کہ مجھے وہی باہر آنے نہیں دیتا جو تمہیں اندر نہیں آنے دیتا' تو یہ پہرہ ہے جو کہ ایک قدم آگے بڑھنے نہیں دیتا اور جبکہ عمل کا مسلسل سلسلہ چلا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ سب مقبول ہو رہا ہے۔ یہ مولانا رومیؒ اور حاجی صاحب نوراللہ مرقدہ کی تحقیق ہے۔

بے پایاں جستجو

ایک اور ملفوظ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ کا اس موقع پر یاد آ گیا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ لوگ آ کر کچھ فائدہ نہ ہونے کی شکایت فرماتے تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ جواب میں یہ ارشاد فرمایا کرتے:

یابم اور ایا نہ یابم جستجوئے میکنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

(اس کو پاؤں یا نہ پاؤں جستجو کرتا رہوں کچھ حاصل ہو یا نہ ہو بس آرزو کرتا رہوں)

اس کا حاصل یہ ہے کہ نفع بھی نہ ہو تب بھی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے اس واسطے کہ ہم مخلوق اور غلام ہیں' غلام کا یہ منصب نہیں کہ وہ کام کے معاوضہ کا امیدوار ہو' اگر کسی غلام سے یہ کہا جائے کہ جا کر کنویں سے پانی لے آؤ اور وہ کہے کہ مجھے اس کے معاوضہ میں کیا ملے گا تو وہ نہایت گستاخ ہے تو ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم غلام ہیں اور اس وجہ سے ہم کو حکم ہے۔ اسی پر فرماتے ہیں۔ ع

حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم ۔ اس کے استشہاد میں بوستان کی ایک حکایت یاد آئی ۔ شیخ نے بوستان میں ایک شخص کی حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص روزانہ عبادت کیا کرتا' آخر ایک روز یہ آواز آئی کہ خواہ کچھ ہی کرو ہرگز قبول نہ ہوگا یعنی عدم النفع معلوم ہوگیا لیکن وہ پھر بھی عبادت میں مشغول رہا' اس قصے کی خبر اس کے ایک مرید کو بھی ہوئی اس نے کہا کہ جب وہاں قبول ہی نہیں ہے تو عبادت کرنے سے کیا فائدہ؟ انہوں نے جواب دیا کہ اے عزیز:

توانی ازاں دل پرداختن   کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن

(اس کی طرف سے اپنے دل کو جب ہٹایا جاسکتا ہے جبکہ میں یہ یقین کروں کہ اس کے بغیر گزر ہوسکتی ہے)

قلب کو اس سے فارغ کرسکتے ہیں جس کے بدون گزر ہوجانے کی امید ہو اور جبکہ یہ نہیں ہے تو میں اب کہاں جاؤں' معاً بحر رحمت جوش میں آیا اور یہ ارشاد ہوا کہ:

قبولست گرچہ ہنر نیستت   کہ جزما پناہ دگر نیستت

(تمہاری سب عبادتیں قبول ہیں اگرچہ یہ تمہارا کوئی کمال اور ہنر نہیں مگر چونکہ تمہارے لیے سوائے میرے اور کوئی پناہ کی جگہ ہے ہی نہیں)

کہ چونکہ کوئی پناہ نہیں ہے اس لیے قبول کرتا ہوں تو ہمارا یہ مذہب ہونا چاہیے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم اپنا کام کیے جائیں باقی ثمرات کا ترتب؟ اس پر ذرا بھی نظر نہ ہونی چاہیے:

بدرود صاف ترا حکم نیست دم درکش   کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطافست

(شراب کے نیچے کا تلچھٹ ہو یا صاف شراب ہو تجھے سوچنے کی ضرورت نہیں بس چڑھا جا کیونکہ ہمارے ساقی نے جو کچھ بھی دیا ہے اس کی عین مہربانی ہے)

اور اگر ایسا نہ کیا تو تم ہی "یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ" (بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو) میں ہو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کے نتیجے کا وعدہ آخرت میں ہے نہ کہ دنیا میں' وہاں نیا بم البتہ نہ ہوگا بلکہ وہاں یہ ہے: "وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا o وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ o" (وہ لوگ جو ہمارے راستہ میں کوششیں کرتے ہیں ہم ان کے راستے آسان کردیتے ہیں ۔ بیشک اللہ تعالیٰ مخلص لوگوں کے ساتھ ہیں) اس آیت کے معنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا میں تو یہ وعدہ ہے کہ "لَنَھْدِیَنَّھُمْ" اور لطائف کے صاف ہونے کا کہیں وعدہ نہیں اور آخرت میں "وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ" اور معیت کا وجوب تو یہاں ہوجاتا ہے مگر کامل

ظہور آخرت میں ہوتا ہے گو دنیا میں بھی اس کے آثار معلوم ہوں یعنی ایسا شخص اپنے قلب کو دیکھتا ہے کہ وہ خدا سے راضی ہے جس کی بابت ارشاد ہے: "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" مگر عینی ظہور آخرت میں ہوگا اب تمام مراتب یحبون کے معلوم ہو گئے ہوں گے۔ اگرچہ جزئیات بیان نہیں ہوئی مگر اصول بحمد للہ بہت کافی بیان ہو گئے۔ اب خدا سے دعا کیجئے کہ وہ (محمد عبدالمنان ناشر اور تمام مسلمانوں کو) توفیق عمل دے۔ آمین

(برحمتک یا ارحم الراحمین)

تادیب المصیبۃ

۲۵ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ منشی غیور احمد صاحب مرحوم کے مکان پر جو کہ تھانہ
بھون میں تھا ایک گھنٹہ پندرہ منٹ تک کھڑے ہوکر بیان فرمایا۔ حاصل اس بیان
مبارک کا یہ تھا کہ مصیبت سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ سامعین کی تعداد عورتوں کے
علاوہ تقریباً پچاس تھی۔ مولوی سعید احمد مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

قال اللہ تبارک وتعالٰی وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِہٖٓ اَوْقَاعِدًا اَوْقَآئِمًاۚ فَلَمَّا کَشَفْنَا عَنْہُ ضُرَّہٗ مَرَّکَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَآ اِلٰی ضُرٍّ مَّسَّہٗؕ کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلْمُسْرِفِیْنَ مَاکَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۝ (سورہ یونس آیت نمبر۱۲)

’’اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے، لیٹے بھی بیٹھے بھی، کھڑے بھی پھر جب ہم اس کی وہ تکلیف اس سے ہٹا لیتے ہیں تو پھر اپنی پہلی حالت پر آ جاتا ہے کہ گویا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے کے لیے کبھی ہم کو پکارا ہی نہ تھا ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال (بد) ان کو اسی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں۔‘‘

تمہید

اس آیت میں ایک ایسا مضمون جو اکثر لوگوں کی حالت کو عام ہے مذکور ہے نیز اس وقت خاص سے بھی اس کو مناسبت ہے اسی واسطے اس وقت یہ آیت تجویز کی گئی ہے۔

غیر اختیاری مصیبت

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسا تو کوئی انسان نہیں جس کو کوئی حادثہ پیش نہ آئے اور کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو، انسان تحت القدرت ہے مستقل نہیں ہے اگرچہ ہر امر میں انسان کی ایک مستقل تجویز بھی ضرور ہوتی ہے جسے اس کا ذہن اختراع کر لیتا ہے۔ مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہر امر اس کی خواہش کے موافق نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد ہے: ’’اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَاتَمَنّٰی‘‘ یعنی انسان کو

اس کی ہر تمنا نہیں ملتی۔ تمنائیں انسان کی بہت کچھ ہوتی ہیں مگر ملتی کم ہیں بلکہ جو خدا تعالیٰ چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے وہی انسان کے لیے بہتر ہوتا ہے اگر چہ اول نظر میں اس کی بہتری انسان کو محسوس نہ ہو لیکن اس کے نتیجے پر اگر غور کیا جائے تو اس کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے اور اول نظر میں چونکہ حکمت پر نظر نہیں ہوتی اس لیے خلاف تمنا کو مصیبت کہتے ہیں ورنہ اگر مصلحت اور حکمت پر نظر ہو تو کوئی مصیبت مصیبت نہیں بلکہ ہر مصیبت نعمت ہے مگر مراد مصیبت غیر اختیاریہ ہے اور اسی میں گفتگو ہو رہی ہے۔ بر خلاف ان کے جن کو اپنے ہاتھوں اختیار کرتے ہیں یعنی گناہ کہ اس کو انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے سو اس میں کوئی حکمت نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ اس کو گناہ اور معصیت قرار دیا گیا یعنی اس سے روکا گیا اور یہی فرق ہے درمیان فعل عبد اور فعل حق کے کہ کوئی فعل شر کا خدا تعالیٰ سے صادر نہیں ہوتا' فعل شر وہی ہے جو بندہ اپنے اختیار سے خلاف رضائے حق کرتا ہے تو امور اختیاریہ عبد تو خیر اور شر دونوں ہیں اور غیر اختیاری جو محض من جانب اللہ ہے وہ خیر محض ہے۔ اسی لیے عارفین نے اپنے متعلقین کو یہ تعلیم کی ہے اور اسی سے انہیں ایک استواری پیدا ہو گئی ہے کہ جس سے وہ پریشان نہیں ہوتے کہ:

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست   در صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

(یعنی درویشی کے راستہ میں چلنے والے کے سامنے خدا کی طرف سے جو کچھ بھی پیش آتا ہے وہ بہتر ہی ہوتا ہے۔ اے دل! صراط مستقیم میں کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا)

تو جو پیش آئے سب کو خیر سمجھے خواہ وہ بیماری ہو یا دشمن کا اپنے اوپر غالب آنا ہو یا فقر و فاقہ ہو یا اور کوئی مصیبت ہو غرض سب میں بہتری ہے مگر یہ بہتری ایسی ہے جیسے دوا کی بہتری شفیق ماں باپ تو جانتے ہیں کہ حلق سے اترتے ہی تریاق کا کام کرے گی لیکن بچہ نہیں سمجھتا بلکہ ماں باپ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے کہ انہوں نے دوا پلا دی یا جیسے دنبل میں نشتر دینا کہ ماں باپ خوش ہیں مگر بچہ ان کو دشمن سمجھتا ہے۔ نشتر زن ماں باپ سے انعام طلب کرتا ہے اور بچہ تعجب کرتا ہے لیکن ہر عاقل جانتا ہے کہ واقع میں یہ کام انعام کا ہے تو بچے کے علم کو جو تفاوت ماں باپ کے علم سے ہے اس سے بہت زیادہ تفاوت بندہ اور خدا کے علم میں ہے تو خدا تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ جس حادثہ کو بندہ مصیبت سمجھ رہا ہے اس میں کیا کیا حکمتیں مخفی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "عَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ" (اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تم لوگ ایک چیز کو ناپسند کرتے ہو اور درحقیقت وہ تمہارے لیے بہتر ہوتی ہے) اس پر جس کی نظر ہوگی وہ ہرگز اس کو مصیبت نہ سمجھے گا جس طرح

جراح نے نشتر لگا کر مصیبت میں نہیں پھنسایا اسی طرح خدا تعالیٰ جو بندے کے ساتھ کرتے ہیں سب بہتر ہی ہوتا ہے مگر بندہ اس کی حکمت کو سمجھتا نہیں حالانکہ اگر ذرا غور کرلے تو بعض حکمتیں معلوم ہو بھی سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مصیبت میں یہ خاصیت ہے کہ اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ انسان خدا کو یاد کرنے لگتا ہے تو بہ نصیب ہو جاتی ہے متنبہ ہوتا ہے کہ فلاں امر کی وجہ سے یہ ہوا تو یہ کھلے فائدے نظر آتے ہیں مگر بعض لوگ اس کو یاد نہیں رکھتے۔ پس اس معنی کو مصیبت نہ کہی جائے گی مگر ظاہر نظر میں وہ مصیبت ہے کیونکہ حقیقت لغویہ مصیبت کی یہ ہے کہ کوئی بات خلاف طبیعت پیش آئے اور چونکہ زندگی میں زیادہ واقعات ایسے ہی ہوتے ہیں اس لیے کوئی بھی مصیبت سے خالی نہیں ہے کوئی مال کی طرف سے پریشان ہے کوئی صحت کی طرف سے پریشان ہے کوئی اولاد کی طرف سے پریشان ہے۔ غرض ہر شخص کو کوئی نہ کوئی مصیبت لاحق ہے۔

تاثر مصیبت

اگرچہ ہر ایک اثر الگ الگ ہوتا ہے اور ایک سرسری اثر ایسا بھی ہے کہ کوئی مسلمان اس سے خالی نہیں اگرچہ برائے چندے ہی اور وہ اثر متنبہ ہے اپنی بدعملی اور اپنے ضعف و عجز پر بڑا ظالم ہے وہ شخص کہ اس پر کوئی مصیبت آئے اور وہ اس پر متنبہ نہ ہو بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ انسان ہی نہیں ہے تو جو انسان ہوگا وہ ضرور اسی طرح متاثر ہوگا اور یہ تاثر بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ قبول حق اور رجوع عن الباطل سے بڑا سد راہ یہ ہے کہ انسان اپنے کو سب سے بڑا سمجھے۔ اسی وجہ سے یہودی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔ اگرچہ یہ جانتے تھے کہ آپ پیغمبر برحق ہیں خدا کے نبی ہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پیشتر ہی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے تھے حتیٰ کہ مشرکین سے کہا کرتے تھے کہ عنقریب ہم تمہاری خبر لیں گے۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف آئیں گے: ''فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ'' (پھر جب وہ چیز آ پہنچی جس کو (خوب جانتے) پہنچاتے ہیں تو اس کا (صاف) انکار کر بیٹھے سو (بس) خدا کی مار ہو ایسے منکرین پر) لیکن جب آپ تشریف لائے تو آپ کی اتباع میں اپنے جاہ کا نقصان ہوتے دیکھ کر آپ کے ساتھ کفر کیا۔ سمجھے کہ آج تو ہم احبار کہلاتے ہیں مقتدا شمار ہوتے ہیں اگر ایمان لے آئیں گے تو چھوٹے ہو جائیں گے۔ اسی طرح رؤسا مکہ شریف یہ کہتے تھے: ''لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ'' کہ اگر یہ کلام خدا کا کلام ہے تو کسی بڑے شخص پر کیوں نازل نہیں ہوا ایک یتیم پر کیوں نازل ہوا۔ پھر یہ کہ آپ کے پاس تمول بھی نہیں تھا

ابوطالب کی پرورش میں آپ رہتے تھے اوران کی یہ حالت تھی کہ اکثر اوقات پیٹ بھرائی نہ ملتا تھا' انہوں نے چونکہ کئی مرتبہ یہ تجربہ کیا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سب گھر کے لوگ کھاتے تو سب شکم سیر ہو جاتے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم علیحدہ تناول فرماتے تو سب بھوکے رہتے اس لیے انہوں نے یہ معمول کررکھا تھا کہ روزانہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کھانا کھاتے اور اگر کبھی آپ تشریف فرما نہ ہوتے تو ابوطالب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھونڈتے تھے کہ آپ کی برکت سے پیٹ تو بھر جائے گا تو آپ کے گھر میں کسی قسم کا تمول بھی نہ تھا۔ البتہ آپ حسب نسب میں سب سے اعلیٰ درجہ کے تھے اور اس میں نبوت میں کوئی دخل نہیں مگر بات یہ ہے کہ یہ قاعدہ ہے کہ صاحب حسب شریف کے اتباع میں کسی کو عار نہیں آتی کیونکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم سے کس بات میں کم ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ بات تو تھی مگر اور کوئی دنیوی فراغت نہ تھی اس لیے رؤسا کہتے تھے کہ کسی رئیس پر کیوں نازل نہ ہوا تو یہی مانع تھا اور اس کی بڑی مذمت آئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ رائی برابر بڑائی بھی جس کے قلب میں ہوگی وہ جنت میں نہ جائے گا اور اس مرض سے بہت کم لوگ خالی ہیں' کم وبیش سب میں ہوتا ہے۔ اسی مرض نے شیطان کو جس نے آٹھ لاکھ برس تک عبادت کی تھی ایک پل میں مردود بنادیا اور اسی راز کی وجہ سے حکمائے اُمت نے کہا ہے کہ نرے وظیفہ سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کہ کسی کے پاس نہ رہے کہ وہ اس کے تکبر کا علاج کرے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ محض کتابیں دیکھ کر کچھ کرتے ہیں ان کے اخلاق درست نہیں ہوتے۔ غرض شیطان نے تکبر ہی کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا اور اس کے سبب ملعون ہوگیا۔ محققین نے کہا ہے کہ آسمان پر سب سے پہلا گناہ یہ ہوا اور کوئی گناہ نہیں ہوا تو یہ تکبر ایسی بری چیز ہے جس قدر بھی کم ہو زیادہ ہے۔ سو مصیبت سے ایسے بڑے مرض کا بھی علاج ہو جاتا ہے کہ اس سے تکبر بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

تنبہ از مصیبت

غرض یہ ہے کہ کوئی ایسا مسلمان نہیں جس پر مصیبت سے اثر نہ ہو مگر فرق یہ ہے کہ بعض لوگ تو یاد رکھتے ہیں اور اکثر بھول جاتے ہیں اور اگرچہ بھول جانے کے یہ معنی نہیں کہ ان کو یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو قدرت نہیں رہی مگر برتاؤ ایسا ہی ہوتا ہے جس سے وہ دوسرا ناواقف یہ اخذ کرسکتا ہے۔ پس اس آیت میں اسی مرض کو ذکر کیا گیا ہے اور اس مرض کے کئی درجے ہیں بعض کو تو مصیبت آتے وقت بھی پوری طرح تنبہ نہیں ہوتا مجھے تعجب ہوا کرتا ہے اس شخص سے جو کہ مصیبت آنے پر یہ کہتا

ہے نہ معلوم نہیں ہم سے کیا گناہ ہوا ہے جس کی پاداش بھگت رہے ہیں۔ صاحبو! کونسا وقت ہے کہ ہم اس میں گناہ نہیں کرتے ہم تو ہر وقت ہی گناہ میں مبتلا ہیں پھر اس سوال کے کیا معنی اور بعض کو۔۔۔ ی طرز کی غفلتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم میں تین قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ کہ ان کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہم نے کچھ کیا ہے مگر پھر بھی اس کا تدارک نہیں کرتے' استغفار نہیں کرتے بلکہ بعضے تو اور زیادہ گناہ کرنے لگتے ہیں' میں نے جہاز میں دیکھا ہے کہ عین شدت طوفان کے وقت نہایت پریشانی میں بعض لوگ یا علیؓ یا علیؓ کہتے تھے اور بہت سے لوگ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کو پکارتے تھے' میں نے اپنے جی میں کہا کہ اے اللہ یہ مشرکین عرب سے بھی بڑھ گئے۔

خدا فراموشی

بلکہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اتنی حفاظت نہیں کرتے' جتنی بزرگ کرتے ہیں۔ مکہ شریف میں ایک شاہ صاحب ہمارے حافظ احمد حسن صاحب برادر زادہ حاجی صاحبؒ کے پاس آئے اور کچھ نقد امانت سپرد کی۔ انہوں نے کہا کہ بھائی اللہ کے سپرد کردو' کہنے لگے کہ یوں نہ کہو اور اس پر ایک بیہودہ حکایت نقل کردی کہ کوئی شخص اپنی دکان حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کرکے چلا جاتا۔ ایک بار اس کے بھائی کو دکان سے اٹھنے کا اتفاق ہوا تو اس نے خدا کے سپرد کردی۔ اسی دن چوری ہوگئی اس کے بھائی نے کہا کہ بھائی بڑے پیر کے سپرد کرنا چاہیے تھا۔ اسی طرح کی ایک اور حکایت ہے کہ ایک قافلہ چلا جارہا تھا راستے میں چور مل گئے' قافلہ والوں نے اول اللہ تعالیٰ ہی کو پکارا تو کچھ نہ ہوا پھر ایک بزرگ کو پکارا تو چور بھاگ گئے۔ غضب یہ ہے کہ کتابوں میں اس قسم کی حکایات لکھ دی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفار کا بھی یہ عقیدہ نہیں تھا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کافر سے پوچھا کہ تمہارے کتنے خدا ہیں' اس نے کہا کہ سات ہیں' چھ زمین میں اور ایک آسمان میں' آپ نے فرمایا کہ مصیبت کے وقت کا خدا کون ہے اس نے کہا کہ آسمان والا تو مشرکین عرب بھی مصیبت کے وقت ایک خدا ہی کو پکارتے تھے۔ مگر ہندوستان میں مصیبت کے وقت بھی دوسروں ہی کو پکارتے ہیں۔ تیسری قسم وہ ہے کہ گناہ کو یاد کرکے تدارک بھی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن وہ حالت ہوتی ہے کہ:

اہلکاراں بوقت معزولی ۔ شبلیؒ وقت و بایزید شوند
باز چوں میر سند برسرکار ۔ شمر ذی الجوشن و یزید شوند

(سرکاری ملازم نوکری سے علیحدہ کردیے جائیں تو وہ ایسے نیک بن جاتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ اپنے زمانہ کے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ اور بایزید رحمۃ اللہ علیہ جیسے بہت بڑے ولی ہیں اور پھر جب اپنی ملازمت پر آجاتے ہیں تو اس قدر برے اعمال کرتے ہیں جیسے کہ شمر جس نے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا اور جیسا کہ یزید تھا کہ جس کی اس وقت حکومت تھی)

یعنی جب تک مصیبت رہے اللہ بھی یاد رہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی یاد رہے اور جب مصیبت ٹلی تو ایسے آزاد کہ گویا خدا تعالیٰ کی حدود حکومت ہی سے نکل گئے۔ اسی کو فرماتے ہیں: "وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا" کہ مصیبت کے وقت تو خوب پکارتا ہے اور جب مصیبت دور کردیتے ہیں تو یہ حالت ہوجاتی ہے کہ گویا تعلق ہی نہ رہا اور اس کی وجہ فرماتے ہیں: "کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلْمُسْرِفِیْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ o" یعنی وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ حدود سے باہر ہوگئے ہیں اور یہ خاصیت ہے کہ نیک عمل میں بصیرت ٹھیک رہتی ہے اور جب گناہ کرتا ہے تو بصیرت جاتی رہتی ہے اسی لیے فرماتے ہیں کہ ان کو اپنے اعمال خوش معلوم ہوتے ہیں۔ پس علت اس کی اسراف ہے کہ اس وجہ سے بری باتیں مزین معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اسی کو سن کر ہر شخص اپنی حالت کو دیکھ لے کم وبیش سب کی یہ حالت ہے اور دوسری جگہ بھی ایسا ہی مضمون ارشاد ہے:

وَاِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِیَّاہُ فَلَمَّا نَجّٰکُمْ اِلَی الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ o

یعنی جب مصیبت آتی ہے اس وقت تو سب کو بھلا کر کہتے ہیں کہ اگر ہمیں اس سے نجات ہوجائے تو ہم خدا تعالیٰ کی اطاعت کریں گے مگر جب اس سے نجات ہوجاتی ہے تو اعراض کرنے لگتے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں: "وَکَانَ الْاِنْسَانُ کَفُوْرًا" کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

مقصود مصائب

اس کے بعد فرماتے ہیں:

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَاتَجِدُوْا لَکُمْ وَکِیْلًا o

"یعنی تم کیا اس سے امن میں ہوگئے ہو کہ تم کو زمین ہی میں دھنسا دیں؟ یا تم پر کوئی ایسی تند ہوا بھیج دیوے جو کنکر پتھر برسانے لگے پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ) چنانچہ قارون کو دھنسا دیا گیا تھا اور اس واقعہ پر گو سب کو ایمان تھا لیکن عین الیقین نہ تھا مگر اب چند ہی سال ہوئے کہ کانگڑہ کے

قریب زلزلہ میں ایک بہت بڑے حصے کو دھنسا دیا گیا کہ لوگ اب بھی دیکھ لیں۔ آگے فرماتے ہیں یا تم پر تند ہوائیں بھیج دیں کہ پھر تم اپنے لیے کوئی وکیل نہ پاؤ، غرض ہر طرح تم ہمارے قبضے میں ہو، کسی طرح بچ نہیں سکتے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خیر وہ دریائی اندیشہ تو کٹ گیا۔ اس کو فرماتے ہیں: "اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَکُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی" (یا تم اس سے بے فکر ہو گئے کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو دریا ہی میں دوبارہ لیجاویں؟) دیکھو! روزمرہ بات پیش آتی ہے کہ انسان ایک جگہ نہ جانے کی قسم کھاتا ہے مگر پھر مجبوراً جانا پڑتا ہے اور یہ اوپر بتلا دیا ہے کہ اگر دریا میں بھی نہ جانا ہو تو دوسری جگہ بھی تو ہلاک کر دینا ممکن ہے کیونکہ اس کی قدرت خشکی اور دریا میں برابر ہے۔ مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک ملاح سے ایک شخص نے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں مرے اس نے کہا دریا میں ڈوب کر، کہنے لگا اور دادا۔ کہاں کہ دریا میں، کہنے لگا کہ پھر بھی تم دریا میں رہتے ہو ڈرتے نہیں۔ ملاح نے کہا کہ تمہارے باپ کہاں مرے کہنے لگا گھر میں، پوچھا اور دادا کہنے لگا کہ گھر میں۔ ملاح نے کہا کہ پھر بھی تم گھر میں رہتے ہو ڈرتے نہیں تو خدا تعالیٰ کی قدرت ہر جگہ موجود ہے بلکہ دریا میں تو بہت سی تدابیر بچنے کی ممکن بھی ہیں، خشکی میں اگر کوئی آفت آئے تو اس سے بچنے کی تو کوئی تدبیر ہی نہیں مثلاً اگر دو ریل گاڑیوں میں تصادم ہو جائے تو کوئی صورت بچنے کی ہو ہی نہیں سکتی، برخلاف جہاز کے کہ اگر ٹوٹ جائے تو غرق ہوتے ہوئے بھی اس کو بہت دیر لگ جاتی ہے، دوسرے جہاز اکثر کنارے کے قریب ہی ہوتے ہیں کہ وہاں سے مدد کا آ جانا بھی ممکن ہوتا ہے تو جو شخص سمندر میں خدا سے ڈرے اور خشکی میں نہ ڈرے وہ کس قدر نادان ہے۔ دوسرے اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ سمندر ہی میں زیادہ خطرہ ہے تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ دوبارہ سمندر ہی میں بھیج دیں اور ایک ایسی ہوا کو مسلط کر دیں کہ وہ کشتی کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں: "اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَکُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی" (یا تم اس سے بے فکر ہو گئے کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو دریا ہی میں دوبارہ لیجاویں؟) اور یہ کچھ اسی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر صاحب مصیبت کو کہا جا سکتا ہے کہ کیا پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ پھر اسی قصہ میں تم کو پھنسا دیں۔ صاحبو! اپنے کو کسی وقت خدا تعالیٰ کے قبضے سے نکلا ہوا نہ سمجھو! اور سب گناہوں کو چھوڑ دو! دیکھو گناہ میں مصیبت اس لیے آتی ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ ناراض ہیں۔ یہ بات سب گناہوں کو عام ہے، گرچہ وہ کسی قسم کا گناہ ہو تو جب خدا تعالیٰ ناراض ہوئے اور ہر قصہ ان کے قبضہ میں ہے تو ممکن ہے کہ پھر کسی قصہ میں مبتلا کر دے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوا تو نمرود کو ایک مچھر سے پریشان کر دیا۔ اہل سیر نے لکھا ہے کہ نمرود کی حالت یہ تھی کہ جب سر پر چوٹ لگتی تھی تو چین آتا تھا تو وہ مچھر اب بھی تو موجود ہیں

اور خدا تعالیٰ کو اب بھی تو وہی قدرت ہے۔ دیکھو کہاں نمرود اور کہاں مچھر مگر خدا تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ ہمارا ایک معمولی سپاہی بھی کافی ہے۔ ایک چیونٹی اگرچہ بظاہر نہایت چھوٹی اور معمولی چیز ہے لیکن جب خدا تعالیٰ چاہتے ہیں تو اسی سے ہلاک کر دیتے ہیں اور جب ان کی حفاظت ہوتی ہے تو کسی سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا' میں نے متعدد مرتبہ دیکھا ہے کہ سر میں تیل ڈال کر سر کے نیچے رومال رکھ کر سو گیا ہوں' اٹھ کر دیکھا رومال پر چیونٹیاں چڑھی ہوئی ملیں لیکن سر میں ایک چیونٹی بھی نہیں پائی گئی۔ سو اس سے بچانے والا کون ہے بجز خدا کے اور اگر وہ نہ بچائے تو ادنیٰ ذرہ پریشان کرنے کو کافی ہے۔ ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ اس کی ناک پر بار بار ایک مکھی آ کر بیٹھتی تھی اس نے تنگ آ کر کہا کہ معلوم نہیں مکھی کو کیوں پیدا کیا ہوگا۔ وزیر نے کہا کہ اس واسطے پیدا کیا ہے کہ متکبرین کا تکبر ٹوٹے۔ حاصل یہ ہے کہ ذرا سنبھل کر خدا تعالیٰ کی مخالفت کرو تم میں تو ایک مکھی کی مقاومت کی بھی تاب نہیں۔ بس اگر بچنے کی کوئی صورت ہے تو یہی کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ میں نے افلاطون کی ایک حکایت دیکھی ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر آسمان قوس ہو اور حوادث تیر ہوں اور خدا تعالیٰ تیر انداز ہوں تو بچ کر کہاں جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر انداز سے قریب ہو جائے کہ تیر دور والے پر چلاتے ہیں۔ افلاطون نے کہا بیشک آپ نبی ہیں کیونکہ یہ جواب سوائے نبی کے اور کوئی نہیں دے سکتا مگر ان لوگوں کی ایک سفاہت یہ تھی کہ اپنے لیے نبی کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ یہ تو خدا کو معلوم ہے کہ افلاطون کا کیا عقیدہ تھا لیکن اس حکایت کو اس لیے عرض کیا کہ خدا کے ان لشکروں سے اگر بچنا چاہے تو خدا کا قرب حاصل کرے۔

رضائے مولیٰ

شاید اس موقع پر کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ خدا کے نیک بندوں پر بھی تو مصائب آتے ہیں پھر قرب حاصل کرنے سے کیا فائدہ۔ جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ وہ واقع میں مصیبت ہی نہیں کیونکہ مصیبت ایک تو حقیقی ہوتی ہے جس سے پریشانی ہو جائے اور پریشانی صرف گناہ سے ہوتی ہے اور وہ اس سے محفوظ ہیں اور ایک مصیبت صوری ہوتی ہے کہ ظاہر میں تو مصیبت ہو مگر اس سے وہ پریشانی نہیں سو یہ واقعات ان کے لیے مصیبت اس لیے نہیں کہ ان کی نظر ہر وقت مصلحت پر ہے اور وہ ہر حال میں راضی ہیں جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کو خیر سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اس میں کچھ تکالیف جسمانی سہنی پڑے مگر روح مسرور ہے اور جسمانی تکلیف تو سب ہی کو ہوتی ہے مگر پریشانی اور شکوہ شکایت ان میں نہیں ہوتا۔ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ سے مزاج پوچھا انہوں نے کہا کہ اس شخص کے مزاج کی کیفیت کیا پوچھتے ہو کہ دنیا میں جو کچھ ہو اس کی خواہش ہی کے موافق

ہوتا ہو۔ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا یہ کس طرح ہو سکتا ہے انہوں نے کہا کہ یہ تو جانتے ہو ہر بات خدا کے ارادے اور خواہش کے موافق ہوتی ہے اور میں نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا اوراس کے تابع کر دیا ہے۔ اسی طرح پر وہ میری خواہش کے موافق بھی ہے۔ اسی طرح ایک حکایت مشہور ہے کہ پنجاب میں ایک بزرگ تھے شاہ دولہ ایک مرتبہ ایک دریا گاؤں کی طرف چلا آ رہا تھا لوگوں نے کہا کہ دعا کیجئے ان بزرگ نے پھاوڑوں سے کھدوا کر اور بھی گاؤں کے قریب کر لیا اور پوچھنے پر فرمایا کہ جدھر مولا نا ادھر شاہ دولا یہ حکایت تو بہت بڑی ہے۔ میرا مقصود یہ ہے کہ وہ جدھر خدا کی مرضی دیکھتے ہیں ادھر ہی ہو جاتے ہیں۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے پر ایک مقدمہ ہو گیا تھا ایک حافظ لکھنؤ کے کہتے تھے کہ مجھ کو تعجب تھا کہ سب کے لیے تو یہ دعا کرتے ہیں اپنے بیٹے کے معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتے۔ بس خواب میں دیکھا کہ مولانا آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے یہ عرض کر رہے ہیں کہ یا اللہ میں احمد کے بارے میں تو کچھ کہوں گا نہیں[1] جو آپ کی مرضی ہو اس پر راضی ہوں جس کی یہ شان ہو کہ خدا کی مرضی ہو وہی اس کی مرضی ہو اس کو کوئی ناگواری پیش کیوں آئے گی۔ پس اس سے اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ اہل اللہ پر تو مصائب نازل ہوتے ہیں۔ دیکھئے! سنکھیا ایک کے لیے زہر ہے دوسرے کے حق میں شفا جس نے مدبر کر لیا ہو۔ ع در حق او شہد و در حق تو سم۔ (اس کے حق میں شہد ہے اور تیرے حق میں زہر ہے) پس وہ لوگ اس مصیبت کا زہر مار دیتے ہیں اور خدا کی رضا اور محبت کے سبب میں مدبر کر کے اس کی ساری تیزی کھو دیتے ہیں اب نہ کہیں کڑوی ہے نہ سنکھیا زہر ہے غرض حقیقی مصیبت گناہ ہی سے آتی ہے۔ سو چونکہ ہم میں کوئی ایسا نہیں جس پر مصیبت نہ آتی ہو اور کوئی ایسا نہیں جس کی حالت معصیت کی نہ ہو اس لیے اس وقت اسی آیت کا مختصر بیان کر دیا گیا ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔

آثار ناراضگی

خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت آئے فوراً توبہ کرو! اور اسی توبہ پر قائم رہو:

غم چو بینی زود استغفار کن   غم بامر خالق آمد کار کن

(جب تو کوئی مصیبت دیکھے فوراً توبہ کر! کیونکہ ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہے لہذا کام کرو)

یعنی خدا تعالیٰ کو راضی کرو یہاں تک کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر حکام کی جانب سے کوئی

---

[1] ولایوهم ان الدعاء بنا فی الرضاء بل الدعاء مامور به وهو لایخالف الرضاء کما علیه الکتاب والسنة وکیفیته و مولانا فضل الرحمنؒ حال من الاحوال غلبت علیه وهو التفویض بالغلبة و صاحب الحال معذور لکن لحکایته تؤید مقصود المقام لان المقام بیان الرضاء بالقضاء ۱۲ احمد حسن عفی عنه

بات خلاف مرضی پیش آئے تو حکام کو برا مت کہو بلکہ خدا کو راضی کرو وہ حکام کے قلوب کو بھی نرم کر دیں گے۔ دیکھئے کتنی پاکیزہ تعلیم ہے یعنی ان کے دل تو میرے قبضے میں ہیں جب میں تمہارے اعمال برے دیکھتا ہوں اور ان کے دل سخت کر دیتا ہوں۔ کسی کا قول ہے: عمالکم اعمالکم (تمہارے اوپر جو حاکم ہیں وہ تمہارے اعمال کے مناسب تم پر مقرر کیے گئے ہیں) اور کسی نے کہا ہے۔ ع زشتی اعمال ما صورت نادر گرفت (ہمارے برے اعمال کی سزا میں نادر شاہ کے ذریعے ہم کو سزا ملی ہے) کہ نادر شاہ کی صورت میں ہمارے اعمال بد ہم کو ستا رہے ہیں تو جب حاکم کی طرف سے سختی دیکھو مجھے راضی کرو! ان کے قلوب کو نرم کر دوں گا پھر وہ تمہارے ساتھ نرمی برتیں گے کیونکہ یہ کارخانہ ظاہر سے وابستہ ہے کارخانہ باطن کے ساتھ اول حکم وہاں سرزد ہوتا ہے پھر اسی کے موافق یہاں ہوتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کی حکایت سنی ہے کہ ایک مرتبہ شہر کا انتظام بہت سست تھا۔ ایک شخص نے شاہ صاحب سے وجہ پوچھی فرمایا آج کل یہاں کے صاحب خدمت سست ہیں پوچھا کہ کون صاحب ہیں شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک کنجڑہ بازار میں خربوزے فروخت کر رہا ہے وہ آج کل صاحب خدمت ہے یہ اس کے امتحان کے لیے آ گئے اور امتحان اس طرح کیا کہ خربوزے کاٹ کاٹ کر اور چکھ چکھ سب ناپسند کر کے ٹوکرے میں رکھ دیئے وہ کچھ نہیں بولے۔ چند روز کے بعد دیکھا کہ انتظام بالکل درست ہو گیا۔ اسی شخص نے پھر پوچھا کہ آج کل کون ہیں شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک سقہ ہے چاندنی چوک میں پانی پلاتا ہے مگر ایک پیاس کی ایک چھدام لیتا ہے یہ ایک چھدام لے گئے اور ان سے پانی مانگا انہوں نے پانی دیا اس نے پانی گرا دیا کہ اس میں تنکا ہے اور دوسرا کٹورہ مانگا انہوں نے پوچھا اور چھدام ہے اس نے کہا کہ نہیں انہوں نے ایک دھول رسید کیا اور کہا کہ خربوزہ والا سمجھا ہو گا اس شخص نے آ کر بیان کیا کہ یہ واقعہ ہوا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ دیکھو آج کل یہ ہیں کہ سب کو نیچا رکھا ہے تو ظاہری انتظام باطنی انتظام کے تابع ہے تو جب خدا کو ناراض کرو گے اول محکمہ باطن میں حکم نازل ہو گا پھر اس کے تابع ظاہر میں مگر اس کو سن کر کوئی شخص اس غلطی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ ایسے فقیروں کو ڈھونڈنے لگے۔ ان کا ڈھونڈنا محض بیکار ہے اس لیے کہ وہ خدا کے قبضے میں ہیں ان کے منہ سے وہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے اگرچہ ان کی خدمت بھی کرو بلکہ جو ان کے منہ سے نکلواتا ہے اس کو راضی کرو۔ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو ڈھونڈتے ہیں اسی طرح بزرگوں کی فاتحہ اس نیت سے دلاتا کہ ان سے ہمارا کوئی کام نکلے گا یہ بھی سخت غلطی ہے۔ دیکھئے! آخر

فرشتے بھی تو مقبول بڑے ہیں مگر ان کی فاتحہ کوئی نہیں دلاتا کیونکہ جانتے ہیں کہ وہ بالکل مجبور اور حکم حق کے تابع ہیں۔ پس اسی طرح سے یہ لوگ ہیں اور اگر کہو فرشتے تو زندہ ہیں اس لیے ان کی فاتحہ نہیں دلاتے تو میں کہتا ہوں کہ زندہ لوگوں کو بھی تو ثواب پہنچانا جائز ہے۔ پس جب ان کی فاتحہ اس لیے نہیں کرتے کہ وہ بالکل حکم حق کے تابع ہیں تو سمجھو کہ یہ حضرات بھی بالکل حکم حق کے تابع ہیں۔ غرض اہل خدمت اور اقطاب بالکل حکم حق کے سامنے مجبور ہوتے ہیں کہ جیسا حکم ہوا ویسا کر دیا۔ پس ان سے محبت تو رکھنی چاہیے مگر ان سے دنیا کا کوئی کام نکلنے کی امید رکھنا سخت غلطی کی بات ہے۔ ہاں! بزرگوں سے دعا کراؤ وہ بھی صرف ان بزرگوں سے جو مشابہ انبیاء علیہم السلام کے ہوں کہ وہ دعا بھی کرتے ہیں اور تعلیم و اصلاح بھی کریں گے کیونکہ وہ طبیب بھی ہیں اور دعا کرانے کے ساتھ اپنے اعمال کی بھی درستی کرو گناہوں سے توبہ کرو کیونکہ بدون درستی اعمال کے محض ان کی دعا سے کچھ معتد بہ نفع نہ ہوگا اور نہ ان کی سفارش کچھ کام آوے گی۔ اس وقت لوگوں نے اول تو عمل کو بالکل چھوڑ ہی دیا ہے اور اگر کرتے بھی ہیں تو یہ بہت سے وظیفے پڑھ لیے حالانکہ دنیا کی غرض سے وظائف پڑھنے میں قلب میں ایک دعویٰ مضمر ہوتا ہے چنانچہ ان کو تیر بہدف سمجھا جاتا ہے بخلاف دعا کے کہ اس میں عجز و انکسار ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ اعمال کی درستی کرے اور ہمیشہ اس سبق کو یاد رکھے اور پھر خدا کو ناراض نہ کرے اور ناراض کرنا خاص یہی نہیں کہ اس خاص گناہ کو چھوڑ دے بلکہ سب گناہوں کو چھوڑے کیونکہ یہ تو محض اسی کا خیال ہے کہ فلاں گناہ سے مصیبت آئی۔ ممکن ہے کہ کسی دوسرے گناہ سے آئی ہو پھر اگر گزشتہ مصیبت کسی خاص گناہ ہی سے آئی ہو تو کیا ضرور ہے کہ مستقبل میں دوسرے سے نہ آئے گی؟ دیکھو! اگر انگارے سے چھپر جل جائے تو کیا چنگاری کو چھپر میں رکھ دیں گے۔

غرض گناہ چھوٹا ہو یا بڑا سب چھوڑ دو! چونکہ اس مضمون کی ضرورت اس وقت عام تھی اس لیے اس کا بیان کر دیا گیا اب خدا سے دعا کرو کہ وہ توفیق عمل (تمام مسلمانوں اور ناشر عبدالمنان) کو بخشیں۔ آمین

(برحمتک یا ارحم الراحمین) تمت بالخیر

ازالۃ الغفلۃ

۳۰ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو مسجد نیلہ روضہ قصبہ جھنجھانہ میں ۲ گھنٹہ تک کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً دو سو تھی۔ مولوی سعید احمد مرحوم نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

قال اللّٰہ تبارک وتعالٰی. یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِاللّٰہِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَo وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّارَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآاَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا وَاللّٰہُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَo

(المنافقون آیت نمبر۹ تا نمبر۱۱)

"اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ تعالیٰ کی یاد اور (اطاعت) سے غافل نہ کرنے پاویں جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں اور ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے (حقوق واجبہ) اس سے پہلے پہلے خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہووے پھر وہ کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اور تھوڑے دنوں کیوں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جب اس کی میعاد (عمر کی ختم ہونے پر) آ جاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب کاموں کی پوری خبر ہے۔"

تمہید

یہ سورت منافقون کی تین آیتیں ہیں ان میں خدا تعالیٰ کو ایک ضروری مضمون بیان کرنا مقصود ہے باقی مضامین اس کے موید و تابع ہیں۔ اور وہ مضمون ایسا ہے کہ اس کے معلوم کرنے کی

اس وقت ضرورت عام ہے کیونکہ اس میں کوتاہی بھی عام ہو رہی ہے اور اس کے وقوع کا احساس تو سب کو ہو سکتا ہے مگر بوجہ غور نہ کرنے کے اس کو کوتاہی و مرض شمار نہیں کرتے اور اسی وجہ سے اس کو شدید مرض کہا جاوے گا کیونکہ امراض دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ مرض جس کے مرض ہونے کی اطلاع مریض کو ہو۔ دوسرا وہ مرض ہے جس کے مرض ہونے کی اطلاع ہی نہ ہو ایسا مرض زیادہ مہلک ہوتا ہے اور اسی لیے زیادہ قابل اہتمام ہوتا ہے اس وقت جن امراض میں گفتگو ہے یعنی معاصی ان کی مختصر سی فہرست تو ہر شخص کے ذہن میں ہے یعنی زنا' چوری جھوٹ بولنا وغیرہ کہ اس کو سب گناہ جانتے ہیں لیکن بعض معاصی ایسے بھی ہیں کہ وہ سب ان کی جڑ ہیں اور اس لیے سب سے اول فہرست معاصی میں ان کا نام ہونا ضروری ہے مگر ہم کو ان کی طرف التفات بھی نہیں نہ ہماری فہرست معاصی میں کہیں ان کا شمار ہے اور یہ بہت بڑی غفلت ہے۔

انہماک دنیا

اس آیت میں بھی ایسے ہی مرض کا ذکر ہے جو ہماری فہرست میں داخل نہیں کیا گیا۔ اس کے نام سے معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے اس کو شمار نہیں کیا اور وہ مرض دنیا میں منہمک ہونا ہے۔ اب جس سے چاہے دریافت کر لیجئے معلوم ہو جائے گا کہ کسی نے بھی اس کو مرض نہیں سمجھا۔ نماز نہ پڑھنے کو دوسرے کا مال دبا لینے کو زنا کرنے کو گناہ سمجھتے ہیں مگر دنیا میں کھپ جانے کو کوئی بھی گناہ نہیں سمجھتا حالانکہ یہ ایسا مرض عام مرض ہے جس میں قریب قریب سب مبتلا ہیں اور ایسا قوی ہے کہ سب معاصی اسی کی فرع ہیں۔ مثلاً کوئی شخص نماز میں کوتاہی کرتا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ وہ دنیا میں غرق ہے اور دین سے بے فکر ہے علی ہذا روزہ' حج' زکوٰۃ جس چیز میں بھی کوتاہی ہو اس کا سبب یہی ہے اگر کوئی شخص بدکاری میں مشغول ہے تو اس کی وجہ بھی دین سے بے فکری اور دنیا میں انہماک ہے۔ غرض اس میں تطویل تقریر کی ضرورت نہیں۔ اگر ذرا غور کیا ہو گا تو معلوم ہوا ہو گا کہ وجہ سب معاصی کی یہی انہماک فی الدنیا ہے مگر پھر بھی یہ سب ہی کا شعار ہو رہا ہے حتیٰ کہ دیندار بھی باستثنا عارفین و اہل تقویٰ و اہل فکر کے سب اس میں مبتلا ہیں۔

آج کل کی دینداری

دینداروں کی دین داری بھی اتنی ہی ہے کہ نماز پڑھ لیں' اگرچہ بے فکری ہی سے ہو اور داڑھی نیچے کر لیں اگرچہ لوگوں کا مال دبا رکھا ہو' معاملات میں ضرر پہنچاتے ہوں۔ غرض دینداری

بھی آج کل اسی کا نام ہے کہ صورت دینداروں کی سی ہو اور سیرت میں صرف وہ باتیں ہوں جو رسوائی سے بچائے رکھیں۔ مثلاً پانچ وقت کی نماز پڑھنا، روزہ رکھ لینا اگرچہ حالت یہ ہو:

از بروں چوں گور کافر پر حلل — واندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درو نت ننگ میدارد یزید

(باہر سے یعنی ظاہری حالت تو ایسی ہے جیسے کافر کی قبر ہوتی ہے جس پر ریشمی غلاف ہوں اور اندر خدا کا غضب نازل ہو رہا ہے اپنی ظاہری حالت ایسی بنا رکھی ہے کہ اپنے مقابلہ میں حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ میں بھی عیب نکالا جاتا اور اندر کی حالت یہ ہے کہ اگر یزید جیسا شخص بھی دیکھے تو اس کو غیرت آئے)

تو اگرچہ یہ حالت ہو لیکن وہ خود بھی اپنے کو اور دوسرے بھی اس کو دیندار سمجھیں گے اور اس میں ضرر یہ ہوتا ہے کہ اگر ایسے آدمی سے مکر و فریب وغیرہ کی کوئی بات ظاہر ہوتی ہے تو لوگ اس کو دیندار سمجھ کر اور پھر ان افعال کا مرتکب دیکھ کر سب دینداروں کو اس پر قیاس کرتے ہیں اور اگر ان کا لقب کہیں مولوی ہے تو ان کے ساتھ مولوی بھی بدنام ہوتے ہیں تو ایسے لوگوں کی بدولت سچے دیندار اور مقبول بھی بدنام ہوئے۔ کاش اگر اس کی شکل دینداروں کی نہ ہوتی تو اس کی حرکات سے دیندار تو بدنام نہ ہوتے اور ایک برا اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ ایسی حرکات دیکھ کر لوگوں کو دینداری سے نفرت ہو جاتی ہے کہتے ہیں کہ ہم نے بڑے بڑے دیندار دیکھے سب ایسے ہی ہوتے ہیں اور شیطان یہ سمجھاتا ہے کہ جب دیندار ایسے ہیں تو اس دینداری میں کچھ اثر نہیں اور اس طرح اور بھی دنیا میں منہمک کر دیتا ہے کہ فائدہ ہی کیا تو اس سے تو دنیا دار ہی اچھے کیونکہ دیندار ہوئے تو فلاں شخص جیسے ہو جائیں گے اور اگر دینداروں کی شکل نہ ہو تو اگرچہ خود برباد ہو لیکن کوئی دوسرا تو فریب میں نہیں آتا۔ صاحبو! آج بہت بڑی جماعت ان ہی نام کے مولویوں کو دیکھ کر علم دین سے متنفر ہو گئی ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے تو وہ صاف یہ جواب دیتے ہیں کہ فلاں مولوی صاحب جیسے ہیں ویسے ہی ہم بھی ہو جائیں گے پھر کیا نتیجہ ہوگا کہ دنیا سے بھی کھوئے گئے اور دینداری ملی تو ایسی ملی۔ یہ ضرر ہوا ان کے دین سے بے فکری کرنے کا کہ خود تو بگڑے ہی تھے دوسروں کے لیے بھی ایک برا نمونہ بن گئے۔

اسلاف کا کردار

سلف صالحین کی یہ حالت تھی کہ ان کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کرتے تھے۔ دیکھئے! صحابہ کرامؓ کی کیا حالت تھی؟ کہ ان کے اعمال کو دیکھ کر لوگوں کو اسلام سے انس ہوتا تھا۔ رہا تلوار اٹھانے کا قصہ

سو یہ محض رفع اعلاء حق کے لیے تھا۔ خواہ اسلام سے یا استسلام سے نہ کہ لوگوں کو زبردستی مسلمان کرنے کے لیے چنانچہ تلوار سے کوئی اسلام نہیں لایا کیونکہ اسلام دل سے ماننے اور تصدیق کرنے کا نام ہے سو اگر تلوار کے زور سے لوگ اسلام لاتے ان کے قلوب پر تلوار کا اثر کیسے ہوجاتا اور دل پر اثر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان کے اخلاق و عادات نہایت پاکیزہ اور شریعت مطہرہ کی تعلیم کے بالکل مطابق ہوگئے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ دل پر کوئی اثر ہوتا تھا۔ پس اس اثر کا ایک سبب مسلمانوں کے معاملات تھے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زرہ جو چوری ہوگئی تھی ایک یہودی کے پاس ملی' آپ نے دیکھ کر پہچانی اور فرمایا: کہ یہ میری زرہ ہے' یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ' اللہ اکبر کس قدر اسلامی تعلیم کا نمونہ اپنے کو بنالیا تھا کہ جہاں رعایا کو زبان سے آزاد کیا عمل سے بھی دکھلا دیا کہ ایک یہودی کی یہ جرأت ہے کہ صاحب سلطنت سے کہتا ہے کہ گواہ لاؤ حالانکہ یہود خود ایک ذلیل قوم تھی جب سے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سرکشی کی تھی اس وقت سے برابر ذلت اور خواری ہی کی حالت میں رہے اور اب بھی جہاں ہیں ذلیل اور خوار ہی ہیں۔ سچ کہا ہے:

عزیزیکہ از در گہش سر بتافت   بہر درکہ شد ہیچ عزت نیافت

(جس کسی عزت والے نے بھی اس کے دروازے سے منہ موڑا پھر جس در پر بھی گیا کچھ عزت نہیں ملی)

پس ایک تو اس کو قومی ذلت اور پھر یہ کہ آپ ہی کے قلمرو کا رہنے والا مگر اس پر بھی یہ جرأت؟ صاحبو! یہ ہے حقیقی آزادی نہ وہ جو آج کل اختیار کی گئی ہے کہ دین سے نکل گئے' خدا کو چھوڑا' رسول کو چھوڑا' آزادی یہ ہے کہ کسی صاحب حق کی زبان بند نہ کریں' کسی پر ظلم نہ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ ایک یہودی کا کچھ قرض آپ کے ذمہ تھا' ایک روز اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے باکانہ کچھ الفاظ کہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس کو دھمکایا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالاً"[1] (جس کسی شخص کا کسی دوسرے پر کچھ حق ہوتا ہے اس کے کہنے کا حق حاصل ہے) تو آزادی یہ ہے کہ حکومت کر کے رعایا کو اتنا آزاد کردیں چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عمل سے اتنا آزاد بنادیا تھا کہ اس یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ یا نالش کرو۔ چنانچہ حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں جو کہ اس وقت قاضی تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقت سے اسی عہدے پر چلے آتے تھے جا کر نالش دائر کی۔ دونوں مدعی مدعا علیہ بن کر مساوات کے ساتھ عدالت میں گئے۔

---

[1] (الصحیح للبخاری ۳: ۱۳۰' الصحیح لمسلم کتاب المساقات: ۱۲۰' سنن الترمذی: ۷: ۱۳۱)

حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے موافق قاعدہ شریعت کے پوچھنا شروع کیا۔ یہ نہیں کہ امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آنے سے ہل چل پڑ جائے۔ غرض نہایت اطمینان سے اس یہودی سے پوچھا کہ کیا یہ زرہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے اس نے انکار کیا اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ گواہ لائیے! اللہ اکبر ذرا آزادی دیکھئے! کہ ایک قاضی سلطنت خود امیر المومنین سے گواہ طلب کر رہے ہیں اور امیر المومنین بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن پر احتمال دعویٰ خلاف واقع کا ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر یہ محض ضابطہ کی بدولت تھا۔ واللہ جن لوگوں نے تمدن سیکھا ہے اسلام سے سیکھا پھر بھی اسلام کے برابر عمل نہ کر سکے۔ غرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دو گواہ لائے ایک امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ایک اپنا آزاد کردہ غلام جس کا نام قنبر تھا۔

اختلاف اسلاف

حضرت شریح اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں یہ مسئلہ مختلف فیہ تھا کہ حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹے کی گواہی باپ کے لیے جائز نہ سمجھتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک جائز تھی اس لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیش کر دیا۔ آج اختلاف پر علماء کو برا بھلا کہا جاتا ہے حالانکہ یہ اختلاف پہلے ہی سے چلا آ رہا ہے مگر آج کل کی طرح ان حضرات میں برا بھلا کہنا نہ تھا۔ ایک دوسرے کی تکفیر و تضلیل نہ کرتے تھے آج کل سب وشتم کی زیادہ تر وجہ علاوہ نفسانیت کے ایک یہ بھی ہے کہ ہر جگہ اصاغر کی علمداری ہے اور اکابر خود آپس میں ملتے نہیں کہ اصل بات کا پتہ چل سکے جس طرح چھوٹے کہہ دیتے ہیں اسی کو صحیح سمجھا جاتا ہے یہ نہیں کرتے کہ راوی کو ڈانٹ دیں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ تھانہ بھون میں رہتے تھے کہ ایک شخص نے آ کر کہا آپ کو فلاں شخص یوں کہتا ہے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس نے تو پس پشت کہا تھا لیکن تو نے تو منہ ہی پر کہہ دیا! تو اس سے بھی زیادہ برا ہے پھر کبھی اس شخص کا حوصلہ کسی بات کے نقل کرنے کا نہیں ہوا۔ اگر ایسا کر دیں تو راوی درست ہو جائیں۔ تو اکثر وجہ یہی ہوتی ہے کہ بڑے تو ملتے نہیں چھوٹے بات کو بڑھا کر نقل کرتے ہیں اور ان کو روکا جاتا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی رد میں رسالے تصنیف ہوتے ہیں ایک دوسرے پر تبرا کہہ رہے ہیں۔ پس یہ اختلاف مذموم ہے ورنہ نفس اختلاف اہل فن میں ایک لازمی بات ہے۔ چنانچہ علماء سلف میں بھی ہوا اور اسی طرح اطباء میں بھی ایک مریض کے علاج میں اختلاف ہوتا ہے۔

ایک ہی مقدمہ دو وکیلوں کے پاس لے جاؤ تو ہر ایک علیحدہ رائے دے گا۔ مگر باوجود اس کے دونوں ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں ان میں ذرا بھی لڑائی نہیں ہوتی پھر اس کی کیا وجہ

کہ علماء میں ذرا سے اختلاف سے لڑائی ہو جاتی ہے۔ بس ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چھوٹوں کی علمداری ہے اور کبھی غرض نفسانی بھی ہے۔ غرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مذہب تھا کہ بیٹے کی گواہی معتبر ہے اور حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو نہیں مانتے تھے۔ حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا اور امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گواہی نہیں مانی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ غلام تو چونکہ آزاد ہو چکا اس کی گواہی تو مقبول ہے مگر بجائے امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور کوئی گواہ لائیے! حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اور تو کوئی گواہ نہیں ہے۔ حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دعویٰ خارج کر دیا۔

اگر آجکل کے معتقد ہوتے تو حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لڑ مرتے لیکن حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی طرح مذہب فروش نہ تھے وہ مذہب کے ہر امر پر جان فدا کرتے تھے۔ اگر حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا جاتا تو وہ قسم کھا کر کہہ سکتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سچے ہیں لیکن چونکہ ضابطہ شریعت اجازت نہیں دیتا تھا اس لیے آپ نے اپنی عقیدت پر کارروائی نہیں کی۔ آخر باہر آ کر یہودی نے دیکھا کہ ان پر تو ذرا بھی ناگواری کا اثر نہیں ہوا باوجودیکہ آپ اسد اللہ ہیں برسر حکومت ہیں تو کس چیز نے ان کو برہم نہیں ہونے دیا۔ غور کر کے کہا کہ حقیقت میں اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کا مذہب بالکل سچا ہے۔ یہ اثر اسی کا ہے لیجئے یہ زرہ آپ ہی کی ہے اور میں مسلمان ہوتا ہوں اور کہتا ہوں کہ:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

آپ نے فرمایا کہ ہم نے یہ زرہ تجھی کو دی۔ غرض وہ یہودی مسلمان ہو گیا اور آپ ہی کے ساتھ رہا۔ حتیٰ کہ ایک لڑائی میں شہید ہو گیا۔ اب بتلائیے کہ یہ یہودی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلوار کو سر پر دیکھ کر مسلمان ہوا یا اس کو نیام میں دیکھ کر غرض حضرات سلف ایسے تھے کہ ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ اسلام قبول کرتے تھے اور آج سب سے زیادہ مسلمان ہی بدنام ہیں اور کفار تو کیوں نہ بدنام کرتے خود مسلمان ہی اپنے کو بدنام کرتے ہیں۔

فقدان امانت

ہماری یہاں تک حالت ہے کہ اگر کوئی شخص کہیں باہر جانے لگے اور اس کو دس ہزار روپے رکھنے کی ضرورت ہو تو کسی مسلمان پر بخوف خیانت اعتماد نہ کرے گا اس کام کے لیے مہاجن پر اعتماد کرے گا۔ بعض مقامات پر مجروحین طرابلس کے لیے چندہ ہوا اور انگریزوں کے وسیلے سے بھیجا گیا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ بڑے بڑے رئیس جائیداد وقف کرتے ہیں اور حکام انگریزی کو متولی کرتے ہیں

اس لیے کہ ان کو کوئی مسلمان اس کا اہل نہیں ملتا مگر افسوس کہ ہم کو اپنی اس حالت کی بھی ذرا خبر نہیں۔ ہاں! کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ وہ خیانت تو کیا روپیہ کو ہاتھ لگانے سے بھی احتیاط کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بریلی تشریف لے گئے۔ ایک رئیس نے بہت سا روپیہ آپ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اس کو جہاں آپ کا جی چاہے صرف کیجئے! مولانا نے فرمایا کہ میں اس روپے کو خرچ کرنے کے قابل نہیں ہوں اور بطور ظرافت کے فرمایا کہ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر مجھے اس قابل سمجھا جاتا ہے تو یہ روپیہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو ملتا جب نہیں ملا تو معلوم ہوا کہ میں اس قابل نہیں ہوں' آپ خود ہی خرچ کیجئے! آخر اس نے مصرف کے متعلق مشورہ دریافت کیا آپ نے رائے دی کہ اس کی جائیداد خرید کر اس کی آمدنی سے ایک مدرسہ جاری کر دیجئے لیکن اس وقت میں مولانا کے ساتھ دس پندرہ نام بھی نہ لے سکا کیونکہ ایسے بہت کم لوگ ہیں اور قبل زمانے میں سب ایسے ہی تھے اور خائن بہت کم ہوتے تھے۔ اس لیے جب تذکرہ اس قسم کا ہوتا تھا تو خائنوں کو گنا جاتا تھا اب چونکہ علی العموم لوگ خائن ہیں اس لیے دیانت داروں کو شمار کیا جاتا ہے جس کے معنی صاف یہ ہیں کہ ان کے سوا سب خائن اور نا قابل اعتبار ہیں' غرض مسلمانوں کی عموماً الا ماشاء اللہ یہ حالت ہو گئی اور یہ تمام تر اسی کی وجہ سے ہے کہ ہم سب دنیا میں منہمک ہیں دین کی فکر نہیں۔

اسباب ترقی

اگر کہیے! کہ جن قوموں میں تہذیب ہے اور جنہوں نے اخلاق درست کر لیے ہیں ان میں دین کیا ہے وہ تو بے حد دنیا میں منہمک ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ تشخیص غلط ہے کہ انہماک فی الدنیا کی نسبت ہماری سب بدحالی ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ ان کی ظاہری تہذیب کی وجہ[1] ہے کہ انہوں نے ان اخلاق میں دینداروں ہی کی نقل کی ہے۔ پس علت تہذیب کی وہی دین نکلا اگر معنی نہیں صورت ہی سہی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ان کے مصنفین نے اقرار کیا ہے کہ ہم نے جو کچھ تہذیب و تمدن سیکھا وہ مسلمانوں[2] سے سیکھا اور مسلمانوں میں یہ تہذیب دین کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مثلاً سچ بولنا ایک ایسی صفت ہے کہ سچ بولنے والے کا سب ہی اعتبار کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس صفت کی بدولت کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محمد امین کہتے تھے۔ چنانچہ بناء کعبہ کے وقت حجر اسود کے رکھنے میں جب اختلاف ہوا اور قریب تھا کہ تلوار نکل پڑے کیونکہ وہاں تلوار کا نکل آنا کیا مشکل تھا۔ آخر

---

[1] (اشارہ اس طرف ہے کہ اگر لوگوں کی خاطر سے ان کا مہذب ہونا تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ جواب ہے ورنہ ہنوز یہ بھی تسلیم نہیں۔ معاملات روزمرہ اور معاہدات فیما بین میں ان کی غداریاں کالشمس فی رابعۃ النہار ہیں جو ہمارے دعوے پر شاہد عدل ہیں)۔

[2] گو اس کو کما حقہ باقی نہیں رکھا ۱۲ اسعید

عقلاء نے کہا کہ کسی کو پنچ بنالو فیصلہ اس پر ہوا کہ جو مسجد میں سب سے پہلے آئے وہی پنچ ہے اور سب نے دعا کی کہ یا اللہ کسی ایسے شخص کو بھیج جو مناسب فیصلہ کردے۔ آخر سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ جب لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو مسرت کا نعرہ مارا کہ "جاء محمد الامین" (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو بڑے امانت دار ہیں' تشریف لے آئے) اگر کوئی دوسرا بھی آتا تو لوگ اسی کو حکم بنالیتے لیکن یہ مسرت جس کا اظہار انہوں نے اپنے ان لفظوں میں کیا کہ جاء محمد الامین ہرگز نہ ہوتی یہ محض آپ کی صفت صدق کی بدولت تھی۔ غرض آپ سے فیصلہ کے لیے کہا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو ایک کپڑے میں رکھ کر ہر قبیلہ کا سردار اس کا ایک کونہ پکڑے اور سب اس طرح اس کپڑے کو خانہ کعبہ تک پہنچادیں' وہاں پہنچ کر اس کے نصب کرنے کے لیے مجھے وکیل بنادیں کہ وکیل کا فعل مؤکل کا فعل ہوتا ہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر صفت صدق کی وجہ سے لوگوں کو پورا اعتماد تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز کسی کی طرف داری نہ کریں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ تجارت کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے یہ بالکل غلط ہے صرف صدق کی ضرورت ہے۔ دیکھئے اکثر روپیہ والوں کو بھی قرض نہیں مل سکتا اور بہت سے مفلسوں کو مل جاتا ہے اور اسی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ روپیہ ہونا کوئی عزت کی بات نہیں بلکہ صدق اور اعتبار اصل عزت ہے تو اپنی شریعت کی تعلیم دیکھئے کہ ایسی چیز سکھائی اگر وہ ہو تو ایک پیسے کی بھی ضرورت نہیں اور نہ ہو تو ہزاروں روپیہ بھی بیکار ہے تو ان لوگوں نے دیکھا کہ مسلمان برابر ترقی کرتے چلے جاتے ہیں یہ دیکھ کر اس کے اسباب میں غور کیا۔ اصل راز کو تو سمجھ نہیں سکے کیونکہ وہ تو یہ ہے کہ مسلمان خدا کی اطاعت کرتے تھے اور جو خدا کی اطاعت کرتا ہے اس پر خدا تعالیٰ متوجہ ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس کو ہر حالت میں ترقی ہوتی ہے مگر یہ اعمال صالحہ اس اصلی سبب کے قائم مقام ہوئے۔ مثلاً ایثار' صدق' مساوات' آزادی۔ لیکن مساوات سے مساوات بالمعنی المتعارف اور آزادی سے آزادی بالمعنی المتعارف مراد نہیں بلکہ وہ مساوات اور آزادی جو حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے برتی تو ان آثار کو دیکھ کر ان اخلاق کو اختیار کیا اور ان پر وہ آثار مرتب ہوئے اور یہ اسلام کے سچے ہونے کی دلیل ہے کہ جہاں صورت اخلاق بھی ہے وہاں بھی وہ آثار مرتب ہو جاتے ہیں تو حقیقت اخلاق پر تو کیوں نہ مرتب ہوں گے تو معلوم ہوا کہ دوسری قوموں کی ترقی کے اسباب یہ اخلاق ہیں اور گو ان کو دنیا میں بھی انہماک ہے مگر وہ لوگ غایت دانش مندی سے اس انہماک سے ان اخلاق میں خلل نہیں ڈالتے۔

صورت دین کی برکت

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھئے کہ مسلمانوں اور غیر قوموں کے اخلاق میں ایک بڑا فرق ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کی غرض تو ان اخلاق سے محض خدا تعالیٰ کی رضا ہے مثلاً مسلمان اس لیے سچ بولے گا کہ اس میں خدا تعالیٰ راضی ہیں اور دوسری قوموں کی غرض تحصیل دنیا ہے۔ مثلاً ان کا اگر کوئی سچ بولے گا تو محض اس لیے کہ اس سے دنیا حاصل ہوتی ہے اور اس فرق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان کا تو اگر سچ بولنے میں ضرر بھی ہوگا تب بھی وہ سچ ہی بولے گا اور دوسری قوموں کو اگر سچ میں ضرر کا اندیشہ ہو اور یہ یقین ہو کہ جھوٹ کی کسی کو اطلاع بھی نہ ہوگی جس سے بدنامی کا اندیشہ بھی جاتا رہے جو کہ آئندہ کے لیے مضر ہے تو ایسے وقت ممکن نہیں کہ غیر مسلم سچ بولے کیونکہ اس کے صدق کا مدار دنیاوی نفع تھا۔ اب اس پر مرتب نہیں لہٰذا وہ یقیناً جھوٹ بولے گا تو مسلمانوں کے اخلاق دین ہیں اور دوسروں کے اخلاق محض صورت دین۔ اب اس اعتراض کا جواب ہوگیا کہ غیر قومیں بھی ترقی کر رہی ہیں حالانکہ ان میں دین نہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ اس کا مدار دین پر نہیں کیونکہ گو وہاں دین نہیں لیکن صورت دین تو ہے تو وہاں بھی دین ہی کی برکت ہے گو درجہ صورت ہی ہے۔ پس یہ آثار محض دین کی برکت سے ہوئے سو جس قوم کو یعنی مسلمانوں کو ان کا حکم ہے جب وہ ان کو چھوڑ دیں گے تو ان میں خرابیاں اور بدنامیاں ضرور ہوں گی۔ پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی سب پستیاں دین کو چھوڑنے سے ہیں۔ یہ ہے وہ مرض جس کو میں کہتا تھا اور جس کی طرف سے ایسی بے خبری ہے کہ اس وقت اس شخص کو وحشی سمجھا جاتا ہے جس کو دنیا کی حرص کم ہو کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی ضرورت سے ناواقف ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دین کی فکر کو حماقت سمجھا جاتا ہے بلکہ عقل مند صرف وہ ہے کہ سود کو بھی نہ چھوڑے قمار و رشوت کو بھی نہ چھوڑے۔

دلی میں ایک شخص نے کہا تھا کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ مسلمان حلال و حرام کو دیکھیں اس وقت جس طرح بنے روپیہ لینا چاہیے۔ اللہ اکبر اس وقت وہ حالت ہو رہی ہے کہ اگر کوئی شخص اس قسم کے معاملات میں احتیاط کرتا ہے تو اس کو کہتے ہیں کہ اس سے کیا ہو سکتا ہے یہ کچھ نہ کرے گا تو غور کیجئے! کہ یہ کتنا شدید مرض ہے کہ جس کو صحت سمجھا جاتا ہے یعنی آج دین سے بے فکری اور لاپروائی کرنے کو ہنر سمجھا جاتا ہے کہ اگر ایک وقت کی نماز بھی نہ پڑھتا ہو لیکن بی اے پاس ہو تو وہ ترقی پر ہے اور اگر نماز بھی پڑھے اور تمام احکام شریعت کا پابند بھی ہو لیکن انگریزی نہ جانتا ہو تو وہ نیم وحشی اور غیر مہذب ہے تو جس قوم کا مذاق اتنا بگڑ گیا ہو اس کے مریض ہونے میں کیا شک ہے

اور میں صرف دنیاداروں ہی کو نہیں کہتا بلکہ دینداروں کو بھی کہتا ہوں کہ وہ بھی صرف تسبیح پڑھنے کو دین سمجھنے لگے ہیں نہ ان میں اخلاق نہ اخلاق کے آثار ہیں۔ صبر، توکل، انس، شوق وغیرہ کا ان میں پتہ بھی نہیں۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ تسبیح تو بہت پڑھتے ہیں لیکن غریبوں پر ان کو ذرا بھی رحم نہیں آتا، سر پر عمامہ بھی ہے کرتا بھی نیچا ہے مگر ظلم وستم انتہا درجہ کا۔ ایک پیسہ کہیں خرچ نہ کریں گے اپنا حق بھی نہ ہو مگر اس کو اپنا حق سمجھیں گے۔ ایسے لوگوں نے دین کو بدنام کر دیا اور ایسے ہی لوگ ہیں جو مرض کو ہنر اور ہنر کو مرض سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ زیادہ تقویٰ کرنے سے دنیا کا نقصان ہوتا ہے تو جب ان کی یہ حالت ہے تو دنیاداروں کی کیا شکایت کی جائے۔ غرض یہ مرض اس لیے بھی اشد ہو گیا کہ لوگ اس سے غافل ہیں اور انہوں نے اس کو صحت سمجھ رکھا ہے۔

حقیقت دین

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے ہمارے اسی مرض کا علاج بتلایا ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم کو تمہارا مال اور تمہاری اولاد خدا کے ذکر سے غافل نہ کر دے۔ یہ اول آیت کا ترجمہ ہے جو کہ اس مقام پر مقصود ہے اور اس آیت میں دنیا کو ایک مختصر سی فہرست میں بتلا دیا یعنی مال اور اولاد۔ گویا خلاصہ دنیا کا یہ ہے چنانچہ جب کسی کی خوش حالی کی تعریف کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ مال بھی ہے اولاد بھی ہے اور ذکر اللہ سے مراد یہی نہیں کہ اللہ اللہ کیا کرے بلکہ مطلق اطاعت مراد ہے۔ چنانچہ حصن حصین میں منقول ہے کہ "کُلُّ مُطِیْعٍ لِلّٰہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ" (جو شخص اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والا ہے دراصل وہی سچا ذاکر یعنی اللہ تعالیٰ کا یاد کرنے والا ہے) حتیٰ کہ اگر خدا تعالیٰ کے امتثال امر کے لیے کھانا بھی کھائے تو وہ بھی ذکر ہے بلکہ اگر قربت منکوحہ میں بھی پابندی دین مقصود ہو تو وہ بھی ذکر ہے۔ علیٰ ہذا اگر استنجا بھی اس نیت سے کرے کہ اس سے فارغ ہو کر عبادت میں مشغول ہو گا تو وہ بھی ذکر ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ ذکر کے معنی یاد کرنے کے ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ جو کام ہو مرضی کے موافق ہو پس اسی کو ذکر نہیں کہتے کہ تسبیح لے کر بیٹھے اگر کوئی پانچ وقت کی نماز پڑھے، روزہ رکھا کرے اور بصورت وجوب حج کرے، زکوٰۃ ادا کر دے اور ایک تسبیح بھی نہ پڑھے تو اگرچہ خاص برکات سے یہ محروم رہے گا لیکن نجات میں ذرا بھی کمی نہ ہوگی۔ ہاں یہ شرط ہے کہ گناہوں کا ارتکاب نہ کرے تو گویا جو شخص صرف اوامر اور نواہی پر عمل کرے وہ خدا کا مقبول ہے اس کو نہ قبر میں تکلیف ہوگی نہ قیامت میں عذاب ہوگا تو حقیقت دین کی ذکر ہے اور اس کے لیے تسبیح کی ضرورت نہیں۔ توضیح کے لیے ایک مثال اس کی عرض کرتا ہوں۔ فرض کیجئے! کہ ایک شخص کسی عورت پر فریفتہ ہو گیا اور اس عورت

نے کہا کہ میں رات کوملوں گی لیکن ذرا آدمیوں کی شکل بنا کر آنا۔ یہ حکم اس عورت کی طرف سے نازل ہوا۔ اب یہ شخص ایسا کرے گا؟ یہ کرے گا کہ نائی کو بلا کر خط بنوائے گا غسل کے لیے پانی مہیا کرے گا اور غسل کرے گا بازار جا کر کچھ زیور وغیرہ ہدیہ دینے کو خریدے گا صبح سے شام تک اسی دھن میں رہے گا لیکن صبح سے شام تک نام ایک دفعہ بھی اس کا نہیں لیا تو بظاہر اس نے اپنے ہی کو بنایا سنوارا اور خرید و فروخت میں مشغول رہا اور اس وجہ سے جس کو راز کی خبر نہیں وہ یوں سمجھے گا کہ یہ شخص دعویٰ عشق میں بالکل کاذب ہے مگر جس کو دل کی لگی کی خبر ہے وہ جانتا ہے کہ ہر وقت دل میں وہی محبوبہ بسی ہے اگر عطر خرید رہا ہے تو اسی لیے کہ اس سے ملوں گا زیور خریدا ہے تو اس واسطے کہ اس کو پہناؤں گا غرض ہر کام اسی کے لیے ہے اپنے لیے کچھ بھی نہیں ورنہ گزشتہ کل میں یہ سب کام کیوں نہیں کیا تھا تو جب محبوبہ دنیا یہ غلبہ کر سکتی ہے تو کیا محبوب حقیقی کی محبت ہر چیز میں غالب نہیں آ سکتی۔

عجب داری از سالکان طریق ۔۔۔ کہ باشند در بحر معنے غریق

(تو تعجب کرتا ہے طریقت اور سچی درویشی کے راستہ پر چلنے والوں پر کہ وہ ہر وقت معنی کے دریا کی گہرائیوں میں غوطے لگاتے رہتے ہیں)

تو اگر کسی تاجر کو خدا سے محبت ہو تو وہ تاجر وہی چیز لے گا جو خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہو کھانا بھی اسی لیے کھائے گا کہ خدا کا حکم ہے آرام بھی اسی لیے کرے گا کہ اس وقت آرام کرنے کا حکم ہے تو ظاہر حالت دیکھنے والا اگرچہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ دیندار نہیں ہے مگر واقع میں وہ پکا دیندار ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی شخص دین کے لیے گھوڑا پالے تو اس گھوڑے کا کھانا پینا سونا حتیٰ کہ اچھلنا کودنا پیشاب لید کرنا سب اس شخص کے اعمال صالحہ میں لکھا جاتا ہے۔ دیکھیے خود اس شخص کا عمل بھی نہیں بلکہ گھوڑے کا عمل اور اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے تو جب نیک نیت کے گھوڑے کا عمل اور استنجا کرنا بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا تو خود اس کے اعمال جن کا دین سے تعلق ہو گو صورت وہ دنیاوی ہوں وہ کیوں اس کے نامہ اعمال میں نہ لکھے جائیں گے؟ بس خود اس کا بول و براز کرنا بھی اس کے لیے موجب اجر ہوگا۔ پس استنجا بھی اگر موافق حکم کے ہو اور بغرض عمل بالحکم ہو وہ بھی دین ہے۔ چنانچہ اسی سبب سے اس کے قواعد بھی ہم کو بتلائے گئے۔

صحابہؓ کی اولوالعزمی

اور اسی بنا پر جب ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک شخص نے یہ طعن کیا کہ تم کو تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہگنا موتنا بھی سکھلاتے ہیں تو ان صحابی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے نہایت دلیری

سے یہ جواب دیا کہ بیشک ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو گِنا موتا بھی سکھلاتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم چونکہ حقیقت سمجھتے تھے ایسے مواقع میں اعداء دین سے الجھتے نہ تھے اب ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ صریح دین کی بات میں بھی الجھنے لگتے ہیں۔ ایک شخص کہتے تھے کہ میں نے ریل میں نماز اس لیے نہیں پڑھی کہ سب کے سب ہندو ہی اس میں تھے وہ میری حرکات پر ہنستے اور اسلام کی اہانت ہوتی۔ استغفر اللہ اور گو الحمد للہ ہم پر اتنا اثر تو نہیں ہوتا کہ نماز چھوڑ دیں لیکن اتنا اثر ضرور ہوتا ہے کہ اگر ہم غیروں کے سامنے کھانا کھاتے ہوں اور ہمارے ساتھ سے ٹکڑا زمین پر گر پڑے تو اس کو اٹھا کر کبھی کھانے کی ہمت نہ ہوگی اس کو عار سمجھیں گے۔ اگر بہت ہی ادب اور دینداری کا غلبہ ہوگا تو کسی نوکر کو اٹھا کر دیں گے کہ اس کو کہیں ادب سے رکھ دو مگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ حالت تھی کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہیں کے حاکم ہو کر گئے ایک مرتبہ دورہ میں تھے کہ کھانا کھاتے وقت ایک لقمہ آپ سے گر گیا' مٹی لگ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فرش بھی کافی آپ کے آگے نہ تھا' آپ نے اس لقمے کو اٹھا کر صاف کر کے کھا لیا اور سب عجمی دیکھتے رہے۔ ایک شخص نے اسی وقت آپ کے کان میں کہا کہ یہ لوگ ایسی باتوں کو ذلت سمجھتے ہیں۔ آپ نے با آواز بلند یہ جواب دیا کہ ان احمقوں کی خاطر اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ صاحبو! ہم کو جو کچھ ذلت ہوئی وہ اپنے اسلاف کی اتباع چھوڑنے سے ہوئی۔ ایسا ہی قصہ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے کہ ماہان ارمنی کے پاس جب مسلمان گئے تو وہاں حریر کا فرش بچھا ہوا تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ اس کو الٹ دیا جائے' ماہان ارمنی نے کہا کہ میں نے آپ کی عزت کی تھی آپ نے اس کو قبول نہیں فرمایا۔ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس سے منع کیا ہے اور تو جو یہ کہتا ہے کہ میں نے عزت کی تھی تو سمجھ زمین خدا کا فرش ہے جو تیرے حریری فرش سے بدرجہا بہتر اور افضل ہے۔

نباشد اہل باطن در پے آرائش ظاہر ۔۔۔ بنقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

(جو اہل باطن ہوتے ہیں وہ اپنے ظاہر کو سنوارنے کی فکر میں نہیں رہتے باغ کی چہار دیواری جس پر خود پھولوں کی بیلیں ہوتی ہیں اس کو نقش و نگار بنانے والے کی کیا ضرورت؟)

ان حضرات کے قلوب ایسے کھلے ہوئے تھے کہ بڑے بڑے آدمی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ صاحبو! یہ ہے اولو العزمی اور جب ہر چمکدار چیز کی چمک دمک سے ہماری آنکھیں چندھیانے لگیں تو قلوب میں سے وہ اولوالعزمی جاتی رہی۔ ایک کینہ میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ

عنہم کو قید کی حالت میں عیسائیوں نے محض اپنی شان وشوکت وعظمت دکھلانے کو جہاں نہایت ہی آرائش اور چمک دمک تھی نیز وہاں حسین عورتوں کو جمع کیا گیا تھا۔ مقصود یہ تھا کہ ان عورتوں کو دیکھ کر ان کی طرف میلان ہوگا اور ہمارے دین کی طرف راغب ہوں گے جب اس سامان کو دیکھا ہے تو باآواز بلند کہنا شروع کیا (اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر) لکھا ہے کہ اس کی تکبیر کی ہیبت سے کنیسہ میں حرکت ہوگئی اور وہاں کے قندیل آپس میں ٹکرانے لگے۔ صاحبو! آج ہم لوگوں کی تکبیروں سے کیوں نہیں ٹکرا جاتے' واللہ ہم لوگ گر گئے ہیں۔

عظمت خداوندی

مولوی عبدالجبار صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ جب میں لارڈ ڈفرن سے ملا ہوں تو اس نے میری عبا کا دامن پکڑ کر کہا کہ اس لباس میں آپ شہزادہ معلوم ہوتے ہیں اور ہم تو اپنی وضع سے مجبور ہیں۔ میں اس قول کو نقل کر کے کہا کرتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کے نزدیک علماء کا فتویٰ قابل وقعت نہیں ہے تو صاحب وائسرائے کا فتویٰ ضرور قابل وقعت ہونا چاہیے۔ غرض ہمارے قلوب میں ہر معمولی وغیر معمولی چیز کی عظمت ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قلوب میں صرف خدا کی عظمت تھی اب میں گرے ہوئے لقمہ کو اٹھا کر کھا لینے کا راز بتلاتا ہوں۔ سمجھئے! کہ اگر کوئی بادشاہ اپنے دربار میں بلا کر آپ کو کھانے کے لیے کچھ دے اور کہے کہ میرے سامنے بیٹھ کر کھاؤ اور اثنائے اکل میں آپ سے ایک لقمہ زمین گر جائے تو اس وقت آپ کیا کریں گے؟ کیا اس لقمہ کو پھینک دیں گے' ہرگز نہیں' بلکہ نہایت سرعت کے ساتھ اس کو اٹھائیں گے اور اٹھا کر صاف کر کے کھالیں گے تاکہ بادشاہ خوش ہو کہ ہماری دی ہوئی چیز کی اس نے قدر کی۔ افسوس کیا خدا کی عظمت شاہ دنیا کی عظمت کی برابر بھی نہ رہی؟ ان حضرات کے قلب میں خدا کی عظمت بھی تھی ہم نے عطیہ شاہ کی تو اتنی عظمت کی اور عطیہ شہنشاہ کی عظمت نہ کی۔

تسہیل شریعت

افسوس ہے کہ دل کی آنکھیں جاتی رہیں ہر چیز میں عیب نکالا جاتا ہے کہ یہ تو کچی رہ گئی ہے اور اس میں تو نمک نہیں ہے مگر میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ کچی کھا جایا کرو! اگرچہ عقل کا فتویٰ تو یہی ہے کہ کچی بھی کھا جاؤ کیونکہ عطیہ شہنشاہ ہے اور اسی سے یہ بھی سمجھو کہ ہماری عقل ہماری دشمن ہے بربنائے مذکور کچی کھانے کو بھی واجب کہتی ہے لیکن قربان ہو جائیے شریعت مطہرہ کے کہ اس نے

رحم کیا اور اس کو چھوڑ دینے کی اجازت دی اور یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ عقل ہم کو صعب اور دشوار گزار راہ پر لے چلنا چاہتی ہے لیکن شریعت مطہرہ تسہیل کر کے نرم بتاتی ہے اور عقل کے فتوے کو منسوخ کرتی ہے۔ اے عقل کے پرستو! آپ عقل پر عمل کیجئے! اور ہم شریعت پر عمل کرتے ہیں جن لوگوں نے عقل اور شریعت کے فتاوے کا موازنہ کرلیا وہ یہ کہتے ہیں کہ:

آزمودم عقل دور اندیش را بعدازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے دور تک سوچنے والی عقل کو بہت آزمایا' بالآخر اپنے کو دیوانہ یعنی شریعت کا فرمانبردار بنانے ہی میں فائدہ دیکھا)

یعنی عقل تو بہت بڑی دشمن ثابت ہوئی اب شریعت پر چلیں گے۔ یہ بطور جملہ معترضہ کے تھا۔ مقصود یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ کیفیت تھی کہ وہ حقیقی دین کو سمجھتے تھے یعنی جو کام اللہ کے واسطے کیا جائے گو صورت وہ دنیوی حاجت ہی ہو چنانچہ حدیث شریف میں ہے: "نَهٰى عَنِ الصَّلٰوةِ وَهُوَ حَاقِنٌ"[۱] (جبکہ پیشاب پاخانہ کی سخت حاجت ہو نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے) فقہاء عظام نے لکھا ہے کہ ایسے وقت نماز پڑھنا حرام ہے۔

مذمت بدعت

یہاں سے ایک اور کام کی بات ذہن میں آئی وہ یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی فاتحہ اور تیجہ وغیرہ کو حرام بتاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو نماز کو منع فرماتے ہیں اس کے جواب میں تم یوں کہو گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے منع نہیں فرماتے بلکہ بے ڈھنگے پن سے منع فرماتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ مولوی بھی ایسے ہی بے ڈھنگے پن سے منع کرتے ہیں۔ اب اگر کہو کہ اچھا پھر ڈھنگ کیا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ ڈھنگ وہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کرتے تھے کیا ان کے متعلقین نہ مرتے تھے؟ اور مرتے تھے تو ان سے فاتحہ اور تیجہ کرنا کہیں ثابت ہوتا ہے؟ کہیں بھی نہیں۔ بلا قید ثواب بخشتے تھے تم بھی ایسا ہی کرو۔ اخیر عذر لوگوں کا یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو تو نیک کاموں کی رغبت تھی ان کو قیود کی ضرورت نہ تھی۔ اب چونکہ رغبت نہیں رہی لہٰذا اگر قیود ہوں جس میں تہلیل وقرآن شریف پڑھنے والوں کا کچھ نفع دنیاوی بھی ہو تو رغبت پیدا ہوتی ہے اور نیک کام ہو جاتا ہے ورنہ بالکل رہ ہی جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ نفع اس لیے معتبر نہیں کہ اس طرح سے تہلیل وغیرہ پڑھنے سے ثواب بھی نہیں ہوتا کیونکہ دنیا کے لیے وہ

---

[۱] (لم اجد الحديث في "موسوعة اطراف الحديث النبوى الشريف") ۔

پڑھنا ہوتا ہے جب اس کو ہی ثواب نہ ملا تو بخشے گا کیا؟ پس وہ نفع کہاں محقق ہوا؟ دوسرے شریعت کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی غیر مامور بہ چیز میں مصلحت نفع اور مفسدہ دونوں جمع ہو جائیں تو مفسدہ کی وجہ سے اس کو چھوڑ دیں گے اور یہاں وہ مفسدہ یہ ہے کہ عوام اس کو دین کا جزو سمجھ گئے ہیں اور غیر دین کو دین کا جزو سمجھنا مذموم ہے کیونکہ اس میں اپنی تجویز کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا لازم آتا ہے اور اس کا مذموم ہونا یوں سمجھو! کہ اگر ایک منادی یہ ندا دے کہ صاحب کلکٹر کا حکم ہے کہ ہر شخص ایک آنہ دے اور جمع کر کے کھانا پکوایا جائے اور فقراء کو کھلا کر گورنمنٹ کے لیے دعا کی جائے حالانکہ صاحب کلکٹر نے یہ حکم نہیں دیا تھا یہ تو ندا کرنا گورنمنٹ کی مصلحت ہی کو متضمن ہے مگر باوجود اس کے صرف اس لیے جرم ہوگا کہ اس منادی نے گورنمنٹ کی طرف ایسی چیز کو منسوب کر دیا جو واقع میں اس کی طرف منسوب نہیں ہے اگرچہ اس میں مصلحت بھی ہو۔ اسی طرح تیجہ وغیرہ کو داخل دین کرنے والوں نے بھی خدا تعالیٰ کی طرف ایسی چیز کو منسوب کیا جو واقع میں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہے اگرچہ اس میں مصلحت بھی مان لی جائے۔ اب اس میں غور کر لو کہ لوگ اس رسم کو ایسا سمجھتے ہیں یا نہیں میں نے کان پور میں ایک شاہ صاحب کو خود یہ کہتے سنا ہے کہ گیارہویں (۱۸) تاریخ تک جائز ہے پھر جائز نہیں اور لیجئے کان پور کی کسی مسجد میں دو طالب علموں میں گفتگو ہو رہی تھی ایک کہتا تھا کہ نیاز دلانے والوں کا عقیدہ اچھا نہیں ہوتا دوسرا کہتا تھا کہ نہیں اچھا ہوتا ہے مقصود صرف بزرگوں کو ثواب بخشنا ہوتا ہے اور نیاز خدا ہی کی دلائی جاتی ہے۔ اتفاقاً اسی وقت ایک بڑھیا دو آنے میں مٹھائی لے کر آئی کہ مولوی صاحب اس پر بڑے پیر کی نیاز دے دو۔ مانع نے اس بڑھیا سے پوچھا کہ بڑی بی؟ اللہ تعالیٰ کی نیاز دے دیں؟ اور بڑے پیر صاحب کو ثواب بخش دیں؟ یہ پڑھے لکھے لوگ تاویل تو کر لیتے ہیں لیکن واقع میں وہ تاویل چل نہیں سکتی۔ چنانچہ اس بڑھیا سے جو پوچھا گیا تو کہنے لگی نہیں بیٹا اللہ تعالیٰ کی نیاز تو میں دلا چکی ہوں یہ تو بڑے پیر صاحب کی نیاز ہے ممکن ہے کہ اس کے جواب میں کوئی یہ کہے کہ ہمارا تو یہ عقیدہ نہیں لہٰذا ہم کو تو جائز ہونا چاہیے۔ تو سمجھو! کہ شریعت کا یہ مسئلہ ہے کہ اگر ہمارے جائز فعل سے کوئی دوسرا مبتلائے معصیت ہو جائے تو ہم کو بھی اس فعل کا کرنا جائز نہ رہے گا اسی کی ایسی مثال ہے کہ اگر طبیب منع کر دے کہ بچے کو حلوہ نہ دینا تو ماں باپ کو بھی حلوہ پکانا یا کھانا نہ چاہیے کہ ان کو دیکھ کر بچہ ضد نہ کرنے لگے۔ بچہ کی حرص کے خیال سے ماں باپ خود ہی اس کو بوجہ محبت کے گوارا نہ کریں گے۔

ایصال ثواب کا طریقہ

صاحبو! اسی طرح اگر تم کو مسلمانوں سے محبت ہو تو سمجھ میں آ جائے کہ اگر ہمارے کسی فعل سے کوئی بگڑے تو ہم کو بھی اس کے کرنے کی کچھ ضرورت نہیں بلکہ اجازت نہیں اور اگر کرنا ہی ہے تو یہ کرو کہ اس کی صورت بدل دو۔

میری ہمشیرہ کا جب انتقال ہوا تو طالب علموں نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو ہم جمع ہو کر قرآن شریف پڑھ دیں۔ میں نے کہا کہ پڑھو لیکن جمع ہو کر نہ پڑھو بلکہ ہر شخص اپنے حجرے میں بیٹھ کر جتنا جی چاہے پڑھ دے اور اس میں راز یہ ہے کہ جو کام خدا کے لیے نہیں ہوتا وہ مقبول نہیں ہوتا اور ثواب بخشنے کی حقیقت یہ ہے کہ اپنا ثواب دوسرے کو دیا جائے تو جب اپنے ہی کو ثواب نہ ملے گا تو دوسرے کو کیا چیز دی جائے گی اور جب جمع ہو کر پڑھا جائے گا تو چار آدمی تو اللہ کے واسطے پڑھیں گے اور دس آدمی محض شکایت رفع کرنے کے لیے اور اس نیت سے کہ اگر ہم نہ پڑھیں گے تو یہ اپنے دل میں سمجھیں گے کہ دیکھو ان لوگوں کو ہم سے تعلق کم ہے اور ایسوں کو خود ہی ثواب نہ ملے گا پھر وہ مرحومہ کو کیا بخشیں گے۔ لہٰذا تم سب حجرے میں بیٹھ کر پڑھو اور پھر پڑھنے کے بعد بھی نفس تلاوت یا مقدار تلاوت کی مجھ کو اطلاع نہ کرو کیونکہ اس میں میری خوشی مدنظر ہوگی۔ اس کے جواب میں لوگ کہتے ہیں کہ یوں تو کوئی بھی نہ پڑھے گا۔ میں کہتا ہوں کہ رسم کے طور پر ہونا بھی تو نہ ہونے کے برابر ہے پھر اگر فرضاً کسی نے نہ بھی پڑھا تو کیا نقصان ہو گیا' ثواب اب بھی نہیں ہوتا اس وقت بھی نہ ہوگا۔ ایک شخص کہنے لگا کہ اصلاح الرسوم سے مردوں کو بہت نقصان ہوا۔ میں نے کہا کہ مردوں کو تو نقصان نہیں ہوا لیکن زندوں کو نفع ہو گیا کیونکہ لوگ جو کچھ کرتے تھے دکھاوے کے لیے کرتے تھے اور اس سے ان کے نقصان کے سوا مردے کو کچھ بھی نفع نہ ہوتا تھا اور دکھاوے کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ فلاں شریف آدمی کو جو کہ نہایت غریب ہے پچاس روپے دے دو لیکن خفیہ دینا ورنہ وہ نہ لے گا نہیں تو کوئی دینے والا بھی اس کو گوارا نہ کرے گا اور دل میں کہے گا کہ وہ اتنا روپیہ بھی خرچ ہوا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی تو جب وہ عمل مخلوق کے دکھانے کو ہوا تو اس میں ثواب تو یقیناً نہ ملا پھر اس کے نہ دینے سے مردوں کا کیا نقصان ہو گیا؟ ہاں! زندوں کا نفع ہو گیا' کہنے لگا کہ واقعی سچ کہتے ہو تو یہ ایسی صاف باتیں ہیں کہ ہر شخص سمجھتا ہے ع

اور اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پہلے بھی تو علماء تھے! انہوں نے کیوں منع نہیں کیا؟ میں کہتا ہوں کہ پہلے بھی منع کیا ہے کتابوں میں سب کچھ موجود ہے ہم لوگ حنفی ہیں حنفیہ کی کتابوں میں دیکھ لیجئے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ کیا ہے یہ سب جزئیات ان کے اصول کے موافق ہیں۔

حقیقت طاعت

غرض جب ایک وقت میں نماز بھی ممنوع ہو جاتی ہے تو رسوم کس شمار میں ہیں؟ سو پیشاب پاخانہ کے دباؤ کے وقت نماز کے ممنوع ہونے سے معلوم ہوا کہ ایک وقت پر استنجا بھی طاعت ہے حالانکہ صورت اس کی عبادت نہیں اس سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی فعل جو صورت عبادت نہ ہو موافق حکم کے کیا جائے وہ بھی عبادت ہے یہ شرح ہے اس قول کی ''كُلُّ مُطِيْعٍ لِلّٰهِ فَهُوَ ذَاكِرٌ'' پس دین خدا کے راضی کرنے کا نام ہے اگر صبح سے شام تک کوئی ایک تسبیح نہ پڑھے لیکن احکام میں اطاعت کرے تو وہ دیندار اور ذاکر ہے دنیادار اور غافل نہیں ہے:

چیست دنیا از خدا غافل بدن ۔۔۔ نے قماش و نقرہ و فرزند وزن

(خدا تعالیٰ سے غافل ہونے کا نام دنیا ہے سونا چاندی بیوی بچے ان کو دنیا نہیں کہتے)

رزق مقسوم

میرا یہ مقصود ہرگز نہیں کہ لوگ کماتے کیوں ہیں۔ صاحبو! دکان کرو تجارت کرو لیکن حدود شرع کی رعایت رکھو! سودے کے عیب کو ظاہر کر دیا کرو یہ کہہ دو کہ یہ جدوار اصلی ہے اور یہ نقلی۔ اگر وبا کے دن ہیں تو ایسا نہ کرو کہ ایک ہی بوتل سے عرق بادیان اور گلاب اور بید مشک سب نکلتا چلا آئے۔ اسی طرح برسوں کی رکھی ہوئی دوا نہ دو اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم سچ بولیں تو تجارت کیسے چلے؟ اول تو یہ غلط ہے کہ سچ بولنے سے تجارت نہ چلے گی دوسرے نہ بھی چلے تو تمہارا کیا حرج ہے خدا دوسرے ذرائع سے رزق دے گا۔ کان پور میں ایک شخص نے بانس کی تجارت شروع کی جب کوئی خریدار آتا تو صاف کہہ دیتے کہ یہ بانس چار برس چلے گا یہ سن کر خریدار واپس چلا جاتا' لوگوں نے ان سے کہا کہ اور سچ بولو کہنے لگے کہ نہ بکے گا تو میرا کیا حرج ہے خدا تعالیٰ دوسرے طریق سے دے گا۔ آخر ان کا ایسا اعتبار بڑھا کہ ان کے ہاں مال ہوتے ہوئے دوسروں کا مال بکنا کم ہو گیا۔ مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایک طالب علم مثنوی پڑھنے کے لیے آیا' مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اول روٹیوں کا بندوست کرلو پھر پڑھنا اس نے کہا روٹی تو اللہ تعالیٰ دیں گے اور جب نہ دیں گے اپنی جان لے لیں گے اس کی کیا فکر! لوگوں کو کہیں اطلاع ہو گئی پھر تو ان کی دعوتیں ہونا جو شروع ہوئیں تو کئی ماہ تک خوب مزے دار کھانے دو وقت ملتے تھے اور جتنا ان کو پڑھنا تھا خوب اطمینان سے پڑھ لیا کسی نے خوب کہا ہے:

رزق مقسوم ست ووقت آں مقرر کردہ اند　　　پیش ازاں حاصل نمیکردد بجید

(رزق مقسوم حساب سے ملتا ہے اور اس کا وقت مقرر ہے کتنی ہی کوشش کرو وقت سے پہلے اور مقررہ مقدار سے بڑھ کر نہیں مل سکتا)

تو رزق ملے گا ہی اور اگر قسمت کا نہیں تو تم کو مل کر بھی تمہارے کام نہ آئے گا۔ مثلاً ایک طبیب نے کہا کہ دو تولہ یخنی پیا کرو زیادہ کی اجازت نہیں اب اگر ہوس سے زیادہ بھی پی لیں گے تو وہ دستوں کی راہ نکل جائے گی۔ ایک واقعہ ہے کہ لکھنؤ میں ایک نواب کو کسی مرض معدہ کے سبب صرف چند تولہ قیمہ چوسنے کی اجازت تھی اور زیادہ ہضم بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک لکڑ ہارے کو دیکھا کہ سر پر سے لکڑیوں کا بوجھ اتار کر ان کے گھر کے سامنے رکھا اور چادر میں سے دو موٹی روٹی نکال کر پیاز یا چٹنی سے کھا کر پانی پی کر زمین ہی پر لمبا ہو کر سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔ نواب صاحب کہتے تھے کہ میں دل سے راضی ہوں کہ میری نوابی اس کو مل جائے اور اس کا آرام و چین مجھے دے دیا جائے۔ افسوس کہ انسان خدا پر نظر نہیں رکھتا۔ غرض رزق کی یہ حالت ہے تو اس کے لیے جھوٹ بولنا دغا کرنا حماقت محض ہے غرض تجارت کرنا زراعت کرنا جبکہ حدود کے اندر ہو سب دین ہے اس لیے میں یہ نہیں کہتا کہ کچھ نہ کرو مگر یہ کہتا ہوں کہ دغا فریب نہ کرو جھوٹ نہ بولو اور یہ نہ سمجھو کہ جھوٹ بول کر ملے گا۔ صاحبو! کیا خدا کو ناراض کر کے ملے گا؟ تو خدا کو راضی کر کے اس سے زیادہ نہ ملے گا؟ عجیب خیال ہے اور اگر کہو کہ اس دلیل کا یہ ہی مقتضا ہے کہ فرمانبرداری میں زیادہ ملے گا مگر مشاہدہ تو یہی ہو رہا ہے کہ نافرمانی میں زیادہ ملتا ہے۔

برکت اطاعت

تو صاحبو! کہیں ایسا ہے بھی تو حقیقت اس کی یہ ہے کہ فرمانبرداروں کی ناداری محض ظاہری ہے اس کی حقیقت اس مثال سے سمجھو! ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ شاہ ابو المعالی رحمۃ اللہ علیہ کے پیران کے ہاں مہمان ہوئے اس روز شاہ صاحب مکان پر نہ تھے اور گھر میں فاقہ تھا' بیوی کو فکر ہوئی' ادھر ادھر سے قرض لینا چاہا تو قرض بھی نہ ملا' پیر صاحب کو اس حالت کا پتہ چل گیا انہوں نے ایک روپیہ دیا اور کہا کہ اس کا اناج لے کر ہمارے پاس لاؤ چنانچہ لایا گیا آپ نے اس کو ایک برتن میں رکھ کر ایک تعویذ اس کے اندر رکھ دیا اور فرمایا کہ جب ضرورت ہوا کرے اسمیں سے نکال لیا کرو اس تعویذ کی برکت سے اس اناج میں خوب وسعت ہوئی چند روز کے بعد حضرت شاہ ابو المعالی رحمۃ اللہ علیہ واپس تشریف لائے۔ بیوی نے پیر صاحب کے آنے کا اور تعویذ رکھنے کا قصہ

بیان کیا۔ حضرت کو اس سے بہت تنگی پیش آئی کہ اب کبھی فاقہ کی نعمت نصیب نہ ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ اس برتن کو میرے پاس لاؤ چنانچہ لایا گیا آپ نے تعویذ نکال کر اپنے سر میں رکھا اور فرمایا کہ حضرت کے تبرک کا مستحق تو میرا سر ہے اور اناج کے لیے حکم دیا کہ سب تقسیم کر دیا جائے۔ اگلے وقت سے پھر فاقہ شروع ہو گیا اور فرمایا ہمارا فقر اضطراری نہیں اختیاری ہے سو آپ تو ان کو نادار سمجھتے ہیں مگر یہ لوگ اسی کو دولت سمجھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مطیع کو ناداری میں بھی اس قدر انشراح ہوتا ہے کہ حرام کھانے والوں کو سلطنت میں بھی نہیں ہوتا اور اصل دولت یہی انشراح ہے جو کہ اموال سے بھی وہی مقصود ہے۔ سو اہل اطاعت کو وہ بدون اموال کے بھی میسر ہے۔ ہاں! جس کو درست کرنے کی ضرورت ہے جس کا طریقہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ بتلاتے ہیں:

صحت ایں حس بجوئید از طبیب　　　صحت آں حس بجوئید از حبیب
صحت ایں ز معموری تن　　　صحت آں حس ز تخریب بدن

(جسمانی احساسات کا علاج طبیبوں کے پاس ڈھونڈو اور اندرونی احساسات کا علاج محبوب کے پاس ڈھونڈو۔ جسمانی حس کی صحت تو بدن کی درستی سے حاصل ہوتی ہے اور اندرونی حس کی صحت بدن سے بے تعلق ہونے پر ہے)

غرض اطاعت ہی کرنے سے اصل دولت و راحت ملتی ہے۔ دیکھئے! اگر غذا بہت سی ملے لیکن سب فضلہ ہی ہو جائے تو ہیچ ہے اور اگر روح کی غذا بلا غذا مل جائے تو کھانے کی ضرورت نہیں تو میرا دعویٰ ثابت رہا۔ اگر اطاعت کرو گے تو اور بھی زیادہ ملے گا یعنی روح کی غذا عطا ہوگی۔ غرض شکایت یہ ہے کہ اس وقت جس طرح سے دنیا ہاتھ آتی ہے لیتے ہیں نافرمانی سے پاک نہیں۔ اس کی اصلاح ہونی چاہیے اور دینداری پیدا کرنی چاہیے۔ گو تہجد اور تسبیح نہ ہو کیونکہ کچھ تسبیح اور تہجد پڑھنے والوں ہی کے لیے رحمت خاص نہیں ہے بلکہ

ہنوز آں ابر رحمت درفشان است　　　خم و خمخانہ با مہر و نشان است

(وہ رحمت کا بادل اب بھی موتی برسا رہا ہے شراب معرفت کے مٹکے اور میخانے پر مہر اور نشان لگا ہوا ہے)

مگر افسوس تو یہ ہے کہ کوئی لیتا ہی نہیں اور لینے کی صورت یہی ہے کہ تقویٰ و طہارت اختیار کرنے۔

حقوق کی نگہداشت

حقوق العباد کو حتی الوسع ادا کرے اس وقت حقوق کے متعلق ذرا خیال نہیں ہے۔ یاد رکھو! کہ اگر کسی کے تین پیسے بھی کسی کے ذمے رہ گئے تو اس کی سات سو نمازیں اس صاحب حق کو دلوائی جائیں

گی۔ آج کل دوسرے کا حق ادا کرنا ایسا گراں ہوتا ہے گویا کہ اپنے گھر سے دے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات تو صاحب حق کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اللہ کے واسطے دے دو اور اسی سبب سے دوسرے کو قرض دینے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے اسی لیے قرض میں اٹھارہ گنا ثواب[1] ملتا ہے اور صدقے میں دس کا ملتا ہے۔ اٹھارہ کا حساب اس طرح ہوا کہ اصل میں صدقہ سے مضاعف ملتا تھا ایک کے مقابلہ میں دو مگر جب اصل روپیہ واپس مل گیا تو اس کے مقابلے میں دو کٹ گئے اور اٹھارہ رہ گئے اور ہمارے اس برتاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر لوگوں کو قرض نہیں ملتا۔ آج مسلمانوں میں بہت سے لوگ اپنے بھائیوں کا کام نکال سکتے ہیں کہ مالدار ہیں مگر کسی وجہ سے خود تجارت نہیں کرنا چاہتے اور چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا کام میں لگالے تاکہ حفاظت سے بچیں مگر اس خوف سے نہیں دیتے کہ ان سے وصول کون کرے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کو وقت ضرورت مہاجن سے قرض لینا پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چندروز کے بعد تمام گھر بار کا مالک مہاجن ہی ہو جاتا ہے اور یہ محض مسلمانوں کی بے اعتباری کی وجہ سے ہے۔ مظفر نگر میں میرے ایک دوست سے ایک شخص نے دس روپے یہ کہہ کر قرض لیے کہ آج میرے مقدمے کی تاریخ ہے اور گھر سے دن کے دن منگا نہیں سکتا تم اس وقت دے دو میں وطن جاتے ہی بھیج دوں گا۔ غرض انہوں نے جب وطن جا کر بھی مدت تک نہ بھیجا انہوں نے تقاضا شروع کیا آخیر میں کہا کہ کیا ہمارا کوئی رقعہ ہے صبر کر کے بیٹھ رہے اور پھر غضب یہ کہ اس حرکت کو دین کے خلاف بھی نہیں سمجھتے۔ صاحبو! کیا قبر میں جا کر جواب دو گے؟ اپنے سارے کام کر لیتے ہیں مگر دوسرے کا قرض نہیں دیتے اور اگر کوئی مانگتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ کیا قرض مار میں ہے اور اس سب کی وجہ ایک ہی بھاری مرض ہے کہ دین کی فکر نہیں۔ بہت سے مسلمانوں کو دیکھا ہے کہ ریل میں زیادہ مال لے جاتے ہیں اور ذرا پروا نہیں کرتے بلکہ بعضے تو کہتے ہیں کہ کافر کا حق مار لینا کچھ ڈر نہیں حالانکہ وہ بھی واجب التحرز ہے بلکہ ایک بزرگ تو یہ کہتے تھے کہ مسلمان کا تو چاہے لے لو لیکن کافر کا حق نہ لو کیونکہ مسلمان سے تو یہ امید ہے کہ وہ قیامت میں معاف کر دے اور کافر سے تو یہ بھی امید نہیں۔ دوسرے اگر معاف نہ کیا تو خیر اپنی نیکیاں اپنے ہی بھائی کے پاس جائیں گی دشمن کے پاس تو نہ جائیں گی۔

میراث میں بے احتیاطی

خصوصاً میراث میں تو ایسی گڑبڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ جس کے ہاتھ جو آ گیا وہ اس نے دبالیا' اکثر دیکھا گیا ہے کہ بیوی مہر معاف کر دیتی ہے لیکن پھر بعد وفات ورثاء سے اختلاف

---

[1] (اور ایک حدیث میں بیس حصہ ثواب آیا ہے کذا فی الترغیب والترہیب ۱۲ احمد حسن عفی عنہ)

کر کے وصول کر لیتی ہے۔ بعضے لوگ شرعی حیلے ایجاد کر کے ورثاء کو نہیں دینا چاہتے۔ چنانچہ ایک صاحب میرے پاس آئے کہنے لگے کہ میری بہن اہل سنت والجماعت میں سے تھی اور اس کا شوہر شیعہ تھا اب اس کی بہن کا انتقال ہو گیا ہے تو اس شوہر کو تو اس کے ترکہ میں سے کچھ حصہ نہ ملنا چاہیے کیونکہ سنی عورت سے شیعہ مرد کا نکاح درست نہیں ہوتا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کفر کا فتویٰ لکھا ہے۔ میں نے کہا کہ غیرت دار آج جائیداد کے بچاؤ کے لیے شاہ صاحب کا فتویٰ نظر آ گیا اور دس برس سے جو بہن سے حرام کرایا اس وقت اس فتویٰ پر عمل نہ کیا۔

اب تو میں یہی کہوں گا کہ نکاح ہو گیا اور میں نے کہا کہ ایمان سے بتلاؤ کہ اگر تمہاری بہن سے پہلے یہ شخص مر جاتا اور بہت سی جائیداد چھوڑتا' کیا تب بھی تم یہی کہتے کہ نکاح نہ ہوا تھا اس لیے میراث نہ ملنا چاہیے ہرگز بھی نہ کہتے۔ تو حیلے نکال نکال کر شریعت کو بدلنا چاہتے ہو! صاحبو! یاد رکھو:

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند   حق رابہ سجود و نبی رابہ درودے

(ہرگز اس جماعت میں سے نہ بن جو حق تعالیٰ کو صرف سجدوں سے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف درود پڑھ دینے سے محبت کا اظہار کرتے ہیں اور کسی کام میں اطاعت نہیں کرتے)

لوگ اس وقت خدا تعالیٰ کو بھی پھسلانا چاہتے ہیں: "يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ" (دھوکہ دیتے ہیں اللہ کو اور مسلمانوں کو اور وہ کسی کو بھی دھوکے میں نہیں ڈال سکتے خود ہی دھوکہ میں ہیں) افسوس کہ بعضے لوگوں نے دین کو اغراض نفسانی کے لیے آڑ بنالیا ہے حتیٰ کہ مشہور ہو گیا ہے کہ دیندار لوگ اپنے مطلب کے مسئلے نکال لیتے ہیں۔ خدا کی قسم دینداروں کا تو یہ مذہب ہے کہ اگر ظاہراً گناہ کریں تو اس سے اچھا ہے کہ دین کے پردے میں گناہ کریں۔ غرض میراث میں یہ گڑ بڑ ہو رہی ہے حتیٰ کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کو میراث دینا نہیں چاہتا حالانکہ میراث کا مسئلہ ایسا نازک ہے کہ ایک بزرگ اپنے دوست کی عیادت کو گئے جب ان کا انتقال ہو گیا تو آپ نے فوراً چراغ گل کر دیا اور فرمایا کہ اب اس چراغ میں وارثین کا تیل ہے اور سب سے اجازت دشوار ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ اللہ واسطے دینے میں بھی احتیاط نہیں کہ جہاں کوئی مرا فوراً اس کے کپڑے مسجد یا مدرسے میں بھیج دیئے حالانکہ جس وقت تک تقسیم نہ ہو جائیں اس وقت تک یہ مشترک میں تصرف ہے جو بدون سب کے اذن اور طیب خاطر کے جائز نہیں ہے اور اگر کوئی ایک وارث دے دے گا تو شرعاً اس کا اس قدر حصہ مجموعہ ترک سے کم ہو جائے گا۔

نفس پرستی

مگر لوگوں نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے جو جی میں آیا کر لیا' شریعت سے کچھ بحث ہی نہیں وہ حالت ہے:"اَرَاَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ" (کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا بنا رکھا ہے؟) اور پھر بعضے اس کی بھی الٹی کوشش کرتے ہیں کہ اہوا نفسانیہ کو علماء سے جائز کرالیں میں نے اس کی ایک مثال میرٹھ میں بیان کی تھی کہ علماء سے ہر بات کے جائز کرانے کی کوشش کرنا ایسا ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک رئیس کی عادت تھی کہ وہ اکثر بے سرو پا باتیں کہا کرتا تھا' لوگ اس پر ہنسا کرتے تھے اس نے ایک شخص کو اس کام کے لیے نوکر رکھا کہ جو کچھ ہم کہا کریں اس کی تاویل کر دیا کرو۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ آج ہم شکار کو گئے ہرن پر جو فائر کیا تو گولی اس کے کھر میں لگ کر پیشانی کو توڑتی ہوئی نکل گئی' لوگ ہنسنے لگے خادم نے عرض کی حضور بجا ہے وہ ہرن اس وقت کھر سے پیشانی کھجلا رہا تھا تو جیسے کام کے لیے اس رئیس نے نوکر کو انتخاب کیا تھا ویسا ہی کام آج ہمارے بھائی علماء سے لینا چاہتے ہیں۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ کھلم کھلا گناہ کرے لیکن ناجائز کو جائز تو نہ بنائے۔ مولانا فرماتے ہیں:

تا ہوا تازست ایماں تازہ نیست　　　چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

(جب تک نفس کی خواہشات تازہ ہیں ایمان تازہ نہیں ہے یہ خواہشات نفس ایمان کے دروازہ کے لیے سب سے بڑا قفل ہیں)

جب تک خواہش نفسانی کو مغلوب نہ کرو گے ایمان میں تازگی نہ آئے گی مگر خواہش نفسانی کو کم کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ کھانا پینا کم کر دیں۔ اس وقت تو درویشوں کو بھی کھانا کم نہ کرنا چاہیے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ خوب کھاؤ اور نفس سے خوب کام لو:

کہ مزدور خوشدل کند کار بیش

(جو مزدور مالک سے خوش ہوگا وہ زیادہ کام کرے گا)

تو کھاؤ' پیو' کپڑا پہنو' ہنسو' بولو مگر حدود شرعیہ کی حفاظت ہر چیز میں رکھو آمدنی آئے تو اس کو دیکھ لو کہ حرام طریقہ سے تو نہیں آئی۔ ریل میں سفر کرو تو دیکھ لو کہ اسباب اجازت قانون سے تو زیادہ نہیں ہے۔ نیز ہم جو ریل میں بیٹھتے ہیں تو ہم نے شریعت کے موافق جگہ گھیری ہے یا زیادہ گھیری ہے۔ صاحبو! دین ریل میں بھی کچہری میں سب جگہ تمہارے ساتھ ہے۔ رعایا کسی وقت قانون سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی' سونے کے وقت دیکھ لو کہ پیر قبلہ کی طرف تو نہیں ہیں یا بے نماز پڑھے

نہ سورہو اور اگر سوتے لگو اور خود جاگنے کی توقع نہ ہو تو کسی کو مقرر کر دو کہ وہ تم کو نماز کے وقت جگا دے اور مصلحت دین کے ساتھ دنیوی مصالح کی بھی تمہارے لیے رعایت کی ہے۔ چنانچہ یہ بھی قانون ہے کہ بے روک چھت پر نہ سورہو! پس شریعت محض گرانی کا نام نہیں ہے بلکہ اس نے تمہاری ہر طرح کی مصلحت کی رعایت کی ہے۔ غرض عمل با شریعت یہ ہے کہ ہر حال میں خدا سے تعلق رکھو دنیا یا دین کا جو کام کرو حدود کے موافق کرو اسی کو کہتے ہیں:

لَاتُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَo"

"دیکھو! تمہارا مال اور تمہاری اولاد تم کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ کر دے اور جو ایسا کرتے ہیں وہ سراسر نقصان میں ہیں۔"

آگے ایک عام عنوان سے اس کی تائید ہے کہ "اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ" یعنی خرچ کرو اس چیز سے کہ دیا ہم نے تم کو۔

مسائل کی تعلیم

اس عام میں ایک یہ خاص فرد بھی داخل ہے کہ تعلیم دین میں بھی اگر ضرورت ہو خرچ کرو اور اس فرد کو میں نے اس لیے بالخصوص بیان کیا یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ دین کو دنیا سے مقدم کرنا ضروری ہے لیکن دین کا مقدم کرنا دین کے علم پر موقوف ہے مگر اس جملہ سے کوئی یہ مطلب نہ سمجھ جائے کہ میں سب کو مولوی بنانا چاہتا ہوں بلکہ جن علماء کی نسبت آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ سب کو مولوی بنانا چاہتے ہیں وہ خود ہی سب کو مولوی بنانے سے منع کرتے ہیں کیونکہ اس سے دو نقصان ہوں گے ایک تو یہ کہ تمام لوگ مولوی بن جائیں گے تو کھیتی اور تجارت سب برباد ہو جائے گی اور مجموعہ قوم پر معاش کی حفاظت کرنا فرض ہے اگر سب چھوڑ دیں اور اس سبب سے سب مر جائیں تو سب گنہگار رہوں گے تو واجب ہے کہ ایک جماعت کھیتی کے لیے رہے ایک تجارت کے لیے اور ایک خدمت دین کے لیے جس کو لوگوں نے اڑا دیا ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ اگر سب مولوی بنے تو چونکہ اکثر طبائع میں حرص اور لالچ غالب ہے اور معاش سے بھی اکثر لوگ مستغنی نہیں ہوتے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مولوی کہلائیں گے اور حرص دنیا میں دین کو تباہ کریں گے اور دین کو ذریعہ تحصیل دنیا کا بنائیں گے ان کا تو یہ ضرر ہوگا اور دوسرے لوگ ان کو اس حالت ذلیل میں دیکھ کر دین کو بھی ذلیل سمجھنے لگیں گے دوسروں کا یہ ضرر ہوگا۔ سلف صالحین کا اس وجہ سے یہ معمول تھا کہ جو شخص امراء سے زیادہ ملتا تھا اس کو اپنے حلقہ درس میں

شریک ہونے سے روک دیتے تھے۔غرض یہ تو مطلب نہیں ہے کہ سب کے سب اصطلاحی عالم بنیں لیکن یہ ضروری ہے کہ کچھ لوگ اصطلاحی عالم ہوں اور کچھ لوگ متوسط درجہ تک پڑھ لیں اور ان کو جو ضرورت پیش آتی جائے علماء کاملین سے اس کے متعلق استفتاء کرلیں۔صاحبو! اس وقت دو پیسے میں کلکتہ تک سے ہر بات دریافت ہوسکتی ہے۔دیکھئے! اگر ایک ہفتہ میں چار مسئلے معلوم ہوں تو ایک ماہ میں کس قدر ہوجائیں۔پھر ایک سال میں ان کی کتنی تعداد ہوجائے اور چند سال میں کیسا معتدبہ ذخیرہ اپنے پاس ہوجائے تو ان کے لیے جو پڑھے لکھے ہیں اور جو حرف شناس نہیں ہیں ان کے لیے یہ کیا جائے کہ کسی ایک شخص کو مقرر کیا جائے جو ان کو ہر ہفتہ مسائل سنایا کرے اور یہ نہ ہوسکے تو ہر مہینے میں ایک بار تو ضرور ہی کچھ مسائل سنا دیا کرے اور یہ لوگ اپنی عورتوں کو سنا دیا کریں مگر اس کے لیے ایک مرکز کی ضرورت ہوگی کہ وہ اس کو اپنے ذمہ لے اور وہ کوئی عالم ہونا چاہیے اس کا کام یہ ہو کہ محض مسائل کا وعظ کہا کرے اس لیے میں نے اس وقت "وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ" (اور جو کچھ ہم نے تمہیں رزق عطا کیا اس میں سے خرچ کرو) کو پڑھا کہ لوگ اس کی طرف توجہ اور ہمت کرکے ایک مولوی کو مناسب معاوضہ پر اس کام کے لیے رکھ لیں۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی حاصل ہوئی کہ یہاں یہ انتظام ہوا ہے۔اس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ روزانہ جب کھانا پکانے بیٹھو تو آٹے کی ایک چٹکی نکال کر علیحدہ کسی برتن میں ڈال دیا کرو اسی طرح جب روپے کے پیسے لو تو اس میں سے ایک پیسہ نکال کر اس کے مد کے لیے رکھ دیا کرو اور اس میں بستی کے ہر شخص کو شریک کرو اور جب مدرسے کی صورت ہوجائے تو اس میں تین چیزوں کی ضرورت ہوگی ان کو جاری کرو ایک تو یہ کہ قرآن شریف کی تعلیم ہو جو لڑکے ناظرہ پڑھیں ان کے ساتھ تو یہ طرز رکھو کہ جب بیس پارے قرآن شریف کے پڑھ لیں تو ان کو مسائل کا کوئی اردو رسالہ شروع کرا دیا جائے اور جو لڑکے حفظ پڑھیں ان کے ساتھ یہ طرز رکھو! کہ جب تک قرآن شریف ختم نہ ہوجائے کسی دوسرے شغل میں نہ لگاؤ' دوسرا کام یہ کہ ایک شخص کو ملازم رکھو کہ وہ عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھا دیا کرے' تیسرا کام یہ کہ ایک واعظ مدرسے میں رکھا جائے کہ وہ ہر ہفتہ وعظ کہا کرے اور قرب و جوار کے دیہات میں بھی وقتاً فوقتاً مسائل کی تعلیم کردیا کرے تو اس کی کوشش کرنا بھی "اَنْفِقُوْا" میں داخل ہے۔

اصطلاح باطن

اور دیکھئے! خدا تعالیٰ نے "مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ" فرما کر بتلا دیا کہ ہم نے ہی تو دیا ہے پھر بخل کیوں کرتے ہو۔ نیز لفظ "من تبعیضیہ" فرما کر یہ بھی تسلی فرما دی کہ ہم سارا مال نہیں مانگتے۔

آگے فرماتے ہیں: "مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ" (اس سے پہلے کہ تمہیں موت آجائے) یہ وہ تعلیم ہے کہ اگر روز پندرہ منٹ بھی اس کو سوچ لیں تو دنیا کی محبت بالکل جاتی رہے گی۔ یعنی یہ سوچ لیا کریں کہ ایک دن ہم کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد ہم سے ہر ہر بات کے متعلق ایک دن سوال ہوگا۔ میزان عدل قائم کی جائے گی اگر ہماری نیکیاں غالب آگئیں تو فبہا ورنہ قعر جہنم ہے اور ہم ہیں اور وہاں یہ حالت ہوگی: "لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى" (نہ تو موت ہی ہو نہ زندگی) آگے فرماتے ہیں اگر خرچ نہ کرو گے تو یہ کہو گے: "لَوْلَا اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ" (اگر مجھے تھوڑی سی مہلت دے دی جاتی تو میں خوب خیرات کرتا اور اچھے لوگوں میں سے ہو جاتا) دوسری آیت میں طلب مہلت کے جواب میں ہے: "وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا" یعنی جب موت کا وقت آجائے گا تو ہرگز مہلت نہ ملے گی اس کے بعد غفلت پر وعید ہے: "وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ" (اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے) لفظ خبیر فرمایا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو دل تک کی خبر ہے اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ دین یہ ہے کہ باطن بھی درست کرو۔ حاصل یہ ہے کہ ان آیات میں حب دنیا کے مرض پر جتایا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ:

غم دیں خور کہ غم غم دین ست ہمہ غمہار فرو تر ازین ست

دین کی فکر میں رہو کیونکہ اصل فکر دین ہی کی فکر ہے اور تمام فکریں اس سے کم درجہ کی ہیں۔ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عمل بخشیں۔ ناظرین کرام سے التماس ہے کہ جامع وعظ (اور ناشر وعظ عبدالمنان) کے لیے حسن خاتمہ و حصول رضائے باری تعالیٰ کی دعا فرمائیں۔ آمین

برحمتک یا ارحم الراحمین. تمت بالخیر

مراقبۃ الارض

۶ جمادی الاول ۱۳۴۳ھ کو محترم حاجی محمد عمر صاحب نجار کے مکان پر دو گھنٹے تک تخت پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ تقریباً چالیس مرد تھے اور مستورات پردہ میں تھیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلَّمَ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ○

(سورۂ طٰہٰ آیت نمبر ۵۵)

”ہم نے تم کو اسی زمین سے پیدا کیا اور اسی میں ہم تم کو (بعد موت) لے جائیں گے اور (قیامت کے روز) پھر دوبارہ اسی سے ہم تم کو نکالیں گے۔“

تمہید

یہ ایک آیت ہے سورہ طٰہٰ کی اس میں حق تعالیٰ نے مخاطبین کی بعض حالتیں یاد دلا کر ان کو متنبہ فرمایا ہے اور وہ تین حالتیں ہیں جو اس آیت میں یاد دلائی گئی ہیں (۱) مبدا کی حالت ہے (۲) معاد کی حالت ہے (یعنی معاد اول کی جس کو موت کہتے ہیں) (۳) ایک حالت معاد اول کے بعد اور ہونے والی ہے جو معاد حقیقی ہے۔ چنانچہ ترجمہ سے یہ بات معلوم ہو جائے گی۔ فرماتے ہیں: کہ ہم نے تم کو اس زمین سے نکالا ہے اور اسی زمین میں تم کو لوٹا دیں گے اور اسی زمین سے دوبارہ تم کو نکالیں گے۔ پس مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ (اس سے ہم نے تم کو پیدا کیا) میں تو مبدا کو یاد دلایا ہے کہ تم کو اسی زمین کے اجزاء خاک وغیرہ سے پیدا کیا گیا ہے اور فِيهَا نُعِيدُكُمْ میں معاد اول کو یاد دلایا ہے کہ ایک وقت میں تم کو پھر اسی زمین کا پیوند کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ انسان مرنے کے بعد زمین میں ہی مل جاتا ہے (خواہ دفن کیا جائے یا جلایا جائے دونوں صورتوں میں خاک ہو کر یا راکھ ہو کر زمین ہی کا پیوند ہو جاتا ہے ۱۲) اور مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (اور اس سے ہم تم کو دوبارہ اٹھائیں گے) میں معاد حقیقی کو

یاد دلایا گیا ہے کہ جس طرح پہلے زمین سے تمہارا مادہ نکلا تھا اسی طرح دوبارہ نکلے گا۔ گو دونوں کی کیفیت میں فرق ہے۔ (کہ پہلی مرتبہ عناصر اربعہ سے بواسطہ غذا اور ہضم کے مادہ منویہ کو اول نکالا گیا پھر اس کو رحم میں پرورش کر کے تدریجاً بڑھایا گیا۔ حتیٰ کہ ایک دن جیتا جاگتا انسان ہو گیا اور دوسری دفعہ یہ تدریجی کیفیت نہ ہوگی بلکہ دفعتاً سب اجزاء سمٹ کر جمع ہو جائیں گے اور پورا انسان بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس وقت یہ نہ ہوگا کہ پہلے نطفہ ہو پھر رحم میں پرورش ہو پھر ماں کے پیٹ سے پیدا ہو بلکہ حکم ہوتے ہی دفعتاً کامل انسان بن جائے گا ۱۲) اس کے بعد پھر دوام و بقاء ہے اس کے بعد پھر کوئی اور حالت نہ ہوگی بلکہ یہی وجود ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا۔ اسی لیے یہاں کوئی اور حالت ذکر نہیں کی گئی اگر اس کے بعد بھی کچھ تغیر حال ہوتا تو اس کو بھی بیان کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بس معاد حقیقی کے بعد پھر کچھ تغیر نہ ہوگا اور میں اسی اشارہ پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسری نصوص اور بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معاد ثانی کے بعد پھر دوام و بقاء ہی ہے۔ چنانچہ اہل جنت کے متعلق ارشاد ہے:
"وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" اور کفار کے بارے میں ہے: "وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" غرض دونوں کے لیے خلود ہے۔ یعنی فنا نہیں بلکہ بقاء ہے اور بعض آیات میں دونوں فریق کے متعلق خالدین کے ساتھ ابداً بھی مذکور ہے جس میں دوام کی زیادہ تصریح ہو گئی۔ بہر حال یہ تین حالتیں ہیں جو اس جگہ ہم کو یاد دلائی گئی ہیں اس مضمون کے اختیار کرنے کی یہ وجہ ہے کہ انسان جو بعض دفعہ خدا کی نافرمانی کرنے لگتا ہے تو اس کا زیادہ سبب یہی ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت سے اور اس حالت سے جو اس کو آئندہ پیش آنے والی ہے غافل ہے۔ غفلت ہی تمام نافرمانیوں کی جڑ ہے اور غفلت اس لیے ہے کہ وہ ان حالات سے یا تو ناواقف ہے اور یا اس کا استحضار نہیں کہ میں پہلے کیا تھا اور ایک دن کیا سے کیا ہو جاؤں گا۔ خیر مستقبل کا استحضار نہ ہونا تو چنداں عجیب نہیں کیونکہ اس کو ابھی دیکھا ہی نہیں چکھا ہی نہیں' گو دوسروں کا انجام تو روزانہ نہیں تو مہینہ میں یا سال بھر میں آنکھ کے سامنے سے ضرور گزر جاتا ہے اور اس کا سب کو یقین ہے کہ ایک دن ہمارا بھی یہی انجام ہونا ہے مگر خیر پھر بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تو دوسروں کا انجام دیکھا تھا ہم پر تو ابھی نہیں گزرا۔ اس لیے اس سے غفلت ہو جاتی ہے۔

ماضی سے غفلت

مگر میں اس سے بڑھ کر ایک اور بات کہتا ہوں وہ یہ کہ انسان کی عادت ہے کہ وہ ماضی کو بھی بھول جاتا ہے' یعنی جو حالت اس پر گزر چکی ہے اس کو بھی یاد نہیں رکھتا۔ بتلایئے! یہاں کیا عذر

ہے؟ صاحبو! ماضی کو تو ہر شخص دیکھ چکا ہے اور چکھ چکا کیا آپ جیسے اس وقت بیٹھے ہیں ہمیشہ سے ایسے ہی تھے ہرگز نہیں بلکہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ آپ میں چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ تھی' بستر ہی پر پڑے ہگتے موتتے تھے' کسی نے اٹھا دیا تو اٹھ گئے' بٹھا دیا تو بیٹھ گئے' کہیں رال بہ رہی تھی کبھی سنک چاٹ رہے تھے خیر اس کو بھی جانے دیجئے! کیونکہ آپ کہیں گے اس وقت ہم کو ہوش ہی نہ تھا اس لیے یہ باتیں کس کو یاد ہیں۔ گو یہ عذر اس لیے قابل قبول نہیں کہ دوسرے خبر دینے والے بکثرت موجود ہیں جو آپ کے سارے اترے پترے کھول سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں بچوں کی حالت کا روزانہ آپ خود مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ کیونکر پیدا ہوتے اور کس طرح بڑھتے ہیں اور ابتداء میں ان کی کیسی قابل رحم حالت ہوتی ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ آپ بھی ماں کے پیٹ سے اسی طرح پیدا ہوئے تھے اور یوں ہی گودوں میں پالے گئے تھے پھر اس کا استحضار دشوار کیوں ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اچھا سات آٹھ برس کی عمر کے واقعات تو اکثر لوگوں کو یاد ہوتے ہیں اور دس گیارہ سال کے حالات تو ضرور ہی یاد ہوتے ہیں۔ ذرا ان ہی کو یاد کر لیجئے کہ اس وقت آپ کی کیا حالت تھی؟ اور اب کیا حالت ہے؟ اس وقت کھانے ہگنے کے سوا کسی بات کی بھی حس نہ تھی' لڑکوں میں واہی تباہی پھرا کرتے تھے' کہیں اینٹوں کا گھر بناتے تھے' کبھی گلی ڈنڈے سے کھیلتے تھے نہ سر کی خبر تھی نہ پیر کی۔ جانوروں کی طرح پھرتے تھے' بھلا آج ہر شخص کی جو حالت ہے کہ کوئی ڈپٹی ہے کوئی تحصیلدار ہے کوئی رئیس ہے کوئی زمیندار ہے' کوئی شیخ ہے کوئی مدرس کوئی واعظ ہے کوئی مفتی کوئی کاریگر ہے کوئی انجینئر کوئی فلسفی ہے' کوئی معقولی' کیا اس وقت کسی کو یا خود اس کو یہ گمان وخیال ہوسکتا تھا کہ میری ایک دن یہ حالت ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں! حضرت اس حالت میں اور اس حالت میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا مگر انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ مستقبل سے تو غافل ہے ہی زمانہ ماضی کو بھی بھول جاتا ہے اگر یہ ماضی کو بھی یاد رکھتا تو اس کی اصلاح کے لیے یہ بھی کافی تھا۔

بندۂ حال

مگر یہ تو ابن الحال ہے۔ صرف حال ہی کو یاد رکھتا ہے اور اسی میں مست ہو جاتا ہے۔ شاید آپ کہیں کہ یہ تو اچھی حالت ہے کہ ماضی و مستقبل دونوں کو الگ کر کے ابن الحال ہو گیا اور ابن الحال تو صوفی کو کہتے ہیں۔ صاحب میں نے یہاں ابن الحال لغت کے اعتبار سے کہا ہے اصطلاحی معنی کے اعتبار سے نہیں کہا جو صوفیاء کی عبارت میں مستعمل ہے اگر ہم ویسے ابن الحال ہوتے تو قسمت ہی اچھی ہو جاتی ہے۔ صوفیاء تو ابن الحال اسے کہتے جو حقوق وقت کو ادا کرتا ہوا ابن الحال

ایسے ہیں جو وقت کو ضائع کرتے ہیں۔ گویا ابن تو ہیں مگر عاق و نافرمان مگر میں اس ایہام ہی کو قطع کیے دیتا ہوں اور ابن الحال کے بجائے عبدالحال کہتا ہوں کہ انسان ماضی و مستقبل سب کو بھلا کر بندہ حال ہو گیا ہے اس کی حالت یہ ہے کہ اس وقت اگر راحت ہے تو اسی میں مست ہے اور اگر کلفت ہے تو خدا سے شکایت ہے' ذراسی بات میں وہ ان تمام انعامات کو بھول جاتا ہے جو زمانہ ماضی سے اب تک ان پر ہو چکے ہیں یہ بھی نہیں دیکھتا کہ پہلے میں کیا تھا اور اب کیا ہو گیا ہوں۔ خدا کا کتنا بڑا انعام ہے کہ اس نے مجھے جانور سے آدمی کیا اور آدمی بھی عاقل' سمجھدار' ہوشیار اور اس نے مجھے اب تک کیسی راحت سے رکھا ایک دن اگر کلفت بھی ہو گئی تو کیا ہوا ساری عمر تو آرام سے گزری ہے مگر تو بہ ان گزشتہ واقعات کا تو خطرہ بھی نہیں آتا' اس کی نظر تو صرف حال پر ہوتی ہے اگر کھانے کو مل گیا تو خوش ہے مست ہے ورنہ گویا ان تلوں میں تل ہی نہیں تھا' بس یہ شان ہے:

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی　　　چونکہ خوردی تندو بدرگ می شوی

بھوک میں کتے کی طرح بھونکتا ہے اور پیٹ بھر کے کتے کی طرح غراتا ہے۔ کسی حال میں راہ پر نہیں آتا۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعاً اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعاً وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعاً

انسان بڑا ہی کم ہمت ہے اگر اس کو کلفت پہنچے تو ہائے واویلا مچادے اور مال مل جائے' راحت نصیب ہو جائے تو بخل کرنے لگے اس وقت بھی چین نہیں۔ اب یہ سمجھتا ہے کہ نہ معلوم پھر بھی ملے گا یا نہیں' لاؤ اس کو جمع کر لو۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں:

اَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّا اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝

یعنی انسان کی یہ حالت ہے کہ جب حق تعالیٰ اس کو (نعمت سے) آزماتے ہیں اس پر بخشش و انعام فرماتے ہیں۔ تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے میری خاطر کی مجھ پر کرم کیا اور جب (تکلیف سے) آزماتے ہیں پھر اس پر روزی کی کھینچ کر دیں۔ تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ذراسی پریشانی میں پچھلے سارے انعامات بھول جاتا ہے اور روزی ہی کے ملنے پر مقبولیت و قدر کا مدار سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو میرے حال پر توجہ نہیں' روز و شب اسی دھندے میں رہتا ہے کہ کسی طرح کھانے کو ملے چاہے کسی طرح ملے جو کچھ اس کو ملتا ہے اس کو خدا پر اپنا حق سمجھتا ہے حالانکہ حق تعالیٰ نے اس کو محض اپنے فضل سے عدم محض سے ہست کیا اور ایسے وقت میں اس پر احسان کیا جب کہ یہ کچھ بھی نہ تھا۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود لطف تو ناگفتہ ما می شنود

(نہ ہم تھے نہ ہمارا تقاضا تھا آپ کا لطف وکرم ہمارے بلا کہے ہوئے سنتا تھا)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا" (انسان پر ایک ایسا وقت آچکا ہے جس میں یہ کچھ بھی قابل ذکر نہ تھا ۱۲) پھر اس کو اس حال میں پرورش کیا کہ یہ بالکل عاجز وکمزور تھا' چلنے پھرنے کے قابل نہ تھا' جانوروں سے بھی عاجز تھا وہ ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی اپنے پیروں سے چلنے پھرنے لگتے اور منہ مارنے لگتے ہیں یہ اتنا بھی نہ تھا پھر ایسے کمزور وعاجز کو خدا نے اتنا پالا' ایسا پالا کہ آج بزعم خود خدا کے مقابلہ کے قابل ہو گیا' اب کھا کھا کر معصیت پر کمر بستہ ہو گیا۔ گویا خدا کوئی چیز ہی نہیں گو اعتقاداً ایسا نہ سہی مگر حالاً تو ہے ہی اور بعض نے اعتقاداً وقولاً بھی ایسا ہی کر دکھایا اپنی ہستی کو انہوں نے ایسا برقرار کیا کہ ہستی خدا کی نفی کر دی۔

فرعونیت ودھریت

چنانچہ نمرود اور فرعون خدا کی ہستی کی نفی کرتے تھے۔ اسی لیے فرعون کہتا ہے "مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ" کہ اپنے سوا میں کسی کو تمہارا معبود نہیں سمجھتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کا قائل ہی نہ تھا کیونکہ یہ تو کوئی بیوقوف سے بے وقوف بھی نہیں کر سکتا کہ خدا کو موجود مان کر پھر اپنے کو اس سے بڑا سمجھے اور اس نے جو "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" کہا ہے اس سے شبہ نہ کیا جائے کہ وہ تو اپنے کو بڑا خدا کہتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا قائل تھا پھر اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہتا تھا بلکہ منشا اس قول کا یہ ہے جو قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ فرعون دھری تھا وہ کہتا تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں بس جو جس کو تربیت کرتا ہے وہی اس کا رب ہے اولاد کو ماں باپ پالتے ہیں تو والدین ان کے رب ہیں حاکم رعایا کی تربیت کرتا ہے وہ رعایا کا رب ہے اور بادشاہ سب سے بڑا حاکم ہے تو وہ سب سے بڑا رب ہے اس لیے وہ اپنے کو رب اعلیٰ کہتا تھا۔ یعنی میں دنیا میں سب تربیت کرنے والوں سے بڑا ہوں تو میں سب سے بڑا ہوں یہ مطلب تھا اس کے قول کا۔ یہ نہیں کہ وہ خدا کا قائل تھا اور پھر اپنے کو خدا سے بڑا سمجھتا تھا بلکہ وہ تو سرے سے خدا ہی کا منکر تھا اسی لیے اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا و ما رب العالمین (رب العالمین کیا چیز ہے خدا کون ہوتا ہے؟) وہ کم بخت خدا کی کنہ پوچھتا تھا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ منکر صانع تھا۔

شان موسویت

پھر موسیٰ علیہ السلام کا جواب قابل دید ہے آپ چونکہ عارف تھے بلکہ عارف کہنا بھی آپ کی کسر شان ہے اعرف العارفین تھے (بلکہ یہ بھی کسر شان ہے رسول اور نبی تھے جو منتہائے

کمالات بشریہ ہے۱۲) آپ نے جواب دیا: "رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَابَیْنَهُمَا اِنْ کُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ" خدا وہ ہے جو آسمان اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا تربیت کرنے والا ہے۔ اگر تم یقین کرنا چاہتے ہو تو علم باری کے لیے اتنا جان لینا کافی ہے) آپ نے اس جواب میں اس مسئلہ پر متنبہ کر دیا کہ کنہ ذات باری مدرک نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا ادراک ہمیشہ بالوجہ ہوگا۔ پس تیرا کنہ سے سوال کرنا حماقت ہے اور یہ تنبیہ اس طرح ہوئی کہ اگر کنہ ذات کا ادراک ہو سکتا تو موسیٰ علیہ السلام جواب میں کنہ ہی کو بیان فرماتے کیونکہ سوال اسی سے تھا اور جواب کا مطابق سوال ہونا ضروری ہے۔ اگر سوال صحیح ہو خصوصاً ایسے موقع میں جہاں غیر مطابق جواب دینے سے مجیب کا عجز سمجھا جائے اور حق پر تمسخر کیا جائے جیسا کہ یہاں ہوا کہ فرعون نے جواب بالوجہ کو سن کر تمسخر کیا اور "قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ" اپنے پاس والوں سے کہنے لگا کہ تم سنتے بھی ہو کیسا جواب دیا یعنی میں تو کنہ پوچھتا ہوں آپ وجہ بیان کر رہے ہیں۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے اس پر بھی کنہ بیان نہیں کی بلکہ ایک وجہ اور بیان کر دی۔ "قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ" فرمایا کہ خدا وہ ہے جو تمہارا رب ہے اور تمہارے گزشتہ باپ دادوں کا بھی رب ہے۔ فرعون اس پر جھلا کر کہنے لگا: "اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ" کہ اے لوگو! تمہاری طرف جو رسول بھیجا گیا ہے وہ تو دیوانہ ہے (کیونکہ ان کو سوال کے مطابق جواب دینا بھی نہیں آتا) میرا سوال کچھ ہے ان کا جواب کچھ ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ کنہ باری کا ادراک ممتنع ہے ورنہ موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ پر ضرور بیان فرماتے مگر آپ نے بار بار وجہ ہی بیان کی (اور ایسی وجہ بیان کی جو اثبات وجود صانع کے لیے بالکل کافی تھی) چنانچہ اول تو یہ فرمایا کہ وہ آسمان و زمین اور ان کے مابین جو اشیاء ہیں سب کا رب ہے اس میں فرعون پر اس خیال کی غلطی نمایاں کر دی کہ بس جو جس کی تربیت کرے وہی اس کا رب ہے کیونکہ اگر یہی بات ہے کہ تربیت علت ہے الوہیت کی تو بتلاؤ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا' آسمان میں سورج اور چاند اور ستارے اور زمین میں پانی' ہوا' آگ وغیرہ کس نے پیدا کی؟ ظاہر ہے کہ تو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں ان چیزوں کا خالق ہوں کیونکہ یہ چیزیں کسی کے تابع نہیں ہیں اور مخلوق کا خالق کے لیے تابع ہونا ضروری ہے جب ان کا رب نہیں اور کسی نہ کسی رب کا ہونا ضروری ہے تو ضرور کوئی اور ہی رب ہے۔ علیٰ ہذا زمین میں جو درخت اور نباتات پیدا ہوتے ہیں یہ کون پیدا کرتا ہے؟ اگر کہو کاشتکار پیدا کرتے ہیں تو یہ بداہتہً غلط ہے اور کاشتکار کا زمین کے درست کرنے اور پانی دینے اور بیج ڈالنے

کے سوا کسی بات میں دخل نہیں اگر دخل ہے تو چاہیے کہ جتنا وہ چاہے اور جب چاہے فوراً پیداوار ہو جایا کرے حالانکہ اس کی مرضی کے موافق بارہا پیداوار نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جس کے قبضہ میں یہ تمام چیزیں ہیں اور وہی سب کا خالق ہے۔ جب فرعون اس سے لاجواب ہو کر تمسخر کرنے لگا تو آپ نے دوسری وجہ بیان کی جس میں صراحتہً اس کے قول سابق کا ابطال تھا فرمایا کہ وہ رب ہے تمہارا اور تمہارے پہلے بزرگوں کا اس میں بتلا دیا کہ تو جو ماں باپ کو اولاد کا رب اور حاکم کو رعیت کا رب کہتا ہے تو بتلا! کہ باپ ماں کے مرنے کے بعد اولاد کیونکر زندہ رہتی ہے یہ عجیب تماشا ہے کہ رب تو مرجائے اور مربوب زندہ رہے۔ اسی طرح حاکم بھی مرتے رہتے ہیں تو ان کے مرنے سے رعایا کیوں نہیں مرجاتی' خالق کے بغیر مخلوق کیونکر زندہ رہتی ہے۔ پھر اگر باپ ماں اولاد کے خالق ہیں تو جو سب سے پہلا باپ تھا اس کا خالق کون تھا' اگر وہ خود اپنا خالق تھا تو مر کیوں گیا' اس نے اپنے آپ کو زندہ کیوں نہ رکھا' جب وجود اس کے اختیار میں تھا تو اس نے اپنے وجود کو باقی کیوں نہ رکھا کیونکہ موت کسی کو مرغوب نہیں طبعاً ہر شخص کو اس سے کراہت ہے اور اگر پہلا باپ کوئی نہیں تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا۔ علاوہ ازیں یہی گفتگو ہر باپ کے متعلق ہے کہ اگر وہ اولاد کے خالق ہیں اور وجود ان کے اختیار میں ہے جس کو چاہیں دے دیں تو خود کیوں فنا ہو جاتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جب تمہارا اور تمہارے آباواجداد کا وجود اپنے قبضہ میں نہیں تو یہ نہ اپنے خالق ہو سکتے ہیں نہ کسی غیر کے تو ضرور تمہارا سب کا رب کوئی اور ہے وہی رب العالمین ہے۔ جب فرعون اس پر بھی لاجواب ہوا اور وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتا رہا یہ تو جواب بالکل نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے تیسری وجہ اور بیان فرمائی: "قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ" فرمایا کہ تربیت کرنے والا ہر مشرق اور مغرب کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کی بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے سمجھ لو کیونکہ یقیناً طلوع شمس و غروب شمس پر اور تبدل و تغیر مواسم و فصول پر کسی انسان کی قدرت نہیں انسان تو یہ چاہتا ہے کہ بارہ مہینہ ایسی حالت رہے نہ گرمی زیادہ ہو نہ سردی اور بہت دفعہ جب کوئی کام پورا نہیں ہوتا تو چاہا کرتا ہے کہ ابھی رات نہ آئے تو اچھا ہے مگر ان باتوں میں اس کے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کا کوئی رب ضرور ہے وہی رب العالمین ہے ۱۲) غرض موسیٰ علیہ السلام دبے نہیں کیونکہ صاحب حق دبا نہیں کرتا ان پر علم کا رعب تو کیا ہوتا سلطنت کا رعب بھی نہ ہوا صاحب حق اظہار حق میں کسی سے مرعوب نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے آپ نے اسی جواب بالوجہ کو مختلف پہلوؤں سے اعادہ کیا (اور ہر دفعہ ایسی چبھتی ہوئی بات کہی جس کا

فرعون کے پاس کچھ جواب نہ تھا۱۲) یہاں سے معلوم ہوا کہ صاحب حق کو کسی مخاطب سے مرعوب ہو کر اپنا طرز نہ بدلنا چاہیے بلکہ حق بات ہی کو بار بار کہنا چاہیے یہ آج کل ہی کا طرز ہے کہ مجیب سائل کا اتباع کر کے اپنا طرز بدل دیتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا بلکہ اخیر تک اپنی بات پر جمے رہے کہ جتنی دفعہ بولو گے جواب وجہ ہی سے ملے گا۔

چو حجت نماند جفا جوئے را ❊ بہ پرخاش درہم کشد روئے را

(جو کیڑا پتھر میں نہاں ہے زمین اور آسمان اس کے لیے وہی ہے)

فرعونی حربہ

جب کوئی بات نہ چلی تو اب اس نے قوت سلطنت سے کام نکالنا چاہا: "قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ" کہنے لگا کہ بس بس زیادہ نہ بولو اگر میرے سوا کسی کو خدا بناؤ گے تو میں تم کو جیل خانہ بھیج دوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام یہاں بھی نہیں دبے "قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَىْءٍ مُّبِيْنٍ" فرمایا کیا اگر میں کوئی صریح دلیل پیش کردوں (جس سے رب العالمین کی قدرت اور میری رسالت کی حقانیت علانیہ ظاہر ہو جائے) تب بھی (تو نہ مانے گا اور خواہ مخواہ ہی اپنی بات پر اڑا رہے گا) اس کے بعد اس نے معجزات ظاہر کرنے کا مطالبہ کیا۔ آپ نے معجزات دکھلائے عصا کو زمین پر ڈال دیا وہ نمایاں اژدھا بن گیا جس کو دیکھ کر فرعون ڈر کر بھاگنے لگا اور ساری خدائی ڈھیلی ہو گئی غرض فرعون کی ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دھری تھا خدا کو مانتا ہی نہ تھا۔

نمرود کی بدد ماغی

اسی طرح نمرود بھی منکر صانع تھا۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مناظرہ کیا تھا کہ تم جو خدا کی ہستی کے مدعی ہو بتلاؤ خدا کیسا ہے؟ "قَالَ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْيِىْ وَيُمِيْتُ" ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب ایسا ہے کہ وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی مارنا اور جلانا اس کے خاص کمالات میں سے ہے کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکتا اور عالم میں ان دونوں فعلوں کا وقوع مشاہد ہے۔ پس خدا کا وجود بھی ضروری التسلیم ہے) وہ کوڑھ مغز جلانے اور مارنے کی حقیقت تو سمجھا نہیں کہنے لگا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں یہ کوئی خدا کی خاص صفت نہیں جس کے وجود سے خدا کا وجود تسلیم کرنا لازم آ جائے کیونکہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ چنانچہ جس کو چاہوں قتل کر دوں یہ تو مارنا ہے اور جس واجب القتل کو چاہوں چھوڑ دوں یہ جلانا ہے پھر جیل خانہ میں سے دو واجب القتل قیدیوں کو بلا کر ایک کو رہا کر دیا اور ایک کو مار ڈالا۔ ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو بالکل ہی

بھدی عقل کا ہے اسے جلانے اور مارنے کی حقیقت بھی معلوم نہیں حالانکہ جلانے کی حقیقت یہ ہے کہ بے جان چیز میں جان ڈال دے نہ یہ کہ جاندار کو چھوڑ دے اسی طرح مارنا یہ ہے کہ زندہ کی جان اپنے اختیار سے نکالے اور گردن کاٹنے میں قاتل کے اختیار سے جان نہیں نکلتی۔ اس کا کام تو صرف گردن کاٹنا ہے اس کے بعد بدوں اس کے اختیار کے جان نکلتی ہے ورنہ پھر یہ بھی اختیار ہونا چاہیے کہ گردن الگ کردے اور جان نہ نکلنے دے اور یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لیے نہ چھیڑی کہ قرائن سے معلوم ہوگیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت تو سمجھے گا نہیں سمجھ بھی گیا تو تسلیم نہ کرے گا اور خواہ مخواہ بحث میں الجھے گا۔ اس ضرورت سے دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اچھا اللہ تعالیٰ آفتاب کو روز کے روز مشرق سے نکالتا ہے (اگر بزعم خود خالق ہو تو ایک ہی دن) مغرب سے نکال کر دکھلا دو۔

نمرود کی مرعوبیت

"فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ" اس پر وہ کافر ان کا منہ تکنے لگا اور کچھ جواب بن نہ آیا پھر اس نے بھی وہی کیا جو فرعون نے کیا تھا کہ سلطنت کے زور سے کام لینے لگا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈلوادیا جس کی گزند سے خدا تعالیٰ نے ان کو بچالیا اور آگ کا مطلق اثر نہ ہوا اس جگہ دو سوال وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ نمرود کو یہ کہنے کی تو گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی سورج کو مغرب سے نکال دے پھر اس نے یہ کیوں نہ کہا جواب اس کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر سے بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے اور یہ مشرق سے نکالنا اس کا فعل ہے اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے اور یہ بھی بے اختیار اس کے دل میں آ گیا کہ یہ شخص پیغمبر ہے اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہو جائے گا اور ایسا ہونے سے جہان میں انقلاب عظیم پیدا ہوگا کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کہ یہ لوگ اس خارق عادت کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو کر ان کی راہ پر ہو لیں اور ذرا سی حجت میں سلطنت ہاتھ سے جاتی رہے۔ یہ جواب تو اس لیے نہ دیا اور کوئی دوسرا جواب تو تھا نہیں اس لیے حیران ہو کر منہ دیکھتا رہ گیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی حجت کیوں بدلی یہ تو آداب مناظرہ کے خلاف ہے کیونکہ اس طرح تو گفتگو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا بس جہاں مدعی کی دلیل پر نقض وارد ہوا ہو وہ اس دلیل کو چھوڑ کر دوسری بیان کرنے لگے گا پھر اس پر نقض وارد ہوگا تو تیسری دلیل پیش کر دے گا وعلیٰ ہذا القیاس یوں تو سلسلہ غیر متناہی ہو جائے گا اسی لیے اہل مناظرہ کے لیے اس قول کا مطلب یہ ہے

کہ مدعی کو اپنی مصلحت سے تبدیل دلیل کی اجازت نہیں باقی خصم کی مصلحت سے کہ مثلاً وہ غبی ہے اور دلیل اول کو غموض کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتا۔ حجت کا بدلنا اور دوسری دلیل بیان کرنا جائز ہے بلکہ جہاں سمجھانا مقصود ہو وہاں ایسا کرنا واجب ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھانا ہی مقصود تھا وہاں ایسا کرنا دلیل غامض کو بدل کر سہل دلیل اختیار کی اور گو اہل مناظرہ نے اس کی تصریح نہیں کی مگر ان کے قول کو اس پر محمول کرنا ضروری ہے کیونکہ جس طرح ایک مصلحت عقلیہ تبدیل کی عدم جواز کو مقتضی ہے اسی طرح ایک مصلحت عقلیہ بھی تفہیم مخاطب اس کے جواز کو مقتضی اور ظاہر ہے کہ ہم نے پہلے قاعدہ کو محض اقتضاء عقل کی وجہ سے تسلیم کیا ہے ورنہ محض اہل مناظرہ پر کوئی وحی تھوڑا ہی نازل ہوئی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اقتضائے عقل کی وجہ سے اس قاعدہ میں استثناء کا قائل نہ ہوا جائے۔ یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق تھی۔

فائدہ جلیلہ

اب میں یہاں سے ایک فائدہ جدیدہ پر متنبہ کرتا ہوں جو طلبہ کے کام کی بات ہے وہ یہ کہ ابھی قریب زمانہ میں حیدرآباد سے ایک عالم نے جو میرے دوست بھی ہیں مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ایک رسالہ میں یہ مضمون لکھنا چاہتا ہوں کہ وجود صانع کا اعتقاد فطری ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید پر دلائل قائم کیے ہیں مگر اثبات وجود صانع پر براہین و دلائل نہیں قائم کیے جیسا کہ قرآن کے مضامین سے واضح ہے جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل توحید کی تعلیم کی گئی ہے کہ ان میں اثبات صانع پر کوئی دلیل نہیں ہے پھر مجھ سے دریافت کیا تھا کہ اس مضمون کے متعلق تیری کیا رائے ہے میں نے لکھا کہ اس مدعی پر اس دلیل سے استدلال کرنا غلط ہے کیونکہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات صانع پر دلائل قائم نہیں کیے مگر دوسرے انبیاء نے تو قائم کیے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام طبیب کے مثل ہیں کہ مرض کو دیکھ کر دوا دیتے ہیں۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب دہری نہ تھے بلکہ مشرک تھے۔ اس لیے آپ نے اثبات صانع پر دلائل قائم نہیں کیے کیونکہ مخاطبین کو اس سے انکار نہ تھا۔ ہاں! توحید سے منکر تھے تو آپ نے اس پر دلائل قائم کیے اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو بعض دہریوں سے بھی سابقہ پڑا ہے اس لیے انہوں نے توحید کے ساتھ اثبات صانع پر بھی دلائل قائم کیے۔ بس گو یہ مسئلہ فی نفسہ صحیح ہے کہ وجود صانع کا اعتقاد فطری ہے مگر اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عدم استدلال سے استدلال کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس پر خصم یہ کہہ سکتا ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ اگر ضرورت پڑتی تو آپ اس پر بھی دلائل قائم کرتے جیسا کہ اور انبیاء علیہ السلام نے کیے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے مقابلہ میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے مقابلہ میں اثبات صانع پر ادلہ قائم کیے جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ میں نے ابھی بیان کیا ہے اور گو اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ بطور دلیل علی الظن کے ہوں اور استدلال کے لیے احتمال بھی قادح ہے اس لیے میں نے لکھا کہ اس مضمون کو رسالہ میں تو آپ شائع نہ کریں گو اپنے خیال میں صحیح سمجھتے رہیں (یہ تنبیہ اس لیے کر دی گئی کہ شاید کسی کو دیگر انبیاء علیہم السلام کے دلائل میں جو قرآن کے اندر مذکور ہیں اثبات صانع پر دلیل دیکھ کر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل میں نہ دیکھ کر یہ شبہ ہو کہ اگر اثبات صانع پر دلیل کرنا ضروری تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہیں قائم کی اور غیر ضروری تھا تو اور انبیاء علیہم السلام نے کیوں قائم کی پھر وہ ایک دوسرے کی ترجیح اور مزیت ثابت کرتا اس لیے یہ بتلا دیا گیا کہ یہ اختلاف دلائل مخاطبین کے اخلاف پر مبنی ہے پس اب کچھ شبہ نہ رہا ۱۲) غرض انسان کی غفلت اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ بعضے منکر صانع بھی تھے اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک بزرگ نے جو صاحب ادلال تھے اور ادلال کے معنے ناز کے ہیں۔ یہ بھی ایک مقام ہے ولایت کا جو بعض اہل اللہ کو نصیب ہوتا ہے وہ صاحب ادلال ہوتے ہیں یعنی بطور ناز کے حق تعالیٰ سے ایسی باتیں عرض کر دیتے ہیں جو دوسرا نہیں کر سکتا گو بعض دفعہ وہ ادلال دوسروں کے لیے اضلال (ضاد کے ساتھ) ہو جاتا ہے کیونکہ وہ موٹی عقل کے ہوتے ہیں ان کو دال سے مناسبت نہیں ہوتی ضاد ہی سے مناسبت ہوتی ہے تو وہ بزرگوں کی ایسی باتوں سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔

منصور و فرعون کا فرق

خیر ایک ایسے ہی بزرگ نے حق تعالیٰ سے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ منصور نے بھی انا الحق کہا تھا اور فرعون نے بھی انا الحق کہا تھا (کیونکہ انا ربکم الاعلیٰ کا بھی وہی حاصل ہے جو انا الحق کا ہے ۱۲) تو بات ایک ہی تھی مگر منصور تو مقبول ہو گیا اور فرعون مردود ہو گیا۔ وہاں سے جواب عطا ہوا کہ تم سمجھتے نہیں دونوں میں بڑا فرق تھا' منصور نے اپنے کو مٹا کر انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹا کر انا الحق کہا تھا یعنی منصور نے ایسی حالت میں انا الحق کہا تھا کہ اپنی ہستی ان کی نظر سے غائب تھی اور ہستی خداوندی کے سوا کسی پر ان کی نظر نہ تھی تو وہ اپنی نفی کر کے انا الحق کہتے تھے اور فرعون نے ایسی حالت میں انا ربکم الاعلیٰ کہا تھا کہ اس وقت خدا کی ہستی اس کی نظر سے غائب تھی محض اپنی ہی

ہستی پیش نظر تھی تو وہ ہستی خداوندی کی نفی کر کے اپنی ہستی کو ثابت کر رہا تھا' دونوں میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ منصور کے انا الحق کے یہ معنے تھے کہ میں اور تمام عالم کچھ نہیں صرف خدا ہی کا وجود ہے اور فرعون کے انا الحق کا یہ مطلب تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں۔ بس میں ہی ہوں جو کچھ ہوں۔ واقعی یہ جواب ایسا عجیب ہے کہ حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

گفت فرعونے انا الحق گشت پست   گفت منصورے انا الحق گشت مست

(فرعون تو اس بات سے مردود اور پست ہو گیا اور منصور مجذوب اور مست شمار ہوئے)

لعنت اللہ آں انارا درقفا   رحمت اللہ ایں انارا در وفا

اس انا کے عقب میں تو لعنت ہے جو فرعون نے کہا تھا اور اس انا پر رحمت ہے جو منصور نے کہا تھا کیونکہ اس کا منشاء وفا تھی وہ خدا کی ہستی کا حق ادا کر کے کہہ رہے تھے اور یہ گفتگو بہت طویل ہو گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان کی عادت یہ ہے کہ وہ ماضی کو بھول جاتا ہے اور اپنے اس ضعف و عجز کو یاد نہیں رکھتا جو ایک زمانہ میں اس پر گزر چکا ہے۔ گویا حالاً یوں سمجھتا ہے کہ (نعوذ باللہ) حق تعالیٰ کو ماضی پر اب قدرت نہیں رہی جو حالت گزر گئی اب دوبارہ مجھے پیش نہیں آسکتی چنانچہ ایک مقام پر حق تعالیٰ نے انسان کی اسی عادت پر (کہ وہ ماضی کو بھول جاتا ہے) متنبہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا" تمہارا رب ایسا (منعم) ہے کہ تمہارے (فائدہ کے) لیے کشتی کو دریا میں لے چلتا ہے تا کہ تم اس کے رزق کو تلاش کرو۔ بیشک وہ تمہارے حال پر بہت مہربان ہے۔ واقعی دریا میں جہازوں اور کشتیوں کا چلنا بڑی رحمت ہے اس سے سفر میں کتنی آسانی ہو گئی ورنہ بس ہندوستان والے تو حج سے محروم ہی رہتے یہ تو دینی ضرر تھا اور دنیوی ضرر یہ تھا کہ دوسرے ممالک کی چیزوں سے محروم رہتے یہ جہازوں ہی کی تو برکت ہے کہ آج قسم قسم کی چیزیں اور راحت کے سامان دوسری ولایتوں سے یہاں آتے ہیں اور یہاں کی چیزیں باہر جاتی ہیں جس سے تجارت کی ترقی ہو گئی اور سمندر میں جہازوں کا چلنا محض خدا کی رحمت ہی ہے ورنہ بڑے سے بڑا جہاز پانی میں ایسا معلوم ہوتا جیسے تنکا بہہ رہا ہو' سمندر کی ایک موج بھی اس کے ڈبونے کے لیے کافی ہے اور اس وقت ساری مشینیں بیکار ہو جاتی ہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے حفاظت فرماتے ہیں:

طوفانی ایمان

ہاں! کبھی بطور تنبیہ و امتحان کے طوفان میں بھی مبتلا کر دیتے ہیں جیسے خشکی میں بعض دفعہ اسی حکمت سے مصائب بھیج دیتے ہیں آگے اس امتحان کے متعلق ارشاد ہے:

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِیَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰكُمْ اِلَی الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا○

اور جب تم کو دریا میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے (جیسے موج اور ہوا کا طوفان) تو (اس وقت) بجز خدا کے اور جتنوں کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہو جاتے ہیں۔ طوفان کے وقت کافر ملحد بھی خدا کا قائل ہو جاتا ہے۔ جہاز کے کپتان بھی کہنے لگتے ہیں کہ ح۔جی بابا خدا سے دعا کرو۔ واقعی خدا کا وجود ایسا فطری ہے کہ طوفان کے وقت اضطراری طور پر ملحد کو بھی اس کا قائل ہونا پڑتا ہے اور کافر مشرک موحد ہو جاتا ہے اس وقت سارے دیوتا اور مہادیو وغیرہ دل سے نکل جاتے ہیں اور خدا ہی خدا رہ جاتا ہے اور مسلمانوں کو اس وقت توبہ و انابت الی اللہ نصیب ہو جاتی ہے۔ ہر شخص گناہوں سے استغفار کرنے لگتا اور آئندہ کے لیے متقی بننے کا قصد کر لیتا ہے۔

خشکی کا الحاد

آگے فرماتے ہیں پھر جب تم کو خشکی کی طرف بچالاتا ہے تو تم پھر خدا سے پھر جاتے ہو بس جہاں جہاز سے کنارہ پر اترے پھر بدستور سابق وہی حالت ہو جاتی ہے' مشرک شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ملحد خدا کا منکر ہو جاتا ہے اور مسلمان گناہوں کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔ حق تعالیٰ اس کی شکایت فرماتے ہیں: وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا کہ واقعی انسان ہے بڑا ناشکرا کہ ایسی جلدی منعم کا انعام اور اپنا عجز و نیاز سب بھول جاتا ہے۔ یہی ہے ماضی سے غفلت کہ ایک مصیبت سے بچنے کے بعد انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ بس اب میں ہمیشہ کو بچ گیا' دریا ہی تک مصیبت تھی اب گھر پہنچ کر سلامتی ہی سلامتی ہے۔ حق تعالیٰ آگے اس خیال کی غلطی ظاہر فرماتے ہیں: "اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا" (یعنی دریا سے نکل کر) کیا تم اس بات سے بھی بے فکر ہو بیٹھے ہو کہ اللہ تعالیٰ تم کو خشکی کی جانب میں لاکر زمین میں دھنسا دے یا کوئی تند ہوا تم پر بھیج دے پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ۔ چنانچہ قارون کو خشکی ہی میں دھنسایا گیا تھا اور اب بھی ایسے واقعات ہو جاتے ہیں کہیں زلزلہ سے آدمی زمین میں دھنس گئے ہیں کہیں ریلیں ٹکرا گئیں' کہیں گھر کی دیواریں گر پڑیں اور دب کر مر گئے بعض دفعہ ایسی سخت ہوا آئی جس سے درخت اکھڑ گئے' آدمی تلف ہو گئے' کبھی ندی اور نالے چڑھ گئے جیسے خشکی ہی میں طوفان آ گیا ہو چنانچہ ابھی ایسے واقعات ہو چکے ہیں۔ گنگا اور جمنا کے طوفان سے ہزاروں گاؤں تباہ و برباد اور سینکڑوں جانیں تلف ہو گئیں پھر کس بات سے بے فکری ہے ارے جو خدا

سمندر میں ڈبو سکتا ہے وہ ہر جگہ تم کو ہلاک کر سکتا ہے۔ آگے بڑے مزے کی بات فرماتے ہیں:

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا۝

یا تم اس سے بے فکر ہو گئے ہو کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو دریا ہی میں دوبارہ لے جائے (جس کا مزہ ایک بار چکھ چکے ہو اور یہ کچھ دشوار نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ضروری کام ایسا نکال دیں جس کی وجہ سے دریا کا سفر پھر کرنا پڑ جائے انسان کے ارادہ کا بدلنا خدا کو کیا مشکل ہے رات دن مشاہدہ ہوتا ہے کہ آج ہم ایک قصد کرتے ہیں اور پھر اس کے خلاف کرنا پڑتا ہے میں خود اپنی حالت کہتا ہوں کہ ابھی قریب زمانہ میں جب ریلوں کے بند ہونے کا قصہ میں نے سنا تو یہ قصد کر لیا تھا کہ اس سال کہیں سفر نہ کروں گا مگر جناب پھر جانا ہی پڑا اور اسی حال میں جانا پڑا کہ ابھی تک بعض اطراف کی ریلیں رکی ہوئی تھیں۔ صورت ہی ایسی پیش آئی کہ میں رک نہ سکا وہ یہ کہ الٰہ آباد میں میرے ایک دوست سخت بیمار تھے ان کے بچنے کی امید نہ رہی تھی انہوں نے ایک صاحب کو یہاں بھیجا اور ان کی زبانی یہ پیام دیا کہ میری حالت نازک ہے اور تجھ سے ملنے کو جی بے اختیار چاہتا ہے جس طرح جانو فوراً چلے آؤ نہ معلوم پھر ملنا ہو یا نہ ہو قاصد نے ان کا اشتیاق کچھ اس طرح ظاہر کیا کہ مجھ سے نہ رہا گیا اور سفر کرنا ہی پڑا پھر خدا نے ایسا کیا کہ میں نے جا کر مریض زندہ ہی پایا اور مجھ سے مل کر ان کو بہت ہی خوشی ہوئی یہاں تک کہ طبیب نے بھی یہ کہہ دیا کہ ان کا آدھا مرض جاتا رہا (پھر واپسی کے چند روز بیچاروں کا انتقال ہو گیا۔ خدا تعالیٰ مغفرت فرمائے اور ان کو اپنی رحمت سے نوازے۔ آمین ۱۲) اور میں اسکو رحمت سمجھتا ہوں کہ حق تعالیٰ ہمارے ارادے توڑتے رہتے ہیں جس سے بار بار اپنا عجز اور ضعف مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اسی لیے ایک بزرگ فرماتے ہیں عرفت ربی بفسخ العزائم کہ میں نے اپنے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا کہ ہم لاکھ ارادے کرتے ہیں اور پختہ قصد کرتے ہیں مگر ایک قدرت ہے جو ان کو توڑ دیتی ہے واقعی وجود صانع کے لیے یہ کافی دلیل ہے مگر انسان ایسا غافل ہے کہ پہلی حالت کو بہت جلد بھول جاتا ہے۔ چنانچہ میں اپنی ہی کہتا ہوں کہ ایک بار فسخ ارادہ کا نمونہ دیکھ چکا ہوں مگر سفر سے واپس آ کر پھر بھی قصد کر لیا ہے کہ اب نہ جاؤں گا استغفر اللہ بلکہ یہ خیال ہے کہ اگر مجبوری پیش نہ آئی تو نہ جاؤں گا اور جو مجبوری پیش آئی تو میں سمجھوں گا کہ اب خدا تعالیٰ ہی کو سفر منظور ہے۔ اس وقت ضرور جاؤں گا بلکہ اب تو میں ارادہ کرنے سے بھی ڈرتا ہوں۔ بس خدا کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ جیسے چاہیں تصرف فرمائیں۔ بندہ کا کام

تفویض ہی ہے اور اسی میں راحت ہے۔ غرض حق تعالیٰ کو یہ کیا دشوار ہے کہ تم کو پھر دریا ہی میں بھیج دیں اور پہلے کی طرح پھر ہوا کا طوفان آ جائے جو غرق ہی کر کے چھوڑے۔ بس یہ نادانی ہے کہ انسان ایک بلا کے ٹلنے سے بے فکر ہو جائے مگر کچھ غفلت کا پردہ ایسا پڑا ہوا ہے کہ ماضی کو انسان بہت جلد بھول جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ بس وہ تو رفت و گزشت ہوا اسی لیے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ الماضی لا یذکر۔ حق تعالیٰ اس پر بھی قادر ہیں کہ حالت ماضیہ کو پھر لوٹا دیں اور ان کو ترکیب کی بھی ضرورت نہیں جس میں کچھ دیر لگے ترکیب کی ضرورت ہو تو اس کو ہو جسے قدرت نہ ہو وہ تو پورے قادر ہیں جب چاہیں پہلی ہی سی حالت کر دیں مگر آدمی اپنی غفلت سے ایسا بے فکر ہو جاتا ہے کہ گویا خدا کو ماضی پر قدرت ہی نہیں رہی۔ (نعوذ باللہ منہ)

مستقبل کی بے فکری

لیکن اگر نسیان ماضی کے ساتھ انسان کو اپنے مستقبل کا ہی خیال رہے تو بھی اتنی غفلت نہ ہو مگر یہ تو ماضی اور مستقبل دونوں سے آنکھیں بند کر کے عبد الحال ہو گیا ہے پھر مستقبل میں بھی صرف موت کا خیال کافی نہیں کیونکہ اس کے قائل تو دہری اور مشرک بھی ہیں مگر اس سے تو ان کو کچھ نفع نہیں ہوا کیونکہ وہ موت کے بعد حیات ثانیہ کے قائل نہیں۔ بس یوں سمجھتے ہیں کہ مر کر مٹی میں مل جائیں گے پھر نہ ثواب ہے نہ عذاب تو اس حالت میں خیال موت سے کیا نفع ہو سکتا ہے۔

معاد ثانی

اسی لیے حق تعالیٰ نے مبداء اور معاد اول کے بعد معاد ثانی کو یاد دلایا ہے چنانچہ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ میں مبداء اول کا ذکر ہے اور فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ میں معاد ثانی کا اور مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى میں معاد ثالث کا اور تینوں کو اس لیے جمع فرمایا کہ ملحدین تو مبداء کا یعنی خدا کے خالق ہونے ہی کا انکار کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تو موت و حیات کا مدار زمانہ کی گردش پر ہے۔ چنانچہ قرآن میں بھی دہریوں کا یہ خیال نقل کیا گیا ہے مگر وہ یوں کہتے ہیں: وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ کہ ہم کو تو زمانہ کی گردش ہلاک کرتی ہے۔ سو مبداء کا ذکر تو اس لیے فرمایا کہ ان کی اصلاح ہو اگرچہ یہ ضروری ہے کہ قرآن میں دہریوں سے تو زیادہ تعرض نہیں کیا گیا کیونکہ مخاطبین اس خیال کے بہت کم لوگ تھے زیادہ تر مشرکین ہی تھے اور مشرکین خدا کے قائل ہیں مگر حیات ثانیہ کے قائل نہیں وہ موت و حیات میں خدا کا دخل تو مانتے ہیں مگر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے قائل نہ تھے اور اس کو مستبعد و محال سمجھتے تھے۔ معاد ثانی کا اس لیے ذکر فرمایا اور اس مقام کے علاوہ بھی

حق تعالیٰ نے قرآن میں جا بجا ان کے استبعاد کا جواب دیا ہے اور بہت اہتمام سے معاد ثانی کو ثابت فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے: وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ کہ معاد ثانی خدا تعالیٰ کو پہلی بار زندہ کرنے سے زیادہ آسان ہے کیونکہ پہلے تو یہ اجسام بقابلیت قریبہ قابل حیات نہ تھے اور اب تو ان میں حیات کی قابلیت قریبہ ہوگئی ہے کیونکہ زمانہ دراز تک اس سے تلبس ہو چکا ہے پس دوبارہ زندہ کر دینا پہلی بار زندہ کرنے سے زیادہ عجیب نہیں بلکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو انسان کی حیات اولیٰ ایسی عجیب ہے کہ اگر ہر روز اس کا مشاہدہ نہ ہوا کرتا تو لوگ اس کو نہایت مستبعد سمجھتے۔ واقعی انسان کی پیدائش کا جو طریقہ رکھا گیا ہے وہ ایسا عجیب و غریب ہے کہ اگر کسی حکیم و فلسفی دماغ والے کو بچپن سے کسی تہ خانہ میں بند رکھا جائے اور وہاں اس کو ہر قسم کے علوم و فنون میں ماہر کر دیا جائے مگر یہ مسئلہ نہ پڑھایا جائے کہ انسان کیونکر پیدا ہوتا ہے نہ کوئی اس سے یہ تذکرہ کرے نہ وہ آنکھ سے اس منظر کو دیکھنے پائے پھر وہ جب تمام علوم و فنون میں کامل و ماہر ہو جائے اس وقت اس سے کہا جائے کہ خبر بھی ہے کہ تم کس طرح پیدا ہوئے تھے پھر اس کے سامنے یہ صورت پیدائش بیان کی جاوے کہ تم پہلے نطفہ کی شکل میں باپ کی پشت کے اندر تھے پھر وہ اس طرح تمہاری ماں سے ملا اور وہ نطفہ ما یہ رحم مادر میں پہنچا جہاں علقہ اور مضغہ بنا پھر اس کے اندر جان پڑی اور خون حیض سے پرورش پاتا رہا پھر نو ماہ کے بعد جیتا جاگتا ماں کے پیٹ سے نکلا پھر خدا نے خون کو بشکل دودھ ماں کے پستان میں پہنچا دیا وہ تم کو پلایا گیا۔ دو سال تم کو دودھ سے غذا دی گئی پھر دودھ چھوڑا کر تدریجاً روٹی کا عادی کیا گیا اس طرح بڑھتے بڑھتے تم جوانی کے قریب پہنچے اس وقت تم کو خدا نے ایسی عقل دی جو پہلے نہ تھی واللہ وہ فلسفی اور حکیم اس صورت کو سن کر فوراً رد کر دے گا اور قسمیں کھائے گا کہ ایسا ہو نہیں سکتا بھلا چند قطرات مایہ سے کہیں ایسا جسم بن سکتا ہے جس میں گوشت پوست ہڈیاں اور آنکھیں اور حواس ظاہرہ و حواس باطنہ ایسے ایسے موجود ہیں نیز جان پڑ جانے کے بعد ایک ذی روح کا پیٹ کے اندر پرورش پانا کیونکر ممکن ہے جہاں نہ ہوا کا گزر ہے نہ ایسی جگہ ہے جو حفظ صحت کے لیے کافی ہو ذی روح کا رحم مادر میں زندہ رہنا محالات سے ہے۔ حضرت میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ہم لوگوں نے پیدائش کا طریقہ جانوروں میں اور بعض انسانوں میں دیکھا نہ ہوتا تو محض سن کر ہرگز یقین نہ آتا سو حیات اولیٰ اس قدر عجیب ہے بخلاف حیات ثانیہ کے کہ وہ اس قدر مستبعد نہیں کیونکہ آج کل بعض ڈاکٹروں نے تحقیق کیا ہے کہ موت کے بعد کچھ دیر تک جسم میں حیات کا اثر باقی رہتا ہے اور اس مدت کے اندر اندر کوئی مقوی دوا مردہ کے جسم میں داخل کر دی جائے تو حیات کا اثر پیدا ہو جاتا

ہے اور مردہ کو حرکت ہونے لگتی ہے اور بعض دفعہ ایک دو گھنٹہ کے لیے وہ بات چیت بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر ڈاکٹروں کو کامیابی بھی ہوئی ہے تو وہ تو خانہ والا حکیم اس پر زیادہ حیرت نہ کرے گا اور نہ ہم اور آپ اس پر حیرت کرتے ہیں یہ تحقیق عجیب ضروری مگر ایسی موجب حیرت و استبعاد نہیں جیسی حیات اولی ہے۔ اب تو آپ کو مشاہدہ ہو گیا وَھُو اَھْوَنُ عَلَیْہِ کا۔ کیونکہ جب ڈاکٹروں کو جن کی قدرت و حکمت خدا تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے سامنے کچھ بھی نہیں اس میں کامیابی ہو گئی کہ جس انسان کو عام طور پر سب لوگ مردہ سمجھ چکے تھے وہ خاص میعاد کے اندر مقوی دوا سے اس کو مثل زندہ کے کر دیتے ہیں تو حق تعالیٰ اگر ہزار دو ہزار برس کے بعد زندہ کر دیں تو کیا عجیب ہے! ممکن ہے کہ ڈاکٹروں کو جتنی دیر تک جسم میں اثر حیات کا ہونا معلوم ہوا ہے اس کے بعد بھی حیات کا اثر جسم میں رہتا ہو مگر وہ نہایت ضعیف و قلیل اثر ہو جو آلات سے مدرک نہیں ہو سکتا۔ پس حق تعالیٰ اسی ضعیف اثر کو کسی بے حد مقوی شے سے بڑھا دیں اور مردہ ہزاروں برس کے بعد زندہ ہو جائے تو کیا عجب ہے! اور یہ بھی تقریب الی الفہم کے لیے کہہ دیا گیا ورنہ خدا تعالیٰ کو ان ترکیبوں کی کیا ضرورت ہے ان کا تو حکم دینا اور ارادہ کرنا ہی کافی ہے۔ بہر حال حق تعالیٰ نے معاد ثانی کے بیان میں بہت اہتمام فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف موت کا علم اصلاح کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کے لیے علم معاد ثانی کی بھی ضرورت ہے اور انسان کی غفلت کی وجہ یہی ہے کہ وہ اس سے غافل ہے اگر اس کا استحضار ہو تو غفلت نہ رہے ہم گو اعتقاداً معاد کے قائل ہیں مگر پھر غفلت اس لیے ہے کہ ہم کو معاد کا استحضار نہیں کسی وقت اس کو سوچتے نہیں بلکہ اگر کبھی خود بخود اس کی طرف خیال چلا بھی جاتا ہے تو جلدی سے دھکے دے دیتے ہیں اس کے خیال سے بھاگتے اور گھبراتے ہیں اور ہر چند کہ پوری اصلاح تو حیات ثانیہ ہی کے استحضار سے ہوتی ہے لیکن اگر انسان معاد اول (یعنی موت) کو بھی یاد رکھے تو زیادہ غافل نہیں ہو سکتا بلکہ کچھ نہ کچھ اصلاح ضرور ہو جائے کیونکہ جس گھر سے نکلنا اور جانا مستحضر ہو اس میں دل نہیں لگ سکتا۔ دیکھو ملازمت کی حالت میں پردیس میں آدمی کرایہ پر مکان لے کر رہتا ہے تو اس مکان سے اس کو زیادہ وابستگی نہیں ہوتی بس بقدر ضرورت اس کی مرمت کر لیتا ہے مگر یہ نہیں ہوتا کہ سارا سرمایہ اسی کی زینت و آرائش میں لگا دے کیونکہ ایک دن اس سے نکلنے کا ہر وقت خیال لگا ہوا ہے کہ نہ معلوم کس وقت تبدیلی کا حکم ہو جائے اور اس کو چھوڑ کر کہیں اور جانا پڑے تو خواہ مخواہ اس کے اندر ساری رقم کیوں لگائے۔ ہاں! ملازمت کے وقت اپنے وطن کے مکان کا ضرور خیال رہتا ہے اس کی مرمت و استحکام کے لیے ہر سال روپیہ صرف کرتے ہیں اور تعطیل میں آ کر اس کی تعمیر شروع کرتے ہیں۔

مراقبہ موت

اب اگر کسی شخص کو ہر دم موت کا دھیان رہے کہ ایک دن وطن کا گھر بھی ہم سے چھوٹنے والا ہے تو یقیناً وہ اس گھر سے بھی زیادہ دل نہ لگائے گا اور یہ بھی انسان کی اصلاح کے لیے کافی ہے کیونکہ اصل ضرر دنیا سے دل لگانے کا ہے۔

طبعی احتیاج

طبعی طور پر احتیاج کے سبب اس کی طرف میلان میں چنداں ضرر نہیں چنانچہ حیات دنیا سے اس درجہ میں خوش ہونے پر حق تعالیٰ نے ملامت نہیں کی بلکہ اس پر مطمئن ہونے اور دل لگانے پر ملامت فرمائی ہے اسی لیے ایک مقام پر کفار کے بارے میں فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ○

کہ وہ لوگ حیات دنیا سے راضی اور اسی کے ساتھ مطمئن ہیں تو یہاں حق تعالیٰ نے "وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا" پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ "وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا" بھی فرمایا۔ معلوم ہوا کہ صرف رضا بالحیوۃ سبب غفلت نہیں بلکہ اس سے دلبستگی ہو جانا سبب غفلت ہے نیز سورہ توبہ کی آیت میں ارشاد ہے: "وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَا اَحَبَّ اِلَیْکُمْ" جس میں صاف دلالت ہے کہ مساکن مرضی ہونا مذموم نہیں اس کی احبیت مذموم ہے چنانچہ اس کی تفصیل عنقریب آتی ہے پس موت کے استحضار سے گو "رضا بالحیوۃ" کا ازالہ نہ ہو مگر اطمینان و دلبستگی تو ضرور زائل ہو جائے گی اور جب زندگی سے دلبستگی نہ رہے گی تو کسی وقت تو غفلت میں کمی آئے گی یہ نہیں ہو سکتا کہ موت کا دھیان رہتے ہوئے آدمی بالکل ہی غافل رہے اور اتنا بھی اصلاح کے لیے کافی ہے۔ صاحبو! اس پر ملامت نہیں ہے کہ ہم کو بیوی بچوں سے یا اپنے گھر سے محبت کیوں ہے اس کا تو مضائقہ نہیں میں آپ سے بیوی بچوں کو اور گھر بار کو نہیں چھڑاتا بلکہ ملامت اس پر ہے کہ ہم کو انہی سے ساری محبت کیوں ہے خدا کے ساتھ تعلق کیوں نہیں؟ دیکھئے! حق تعالیٰ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ○

فرما دیجئے! کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بیویاں اور برادری اور وہ مال جن کو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو خطرہ رہتا ہے اور وہ گھر جن کو پسند کرتے ہیں تم کو اللہ اور رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی حکم (تمہاری سزا کے متعلق) بھیجیں اور اس میں بیوی بچوں اور مال و دولت کی مطلق محبت پر وعید نہیں فرمائی بلکہ احبیت پر وعید ہے کہ یہ چیزیں اللہ اور رسول سے زیادہ محبوب نہ ہونی چاہئیں اور ان کی محبت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت سے مانع نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ مَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا فرمانے کے بعد اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فرمانا اس کی صریح قرینہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ رضا بالمسکن پر وعید نہیں بلکہ اس کے بعد احبیت من اللہ ورسولہ پر ملامت ہے جیسا کہ اوپر والی آیت میں "رضا بالحیوۃ الدنیا" پر وعید نہ تھی بلکہ اطمینان و دلبستگی پر وعید تھی اور اس اطمینان و احبیت کا منشا وہی موت سے غفلت ہے اگر موت کا خیال رہے تو ان چیزوں کے ساتھ اطمینان اور دلبستگی اور احبیت کا درجہ تو ہرگز نہ پیدا ہوگا۔

استحضار قیامت

اسی لیے اہل طریق فرماتے ہیں کہ معاد اول کا حاضر فی الذہن ہونا بھی دنیا سے دل برداشتہ ہو جانے اور کسی قدر اصلاح پر متوجہ کر دینے کے لیے کافی ہے مگر ستم یہ ہے کہ انسان اس سے بھی غافل ہے اور موت کے ساتھ مابعد الموت یعنی قیامت کا استحضار بھی ہو اور دوبارہ زندہ ہونے اور ثواب و عذاب اور حساب و کتاب ہونے کا بھی خیال ہو پھر تو کیا کہنا ورنہ کم از کم موت کا دھیان تو ضرور ہونا چاہیے جس سے کوئی ملحد دھری اور مشرک بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے موت کو یقین سے تعبیر فرمایا ہے: "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ" واقعی یہ ایسی یقینی ہے کہ اس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ پس لذات کو مکدر کرنے اور غفلت کو کم کرنے کے لیے اسی کا استحضار بہت ہے اور اس کے استحضار میں کچھ دشواری بھی نہیں کیونکہ اس کا وقوع یقینی اور مشاہد ہے اور اس وقت کی بے بسی اور بے کسی کی حالت بہت دفعہ آنکھوں کے سامنے سے گزرتی رہتی ہے تو اسکا سوچنا بہت آسان ہے کہ جس طرح دوسرا شخص مر کر بیکس و بے بس ہو گیا اور اس کا سارا مال و دولت دھرا رہ گیا اور بیوی بچے جائیداد و مکانات سب اس سے چھوٹ گئے۔ اسی طرح ایک دن ہم کو بھی یہ سانحہ پیش آئے گا اور یہ خیال ایسا نہیں جو انسان کو بے فکر بیٹھنے دے۔

حکمت فلاسفہ

دیکھئے فلاسفہ یونان معاد ثانی کے قائل نہ تھے اور جس معاد کا برائے نام ان کو اعتقاد تھا وہ کالعدم ہے کیونکہ ان کی معاد کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص علوم حقہ کو حاصل کر لے اور وہ علوم کیا ہیں محض یہ ہیں کہ افلاک نو ہیں اور وہ کروی ہیں اور ان میں ترتیب یہ ہے کہ سب کرات میں اسفل کرہ ارض ہے اس کے اوپر کرہ ماء اس کے اوپر کرہ ہوا پھر کرہ نار ہے اور ان سب کو نو افلاک محیط ہیں جو بروقت متحرک ہیں پس جس کو یہ ترتیب عالم صحیح معلوم ہو اور اخلاق اچھے ہوں اس کے دل کو مرنے کے بعد راحت ہوگی یہ تو جنت ہے اور جس کو اس ترتیب سے جہل ہو اور اخلاق برے ہوں اس کو اپنے اس اصل سے مرنے کے بعد تکلیف ہوگی یہ دوزخ ہے۔ سبحان اللہ علوم کیا عالی ہیں جن کے جاننے اور نہ جاننے پر مدار راحت والم کا رکھا ہے۔ بس وہی مثال ہے:

چو آں کرمے کہ در سنگے نہاں است زمین و آسمان وے ہماں است

جو کیڑا ابھی تک پتھر کے اندر ہو اس کا تو وہی آسمان ہے اور وہی زمین۔ جیسے ماں کے پیٹ میں جب بچہ ہوتا ہے تو اسی کو بڑا امکان سمجھتا ہے اور وہاں سے دنیا میں آتے ہوئے روتا ہے۔ یہی حال ان فلاسفہ کے علوم کا ہے کہ بس ان کے یہاں ترتیب عالم کے جان لینے پر راحت کی انتہا اور اس کے نہ جاننے پر الم کا مدار ہے نہ کمالات حقیقیہ سے بحث ہے نہ علوم مقصودہ سے اس حقیقت معاد پر خود حکماء ہی کی جماعت نے یہ اعتراض کیا ہے کہ وہاں تو سب کو حقیقت منکشف ہو جائے گی مرنے کے بعد تو کوئی بھی جاہل نہ رہے گا پھر صاحب جہل کو رنج و تکلیف کیوں ہوگی اس کا کچھ جواب نہیں دیا جا سکا غرض باایں ہمہ کہ یہ لوگ معاد ثانی کے صحیح طور پر قائل نہ تھے اور جس معاد کے قائل تھے وہ محض مہمل تھی مگر موت کے قائل تھے اور تھے عاقل تو اسی کے استحضار سے ان کی یہ حالت تھی کہ حکماء کے ایسے ایسے واقعات منقول ہیں جیسے ہمارے اہل اللہ کے۔ چنانچہ یہ لوگ خلوت نشین عزلت گزیں ہوتے تھے۔ ریاضات اور مجاہدات بہت کرتے تھے۔ لذات دنیا و سامان عیش و عشرت سے بہت بچتے تھے۔ یہ آج کل ہی کی نئی حکمت ہے جس میں خلوت نشینی پر اعتراض کیا جاتا ہے اس کا نام حکمت نہیں بلکہ حکومت ہے آج کل ساری حکمت کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ہو تمام دنیا کو مسخر کر لیا جائے چنانچہ بعضے کرہ مریخ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہاں کی مخلوق کو بھی مسخر کیا جائے چنانچہ جس قدر ترقی صنعتوں میں ہو رہی ہے سب کا یہی خلاصہ ہے بس مادہ پرستی غالب ہے روحانیت کا پتہ بھی نہیں تو اس کو حکمت کہنا حکمت کے نام کو بدنام کرنا ہے جس کو حکمت و دانائی سے ذرا

بھی مس ہوگا وہ موت کا خیال کر کے دنیا سے ضرور دل برداشتہ ہوگا اور ترقی روحانیت کا مسائی ہوگا چنانچہ حکمائے یونان کو گو صحیح حکمت تو حاصل نہیں تھی مگر خیر وہ آج کل کی جدید حکمت سے بدر جہا اچھی تھی اس کا یہ اثر تھا کہ وہ لوگ تزکیہ روح اور صفائی نفس کی بہت کوشش کرتے تھے اس کے لیے خلوت نشینی اختیار کرتے تھے دنیا سے ان کا دل بجھ گیا تھا' لذات کو ترک کرتے تھے۔ افلاطون کی حکایت ہے کہ سالہا سال ایک پہاڑ پر رہا کرتا تھا کسی سے ملتا نہ تھا' خدمت کے لیے صرف ایک شاگرد پاس رہتا تھا۔ جب کوئی افلاطون سے ملنا چاہتا تو اسی شاگرد کو حکم دیتا کہ اس شخص کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرو' ظالم کو علم قیافہ ایسا صحیح حاصل تھا کہ تصویر سے پہچان لیتا تھا کہ اس شخص کے اخلاق وعادات کیسے ہیں' یہ ملنے کے قابل ہے یا نہیں' اگر ملنے کے لائق ہوتا تو اندر آنے کی اجازت دیتا ورنہ صاف کہہ دیتا کہ تم ملنے کے قابل نہیں ہو چاہے کوئی بادشاہ ہوتا یا وزیر مالدار ہوتا یا رئیس کسی کی پرواہ نہ کرتا تھا' حکماء کے استغنا کے واقعات بکثرت ویسے ہی ہیں جیسے ہمارے اہل اللہ کے ہیں حتیٰ کہ اگر وہ واقعات لکھ کر نام نہ ظاہر کیا جائے تو دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ یہ کسی ولی اللہ اور بڑے بزرگ کے واقعات ہیں تو بات کیا تھی کہ موت کے خیال نے ان عقلاء کے دل کو دنیا سے سرد کر دیا تھا' دنیا کی طمع و حرص ان کے دل میں نہ رہی تھی اسی کا یہ اثر تھا کہ اہل دنیا سے ان کو پورا استغناء تھا وہ کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ صاحبو! قاعدہ یہی ہے کہ جب دنیا سے دل خالی ہو جاتا ہے تو پھر آخرت ہی ذہن میں آئے گی کیونکہ دل کا بالکل خالی رہنا تو ممکن نہیں کچھ نہ کچھ اس میں ضرور رہے گا تو موت کے استحضار سے جب دنیا قلب سے نکل جائے گی تو آخرت کا خیال ضرور پیدا ہوگا اس لیے اہل طریق کا قول صحیح ہے کہ فی الجملہ اصلاح کے لیے استحضار معاد اول بھی کافی ہے۔

اتباع نبوت

اس پر شاید کسی کو یہ سوال ہو کہ حکماء یونان کے دل سے تو دنیا نکل گئی تھی پھر انکے ذہن میں آخرت کیوں نہ آئی اس کا جواب یہ ہے کہ آئی تھی مگر ناتمام کیونکہ صرف عقل سے تو آخرت کا علم ناقص ہی ہوسکتا ہے بس ٹوٹی پھوٹی معاد عقل سے معلوم ہو گئی تھی اسی پر جمے رہے علم تام وصحیح کے لیے انبیاء علیہم السلام کے اتباع کی ضرورت تھی اور ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کا اتباع نہیں کیا گو تکذیب بھی نہیں کی بلکہ یہ کہتے تھے کہ " نحن قوم قد ہذبنا نفوسنا فلا حاجتہ لنا الی نبی یھذبنا" (یعنی ہم لوگ اپنے نفوس کو مہذب بنا چکے ہیں اس لیے ہم کو کسی مہذب بنانے والے کی ضرورت نہیں) ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کو محض جہلاء کے واسطے مانا تھا جیسا کہ یہود نے حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا تھا کہ آپ نبی تو ہیں مگر امیین کے نبی ہیں (یعنی جہلاء عرب کے) ہمارے واسطے نبی نہیں ہیں ہم تو خود صاحب کتاب ہیں ہم کو نبی کی کیا ضرورت ہے ہمارے علماء نے اس کا خوب جواب دیا ہے کہ تم کو یہ تو تسلیم ہے کہ آپ نبی ہیں اور نبی سے صدور کذب محال ہے تو اب چل کر خود اس نبی ہی سے پوچھ لو تا کہ آپ فقط امیوں کے واسطے مبعوث ہوئے ہیں یا تمام عالم کے واسطے پس جو وہ فرمادیں اسی پر فیصلہ ہے اس کا جواب یہود کے پاس کچھ نہیں تو ایسے ہی بعض حکماء نے انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کی ہے اور چونکہ عاقل تھے اس لیے تکذیب نہیں کی بلکہ ان کی نبوت کو تسلیم کیا چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے اور وہ آپ سے ملا بھی ہے اور کچھ سوالات بھی کیے ہیں۔ من جملہ ان کے ایک سوال یہ مشہور ہے کہ بتلایئے کہ اگر اللہ تعالیٰ تیر انداز ہوں اور فلک کمان ہو اور حوادث تیر ہوں تو ان سے بچ کر کہاں جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر انداز کے پاس جا کھڑا ہو کیونکہ تیر اسی کے لگتا ہے جو تیر انداز سے دور ہو اور جو اس کے پہلو میں کھڑا ہو اس کے نہیں لگ سکتا۔ اس جواب پر افلاطون حیران ہو گیا اور کہنے لگا کہ یہ جواب نبی کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ آپ بیشک نبی ہیں مگر عوام کے واسطے۔ ہمارے واسطے نہیں کیونکہ ہم نے تو اخلاق وعلوم سے اپنے کو مہذب بنالیا ہے اب ہم کو اس سے زیادہ تہذیب کی ضرورت نہیں ہاں ان لوگوں نے انبیاء کی تہذیب کو دیکھا نہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ جس کو ہم تہذیب سمجھے ہوئے ہیں وہ محض تعذیب ہے اور اصل تہذیب انبیاء علیہم السلام ہی کے پاس ہے نیز انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے علوم کو حاصل ہی نہیں کیا ہے ورنہ معلوم ہو جاتا کہ جن علوم پر ہم نازاں ہیں ان پر ناز کرنے کی حقیقت یہ ہے:

چوآں کرمیکہ درسنگے نہاں است　　　زمین و آسمان وے ہماں است

ایسے لوگوں کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "**فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ**" کہ جو ذرا سا علم ان کے پاس ہے اسی پر اتراتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ اس کے عموم میں حکماء بھی داخل ہیں۔ بہر حال معلوم ہو گیا کہ حکماء کے دل سے بھی جب دنیا نکل گئی تھی تو آخرت ہی ان کے ذہن میں آئی تھی مگر جیسی ٹوٹی پھوٹی حقیقت ان کے پاس تھی ویسی ہی آئی اور ہم چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں تو ہمارے ذہن سے جب دنیا نکلے گا پھر آخرت کما حقہ صحیح طور پر ہمارے ذہن میں آئے گی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے آخرت کی صحیح اور تام حالت ہم کو معلوم ہو چکی ہے۔ غرض نسخے متعدد ہیں چاہے معاد

ثانی کا استحضار کرو یا معاد اول کا کسی کا تو خیال کرو مگر افسوس ہم کسی نسخہ سے بھی کام نہیں لیتے اور اگر کسی کو موت کا استحضار بھی اسی وجہ سے دشوار معلوم ہوتا ہو کہ وہ مستقبل ہے ابھی تک اس کا وقت نہیں آیا اور معدوم کا تصور مشکل ہے تو میں آپ کو ایسے موجود کا تصور بتلاتا ہوں جس سے اس مستقبل کا تصور سہل ہو جائے آپ اسی سے کام لیجئے۔

معاد روح

وہ یہ کہ اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ ہمارے اندر دو چیزیں ہیں ایک جسم ایک روح ان میں سے ایک سفلی ہے ایک علوی اور ہر ایک کا مبداء و معاد الگ الگ ہے جسم تو سفلی ہے اور اس کا مبداء و معاد تو زمین ہی ہے۔ چنانچہ یہ آیت بھی جو کہ میں نے تلاوت کی ہے اس کی دلیل ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ'' اور روح علوی ہے اس کا مبداء و معاد آسمان ہے وہ آسمان ہی سے آئی ہے مرنے کے بعد آسمان ہی پر چلی جاتی ہے کیونکہ روح سے مراد روح انسانی ہے جس سے ادراک معقولات ہوتا ہے۔ روح طبی مراد نہیں جو کہ دم سے متولد ہے روح انسانی کو سفلی کوئی نہیں کہتا' سب نے علوی مانا ہے یہ الگ اختلاف ہے کہ وہ مجرد ہے یا مادی اگر مجرد ہے جیسا کہ حکماء نے بھی کہا ہے کیونکہ جس چیز کو وہ نفس ناطقہ کہتے ہیں وہ روح انسانی ہے اور نفس ناطقہ کو ان لوگوں نے بھی مادی نہیں مانا بلکہ مجرد کہا ہے اور یہی صوفیاء کی بھی تحقیق ہے کہ روح مجرد ہے تب تو علوی بایں معنی ہے کہ فوق الاحیاز ہے اور یہی محمل ہوگا۔ صوفیاء کے نزدیک روح کے فی السماء ہونے کا جیسا کہ یہی محمل ہے علماء ظاہر کے نزدیک بھی احادیث کون اللہ فی السماء کا اور اگر مادی ہے جیسا کہ متکلمین کا قول ہے کہ انہوں نے اسے جسم مانا ہے مگر جسم علوی لطیف۔ تب وہ علوی بایں معنی کہ اس کا جزء عالی ہے پس ثابت ہوا کہ روح کے علوی ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور ہم کو سب سے کیا لینا کوئی بھی نہ مانے تو کیا جب کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ روح کا مبداء و معاد آسمان ہے معاد ہونا تو صراحۃً اور مبداء ہونا قیاساً چنانچہ حدیث میں روح کی حالت وارد ہے: ''حَتّٰى تَخْرُجَ ثُمَّ اِلَى السَّمَاءِ فَيُفْتَحُ لَهَا الى قوله حتّٰى تَنْهِىَ اِلَى السَّمَآءِ الَّتِىْ فِيْهَا الحديث'' (مشکوٰۃ عن ابن ماجہ) یعنی جب آدمی مرتا ہے تو فرشتے اسی کی روح کو آسمان پر لے جاتے ہیں اس سے یہ تو ظاہر ہے کہ روح کا معاد آسمان ہے اور مبداء ہونا اس طرح معلوم ہوا کہ موت کے بعد جسم کے لیے دفن کا حکم دیا گیا ہے جس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کو اصل کی طرف لوٹا دینا مقصود ہے جب جسم کا مبداء زمین تھی اور اس کو جسم کا معاد بنایا گیا اور روح کے لیے

آسمان پر لے جانا بتلایا جس سے معلوم ہوا کہ آسمان سے مراد روح ہے اور یہ ابھی معلوم ہو چکا کہ معاد اسی کو بنایا ہے جو مبداء تھا تو معلوم ہوا کہ آسمان ہی روح کا مبداء بھی ہے بس جسم کا مبداء و معاد تو زمین ہوئی اور روح کا مبداء و معاد آسمان ہوا اور موت کے بعد روح کا آسمان کی طرف جانا جس طرح حدیث مذکور سے ثابت ہے اسی طرح قرآن سے بھی مفہوم ہوتا ہے۔ چنانچہ کفار کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ" یعنی ارواح کفار کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روحیں ان کی بھی آسمان پر جانا چاہتی ہیں مگر ان کو دھکے دے دیئے جائیں گے۔ پس یہ دعویٰ بھی ثابت ہوگیا کہ آسمان روح کا مبداء و معاد ہے اور آسمان و زمین دونوں اس وقت سامنے موجود ہیں تو ان کو اس نظر سے دیکھتے رہنا معاد مستقبل کے استحضار کو سہل کر دیتا ہے اور اب مناسبت مقام سے استطراداً ایک تو اس پر شیخ اکبر نے یہ تفریع کی ہے کہ عالم آخرت اس وقت موجود ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ عالم آخرت کے دو جز ہیں ایک زمان آخرت جس میں جزا سزا شروع ہو جائے اور اعمال کا صلہ مل جاوے تو وہ بعد میں آئے گا۔

مکان آخرت

اور ایک مکان آخرت اس وقت بھی موجود ہے یعنی آسمان اور عالم بالا چنانچہ آسمان کا موجود ہونا تو مشاہد ہے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ساتویں آسمان پر ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ جنت موجود ہے تو معلوم ہوا کہ مکان آخرت اس وقت موجود ہے۔ اس تحقیق سے بہت سے اشکالات سہولت کے ساتھ حل ہو گئے۔ مثلاً ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں رویت حق کیونکر ہوئی جبکہ دنیا میں رویت حق محال عادی ہے اس تحقیق کے بعد جواب آسان ہوگیا کہ آپ کی رویت دنیا میں نہ تھی بلکہ عالم آخرت میں تھی کیونکہ امکان آخرت اب بھی موجود ہے اس پر شاید یہ اشکال ہو کہ گو آپ اس وقت مکان آخرت میں تھے مگر آپ کی حیات تو دنیوی تھی پھر حیات دنیویہ رویت کی کیسے متحمل ہوئی۔ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ جیسے زمان آخرت میں یہ خاصیت ہے کہ اس وقت تحمل رویت ہو جائے گا ایسے ہی مکان آخرت میں بھی یہ خاصیت ہے کہ جو وہاں پہنچ جائے اس میں تحمل رویت پیدا ہو جاتا ہے گو وہ حیات دنیاویہ ہی سے متلبس ہو آخرت کے مکان و زمان دونوں کی خاصیت دنیا سے الگ ہے۔

ردقادیانیت

اور یہاں سے قادیانیوں کے بیہودہ تمسخر کا بھی جواب ہو گیا جو اہل سنت کے اس عقیدہ پر کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہیں کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر وہ آسمان پر زندہ ہیں تو کھاتے کہاں سے ہیں اور ہگتے موتتے کہاں ہیں اسی قسم کی بیہودہ باتیں بکتے رہتے ہیں، جواب یہ ہے کہ عالم آخرت کی خاصیت سے دنیا کی خاصیت جدا ہے وہاں کھانا پینا ایسا ہضم ہو جاتا ہے کہ فضلہ بالکل نہیں رہتا جیسا کہ اہل جنت کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ وہ ہگنے موتنے سے پاک ہوں گے بس کھانا کھا کر ان کو مشک جیسا خوشبودار پسینہ آئے گا اور کچھ نہ ہوگا گویا فضلہ اتنا کم ہوگا کہ پسینہ ہی کی راہ سے نکل جائے گا۔ ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام کو صرف پسینہ آ جاتا ہوگا اور کچھ ضرورت نہ ہوتی ہوگی، رہا یہ کہ کھاتے کہاں سے ہیں اس کا جواب ظاہر ہے کہ جنت آسمان ہی پر ہے ممکن ہے کہ وہاں سے فرشتہ کے ذریعے سے ان کے لیے غذا پہنچتی ہو اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھوک پیاس ہی نہ لگتی ہو، خدا تعالیٰ بدون غذا کے بھی تو زندہ رکھ سکتے ہیں کیونکہ جس نے غذا میں قوت ابقاء رکھی ہے وہ بدون غذا کے بھی اس قوت کو پیدا کر سکتا ہے اگر قوت ابقاء کے لیے غذا کا واسطہ ضروری ہے تو خود غذا میں جو قوت ابقا ہے کیا اس کے لیے بھی غذا کا واسطہ ہے تو پھر غذا کے لیے غذا لازم آئے گی پھر اس میں بھی ہم کلام کریں گے۔ اسی طرح سلسلہ چلتا رہا کہ ہر غذا کے لیے دوسری غذا کا واسطہ بنایا گیا تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا۔ پس لامحالہ کسی جگہ یہ کہنا پڑے گا کہ اس غذا میں قوت ابقا بلا واسطہ پیدا ہوئی ہے معلوم ہوا کہ اس قوت کے لیے غذا کا واسطہ لازم نہیں حق تعالیٰ بلا واسطہ غذا بھی اس قوت کو پیدا کر سکتے ہیں پھر اگر عیسیٰ علیہ السلام میں اسی طرح یہ قوت پیدا کر دیتی ہو تو کیا استحالہ ہے؟ پھر دنیا میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ بعض لوگوں کو بدون غذا کے ہفتوں اور مہینوں زندہ رکھتے ہیں چنانچہ مریض بعض دفعہ مہینہ بھر تک کچھ نہیں کھاتا اور زندہ رہتا ہے اب یہاں تاویل کی جاتی ہے کہ اس مریض کے جسم میں رطوبات فضلیہ بہت پیدا ہو گئے ہیں معدہ ان کے تحلیل میں مشغول ہے اس لیے بھوک نہیں لگتی اور نہ حیات پر کچھ اثر پڑتا ہے۔ مگر یہ محض بات کا بنانا اور تاویل گھڑنا ہے میں کہتا ہوں کہ تندرست آدمی تو مریض سے زیادہ مرطوب ہوتا ہے۔ غریب بیمار جس کا چہرہ بھی زرد اور ہاتھ پیر بھی لاغر ہو جاتے ہیں جو قلت دوران خون کی علامت ہے کیا ہٹے کٹے سرخ و سفید رنگ والے سے زیادہ مرطوب ہو سکتا ہے ہرگز نہیں پھر ذرا کوئی تندرست تو مہینہ بھر بھوکا رہے کہ غذا کا دانہ بھی اس کے حلق میں نہ جانے پائے جس طرح بیماروں کو اس طرح کئی ہفتہ اور مہینہ بھر گزر جاتا ہے، تندرست تو یقیناً ہلاک ہو جائے مگر بیماروں کو حق تعالیٰ اپنی قدرت

سے بدون غذا کے زندہ رکھتے ہیں تو کیا جس نے مہینہ بھر بدون غذا کے زندہ رکھا وہ اس سے زیادہ مدت تک بغیر غذا کے زندہ رکھنے پر قادر نہیں۔ ضرور قادر ہے اگر یہ بھی سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھو کہ غذا کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری ایک باطنی جس طرح غذا ظاہری سے قوت وحیات باقی رہتی ہے اسی طرح کبھی غذائے باطنی بھی اس کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دنیا میں صوفیاء کے واقعات بکثرت اس قسم کی منقول ہیں کہ وہ مہینوں محض ذکر اللہ پر اکتفا کرتے تھے اور بہت دنوں کے بعد کھانا کھاتے تھے۔ حضرت شیخ علی صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت متواتر اور مشہور ہے کہ زندگی بھر میں ان کے پیٹ کے اندر چند سیر سے زیادہ غذا نہیں پہنچی اور اس پر قوت کی یہ حالت کہ حضرات صوفیاء کی عمریں عام آدمیوں سے طویل ہوتی ہیں۔ آخر یہ کس چیز کی طاقت تھی محض ذکر الٰہی کی کہ وہ ان کے لیے غذا کا قائم مقام بن گیا تھا اس لیے ان کو غذا کی بہت کم ضرورت ہوتی تھی اور باوجود تقلیل غذا کے ان کی قوت میں کمی نہ آتی تھی تو ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے یہی غذائے باطنی ظاہری غذا کے قائم مقام بن گئی ہو اور چونکہ عالم آخرت کی خاصیت دنیا کی خاصیت سے الگ ہے تو ممکن ہے کہ یہاں اگر غذائے باطنی مہینہ بھر یا چالیس دن تک غذائے ظاہری کی قائم مقام ہوتی ہے تو وہاں برسوں اور مدت دراز تک اس کے قائم مقام ہو جاتی ہو۔ آخر اس میں استحالہ کیا ہے؟ بہرحال شیخ کی اس تحقیق نفیس سے بہت سے اشکالات کا حل ہو گیا اور اس عالم آخرت کا تصور بالفعل بھی آسان ہو گیا کیونکہ عالم آخرت باعتبار مکان کے اس وقت بھی موجود ہے پس یہاں دو تصور ہوئے ایک روح کے مبداء و معاد یعنی آسمان کا کہ وہ آخرت ہے دوسرے جسم کے مبداء و معاد کا کہ وہ زمین ہے اور یہ دونوں ہر وقت پیش نظر ہیں جس سے تصور میں کوئی تکلف ہی نہیں کرنا پڑتا۔ بس اسی طرح تصور کیا کرو کہ روح کا مبداء و معاد سر کے اوپر ہے ایک دن روح جسم سے الگ ہو کر اوپر چلی جائے گی اور جسم کا مبداء و معاد زمین ہے ایک دن یہ روح سے الگ ہو کر مٹی میں مل جائے گا اور زمین کا جسم کے لیے مبداء معاد ہونا قرآن کا جس طرح مدلول ہے اسی طرح مشاہد بھی ہے۔ چنانچہ معاد ہونا تو بہت ہی ظاہر ہے رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے کہ بہت سے بدن مرنے کے بعد پیوند زمین ہو گئے ہیں۔

تخم انسانی

باقی مبداء ہونا اس طرح ہے کہ جسم انسان کی ترکیب عناصر اربعہ سے ہے جس میں غلبہ تراب کو ہے اور تراب کا جزو ارض ہونا ظاہر ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل مادہ جسم انسانی کا ارض ہی ہے اسی طرح سے اس کا مبداء زمین ہے دوسرے انسان کا جو مادہ ہے یعنی نطفہ وہ انہی غذاؤں سے

پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ باپ ماں قسم قسم کی غذائیں کھاتے ہیں جن سے ان کے بدن میں خون پیدا ہوتا ہے اور اس خون کے جوہر سے نطفہ بنتا ہے پھر نطفہ سے اولاد ہوتی ہے بس یہ کہنا صحیح ہے کہ انسان کا مبداء زمین ہے کیونکہ یہ غذائیں سب زمین ہی سے پیدا ہوتی ہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جس طرح زمین میں نباتات کا تخم موجود ہے اسی طرح حیوانات اور انسان کا تخم بھی زمین ہی کے اندر موجود ہے۔ دیکھئے زمین کے بعض اجزاء سے درختوں کے پتے بنتے ہیں اور اسی کے بعض اجزاء سے لکڑی بنتی ہے اور بعض اجزاء لطیف سے انار دانہ اور انگور اور سیب اور مٹھائی کھٹائی اور تمام اقسام کے مزے بھی بنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان سب کی اصل زمین کے اندر ہے جبھی تو ثمرات میں ان کا ظہور ہوتا ہے اسی طرح زمین کے اندر ایسا تخم بھی ہے جس سے نطفہ بنتا ہے جو انسان کی اصل ہے تو زمین کے اندر انسان کا بھی تخم موجود ہوا۔ اسی طرح زمین میں چاندی سونے کی بھی اصل موجود ہے یاقوت اور عقیق وغیرہ کی اصل بھی موجود ہے مگر چاندی پھلوں کی ایسی اصل کو نکال کر اور ان کو ترکیب دے کر پھل ظاہر کر دیتے ہیں پس وہ زمین کے اجزاء میں سے انار کی اصلی کو الگ نکال لیتے ہیں وہ انار ہی میں پہنچتی ہے اور انگور وغیرہ کی اصل کو جدا نکال لیتے ہیں اس کا انگور بن جاتا ہے ایسے ہی وہ زمین کے اجزاء میں انسان کی اصل کو جدا نکال کر نطفہ بنا دیتے ہیں جس سے دوسرا انسان بن جاتا ہے غرض زمین ہی کے اندر تمام اشیاء کی اصل ہے جن کو حق تعالیٰ ترکیب خاص سے الگ الگ نکالتے رہتے ہیں کہیں خوشبو کی اصل کو نکال کر چنبیلی بیلا گلاب میں ظاہر کر دیتے ہیں کبھی مٹھاس کھٹاس کی اصل کو الگ الگ کر کے گنے اور انگور سیب وغیرہ میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہاں سے اس حدیث کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی ہو گی جس میں وارد ہے کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کو جنت میں جانے کے ساتھ ہی پہلے زمین کی روٹی کھلائیں گے۔

زمین کی روٹی

اس پر ملاحدہ نے اعتراض کیا ہے کہ زمین کی روٹی کیسی ہو گی کیا مسلمانوں کو ڈلے پتھر کھلائے جائیں گے صاحب ڈلے پتھر تو ان کو ہی ملیں گے ہم کو تو جو ہر ارضی ملے گا یعنی یہ تو معلوم ہو گیا کہ تمام لذائذ اور ہر قسم کے مزے زمین ہی کے اندر موجود ہیں سو جس طرح اس وقت حق تعالیٰ ہر مزے کو الگ الگ پھلوں میں نکال کر دیتے ہیں اس وقت تمام مزیدار چیزوں کی اصل نکال کر اس کا مزہ بنایا جائے گا وہ جوہر ارض ہو گا اس میں گیہوں' چنا' انگور' بادام' انار' سیب اور ہر قسم کی لذیذ چیزوں کا مزا موجود ہو گا اس کی روٹی بنا کر مسلمانوں کو کھلائی جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اس وقت آپ جو گیہوں

کی روٹی کھاتے ہیں یہ کس چیز کی روٹی ہے صاحب یہ بھی تو زمین ہی کی روٹی ہے' آٹا بھی تو زمین ہی کے اجزاء سے بنتا ہے جس کو گیہوں میں الگ کر کے کھاتے ہو اور گیہوں یہ کہاں سے آیا تھا اسی مٹی میں سے۔ چنانچہ ایک دانہ زمین میں ڈالتے ہو وہ زمین کی مٹی اور پانی کے بہت سے اجزاء کو کھینچ کر پرورش پاتا ہے اور اسی ایک دانہ کے ہزاروں دانہ ہو جاتے ہیں مگر چونکہ اس وقت وہ مٹی کی شکل میں نہیں ہے بلکہ صورت بدل گئی ہے اس لیے یہ نہیں کہا جاتا کہ مٹی کھا رہے ہیں مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو آپ رات دن مٹی ہی کھاتے ہیں کیونکہ وہی رنگ بدل بدل کر ہر غلہ اور ترکاری اور پھل پھلواری میں ظاہر ہوتی ہے۔ پس سمجھ لو کہ حق تعالیٰ قیامت میں زمین کے انہی عمدہ اجزاء کو جنہیں آج کل تم بہت شوق سے کھاتے ہو یکجا جمع کر کے مسلمانوں کو کھلائیں گے پھر اس کو ڈھیلے پتھر اور مٹی کہنا کیونکر صحیح ہے اور حقیقت کے اعتبار سے کہو تو آج کل جتنی بھی چیزیں تم کھاتے ہو وہ سب بھی مٹی ہی ہیں اور صورت کے اعتبار سے جیسے یہ مٹی نہیں اسی طرح وہ بھی مٹی نہ ہوگی بلکہ صورت اور مزے میں آج کل کی غذاؤں سے بہت زیادہ خوشنما اور لذیذ ہوگی کیونکہ اس میں تمام لذائذ کے مزے اور سب کے رنگ موجود ہوں گے۔ اب یہ سوال رہا کہ یہ تو معلوم ہوگیا کہ وہ روٹی ڈھیلے پتھروں اور مٹی کی نہ ہوگی بلکہ زمین کے ماکول اجزاء کا جوہر اور ست ہوگا لیکن مسلمانوں کو جوہر کھلایا جائے گا اس میں حکمت کیا ہے اور جنت کے اغذیا کے ہوتے ہوئے اجزاء ارضیہ جو اس سے بدرجہا کم درجہ ہے کھلانے کی مصلحت کیا ہے۔ سو حکمت بھی سنئے اس میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد چونکہ دنیا کی لذیذ چیزوں کے مزے کچھ تو طول مدت کی وجہ سے اور کچھ ہول محشر کی وجہ سے لوگوں کو یاد نہ رہے ہوں گے تو اس وقت مسلمانوں کو تمام ماکول اجزاء کا جوہر کھلا کر جو کہ ہر ماکول کے الگ الگ کھانے سے زیادہ لذیذ ہوگا یہ بتلا دیا جائے گا۔

نعمائے جنت

کہ دیکھو دنیا کی لذائذ کا تو یہ منتہیٰ اور خلاصہ ہے جس میں سب قسم کے مزے موجود ہیں اگر بھول گئے ہو تو ان کو چکھ لو اور دنیا کی لذتوں کو یاد کر لو اس کے بعد جنتوں کی نعمتوں کے مزے چکھو کہ وہ کس درجہ لذیذ اور لذائذ دنیا سے کتنی بڑھی ہوئی ہیں۔ پس خلاصہ لذائذ دنیا کھا کر اور سب کے مزے یاد کر کے جب وہ جنت کی چیزیں کھائیں گے اور ان میں زمین و آسمان کا فرق دیکھیں گے اس وقت ان کو نعمائے جنت کی پوری قدر ہوگی تو یہ حکمت ہوگی اس جوہر کے کھلاتے میں تاکہ نعمائے جنت کی پوری قدر ہو۔ دوسرے یہ حکمت بھی ہوگی کہ دنیا میں بعض اللہ کے بندوں نے یا تو

بوجہ غربت وافلاس کے یا بوجہ ترک لذات ومجاہدات کے سب قسم کے مزے نہیں چکھے' بعضوں نے
عمر بھر بھی انگور وسیب نہیں کھایا ہوگا۔ چنانچہ میرے ایک مخدوم نے مجھ کو خربزہ کی ایک قاش دی اور
خود بھی کھائی اور کہنے لگے آج سترہ برس کے بعد خربزہ کھا رہا ہوں یہ تو معمولی لذائذ کا حال ہے اور
جو لذتیں بادشاہوں اور امیروں کو عجیب وغریب نصیب ہوتی ہیں وہ تو ان بیچاروں کو کہاں نصیب۔
تو حق تعالیٰ ان مقبول بندوں کو اول زمین کا جوہر کھلائیں گے تا کہ جنت میں جانے سے ہر قسم کی
لذائذ کا مزہ ان کو معلوم ہو جائے گا پھر جنت کی نعمتوں کو چکھ کر اندازہ کریں کہ یہ دنیا کی لذتیں ان
کے سامنے کیا ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ جنت میں جا کر ان کو یہ وسوسہ نہ آ سکے گا
کہ دنیا کی لذات سے ہم محروم ہیں یا جن کے ہم تارک رہے تھے معلوم نہیں وہ کیسی ہوں گی تو پہلے
سب چیزیں انہیں کھلا دی جائیں گی تا کہ یہاں کی ہر لذت کا خوب ادراک ہو جائے تو پھر ان کے
متعلق نعمائے جنت کی مساوات کا وسوسہ نہ آ سکے گا تو اصل دعوت تو ان خاص بندوں کی ہوگی مگر
کریموں کی عادت ہے کہ مہمانوں کے طفیل میں نوکروں اور دربانوں کو بھی دعوت کے دن پلاؤ'
زردہ جو کچھ پکتا ہے دے دیتے ہیں اس طرح طفیل میں ہم کو بھی وہ جوہر کھلا دیا جائے گا۔ خیر یہ تو
درمیان میں ایک حدیث کے رفع اشکال کے طور پر گفتگو ہوگئی تھی۔

مبداء روح

اصل میں یہ مضمون بیان کر رہا تھا کہ زمین جسم انسانی کا مبداء بھی ہے۔ جیسا کہ اس تقریر
سے معلوم ہو گیا اور معاد تو ہے ہی اور آسمان روح انسانی کا مبداء ومعاد ہے اور یہاں سے معلوم ہوا
ہوگا کہ انسان بیچارہ کیسی کشاکشی میں ہے کہ اس کی ایک ٹانگ تو زمین میں ہے اور ایک آسمان پر
ہے روح تو اس کی سماوی ہے اور جسم ارضی ہے ایک جزو تو آسمان پر جانا چاہتا ہے اور ایک جزو زمین
پر رہنا چاہتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا ایک جزو اسی وقت آسمان پر اور دوسرا زمین پر ہے
کیونکہ روح حقیقی اب بھی آسمان ہی پر ہے وہ بدن میں حلول کیے ہوئے نہیں ہے بلکہ اوپر ہی سے
بدن کی تدبیر کر رہی ہے اور جو روح انسان کے اندر وہ روح اصلی نہیں ہے بلکہ نسمہ ہے جو بدن
انسانی میں حلول کیے ہوئے ہے۔

صوفیاء نے اس کو نسمہ کہا ہے اور انہوں نے کشف سے معلوم کیا ہے کہ یہ روح حقیقی نہیں
بلکہ ایک جسم لطیف ہے جو اس جسم کثیف میں حلول سریانی کیے ہوئے ہے جیسے جسم تعلیمی جسم طبعی
میں حال ہوتا ہے۔ گو جوہریت وارضیت کا تفاوت ہے طلبہ اس کو سہولت سے سمجھ لیں گے اور یہ بھی

کشف سے معلوم کیا ہے کہ وہ اسی جسم کی صورت پر ہے (غالباً مرنے کے بعد وہی آسمان کی طرف لے جائی جاتی ہے) اور روح حقیقی حال فی الجسم نہیں ہے بلکہ وہ جوہر مجرد عن المادہ ہے جس کو مادی سے حلول کا کچھ علاقہ نہیں صرف تدبیر و تصرف کا علاقہ ہے وہ آسمان سے بھی فوق ہے اور اس کو سماوی بمعنی علوی کہا جاوے گا۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے اور اس فوق السماء ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آسمان سے اوپر کسی مکان میں ہے کیونکہ مجرد کے لیے مکان نہیں ہوسکتا بلکہ صوفیاء کا اسے فوق السموات کہنا یہ اس کے لامکانی ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ فوق السموات مکان نہیں ہے تو فوق السماء ہونا لامکانی ہونا ہے اسی لیے استواء علی العرش کی ایک تفسیر یہ بھی کی ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کے لامکانی ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عرش منتہائے امکنہ ہے تو حق تعالیٰ کا عرش فوق ہونا لامکانہ ہونا ہے (پس اس تفسیر پر استویٰ علی العرش کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ مکان اور مکانیات کو پیدا کر کے ان میں مقید نہیں ہوا بلکہ لامکانی ہی رہا اور یہ مراد نہیں کہ یہ پیدا کرنے کے وقت مکان یا مکانیات سے کچھ تلبس ہوگیا تھا پھر تنزہ عن المکان ہوگیا جیسا کہ لفظ ''ثم استویٰ'' میں ثم سے ظاہراً شبہ ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس طرح پہلے استویٰ علی العرش سے موصوف تھے اسی طرح بعد میں بھی رہے ثم کے یہ معنی ہیں یعنی پھر بھی وہ استویٰ ہی رہا (واللہ اعلم ۱۲ جامع) اور متکلمین نے روح حقیقی کو نہیں سمجھا وہ نسمہ ہی کو روح حقیقی کہتے ہیں اور صوفیاء نے جو روح حقیقی کو مجرد کہا ہے اس پر بعض متکلمین نے ان کی تکفیر کی ہے حالانکہ ان میں کوئی بھی تکفیر کی بات نہیں۔ صوفیاء کو ایک چیز نسمہ کے سوا کشف سے معلوم ہوئی وہ اس کے قائل ہوگئے۔ متکلمین کی نظر وہاں تک نہیں پہنچی وہ قائل نہ ہوئے مگر اس کے کیا معنی کہ وہ صاحب مشاہدہ کو کافر کہیں۔ متکلمین کے اس حکم کی بناء یہ ہے کہ انہوں نے تجرد کو حق تعالیٰ کی خاص صفت مانا ہے پس مجرد سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں ہوسکتا اور صوفیاء ارواح کو بھی مجرد مانتے ہیں لہٰذا وہ شریک باری کے قائل ہوئے اور یہ کفر ہے مگر یہ دلیل نہایت مخدوش ہے اس لیے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ تجرد اخص صفات واجب ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ واجب کے اخص صفات کی تحقیق تو بہت دور ہے خود ممکنات کی صفات کے حقائق بھی جو کچھ کسی نے بیان کیے ہیں وہ قطعی نہیں ہیں۔ حکماء اور منطقیین خود اقرار کرتے ہیں کہ جنس کو عرض عام سے اور فصل کو خاصہ سے بہت اشتباہ ہے۔ پس ممکن ہے کہ جس کو ہم نے فصل سمجھا ہے وہ حقیقت میں خاصہ ہو اور جس کو ہم جنس کہتے ہیں واقع میں وہ عرض عام ہو جب ہمارے علم کی

ممکنات کے بارے میں یہ حالت ہے تو صفات واجب میں اس کا نقص ظاہر ہے پس کسی کو حق نہیں کہ واجب کے لیے کسی خاص صفت کو مابہ الامتیاز قرار دے کر دوسروں کی تکفیر کرنے لگے چنانچہ صوفیاء نے متکلمین کی اس رائے کو تسلیم نہیں کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ تجرد کا واجب کے لیے اخص صفات ہونا مسلم نہیں بلکہ اقرب یہ ہے کہ وجوب بالذات یہ اخص صفات واجب ہے۔ پس غیر واجب کو مجرد ماننے سے شرک وکفر لازم نہیں آتا۔ البتہ کفر اس وقت لازم آتا ہے جبکہ روح کو مجرد مان کر اس وقت کو واجب وقدیم بھی مانا جاوے اور یہاں ایسا نہیں کیونکہ ہمارے نزدیک مجرد بھی حادث ہوسکتا ہے ہمارے نزدیک ارواح مجرد بھی ہیں اور حادث بھی ہیں واجب اور قدیم نہیں ہیں۔ بہرحال صوفیاء کے قول پر تو انسان کی ایک ٹانگ آسمان پر اور ایک زمین پر ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ تو روح حقیقی کو حال فی الجسم نہیں مانتے بلکہ فوق السموات کہتے ہیں اور متکلمین کے قول پر بھی ظاہر ہے کیونکہ گو ان کے نزدیک روح بدن میں حلول کیے ہوئے ہے مگر اس کا علوی ہونا اور طالب سموات ہونا ان کو بھی مسلم ہے کیونکہ وہ روح کو مثل ملائکہ کے جوہر کے مادی لطیف کہتے ہیں جس کا مبداء ومعاد عالم ناسوت نہیں بلکہ عالم ملکوت ہے۔

روح جسم کشاکشی

پس انسان عجیب کشمکش میں ہے کبھی جسمیت کا غلبہ اس پر ظاہر ہوتا ہے کبھی روحانیت کا غلبہ جسمیت کے وقت اس سے اعمال سفلیہ صادر ہوتے ہیں (معاصی وغیرہ) اور غلبہ روحانیت کے وقت اعمال علویہ ظاہر ہوتے ہیں (یعنی طاعات وغیرہ) اور یہاں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ایک سالک کو کسی وقت مطمئن اور بےفکر ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے کیونکہ جب تک جسم وروح کا تعلق باقی ہے اس وقت تک دونوں میں کشاکشی ضرور باقی ہے گو مجاہدہ کے بعد سخت کشاکشی تو نہیں رہتی مگر بالکل زوال بھی نہیں ہوتا اس لیے مجاہدہ کی ہر وقت ضرورت ہے گو مجاہدہ کاملہ کے بعد پہلی جیسی ضرورت تو نہیں رہتی مگر استغناء بھی نہیں ہوجاتا کیونکہ جب تک ضدین کا اجتماع باقی ہے اور ہر ضد دوسرے پر غالب ہونا چاہتی ہے اس وقت تک مجاہدہ کی ضرورت ناگزیر ہے بس زندگی میں تو انسان کی یہ حالت ہے:

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما ۔۔۔ گہ خندہ زند دیو زناپاکی ما

ایماں چو سلامت بلب گور بریم ۔۔۔ احسنت بریں چستی و چالاکی ما

(کبھی فرشتہ ہماری پاکی پر رشک کرتا ہے کبھی شیطان ہماری ناپاکی پر خندہ زنی کرتا ہے اگر ہم قبر تک ایمان سلامت لے کر جائیں تو ہماری چستی وچالاکی پر آفرین کہتا ہے)

واقعی ایمان پر خاتمہ ہو گیا تو اس دن بے فکری ہوگی اور اس دن مجاہدہ کی کامیابی ظاہر ہوگی ورنہ زندگی میں تو یہی کشاکش لیل ونہار باقی ہے یہ بیچ میں چند لطیفے استطر اداً میں نے بیان کر دیئے ہیں اب اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے اندر دو چیزیں ہیں ایک جسم ایک روح اور ہر ایک کا ایک مبداء و معاد ہے جس کے استحضار سے غفلت کم ہو جاتی ہے اور غفلت ہی ہمارے امراض کی جڑ ہے تو حق تعالیٰ نے ہم کو اس جگہ بتلایا ہے کہ تمہارے اندر جو ایک جزو جسم کا ہے اس کا مبداء و معاد زمین ہے جس کا مشاہدہ آسمان کے مشاہدے سے اکثر و ایسر ہے تم اسی میں غور کر لو تو تمہارے دن بھلے ہو جائیں گے یہ بھی کتنی شفقت ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو آسمان کا مراقبہ تعلیم نہیں کیا کیونکہ وہ ہم سے دور ہے پھر ہر وقت آسمان کی طرف نظر کرنا اور غور کرنا بھی دشوار ہے۔

مراقبہ ارض

اور زمین ہر وقت ہم سے قریب ہے اور اس پر ہر دم نگاہ پڑتی ہے تو بتلا دیا کہ تم زمین پر چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے سوتے لیٹتے اس کا تصور کیا کرو کہ ہم زمین ہی سے پیدا ہوئے ہیں تو ہماری اصل خاک ہے لہٰذا ہم کو خاک بن کر رہنا چاہیے مٹی ہو کر تکبر کرنا نہایت ہی نازیبا ہے پھر آخر میں بھی ہم مٹی ہی میں ملنے والے ہیں۔ یہ جسم سب خاک خوردہ ہو جائے گا ایک دن ہم زمین کے اوپر سے اس کے اندر پہنچ جائیں گے تو اس کے لیے ہم کو ایسے اعمال کرنا چاہئیں جو اس وقت کارآمد ہوں حقیقت میں اس مراقبہ کو اصلاح حال میں بہت ہی تاثیر ہے اس جگہ بجائے مراقبہ سموات کے (جو کہ روح کا مبداء و معاد ہے) مراقبہ زمین کی تعلیم فرمانے کا ایک نکتہ تو یہ تھا کہ زمین ہم سے بہ نسبت آسمان کے اقرب ہے اور ایک نکتہ اس میں اور ہے وہ یہ کہ اس جگہ اوپر سے موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کا ذکر ہے جو فرعون کے ساتھ ہوئی تھی۔ چنانچہ اوپر ارشاد ہے "قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يَا مُوْسٰى" یعنی فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام تم دونوں کا یعنی موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا رب کون ہے اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى" یہاں بھی ایک عجیب لطیفہ ہے وہ یہ کہ فمن ربکما کے بعد مقتضائے ظاہر یہ تھا کہ یا موسیٰ و ہارون کہا جاتا جب فمن ربکما میں دونوں کو خطاب کیا گیا ہے تو نداء میں بھی دونوں کو خطاب ہونا چاہیے مگر حق تعالیٰ نے صرف "یا موسیٰ" فرمایا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ وہ باتیں ہیں کہ ان کا کشف ہونے لگے تو آدمی قرآن کے لفظ پر ناچنے لگے لوگ ڈھولکی پر کیا ناچتے ہیں؟ الحمد قرآن کا لفظ لفظ نچا دینے والا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بتلا دیا گیا کہ فرعون کا اصل روئے سخن حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی طرف تھا انہی کی طرف متوجہ ہو کر بات

کررہا تھا' ہارون علیہ السلام سے تبعاً خطاب تھا نہ کہ اصالتاً اور اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون نے موسیٰ کو تربیت کیا تھا جس کا عجیب قصہ ہے اور اس سے خدا تعالیٰ کی قدرت کا ظہور ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فرعون سے نجومیوں نے بطور پیشین گوئی کے کہہ دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کے زوال کا سبب ہوگا' فرعون نے اس حکم کے بعد حکم کردیا تھا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا بھی پیدا ہو اس کو قتل کردیا جائے اور لڑکیوں کو اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ ان سے خطرہ نہ تھا۔ دوسرے خدمت گاری کے واسطے ان کو ماما بنا بنا کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ بہرحال بنی اسرائیل کے بچے قتل ہونے لگے۔ اسی زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے ان کی والدہ کو فکر ہوئی کہ اب یہ بھی قتل ہوں گے۔ حق تعالیٰ نے ان کو الہام کیا کہ ایک صندوق میں بند کر کے ان کو دریا میں ڈال دو ہم ان کو بچالیں گے پھر ان کو تمہارے پاس ہی پہنچادیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور زیادت احتیاط کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے فرمایا کہ تو کنارہ کنارہ صندوق کو دیکھتی ہوئی چلی جا اور معلوم کر کہ یہ کہاں پہنچتا ہے اور اسے کون اٹھاتا ہے وہ دور سے دیکھتی ہوئی چلتی رہی تھیں کہ صندوق فرعون کے محل سے نیچے کو گزرا کیونکہ وہ دریا اس کے محل سے ہوکر گزرتا تھا اس وقت فرعون مع اپنی بی بی کے محل کے نیچے کنارہ دریا پر بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے صندوق بہتا ہوا آیا تو اس نے اس کے نکالنے کا حکم دیا۔ جب صندوق اس کے سامنے لاکر رکھا گیا اور اس نے کھولا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نظر پڑی جو اپنا انگوٹھا چوس رہے تھے' موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے ایسا حسین بنایا تھا کہ ہر شخص کو صورت دیکھنے سے ان پر محبت آتی تھی۔ چنانچہ ارشاد بھی ہے: "وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ" اور تجلی طور کے بعد تو یہ کیفیت ہوئی کہ کسی کو نگاہ بھر کر آپ کا چہرہ دیکھنے کی تاب نہ تھی اور جو دیکھ لیتا اس کی بینائی زائل ہوجاتی' غرض آپ اس درجہ حسین تھے کہ بس دیکھتے ہی فرعون کو بے اختیار محبت آئی اور ان کو نکال کر گود میں لے لیا اور چومنے لگا اس کے بعد پھر نجومیوں کی پیشین گوئی کا خیال آیا اور کھٹکا پیدا ہوا کہ یہ بچہ کہیں وہی نہ ہو اور قتل کا ارادہ کیا مگر اس کی بی بی حضرت آسیہ نے سفارش کی کہ اس سے کیا خطرہ اول تو یہی معلوم نہیں کہ یہ بنی اسرائیل سے ہے یا نہیں اور ہو بھی تو ہم اپنی حفاظت میں پرورش کریں گے ہاتھ تلے رہے گا تو کیا خوف ہے؟ پھر ایسے خوبصورت بچہ کا قتل کرنا بھی دل کو گوارا نہیں! فرعون کو خود بھی محبت آ ہی چکی تھی اس لیے ذرا سی سفارش پر اپنے خیال سے رک گیا اور موسیٰ علیہ السلام کو اپنا بیٹا بنا کر پالنا شروع کیا اب وہ شاہی فرزند کہلانے لگے اور دشمن کے ہاتھوں سے پلنے لگے' خدا تعالیٰ نے کیسی اپنی قدرت ظاہر کی کہ لے کمبخت! تو کہاں تک تدبیریں کرے گا! ہم تیرے ہی ہاتھ سے دشمن کو پلوائیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں:

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود　　　حیلہ فرعون زیں افسانہ بود

(دروازہ بند کرلیا اور دشمن گھر کے اندر ہے' فرعون کا حیلہ افسانہ تھا)

واقعی فرعون کی تدبیر ایسی ہی تھی کہ باہر تو ناحق بچوں کو مار رہا تھا اور گھر کی خبر نہ تھی کہ جس کے لیے یہ سامان کر رہا ہے وہ میرے ہی ہاتھ سے پل رہا ہے۔ غرض جب وہ شاہی بیٹے ہو گئے تو دودھ پلانے کے لیے اناؤں کو بلایا گیا اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی بہن بھی محل شاہی میں پہنچ گئیں۔ حق تعالیٰ نے یہ تدبیر کی کہ جس عورت کا پستان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے منہ میں دیا جاتا وہ اس کو منہ میں ہی نہ لیتے اور ہرگز دودھ نہ پیتے اس پر فرعون کو بڑی پریشانی ہوئی کہ یہ کسی کا دودھ کیوں نہیں پیتا اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا "**هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نَاصِحُوْنَ**" کیا میں تم کو ایسی بی بی کا پتہ بتلاؤں جو تمہاری خاطر اس بچہ کو اچھی طرح پرورش کر دیں اور وہ اس کی خیر خواہ بھی ہیں۔ اہل سیر نے لکھا ہے کہ ان کے اس قول پر **وَهُمْ لَهٗ نَاصِحُوْنَ** فرعون کھٹک گیا اور کہا کہ یقیناً تجھ کو معلوم ہے کہ یہ بچہ کس کا ہے جبھی تو یہ کہتی ہے کہ وہ اس کی خیر خواہ بھی ہیں ورنہ تجھ کو یہ کیا معلوم ہوتا کہ اس کا خیر خواہ کون ہے' کون نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن بڑی سمجھدار اور فہیم تھیں' کیوں نہ ہو آخر کس خاندان کی تھیں' فوراً جواب دیا کہ لہ کی ضمیر اس بچہ کی طرف عائد نہیں بلکہ فرعون کی طرف عائد ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ سرکاری خیر خواہ بھی ہیں (کانت فہیمۃ للہ درھا ۱۲) خیر اس جواب سے اطمینان سا ہوا تو فرعون نے کہا کہ اچھا بی بی کو بلا کر لاؤ چنانچہ وہ اپنی والدہ کو بلا لائیں ان کا پستان منہ میں جانا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اچھی طرح دودھ پینے لگے' فرعون نے آپ کی والدہ سے کہا کہ یہ بچہ تمہارا ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ اس کی کیا وجہ کہ تمہارے سوا اس نے کسی کا دودھ بھی نہ پیا۔ انہوں نے فرمایا کہ حضور اتنے سے بچہ کو ماں باپ کی کیا سمجھ' لایئے آپ جس عورت کا چاہے بچہ لے آیئے وہ بھی ضرور میرا دودھ پی لے گا۔ وجہ یہ ہے کہ بعض عورتوں کا دودھ خراب ہوتا ہے اس لیے بعضا بچہ ایسی عورتوں کا دودھ نہیں پیتا' میرا دودھ نہایت عمدہ ہے اس لیے اس نے خوشی سے لے لیا اور ہر بچہ اسی طرح پی لے گا' یہاں بھی وہ لاجواب ہوا اور آپ کی والدہ کو معقول تنخواہ پر اپنے محل میں رکھا کہ تم ہی اس بچہ کو دودھ پلاؤ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس طرح آپ کی ماں کو بھی ان سے ملا دیا اور پرورش ہوتی رہی حتیٰ کہ بڑے ہوئے اور جوان ہوئے اور شاہی فرزند کہلانے کی وجہ سے سب کی نگاہ میں معظم و محترم رہے پھر ایک قبطی کا خون آپ کے ہاتھ سے ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے روپوش ہو کر مدین پہنچ گئے دس

سال کے بعد وہاں سے واپس ہوئے اور راستہ میں نبوت سے مشرف ہوکر فرعون کو تبلیغ کرنے کے لیے مصر میں تشریف لائے۔اس وقت ہارون علیہ السلام آپ کے ساتھ تھے کیونکہ وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر نبی بنادیے گئے تھے دونوں صاحبوں نے آ کر اس سے کہا:

"اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّکَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْجِئْنَاکَ بِاٰیَةٍ مِنْ رَّبِّکَ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی اِنَّا قَدْاُوْحِیَ اِلَیْنَا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی"

چونکہ فرعون موسیٰ علیہ السلام سے اچھی طرح واقف تھا اور ان پر ایک قسم کا ناز بھی تھا اس لیے انہی کی طرف روئے سخن کیا' ہارون علیہ السلام کی طرف اصل خطاب نہ تھا اس واسطے "فَمَنْ رَّبُّکُمَا" کے بعد یا موسیٰ کہا گیا یا ہارون و موسیٰ نہیں کہا گیا اس سوال کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کو وجود عطا کیا' پھر (اسباب بقاء کی طرف ہر شے کو) رہنمائی کی (چنانچہ ہر مخلوق اپنی بقاء کا ذریعہ پیدا ہوتے ہی ڈھونڈ ھنے لگتا ہے۔مرغی کا بچہ زمین پر چونچ مارتا ہے اور انسان کا بچہ پستان کو ڈھونڈ ھنے لگتا ہے وغیرہ وغیرہ) اس کے بعد فرعون نے یہ سوال کیا "قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی" کہ پہلے لوگوں کا کیا حال ہے؟ (جو مرچکے ہیں) اس سوال کی وجہ یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں یہ حکم تھا "اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی" جس سے مقصود تکذیب پر وعید سنانا تھا۔اس پر یہ سوال کیا کہ الوہیت و رسالت کے مکذبین بہت گزرے ہیں ان کی حالت عذاب میں کیا ہوئی۔"قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتَابٍ لَایَضِلُّ رَبِّیْ وَلَایَنْسٰی" موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: کہ اس کا علم خدا ہی کے پاس ہے ایک کتاب میں ہے (اس نے سب محفوظ کر رکھا ہے محض علم پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اتمام حجت کے لیے سب کو لکھ بھی دیا ہے) میرے پروردگار کو غلطی اور بھول نہیں ہوتی) پس لکھنا اس غرض سے نہیں ہے کہ یاد رہے بلکہ اور حکمتوں کی بنا پر ہے) پس حالت تو ان کی علم الٰہی میں منضبط ہے۔اب صرف انتظار وقت موعود آنے کا ہے اس وقت عذاب اکبر کا ظہور ہو جاوے گا آگے حق تعالیٰ کے کمال علم و حکمت کو چند واقعات مشاہدہ سے ثابت کیا ہے تا کہ ان کا قادر ہونا بھی ثابت ہو جاوے اور ایقاع وعید کے لیے اسی علم و قدرت کی ضرورت ہے۔چنانچہ ارشاد ہے: "اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً" جس نے زمین کو تمہارے لیے بستر بنایا (جو نہ بہت سخت ہے لوہے کے مانند جس پر لیٹنے بیٹھنے سے جسم کو

تکلیف ہو نہ بہت نرم ہے گارے کے مانند جس میں پاؤں دھنسنے لگیں اور یہ کمال حکمت ہے) اور اس میں تمہارے لیے راستے چلادیئے (اگر زمین میں بہت سخت یا بہت نرم ہوتی تو اس پر راستوں کے نشانات یا تو قائم نہ ہوتے یا باقی نہ رہتے تو چلنے والے کو پتہ نہ چلتا کہ اب راستہ کدھر کو ہے۔ یہ بھی کمال حکمت ہے کہ زمین کو ایسا بنایا ہے جس پر مختلف راستے الگ الگ محفوظ رہتے ہیں) اور آسمان سے پانی اتارا (یہ بھی کمال حکمت پر مبنی ہے) اس کے بعد ارشاد ہے:

فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى النُّهٰى

(پھر ہم نے پانی کے ذریعے سے قسم قسم کی نباتات پیدا کیں ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ اس میں عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں کمال قدرت الٰہیہ غیر متناہیہ پر) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر تو حق تعالیٰ کا ذکر غیبت کے صیغوں سے تھا یہاں تکلم کے ساتھ ہونے لگا۔ اہل ظاہر نے تو اس کا یہ جواب دیا کہ "اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً" تک موسیٰ علیہ السلام کا کلام تھا۔ انہوں نے تو بارش کے نازل ہونے پر گفتگو کو ختم کر دیا تھا' آگے حق تعالیٰ نے پیدائش نباتات کا ذکر تتمیم کلام کے لیے بڑھا دیا اور بتلا دیا کہ پانی سے نباتات کا پیدا ہونا نہایت عجیب حکمت پر مبنی ہے اور بعض مغلوبین اہل حال نے کہا ہے کہ نہیں یہ بھی موسیٰ علیہ السلام ہی کا کلام ہے اس وقت ان پر وحدت الوجود کا غلبہ ہو گیا تھا' غائبانہ ذکر چھوڑ کر تکلم کے ساتھ فرمانے لگے کہ پھر ہم نے پانی سے نباتات کو نکالا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام کا "فاخرجنا" فرمانا ایسا ہی تھا جیسا کہ شجر طور نے کہا تھا: "اِنِّىْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" یہ اہل حال بہت دور کی بات کہتے ہیں ان کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا' طلبہ تو وہی جواب سمجھ لیں جو اہل ظاہر نے دیا ہے وہ اہل حال کی باتوں میں غور نہ کریں مگر ان پر انکار بھی نہ کریں (کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ جو بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے وہ غلط ہی ہو) بہر حال چاہے موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہو یا حق تعالیٰ نے ان کے کلام کو پورا کیا ہو یہ مضمون اسی گفتگو کے متعلق ہے جو فرعون سے ہو رہی تھی اس لیے یہاں حق تعالیٰ نے مراقبہ ارض ہی کی تعلیم فرمائی کیونکہ فرعونی "مراقبہ ارض" ہی کے قابل تھے۔ "مراقبہ سماء" کے قابل نہ تھے یہ بھی اس مقام پر ایک نکتہ ہے جس میں ہم پر بھی یہ چھینٹا ہے کہ تم فرعون اور اس کی قوم کی طرح غبی ہو اس لیے تم کو بھی مراقبہ ارض کی تعلیم کی جاتی ہے۔ (یہ تیسرا نکتہ ہے) مگر حق تعالیٰ کے یہاں ایسے اغبیاء کی بھی دوا موجود ہے وہ اذکیا کو مراقبہ سماء تعلیم

فرماتے ہیں (جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد ہے: "ویتفکرون فی خلق السموات والارض وقدم فیه السموات لان المقام مقام مدح اولی الالباب ۱۲ جامع" اوراغنیاء کومراقبہ بتلاتے ہیں وہ زمین ہی کا مراقبہ کرلیں توان کے دن بھلے ہوجائیں۔

مراقبہ کا طریقہ

اوراس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ زمین پر چلتے ہوئے یہ سوچو کہ اس وقت ہم اوپر چل رہے ہیں اورعنقریب زمین کے نیچے اتریں گے۔ موت کا خیال بھی نہ ہوتو صرف اتنا ہی سوچ لینا بھی کافی ہے۔ پھراس سے یہ سوچ پیدا ہوگی کہ جب ہم کو زیر زمین جانا ہے تو اس وقت کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اس وقت اعمال ہی کام دیں گے اورکوئی چیز ساتھ نہ جائے گی۔

مراقبہ کا نفع

صاحبو! یہ بات تو ذرا سی ہے مگراس پرعمل کر کے دیکھو چند دن میں حالت بدل جائے گی دوا کا نفع نام بتانے سے نہیں ہوا کرتا استعمال کرنے سے ہوتا ہے آپ اس پرعمل کیجئے نفع خود معلوم ہوگا کہ کام تین قسم کے ہیں ایک وہ جو زیر زمین نافع ہیں دوسرے وہ جو مضر ہیں تیسرے وہ جو نہ نافع ہیں نہ مضر ہیں جو مضر ہیں ان کو تو فوراً چھوڑ دوگے۔ رہے وہ جو نہ نافع ہیں نہ مضر ہیں وہ بھی قابل ترک ہیں کیونکہ آدمی جب اپنے گھر میں آتا ہے تو ترکاری دال گوشت آٹا اناج وغیرہ لے کر داخل ہوتا ہے جو معاش کے لیے ضروری اور مفید ہیں سانپ بچھو لے کر گھر میں کوئی نہیں گھستا جو کہ مضر ہیں اور جیسے سانپ بچھو لے کر گھر میں نہیں آتے اسی طرح ڈلے پتھر لے کر بھی نہیں گھستے۔ آخر کیوں محض اس واسطے کہ فضول ہیں ان میں نفع کیا اور جو کوئی ڈلے پتھر لائے بھی تو بیوی سے بحث ہوگی وہ کہے گی کہ ان چیزوں کا گھر میں کیا کام تھا؟ آپ کہیں گے کہ ضرر بھی تو کچھ نہیں اس پر وہ آپ کو بیوقوف بنائے گی کہ میاں پھر ساری بستی کا کوڑا گھر ہی لاکر جمع کر دو کیونکہ اس میں فائدہ نہیں تو ضرر بھی کچھ نہیں غرض بیوی سے خوب بحث ہوگی اور انشاء اللہ وہی جیتے گی تو جب دنیا کے گھر میں تم فضولیات جمع نہیں کرتے' گو مضر بھی نہ ہوتو آخرت میں فضول اعمال کیوں لے جاتے ہو بس وہی کام کرو جو آخرت کے لیے ضروری اور مفید ہوں اور جو مضر یا فضول ہوں ان سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! اس مراقبہ کا نافع ہونا تجربہ میں آ گیا ہے۔ اول یہ مضمون بے ساختہ میرے قلب میں آیا تھا اس وقت کسی آیت سے استنباط کر کے میں نے اس کو نہ سوچا تھا بلکہ ویسے ہی گھر جارہا تھا کہ دفعۃً چلتے ہوئے خیال آیا کہ اس وقت تو ہم زمین کے اوپر چل رہے ہیں اور ایک دن اس کے

نذر ہو ں گے اس خیال کے آتے ہی حالت بدل گئی اور قلب پر خاص اثر ہوا اور کئی دن تک اس کا
غلبہ رہا پھر آیات قرآنیہ میں بھی اس کی تعلیم نظر آئی اور میری عادت ہے کہ جو مضمون مجھے نافع
معلوم ہوتا ہے جی چاہا کرتا ہے کہ اپنے بھائیوں کو اس سے مطلع کردوں کیونکہ مثل مشہور ہے:

کہ حلویٰ بہ تنہا نہ بایست خورد

(حلوہ اکیلا نہ کھانا چاہیے)

اس لیے میں نے یہ مضمون بیان کیا اور اسی لیے اس آیت کو اختیار کیا۔ کیف ما اتفق اختیار نہیں
کیا میں نے اپنے بعض دوستوں کو بھی یہ مراقبہ تعلیم کیا ہے بہت ہی نفع ہوا غرض اس کا نافع ہونا محقق
ہو چکا ہے اس لیے میں سب کو ہدایت کرتا ہوں کہ چلتے پھرتے اس کا مراقبہ رکھا کرو کہ ایک دن ہم
زیر زمین ہوں گے یہ مراقبہ سہل بھی بہت ہے اس میں کچھ وقت نہیں حق تعالیٰ نے ہم کو نزدیک کی
چیزوں میں غور کرنے کی تعلیم فرمائی ہے تاکہ کچھ دشواری نہ ہو۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ
وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ

کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے کیونکر پیدا کیا گیا ہے اس میں سب سے پہلے اونٹ کا ذکر کیا گیا ہے
کیونکہ اہل عرب کثرت سے اسی پر سوار ہوتے ہیں اور راکب جمل کو زیادہ تلبس اونٹ ہی سے ہوتا
ہے پھر اہل عرب کو اونٹ سے محبت بھی بہت ہے۔ چنانچہ ایک شاعر اپنے محبوب کے خال رخسار کی
تشبیہ میں کہتا ہے کہ رخسار پر تل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالو کے میدان میں اونٹ کی مینگنی پڑی ہو
اس سے اونٹ کے ساتھ اس کا تعلق ظاہر ہے اور ایک شاعر کہتا ہے:

احبها و تحبنی ویحب ناقتها بعیری

(میں محبوبہ سے محبت رکھتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے اونٹ کو اس کی اونٹنی سے محبت ہے)

طرز مراقبہ

اس لیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ ہمارے دلائل قدرت کو اونٹ میں نہیں دیکھتے
کہ اس کو کیسا عجیب الخلقت بنایا ہے اور کیسا جفاکش اور صابر و بردبار کر دیا ہے پھر اونٹ پر سوار
ہوتے ہی آدمی اونچا ہو جاتا ہے تو سامنے آسمان نظر آتا ہے اس لیے اس کے بعد فرماتے ہیں:
"وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ" اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیونکر بلند کیا گیا ہے پھر سفر شروع
کرنے کے بعد دائیں بائیں پہاڑ نظر آتے ہیں تو آگے فرماتے ہیں: وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ

نُصِبَتْ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کس طرح زمین میں نصب کیے گئے ہیں پھر گا ہے گا ہے سواری کی حالت میں زمین پر بھی نظر پڑ جاتی ہے، سامنے بڑے بڑے میدان آتے ہیں جن کو سوار طے کرتا جاتا ہے تو فرماتے ہیں: وَاِلَی الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی جو شخص کبھی اونٹ پر سوار ہوا ہو یا اس نے راکب جمل کی حالت میں تامل کیا ہو وہ اس ترتیب کی خوبی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ پہلے اونٹ کا ذکر کیا پھر آسمان کا پھر پہاڑوں کا پھر زمین کا کیونکہ رکوب کی حالت میں اکثر نظر اسی ترتیب سے واقع ہوتی ہے بہرحال جن چیزوں سے ہم کو زیادہ قرب اور زیادہ تلبس ہوتا ہے حق تعالیٰ نے انہی میں تامل کی تعلیم فرمائی ہے اور یہاں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوگئی کہ حق تعالیٰ نے دلائل قدرت معلوم کرنے کے لیے اونٹ اور پہاڑ اور آسمان و زمین کا مراقبہ تو بتلایا ہے مگر امارد و نسواں کی طرف کہیں متوجہ نہیں فرمایا کیونکہ ان میں توجہ کرنے سے دلائل قدرت پر نظر نہیں رہتی بلکہ خواہش نفس پر نظر رہ جاتی ہے آگے نہیں بڑھتی۔ معلوم ہوا کہ دلائل قدرت کا مشاہدہ انہی چیزوں میں ہوسکتا ہے جہاں خواہش نفس کا موقع نہ ہو ورنہ دلائل قدرت تو نظر قلب سے غائب ہوجائیں گے اور محض خواہش ہی خواہش رہ جائے گی۔ پس اب جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم امارد و نسواں کو قدرت خدا دیکھنے کے لیے گھورتے ہیں ان کا جھوٹا ہونا ظاہر ہوگیا۔ اگر واقعی ان کو دلائل قدرت کا مطالعہ مقصود ہوتا تو وہ ان چیزوں میں نظر کرتے جن کا مراقبہ حق تعالیٰ نے تعلیم فرمایا ہے۔ طالب کو تو ان میں بھی وہی قدرت نظر آتی ہے جو خوبصورت لڑکوں اور عورتوں میں نظر آتی ہے بلکہ ان سے زیادہ کیونکہ ان کے مطالعہ میں محض دلائل قدرت ہی پر نظر ہوتی ہے اور کسی بات کا خیال نہیں آتا۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں:

محقق ہماں بیند اندر ابل   کہ در خوبرویان چین و چگل

(محقق جو کچھ اونٹ کے اندر دیکھتا ہے جو دوسروں کو چین و چگل کے خوبروؤں میں نظر نہیں آتا)

صاحبو! امارد و نسواں کو وہی گھورتا ہے جس کو خدا مطلوب نہیں بلکہ مخلوق ہی مطلوب ہے شیخ اس کے متعلق فرماتے ہیں:

خداوند صاحبدلاں دل بہ پوست   وگر ابلہے داد بے مغز اوست

یعنی عقلمند کبھی پوست اور کھال کو دل نہیں دیا کرتا اور اگر کوئی دے تو وہی بیوقوف ہے اس لیے ان چیزوں سے نظر کو بچانا ہے ان سے اصلاح نہ ہوگی فساد بڑھے گا۔ قدرت کے دلائل دیکھنے کے لیے زمین ہی کو دیکھ لو جو سب کی ماں ہے تم کیونکر گیہوں اور میوؤں اور شلجم مولی میں سے نکل کر نطفہ کی شکل

میں آئے پھر اس سے کس حکمت کے ساتھ اس خوبصورت جسم کی طرف منتقل کیے گئے اور کیونکر پیدا ہوئے پھر کیسے پلے پلائے جوان ہوئے پھر یہ بھی سوچ لو کہ ایک دن زمین کے نیچے بھی جانا ہے اور زمین میں جانے سے پہلے نزع کی حالت ہوگی' بیماری ہی میں مال و دولت و جائیداد وغیرہ سے آپ کا تعلق کم ہو جائے گا۔ اس وقت اپنے لیے کچھ نہ کرسکو گے نہ کسی کو خیرات دے سکو گے نہ فوت شدہ نماز روزہ کی تلافی کرسکو گے' بس ثلث مال میں جو چاہو کرلو اس سے زیادہ حق نہ ہوگا پھر دفن کے بعد فرشتے آویں گے نہ معلوم سوال و جواب کیسے ہوں گے کیسے نہ ہوں گے اس کو سوچو تو پھر حالت کی اصلاح ہوگی اور فکر پیدا ہوگی کہ وہ کون کون سے اعمال ہیں جن سے وہاں بیڑا پار ہو اس کے لیے آپ کو دو چیزوں کی ضرورت ہوگی ایک بقدر ضرورت علم کی دوسرے عمل کی اور اگر کسی سے تحصیل علم نہ ہوسکے تو وہ اہل اللہ کی صحبت اور ان سے ملنا ملانا اختیار کرے اور ان سے پوچھ پوچھ کر عمل کرے اس کو لوگوں نے بالکل ہی ترک کردیا حالانکہ یہ سب کی اصل ہے اور کم و بیش اس کی ضرورت سب کو ہے۔ بہٰذا اصلاح حال میں اس سے بڑھ کر کوئی چیز بھی فائدہ مند نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

گر تو سنگ خارہ و مرمر شوی   چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

(اگر تم سخت پتھر اور سنگ مرمر بھی ہوگے جب اہل اللہ کے پاس پہنچوگے تو موتی بن جاؤ گے)

صحبت اہل اللہ کا سب کو اہتمام کرنا چاہیے اور جن کو علم کا حاصل کرنا مطالعہ سے دشوار ہو وہ تو ضرور اس کا اہتمام کریں کہ اس کے ذریعے سے علم و عمل دونوں سہولت سے حاصل ہو جائیں گے۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہماری اصلاح فرمائیں۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین والحمدللہ رب العلمین.

التہذیب

۷ رمضان المبارک سنہ ۱۳۲۲ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں تین گھنٹے پینتیس منٹ تک بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی۔ مولوی محمد عبداللہ صاحب گنگوہی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡكَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الۡفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ وَالۡاِثۡمَ وَالۡبَغۡيَ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ وَاَنۡ تُشۡرِكُوۡا بِاللّٰهِ مَالَمۡ يُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطَانًا وَّاَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعۡلَمُوۡنَ۝ (الاعراف آیت نمبر ۳۳)

ترجمہ: ''اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمایئے کہ البتہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو جو علانیہ ہوں وہ بھی اور ان میں جو پوشیدہ ہوں وہ بھی ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور اس بات کو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس بات کی کہ تم اللہ کے ذمہ ایسی بات لگاؤ جو تم نہیں جانتے۔''

تمہید

یہ ایک آیت ہے سورہ اعراف کی اس میں حق تعالیٰ نے معاصی کی حرمت اور اس کی ایک مختصری تقسیم ارشاد فرمائی ہے اس مضمون کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے جمعہ گزشتہ کو بیان کیا تھا کہ روزہ کا فائدہ اس وقت مرتب ہوگا جب کہ روزہ کے حقوق ادا کیے جائیں اور یہ بھی بیان کیا تھا کہ روزہ کے حقوق میں سے یہ ہے کہ معاصی کو ترک کر دیا جائے اور یہ بھی بتلایا تھا کہ اس زمانہ میں اصل عبادت روزہ اور قیام لیل ہے اور ان دونوں کی کچھ حکمتیں بھی بیان کی تھیں اور یہ بھی عرض کیا تھا کہ ان حکمتوں کی تحصیل میں خلوت معین ہے آج کوئی نیا مضمون نہیں ہے مضامین سابقہ کی شرح ہے یعنی آج یہ بتلایا جائے گا کہ وہ معاصی کیا کیا ہیں جن سے روزہ میں اجتناب ضروری ہے اور اس کے بعد کچھ نماز اور خلوت کے آداب ذکر کیے جائیں گے یہ حاصل ہوگا آج کے بیان کا۔

ظلمت معصیت

ارشاد ہے: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے! کہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو جوان میں ظاہر ہیں وہ بھی اور جو باطن ہیں وہ بھی اور گناہ کرنے کو اور ظلم کرنے کو اور اس بات کو حرام کیا ہے کہ اللہ کے ساتھ ایسی شے کو شریک ٹھہراؤ کہ جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ بھی حرام کیا ہے کہ اللہ کی طرف ایسی بات منسوب کرو جس کو تم نہیں جانتے یہ ترجمہ ہے اس آیت کا۔

ترجمہ سے اجمالی تعین مضمون اور تقسیم معاصی کی معلوم ہوگئی ہوگی لیکن ترجمہ سننے سے اس مضمون کی وقعت جیسا کہ چاہیے نہیں ہوئی ہوگی اس لیے اس کی وقعت واقعیہ ظاہر ہونے کے لیے اور مقامات کی حقیقت کے انکشاف کے لیے کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ پس جاننا چاہیے کہ اس مضمون کا تعلق بہت دور سے ہے یعنی شروع رکوع یا بنی آدم سے یہ مضمون چلا ہے اور سبب نزول اس کا ایک خاص قصہ ہے وہ یہ ہے اہل جاہلیت میں من جملہ دیگر رسوم جہالت کے یہ بھی ایک بے حیائی کی رسم تھی کہ وہ بیت اللہ شریف کا برہنہ طواف کرتے تھے اور یوں کہا کرتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نافرمانی کرتے ہیں ان میں طواف نہیں کرتے۔ دیکھئے! ظاہر میں تو کیسی خوبصورت ہے لیکن ان احمقوں نے جہالت میں یہ نہ سمجھا کہ برہنہ طواف کرنے میں کس قدر بے حیائی اور بیت اللہ شریف کی بے ادبی ہے اور نیز کپڑوں کے اتارنے سے کیا ہوتا ہے۔ چاہیے کہ کھال اتار دیا کریں اس لیے کہ اصل اثر تو گناہ کا بدن کے اندر ہے گو اس شخص کو ادراک اس کا نہ ہو۔ چنانچہ بعض اہل نظر آنکھ کی پتلی کو دیکھ کر پہچان لیتے ہیں کہ یہ شخص بدنگاہی میں مبتلا ہے۔ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطبہ پڑھ رہے تھے چند آدمی آئے اور وہ کسی کو بری نظر سے دیکھ کر آئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا حال ہے لوگوں کا کہ مسجد میں آتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان تو بڑی ہے۔

نور طاعت

طاعت کا نور اور معصیت کی ظلمت تو ایسی شے ہے کہ ہر ادنی مسلمان کو بھی اس کا ادراک ہو جاتا ہے اور یہ نور و ظلمت گورے چٹے یا کالے ہونے پر موقوف نہیں وہ نور و ظلمت دوسرا ہے بعضے لوگ رنگ کے کالے ہوتے ہیں لیکن چہرہ پر ان کے ایسا نور طاعت چمکتا ہے کہ بھلے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اسی نور کی نسبت ارشاد فرمایا ہے: "سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ" (ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان پر نمایاں ہیں) اور مولانا اسی نور کی نسبت فرماتے ہیں:

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی نیک بین باشی اگر اہل دلی

(ولی کے اندر نورِ حق ہوتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو تو بھی اس نور کو دیکھ لے)

لباس ظاہر و باطن

غرض گناہ کا اثر کپڑوں پر اتنا نہیں ہوتا جس قدر کہ بدن میں ہوتا ہے تو اگر ایسا ہی ادب تھا تو بدن سے کھال اتارنا چاہیے تھا اور جن اعضاء سے گناہ کیے تھے ان کو پارہ پارہ کرنا تھا اور وہ اپنی اس بے حیائی کی نسبت یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم فرمایا ہے: حق تعالیٰ اس سب کا رد فرماتے ہیں اول بطور تمہید ارشاد ہے:

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِیْشًا ؕ

یعنی اے اولاد آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا ہے جو تمہاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور زینت کا لباس بھی اتارا ہے حق تعالیٰ کی رحمت تو دیکھئے کہ کس قدر ہے۔ گویا ارشاد ہے کہ ارے ظالمو! اللہ تعالیٰ کپڑے اتارنے کی اجازت تو کیا دیتے انہوں نے تو تمہارے لیے زینت کا لباس عطا فرمایا ہے اور زینت کی بھی اجازت دی ہے۔ سبحان اللہ کیا بلاغت ہے۔ آگے لباس کی مناسبت سے ایک دوسرے مہتم بالشان لباس کی طرف انتقال فرماتے ہیں اور اس کی اطلاع دیتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَیْرٌ یعنی جب کہ ہم لباس باطنی کے اتارنے کو پسند نہیں کرتے جس کا اترنا علانیہ بے حیائی بھی نہیں تو اس لباس ظاہری کے اتارنے کو کیسے پسند کریں گے نیز اس تمہاری حرکت سے لباس حقیقی و لباس ظاہری دونوں اترے ہیں کیونکہ ظاہری لباس کا اترنا تقویٰ میں بھی مخل ہے اس مضمون کو حق تعالیٰ نے اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا میں ایک عام اور عقلی عنوان سے ذکر فرمایا ہے کہ جس سے یہ مسئلہ عقلی ہو گیا۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ لباس کو جب ہم نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے یعنی یہ امر فطری ہے تو فطرۃً بھی عقل اس کو گوارا نہیں کرتی کہ اس کو اتارا جائے اور اس کے ضمن میں تقویٰ کی تاکید جو کہ اصل مبحث ہے قرآن شریف کا اور روح ہے شریعت کی۔ نیز بعنوان لباس ایک نہایت عجیب طریقہ ہے سے وَلِبَاسُ التَّقْوٰى میں ارشاد فرمائی کہ جس میں لفظاً بھی رعایت مقصود مقام کی رہی۔ گویا یہ جزئی مقصود کو چھوڑا اور نہ کلی مقصود تو اس میں بے حد بلاغت ہے کہ زبان اس کے بیان سے کوتاہ ہے اگر اہل علم غور کریں گے تو سمجھ لیں گے۔ یہاں تک تو لباس سے اپنے بدن کو چھپانے کو محبوب عند الحق ہونے کا بیان تھا۔ اب آگے نزع لباس کا محبوب عند الشیطان ہونا بیان فرماتے ہیں:

يَابَنِيٓ اٰدَمَ لَايَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَاO

یعنی اے بنی آدم تم کو شیطان گمراہی میں نہ ڈالے جیسا کہ تمہارے ماں باپ کو اس نے جنت سے نکالا یعنی ایسا کام کرایا جس سے وہ جنت سے نکلے اور اس حالت میں کہ ان سے ان کا لباس اترا ہوا تھا تا کہ ان کو ان کے مستور بدن دکھلائے اس میں حق تعالیٰ نے کئی باتیں بیان فرمائیں ایک تو یہ کہ شیطان تمہارا بہت پرانا آبائی دشمن ہے اس سے بہت بچنا چاہیے دوسرے یہ کہ گناہ کا مقتضے یہ ہے کہ جتنے کپڑے بدن سے اتر جائیں اور لیریھما میں لام عاقبت کا ہے یعنی انجام شیطان کے کہنا ماننے کا یہ ہوا کہ آدم وحوا کو ان کا ستر دکھلا دے اس میں ایک باریک مسئلہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہے کہ آدم وحوا علیہما السلام دونوں میاں بیوی ہیں اور یہ بھی ہے کہ اپنا بدن دیکھنا جائز ہے اور نیز اپنی بیوی کا بدن دیکھنا بھی جائز ہے پھر اس میں کیا حرج تھا کہ آدم وحوا نے آپس میں اپنا یا دوسرے کا بدن دیکھا' انجام تو کوئی ایسا امر بیان فرمانا چاہیے تھا کہ جو کوئی امر مذموم ہوتا ہو تو امر مباح ہے تو بات یہ ہے بعض مباحات ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے انسان کو طبعی نفرت ہوتی ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آدم وحوا علیہما السلام کا گیہوں کھانا خطا اجتہادی تھی' گناہ نہیں تھا لیکن بجوائے مقربان را بیش بود حیرانی۔ عتاب اس پر ہوا کہ عزم اور احتیاط کا درجہ کیوں فروگذاشت ہوا اس لیے اس کا انجام واثر بھی ایسا ہی امر ہوا کہ وہ فی نفسہ مباح تھا۔ قبیح وشنیع نہیں تھا لیکن ان کی شان کے خلاف تھا۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدم وحوا تقدس کے اس درجہ میں تھے کہ ان کے لیے یہ امر مباح بھی باعث تکدر ہوا اور نیز یہ مسئلہ بھی مستفاد ہوا کہ اراءۃ سوءۃ زوجین میں گو جائز ہے لیکن ادب کے خلاف ہے اور بلاضرورت ایسا کرنا نامناسب ہے۔

حیاء کا اقتضاء

حدیث شریف میں آیا ہے کہ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ستر کھولنا کیسا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار فرمایا' اس شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِنْ کَانَ خَالِیًا یعنی اگر خلوت میں ہے فرمایا: فَاللّٰهُ اَحَقُّ مِنْ اَنْ یُّسْتَحْیٰ مِنْهُ یعنی اللہ تعالیٰ احق ہیں اس بات کے ساتھ کہ ان سے حیاء کی جائے اگرچہ اللہ تعالیٰ سے پردہ اور ستر نہیں ہوسکتا مگر یہ تو ہوسکتا ہے کہ پردہ کی صورت بنائی جاوے اور یہاں

سے اس حدیث کی بھی شرح ہوگئی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر پر جایا کرتی تھیں جب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں دفن ہوئے تو میں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حیا کی وجہ سے نہیں گئی۔ اس حدیث سے لوگوں نے اپنی ذہانت سے بہت کچھ مستنبط کیا ہے سماع موتی بھی اس سے ثابت کیا ہے یہ سب نری ذہانت ہے اس سے کچھ نہیں نکلتا اس لیے کہ حیا کے دو اثر ہیں ایک پردہ حقیقۃ اور دوسرے پردہ صورۃ جیسا یہاں شبہ ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے حیا ہو تو اس کا اثر کیا ہوگا پردہ تو ہو نہیں سکتا تو جواب یہ ہے کہ گو پردہ حقیقی نہ ہو لیکن حیا کا اقتضاء یہ بھی ہے کہ پردہ کی صورت ہو پس یہاں بھی حیاء من عمر کے اندر دوسرا احتمال ہے کہ مراد یہ ہو کہ گو پردہ حقیقی کا تحقق تو حی ہی کے اندر ہو سکتا ہے لیکن پردہ صورۃ میت سے بھی ممکن ہے پس اس احتمال کے ہوتے ہوئے استدلال کرنا سمع کے مسئلہ پر مشکل ہے۔

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تنہائی میں بھی بلا ضرورت برہنہ ہونا نہ چاہیے اور بیوی کا ستر دیکھنا تو اس سے بھی زیادہ شرمناک ہے بعض حکماء نے کہا ہے کہ اس حرکت سے اولاد اندھی پیدا ہوتی ہے لیکن اگر اندھی نہ ہو تو بے حیا تو ضرور ہوتی ہے' اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس وقت خاص میں جس قسم کی اس سے حرکت ہوتی ہے اولاد کے اندر وہی خصلت پیدا ہوتی ہے اسی واسطے حکماء نے لکھا ہے کہ انزال کے وقت اگر زوجین کو کسی اچھے آدمی کا تصور آ جائے تو بچہ نیک ہوگا اسی واسطے پہلے لوگ اپنے خلوت کے کمرے میں علماء اور حکماء کی تصویریں رکھا کرتے تھے۔ شاید یہ سن کر کسی کی رال ٹپکی ہو کہ یہ تو تصویریں رکھنے کی ایک مصلحت بھی نکل آئی پھر کیوں ناجائز کہا جاتا ہے اس سے کیوں فائدہ نہیں اٹھایا جاتا لیکن ع

فی طلعتہ الشمس مایغنیک عن زحل

(ہمارے پاس سورج کی روشنی ایسی ہے جس کے ہوتے ہوئے سیارہ زحل کے روشنی کی ضرورت نہیں) حضرت! ہمارے پاس ایسی تصویر ہے کہ وہ ان تصویروں سے مغنی ہے۔ وہ کیا ہے:

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار ۔۔۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

یعنی ہم کو چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا تصور کریں اور یہ دعا پڑھیں: "اَللّٰھُمَّ جنبنا الشَّیطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیطَانَ مَارَزَقْتَنَا" (اے اللہ ہم کو شیطان سے بچا اور دور رکھ شیطان کو اس سے جو ہم کو عطا فرما) اللہ جل جلالہ سے زیادہ کون ہے کہ جس کا خیال کیا جاوے۔ اگر کوئی کہے کہ شیطان کا خیال تو اس وقت نہ ہونا چاہیے اور اس دعا کے پڑھنے میں شیطان کا خیال ضرور آوے گا۔ بات یہ۔

ہے کہ ایک تو کسی شے کا خیال اس کو مقصود و مرغوب بنا کر لاتا ہے اور ایک مہروب عنہ بنا کر دونوں میں بڑا فرق ہے اس دعا کا حاصل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کیا گیا ہے کہ اے اللہ ہم کو اور ہماری اولاد کو شیطان سے بچایئے تو اس کا تصور بحیثیت تنفر کے ہوا پس اثر اسی کے مناسب ہوگا۔ چنانچہ اس دعاء کا اثر یہ آیا ہے: "فانه لن يضره الشيطن" اس کو ضرر نہ پہنچائے گا۔ اولاد پاک اور مقدس ہوگی اور یوں اگر اپنے ہاتھوں بگڑیں وہ دوسری بات ہے پس ہم کو اس تصویر کے ہوتے ہوئے کسی اور تصویر کی حاجت نہیں۔ بہرحال بیوی کو برہنہ دیکھنے سے اخلاق پر اولاد کے اثر پڑتا ہے اور اس میں آدم وحوا کے رتبہ کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔

غلو فی المجاہدہ

آگے اس تمہید کے بعد صراحۃً عنوان عام میں ان کا رد فرماتے ہیں:

وَإِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَا اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

یعنی جب وہ کوئی بے حیائی کی بات کرتے ہیں جیسے برہنہ طواف کرنا تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکم کیا ہے کہ آپ فرما دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں فرماتے۔ آگے ارشاد ہے: قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کرنے کا) اس میں مامورات کی تقسیم ہے اور قل سے اشارہ نہایت اہتمام کی طرف ہے اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بغیر قل کے بھی تبلیغ فرماتے۔ پس قل لانا نہایت اہتمام کی دلیل ہے۔ قسط میں حقوق العباد کی طرف ارشاد ہے اور اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (تم ہر سجدہ کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کرو) میں حقوق اللہ آگے اور وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اور تم اس عبادت کو خالص اللہ ہی کے واسطے کرو) میں عقائد داخل ہو گئے۔ مامورات کی بھی تین قسمیں ہیں تینوں کو جمع فرما دیا۔ آگے اصل مقصود کو بیان فرماتے ہیں: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ یعنی اے اولاد آدم اپنی زینت یعنی کپڑے پہنا کرو مسجد کے وقت یعنی طواف کے وقت جو کہ مسجد میں ہوتا ہے اور چونکہ کفار نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس برہنہ ہونے کا حکم دیا ہے تو اس تقریب سے آگے فرماتے ہیں: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے کپڑوں کو کس نے حرام قرار دیا ہے) اور اگرچہ مامورات کے ضمن میں منہیات بھی آ گئے

تھے اس لیے مامور بہ پر عمل کرنے سے منہیات سے خود ہی احتراز ہوگا اور کسی منہی کا ارتکاب کرنے سے کسی واجب العمل مامور بہ عمل ضرور ترک ہوگا لیکن چونکہ کفار نے کہا تھا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس بے حیائی کا حکم فرمایا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مقابلہ میں منہیات کی فہرست مصرحاً بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے تو یہ چیزیں حرام کی ہیں یہ تمام تمہید اس لیے بیان کی گئی تا کہ اس مضمون کی وقعت ذہن نشین ہوجائے۔ غرض ارشاد ہوتا ہے: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ (اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمائیں کہ البتہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو) قل لانے کی وجہ تو وہی اہتمام شان ہے اور انما حصر کے لیے ہے اس میں بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ کیا یہی چیزیں حرام ہیں اور ان کے علاوہ سب حلال ہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حصر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حصر حقیقی دوسرے حصر اضافی۔ یہاں حصر اضافی مراد ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اہل مکہ دو بلاؤں میں مبتلا تھے تحریم حلال اور تحلیل حرام کپڑا پہننا حلال تھا۔ اس کو حلال جانتے تھے اور لڑنا بھڑنا تو ان کی شب و روز کی دال روٹی تھی۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے اول تو تحریم حلال کی نسبت ارشاد فرمایا: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے بندوں کے لیے پیدا کی ہے یہ تو ملبوسات کی نسبت ہے اور وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ یعنی کس نے حرام کی ہیں پاکیزہ چیزیں رزق سے۔ یہ ماکولات کی نسبت ارشاد فرمایا۔ حاصل یہ ہے کہ پہننے اور کھانے پینے کی چیزیں خواہ درجہ حاجت میں ہوں یا درجہ لذت میں حرام نہیں۔ یعنی اچھا کپڑا اور اچھا کھانا حرام نہیں ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجاہدہ کے اندر غلو کرنا مناسب نہیں بعض اہل مجاہدہ اس میں حد سے آگے نکل جاتے ہیں پھر چھوڑ دیتے ہیں بعضے گوشت کھانا ترک کر دیتے ہیں۔

خود فریبی

بعضوں کی شہرت کی جاتی ہے کہ فلاں بزرگ اناج نہیں کھاتے لیکن ان کو یہ خبر نہیں کہ انہوں نے ایک غذا کو تو چھوڑا جو کہ حلال تھی اور ایک دوسری غذائے حرام یعنی عجب اور حب شہرت کو اختیار کیا۔ چاروں طرف سے حب شہرت ہوگی اور سب کی نظریں پڑیں گی تو نفس کو بڑی غذا ملے گی اور نفس موٹا ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں:

آدمی فربہ شود از راہ گوش — جانور فربہ شود از نائے و نوش

(آدمی اپنی تعریف سن کر موٹا ہوجاتا ہے اور جانور کھانے پینے سے موٹا ہوجاتا ہے)

اور فرماتے ہیں:

تن قفس شکل است امر حارجاں　　　از فریب داخلان و خارجاں

نیش گوید نے منم انبار تو　　　آنش گوید نے منم ہمراز تو

(تن قفس کی مانند ہے اور جان کے لیے تکلیف دہ ہے کیونکہ وہ داخلی اور خارجی فریب میں مبتلا ہے' تن یہ کہتا ہے کہ نہیں میرا تیرا شریک زندگی ہوں جان کہتی ہے کہ میں تیری ہمراز ہوں)

چاروں طرف سے جب اپنی مدح وثناء دیکھتا ہے تو اس کی یہ حالت ہوتی ہے:

اوچو بیند خلق راسر مست خویش　　　از تکبری رود از دست خویش

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو خود بھی وہم ہو جاتا ہے کہ میں آخر کچھ تو ہوں جب تو لوگ مجھ کو ایسا کہتے ہیں۔اس کے بعد مولانا اس کا معالجہ بتاتے ہیں:

خویش را رانجور ساز و زار زار　　　تاترا بیروں کنند از اشتہار

(جب وہ مخلوق کو اپنی طرف مائل دیکھتا ہے تو غرور کی وجہ سے بے خود ہو جاتا ہے)

دوائے نخوت

آگے اس شہرت کی خدمت فرماتے ہیں:

اشتہار خلق بند محکم ست　　　بند ایں از بند آہن کے کم ست

(تو اپنے آپ کو رنجیدہ اور غم زدہ بنالے تاکہ لوگ تجھ کو مشتہر نہ کریں)

یعنی شہرت کی قید لوہے کی قید سے بھی سخت تر ہے ہزاروں کام دین کے ایسے ہیں کہ آدمی کو ان سے شہرت اور وجاہت مانع ہوتی ہے۔ دیکھو رکابی چاٹنا سنت ہے لیکن بڑا آدمی جس کے طرف چار آدمیوں کی نظریں ہوں وہ مجمع میں سنت کو ادا نہیں کرسکتا۔ بہت سی رسوم ایسی ہیں کہ ننگ وناموس کی وجہ سے بڑا آدمی نہیں چھوڑ سکتا اور گمنام چھوڑ دیتا ہے اور اس ننگ وناموس کا علاج اگر کچھ ہے تو عشق ومحبت حق تعالیٰ کی ہے جس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　　وے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما　　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے عشق جو ہماری تمام بیماریوں کا طبیب ہے ہمیشہ قائم رہ اے عشق تو ہمارے عزت وناموس کی دوا ہے اور ہمارے لیے تو ہی افلاطون اور جالینوس جیسا حکیم ہے)

ایسا شخص نہ بدنامی سے ڈرے گا اور نہ ننگ وناموس اس کا سدراہ ہوگی اور بہت آزادی سے کہہ دے گا:

گرچہ بدنامی ست نزد علاقاں   مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقل مندوں کے نزدیک گمنامی ایک بدنامی ہے مگر اس کے باوجود ہم شہرت نہیں چاہتے)

اور یہ کہے گا:

ساقیا برخیز و دردہ جام را   خاک برسر کن غم ایام را

(اے ہمارے ساقی اٹھ اور ہمیں تلچھٹ والی شراب کا پیالا پلا اور غم ایام پر خاک ڈال)

ورنہ حضرت یہ ننگ و ناموس وہی ہے جس نے ابوطالب کو ایمان سے روک دیا اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا تو یہ کہا کہ ایمان تو لے آتا مگر کیا کہے گی خلقت کہ ابوطالب دوزخ سے ڈر گیا اور کیا کہیں گی قریش کی بوڑھیاں کہ ایک بچہ پر ایمان لے آیا' وہی ننگ ہم کو بھی خراب کر رہی ہے وہاں اور رنگ سے تھی وہاں ایمان نہ تھا' ایمان سے روک رہی تھی ہم چونکہ پہلے سے مسلمان ہیں اس لیے اس پر قائم تو ہیں مگر تارک سنت ہیں ہم کو اس کی اتباع سے روکتی ہے اور اگر پہلے سے مسلمان بھی نہ ہوتے تو کیا عجب ہے کہ ہم کو یہ ننگ اسلام سے بھی روکتی اور ایک یہ ہی ننگ کیا لاکھوں بلاؤں میں مبتلا ہیں مجاہدہ کر کے ایک سے خلاصی ہوتی ہے دوسری بلا میں مبتلا ہو جاتے ہیں جیسے یہاں ترک لذات کیا تھا قوائ شہویہ کے مغلوب کرنے کو لیکن ابتلا ہو گیا عجب اور اشتہار کی بلا میں بجز فضل کوئی چارہ نہیں ہے۔ مولانا اسی مقام کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں:

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا   ماچو مرغان اسیر بے نوا

دمبدم پابستۂ دام نوائم   گر ہمہ شہباز و سیمرغے شوئم

میرہانی ہر دمے مارا و باز   سوئے دامے می روم اے بے نیاز!

یعنی اے اللہ! ہم عاجز ہیں ہمارا مجاہدہ کچھ کام نہیں دیتا' لاکھوں جال ہیں اور ہم مثل حریص پرندوں کے ہیں' ایک جال سے آپ چھڑاتے ہیں دوسرے نئے جال میں ہم پھنس جاتے ہیں۔

الحاصل یہ جاہ سخت مرض ہے اور جاہ کیا ہے چاہ ہے۔

ذکر لذات

چنانچہ یہ جاہ ہی کی برائی ہے کہ شیطان نے پٹی پڑھا دی کہ آم کھانا چھوڑ دو' خربوزے ترک کرو شہرت ہوگی یا درکھوان چیزوں کے چھوڑنے سے کچھ نہیں ہوتا اصل شے حکم کا اتباع ہے خواہ وہ حکم جو کچھ بھی ہو اگر یہ حکم ہو کہ اس وقت نماز پڑھو بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق کرو اس وقت وہی عبادت ہوگا وراگر حکم ہے کہ روزہ توڑ دو روزہ توڑنا ہی عبادت ہوگا۔ حدیث شریف میں قصہ وارد ہوا ہے۔

ہدف

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں سب کے سامنے پانی منگا کر پیا جس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزہ سے نہیں ہیں تا کہ اور لوگ بھی افطار کر دیں کیونکہ اس وقت ایک شرعی ضرورت افطار کی تھی اس لیے سمجھدار لوگوں نے بھی یہ دیکھ کر روزہ افطار کیا کہ

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں   خاک برفرق قناعت بعد ازیں

اور بعض نے افطار نہیں کیا ان کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اولئک العصاۃ'' یعنی یہ لوگ نافرمان ہیں اس موقع پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی جو مولانا نے مثنوی شریف میں لکھی ہے کہ سلطان محمود پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ ایاز کے اندر کون سی خوبی ہے جس کی وجہ سے حضور اس قدر چاہتے ہیں بادشاہ نے کہا کہ کسی موقع پر دکھلا دیں گے کہ کیا بات ہے۔ ایک روز ایک بڑا بیش قیمت موتی خزانہ سے دربار میں منگایا گیا اور وزیر اعظم کو حکم دیا کہ اس کو توڑ ڈالو وزیر اعظم سمجھا کہ بادشاہ کو شاید خلل دماغ ہو گیا ہے جو ایسے در بے بہا کو توڑنے کا حکم دیتے ہیں۔ ادب سے عرض کیا کہ حضور اس حکم پر نظر ثانی فرمایئے ایسا در شہوار پھر نہ ملے گا۔ اس کے بعد دوسرے وزیر کو حکم دیا اس نے خیال کیا کہ جب وزیر اعظم نے نہیں توڑا تو میری کیا شامت آئی ہے۔ میں تو پھر بھی عقل میں کم ہوں غرض اس نے بھی عذر کیا سب نے اسی طرح عذر کر دیا۔ سب کے بعد ایاز کو حکم دیا کہ ایاز اس کو توڑ ڈالو کہا حضور بہت اچھا ایک پتھر نیچے رکھا اور ایک اوپر سے مارا چکنا چور کر دیا۔ بادشاہ نے ایاز کی طرف نظر تادیب سے دیکھ کر فرمایا کہ یہ کیا حرکت کی ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ قصور ہوا بادشاہ نے حاضرین سے کہا کہ بس یہ ادا ہے جس کی وجہ سے میں اس پر مرتا ہوں۔ وزراء نے ایاز سے کہا کہ تجھ کو کیا سوجھی تھی کہ ایسے در نایاب کو تو نے ریزہ ریزہ کر دیا۔ ایاز نے کیا اچھا جواب دیا کہ ارے ظالمو! میں نے تو موتی ہی توڑا ہے تم نے شاہی حکم کو توڑا میرے نزدیک حکم شاہی موتی سے ہزار درجہ بہتر ہے:

نقض حکم از کسر در شہوار تر   لاجرم بستم بامراد کمر

پس اولئک العصاۃ (یہ لوگ نافرمان ہیں) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا یہ فرمایا کہ بتلاؤ ہمارا حکم زیادہ ہے یا تمہارا؟ تمہارے روزہ افطار نہ کرنے سے معلوم ہوا کہ تم ہمارے حکم کو اپنے روزہ سے کم سمجھتے ہو۔

معارف ۔

اس مقام پر طالب علموں کو ایک سخت شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ ظاہر ہے کہ افطار کرنے کا حکم وجوبی تھا نہیں! پھر اولٰئک العصاۃ کیوں فرمایا' عصیان تو ترک واجب سے لازم آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض چیزیں ظاہر میں مباح ہوتی ہیں لیکن چونکہ منشا ان کا برا ہوتا ہے اس لیے وہ شدید ہو جاتی ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کھول ڈالا اور بعض نے نہ کھولا تو ان کے ذہن میں یہ تھا کہ روزہ رکھنا افضل ہے اور جب یہ سمجھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرتکب جانا ترک اولیٰ کا۔ پس من وجہ اپنے فعل کو اولیت کے درجہ میں گمان کیا اور نہایت سخت امر ہے پس اے مجاہدہ کرنے والو! ترک لذات کے اندر اپنے نفس کو خوب ٹٹولو اگر اس ترک کو تم افضل عند الخلق سمجھ کر کرتے ہو تو یاد رکھو یہ اندرونی مرض ہے اور اس کا منشاء حب جاہ ہے اور اگر افضل عند الخالق سمجھتے ہو تو بدعت ہے اور اگر ترک کو افضل اور قربت نہیں جانتے بلکہ یہ جانتے ہو کہ ہم بیمار ہیں اور بیمار کو جیسے پرہیز کرنا لازم ہے ایسے ہی ہم بھی ان لذات کو ترک کرتے ہیں تو مبارک ہو اس کا کچھ حرج نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ ان چیزوں کے ترک کو بزرگی اور تقدس مت سمجھو! ہاں معالجہ کے واسطے لذائذ کو ترک کرنے کا مضائقہ نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

لقمہ ونکتہ است کامل را حلال   تو نہ کامل مخوری باش لال

تو صاحب نفسیا ے غافل میاں خاک و خوں می خورد

کہ صاحب دل اگر زہرے خوردآں انگبیں باشد

پس یہ نہ سمجھو کہ خربوزہ اور آم میرے قابل نہیں ہیں میری شان ان سے ارفع ہے اگر یہ سمجھ کر کسی نے خربوزہ چھوڑا ہے تو وہ خر اور بز ہے اور آم چھوڑا ہے تو عام ہے خواص میں سے نہیں بلکہ یہ سمجھو کہ میں ان نعمتوں کے قابل ابھی نہیں ہوا۔ میں مرض میں مبتلا ہوں حکیم جی نے مجھ کو ان چیزوں کا پرہیز بتلایا ہے۔ الحاصل ترک فواکہ ولذات کوئی قربت نہیں ہے بلکہ افضل وسنت یہی ہے کہ سب چیزیں کھایا کرے اگر کوئی کہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک مرتبہ وضو کیا تو چاہیے کہ یہ بھی افضل ہو حالانکہ بالاتفاق تثلیث غسل کا افضل ہونا ثابت ہے۔ جواب یہ ہے کہ وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک مرتبہ وضو بیان جواز کے لیے کیا ہے۔ عادت تو تین تین مرتبہ کی تھی افضل وہی ہے جو عادت ہو اسی طرح ترک فواکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت نہ تھی۔ عادت شریف یہی تھی کہ جو پھل آ گیا کھا لیا اس لیے ترک کو افضل نہ کہا جاوے افضل فواکہ کا کھانا ہی ہوگا۔

بسیار خوری

لیکن اس سے طماع اور اکالین خوش نہ ہوں کہ یہ تو اچھی سنت ہے اور انہماک فی المباحات واللذائذ پر استدلال نہ کریں جیسے کسی اکال کی حکایت ہے کہ پیٹ میں درد ہوا۔ کسی نے ایک دوا دی کہ یہ کھالو کہا کہ اگر اس کی گنجائش ہوتی تو میں دو لقمہ اور ہی نہ کھا تا' بعضے آدمی رمضان شریف میں اس قدر کھاتے ہیں کہ رسید پہ رسید (ڈکار) چلی آتی ہے مگر وہ بس ہی نہیں کرتے' اعتدال ہر شے میں محمود ہے نہ اتنا کم کھائے کہ بھوک سے آنتیں بولنے لگیں اور نہ اس قدر زیادہ کھائے کہ منہ سے نکلنے لگیں' پیٹ سے کچھ کم کھاوے اور خیر پیٹ بھر کھالے تب بھی مضائقہ نہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ بعضے حریص پیٹ بھر کر پھر نیت بھرتے ہیں اور پھر شک رہتا ہے کہ شاید دن میں شام کو بھوک لگ جائے اس لیے رفع شک کے لیے بھی کچھ لقمے کھاتے ہیں۔

تحریم حلال

اور یہاں سے اس حدیث کے معنے بھی سمجھ میں آ گئے ہوں کہ اَلْمُؤْمِنُ یَاْکُلُ فِیْ مِعًی وَّاحِدٍ وَّالْکَافِرُ یَاْکُلُ فِیْ سَبْعَةِ اَمْعَاءٍ[1] یعنی مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے یہ کنایہ ہے قلت اکل اور کثرت اکل سے مطلب یہ ہے کہ مومن کو حرص کم ہوتی ہے اس لیے وہ صرف پیٹ بھرنے پر اکتفا کرتا ہے اور کافر پیٹ بھی بھرتا ہے اور نیت بھی بھرتا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ جو بزرگوں نے کہہ دیا ہے کہ روزہ میں کم کھائے ورنہ روزہ کا فائدہ باطل ہو جائے گا۔ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے نزدیک یہ مجاہدہ میں غلو ہے۔ چنانچہ اس کو کئی بار مفصلاً بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال حق تعالیٰ نے قل من حرم میں ماکولات وملبوسات کی جو اہل مکہ تحریم کرتے تھے اس کا رد فرمایا لیکن یہاں شبہ ہو سکتا تھا کہ گو یہ چیزیں حرام نہیں لیکن باوجود حرام نہ ہونے کے اگر ترک کریں تو شاید مناسب اور مستحب ہو تو اس کو آگے دفع فرماتے ہیں: قُلْ هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ یہ نعمتیں اہل ایمان کے لیے ہیں دنیا میں اس سے معلوم ہوا جب ہمارے لیے تیار کی گئی تو ہم اگر نہ کھائیں گے تو یقیناً یہ مرضی اور غیر پسندیدہ ہوگا۔

دیکھو اگر کوئی میزبان بڑے اہتمام سے مہمان کے لیے کھانے تیار کرائے اور وہ مہمان نہ کھائے تو میزبان ضرور ناخوش ہوگا۔

---

[1] (الصحیح للبخاری ۷: ۹۲' الصحیح لمسلم کتاب الاشربة: ۱۸۲' سنن الترمذی: ۱۸۱۸)

انتفاع طیبات

یہاں پر ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں تو مومن اور کافر سب کے لیے ہیں پھر یہ کیوں فرمایا: هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (یہ اشیاء اس طور پر کہ دنیوی زندگی میں بھی خاص رہیں ایمان والوں کے لیے) اس کا جواب موقوف ہے اس آیت کی ترکیب سمجھنے پر اس آیت کی ترکیب میں بہت سے اقوال ہیں اور ان اقوال ہی کے اعتبار سے تفسیر بھی آیت کی بدلے گی میرے ذہن میں جو اس آیت کی ترکیب و تفسیر آئی ہے وہ یہ ہے خالصتاً حال ہے ہی ضمیر مقدر سے جو ہی ملفوظ کی خبر ثابتۃ میں مقدر ہے اور فاعل ہے ثابتۃ کی اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حال ذی الحال کے لیے بمنزلہ قید کے ہوتا ہے۔ پس یہ تخصیص مومنین کی مطلق انتفاع کے اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ مطلق انتفاع تو عام ہے مومن و کافر سب کو پس یہ تخصیص انتفاع کی اس قید خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (اور قیامت کے روز بھی خالص رہیں) کے لحاظ سے ہے مطلب یہ ہے کہ یہ طیبات جس حال میں کہ کدورات وتبعات و معاقبات قیامت سے خالص ہوں یہ مومنین کے ساتھ دنیا میں مخصوص ہیں اور کفار جو ان سے متمتع ہوتے ہیں وہ معاقبات وتبعات قیامت کے ساتھ مشوب ہیں یعنی مومنین کو ان طیبات کے متعلق کوئی سزا و عتاب نہ ہوگا اور کفار کو ہوگا اور یہ خلوص عن العتاب تو آخرت کے اعتبار سے ہے جو یہاں مذکور ہے باقی مشاہدہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں بھی خالص لذت خالی از کدورت مومنین ہی کے لیے ہے اور کفار کے لیے کدورت سے خالی نہیں گو ان کو اس کدورت کا احساس نہ ہو اور غایت بے حسی سے ان کی ایسی مثال ہوگئی ہے جیسے ایک شخص کو کل مثلاً پھانسی ہوگی آج سلطان وقت کی طرف سے اس کو کھانے پینے کو دیا جارہا ہے اور اس کو خبر نہیں ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور مومنین کی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ ان سے راضی ہے اور ان کو اپنی عطا سے سرفراز فرمارہا ہے۔ پس اب واضح ہوگیا کہ طیبات کو اللہ تعالیٰ نے مومنین ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ پس ترک کرنا ان کا افضل نہ ہوا بلکہ کھانا ہی افضل ہے اور اسی واسطے اس سے پہلے جو كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (کھاؤ اور پیو اور اسراف نہ کرو) ہے اس کے معنی میرے نزدیک یہ ہیں "ولاتسرفوا عن حدود الشرع ای تحریم الحلال" (کھاؤ اور پیو مگر شرعی حدود سے تجاوز نہ کرو یعنی حلال کو حرام نہ کہو) غرض سیاق وسباق دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تنگی نہیں ہے بلکہ توسیع ہے اب کھاؤ پیو اگر حلال کو حرام سمجھو گے تو اسراف ہو جاوے گا مجھ کو اس تفسیر پر بالکل اطمینان ہے اس لیے اسی کو میں نے اپنی تفسیر میں اختیار کیا ہے یہاں تک ذکر تھا ان چیزوں کا جو

حلال تھیں اور وہ لوگ ان کو حرام سمجھتے تھے۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حصر اضافی مراد ہے یعنی اے اہل مکہ وہ اشیاء حرام نہیں جن کو تم حرام کرتے ہو بلکہ میرے رب نے تو وہ چیزیں حرام کی ہیں جن کو تم حلال سمجھتے ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ یہی چیزیں حرام ہیں اور کوئی اور شے حرام نہیں ہے۔

مفتاح سعادات

اور ربی میں عجیب رحمت کا ظہور ہے وہ یہ ہے کہ حرم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اشیاء مرغوبہ نفس کو ہم سے روکتے ہیں تو اس میں محبت کی کمی کا شبہ ہو سکتا تھا جیسے کوئی کہے کہ دیکھو جی ایک روپیہ لینا زیادہ مت لینا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کم ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو حرم فرمایا تو بس بدگمانی معلوم ہوتی ہے ہماری آزادی سلب کی جاتی ہے۔ حالانکہ

بدگمانی کردن و حرص آوری　　　کفر باشد نزد خوان مہتری

پس ربی سے اس کو دفع فرماتے ہیں کہ ارے وہ حرام کرنے والی ایسی ذات ہے جس نے تم کو پالا ہے تمہارا مربی ہے تمہارا وجود نہ تھا وہ تم کو وجود میں لایا ہے تم نہ تھے اور پھر تم پر رحمت فرمائی۔ مولانا فرماتے ہیں:

مانبودیم و تقاضا مانبود　　　لطف تو ناگفتہ مامی شنود

جو ذات ایسی ہو کیا اس پر یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس نے اب شفقت میں کمی کی ہوگی بلکہ شدت محبت ہی سبب ہوا ہے اس تحریم کا جیسے ماں باپ بچے کو بعض مضر چیزوں سے روکتے ہیں۔ بچہ چاہتا ہے کہ ان کو کھائے لیکن ماں باپ جانتے ہیں کہ اگر یہ کھائے گا تو اس کو نقصان ہوگا اور بعض مرتبہ کوئی شے لاتا ہے اور دیتا نہیں تاکہ بچہ روئے اور مانگے اور ضد کرے اس لیے کہ اس کو مانگنا اور ضد کرنا اور رونا دھونا اس کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ بعض اشیاء تو بالکل جائز نہیں فرماتے کہ مطلقاً مضر ہیں اور بعض اشیاء دعا کے بعد دیر میں اس لیے دیتے ہیں کہ جانتے ہیں کہ اگر ہم اپنے بندہ کو جو یہ شے مانگتا ہے ابھی دے دیں گے تو پھر ہم سے یہ مانگے گا نہیں اور ہم کو یاد نہ کرے گا تم تو اس کو باعث غم و رنج جانتے ہو حالانکہ یہ غم ہزاروں خوشیوں کی کنجی ہے اسی گریہ کی نسبت مولانا فرماتے ہیں:

اے خوشا چشمے کہ آں گریان اوست　　　اے خوشا آں دل کہ آں بریاں اوست

یہ رونا ہی سبب ہو جائے گا ہنسی کا رونے کی برکت میں اہل سیر نے ایک حکایت لکھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک پتھر کو دیکھا کہ رو رہا ہے آپ نے اس سے وجہ پوچھی اس نے کہا کہ جب سے مضمون "وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (دوزخ کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں) سنا ہے تب سے یہ حال ہے آپ نے یہ دعا کی کہ یہ پتھر جہنم میں نہ جائے وعدہ ہو گیا۔ آپ نے بشارت دیدی وہ تھم گیا چندروز کے بعد جو اس پر گزر رہوا تو پھر روتا ہوا پایا' پوچھا اب کیا ہوا' کہنے لگا کہ آپ کی تشریف

براری کے بعد خیال آیا کہ جب رونا ایسی پسندیدہ چیز ہے جس کی برکت سے یہ دولت ملی تو ایسی چیز کو کیوں چھوڑا جاوے اور معلوم نہیں کہ کیا کیا دولت مل جاوے گی۔ صاحبو! ہماری سمجھ تو پتھر سے بھی کم نکلی۔ یاد رکھو حزن و غم بہت پسندیدہ حال ہے اس لیے کہ یہ مفتاح ہے بہت سعادت کی۔

رو رو کر مانگنا اور تنکنا حق تعالیٰ کو پسند ہے۔ حدیث شریف میں ہے: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُلْحِیْنَ فِی الدُّعَاءِ[1] (بلاشبہ اللہ تعالیٰ رو رو کر دعا مانگنے والوں کو پسند کرتے ہیں) اور جو کسی کافر وغیرہ کو دیکھو کہ اس کا مانگا ہوا جلدی جلدی مل جاتا ہے تو وہاں یہ علامت ہوتی ہے عدم مقبولیت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو اس کا مانگنا پسند نہیں آیا اس لیے جلدی سے دے کر ٹال دیا' دیکھو اگر تمہارے دروازہ پر کوئی سائل آتا ہے تو اس کی آواز اگر کانوں کو بری معلوم ہو تو کہو گے کہ اس کو جلدی دے کر ٹالو اور اگر کوئی خوش آواز یا کوئی حسین محبوب ہے تو نہ ٹالو گے اور نہ دو گے کہ اچھا ہے کچھ دیر اور کھڑا رہے تا کہ اس کی آواز کانوں میں آوے۔ پس حق تعالیٰ کے یہاں سے غیر مقبول کو جلدی کسی شے کا مل جانا یہ علامت ہے۔ اس کی کہ مقصود یہ ہے کہ اس کو جلدی دربار سے نکالو اور مقبول کو بدیر ملنا علامت اس کی ہے کہ اس کی گریہ وزاری پسند ہے خوب سمجھ لو حق تعالیٰ کا نہ دینا یا دیر میں دینا اس کا منشاء مومن میں محبت ہے۔

پس اگر باوجود مانگنے کے کوئی شے بالکل نہ ملے تو سمجھ لو کہ وہ شے تمہارے مناسب نہیں اس لیے نہیں ملی۔

آنکس کہ تو نگرت نمی گرداند   او مصلحت تو از تو بہتر داند

ایسی طرح جن اشیاء کی تشریعاً تحریم فرمائی ہے وہ ہمارے لیے مضر ہے۔

تفسیر آیت: اب آگے آیت میں چند چیزیں مذکور ہیں جن پر تحریم وارد ہوئی ہے (۱) فواحش (۲) اثم (۳) بغی (۴) شرک (۵) اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ" (کہ تم اللہ کے ذمہ وہ بات لگاؤ جو تم نہیں جانتے) ظاہر میں تو یہ پانچ قسمیں ہیں لیکن جیسے اوامر کی تین قسمیں تھیں واقع میں یہ پانچ بھی تین قسموں کی طرف راجع ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اوامر میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کل تین قسمیں ہیں۔ عقائد' حقوق اللہ' حقوق العباد۔ یہاں بھی یہی قسمیں ہیں۔ فواحش ماظہر ہوں یا باطن ہوں اثم میں داخل ہیں اور اثم کا اطلاق اعمال متعلقہ دیانت پر زیادہ آتا ہے اس لیے یہ حقوق اللہ ہوئے یعنی ان کا ارتکاب کرنے سے اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اور بغی کے معنی کسی پر ظلم کرنا ہے۔ یہ حقوق العباد کی طرف ارشاد ہے اور ان تشرکوا میں ان کے عقائد فاسدہ آ گئے۔ باقی فواحش کو جداگانہ لائے۔ حالانکہ الاثم کے اندر داخل ہے اس لیے کہ خصوصیت مقام اور سبب نزول اس کو مقتضی ہے اور نیز اسی اہتمام کی وجہ سے اس کی تقسیم بھی فرمائی۔

مَاظَھَرَ مِنْھَا وَمَابَطَنَ (ان میں جو علانیہ ہوں وہ بھی اور ان میں جو پوشیدہ ہوں وہ بھی)

---

[1] (فتح الباری لابن حجر ۱۱: ۹۵' الدر المنثور ۵: ۳۵۶' الکامل لابن عدی ۷: ۲۶۲۱)

مَاظَھَرَ (ان میں جو علانیہ ہوں) میں تو کھلی بے حیائی داخل ہے جیسے برہنہ رہنا اور برہنہ طواف کرنا اور مابطن (ان میں جو پوشیدہ ہوں) میں بے حیائیاں ہیں جو چھپ کر کرتے تھے جیسے زنا کرنا اور اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ" (کہ تم اللہ کے ذمہ وہ بات لگاؤ جو تم نہیں جانتے) کا منشا بھی فساد عقیدہ ہے اس لیے یہ بھی حکما ان تشرکوا میں داخل ہے یہ تو تفسیر ہے۔ الفاظ آیت کی اس آیت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے سب قسم کے گناہ اور سب زمانوں میں حرام فرمائے ہیں۔ رمضان شریف کی کوئی تخصیص نہیں مگر فرق اتنا ہے کہ رمضان المبارک میں حرمت اور زیادہ بڑھ جائے گی جیسے کہ شرف مکان وزمان سے نیکی کا ثواب بڑھ جاتا ہے اسی طرح گناہ کے اندر بھی شدت زیادہ ہو جاتی ہے۔ پس چاہیے تو یہ کہ تمام گناہوں سے بچیں لیکن بالتخصیص بعض ان گناہوں کو ذکر کرتا ہوں کہ جن میں ابتلا زیادہ ہے اور ان گناہوں کو بھی نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں تو ہلکا جانتے ہیں۔ ایسے گناہ کے افراد تو زیادہ ہیں مگر چند کلیات عرض کرتا ہوں۔ انشاء اللہ سب افراد اس میں آ جاویں گے۔

نگاہ کی خرابی

ان میں سے بڑا بھاری گناہ جس کو لوگ ہلکا سمجھتے ہیں نظر کا گناہ ہے اور بھاری میں نے اس کو باعتبار آثار کے کہا اس کی ایسی مثال ہے جیسے گھڑی کے اندر بال کمانی ہوتی ہے کہ دیکھنے میں تو چھوٹی سی شے ہے لیکن سارا چرخہ گھڑی کا اسی پر چلتا ہے۔ اسی طرح آنکھوں سے جو شعاعیں نکلتی ہیں وہ بال کمانی سے بھی زیادہ باریک ہیں لیکن قلب جو سلطان جسم ہے اسی پر چلتا ہے پھر قلب پر تمام چرخہ جسم کا حرکت کرتا ہے۔ یہ آنکھیں تمام امراض کی جڑ ہیں اور اسی کو لوگ ہلکا سمجھتے ہیں عام عادت ہو گئی ہے مطلقاً اس سے پرہیز نہیں جس کو چاہا گھور لیا جس کو چاہا تاک لیا اصل گناہ زنا اور لواطت بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے اگر کوئی کہے کہ نگاہ پر مدار ہوتا ہے تو اندھے زنا نہ کیا کرتے۔ صاحبو! اندھے بھی اسی کی بدولت مبتلا ہوتے ہیں آواز سن کر تصور کرتے ہیں کہ یہ لڑکا یا عورت خوبصورت ہوگا تو ان کے دل میں بھی یہی تصور اول ہوتا ہے کہ اس میں جو دیکھنے کی چیز ہے وہ ایسی ہوگی اگر لمس سے عاشق ہوتے تو روئی بہت نرم ہوتی ہے اس پر کیوں عاشق نہیں ہوتے۔ پس گو ان کے اندر ظاہری نگاہ نہیں ہے مگر دل کی نگاہ تو ہے اسی سے وہ کام لیتے ہیں پس اب میرا دعویٰ صحیح ہوگا کہ جب خرابی ہوتی ہے نگاہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ بازار میں آدمی چلا جا رہا ہے اور کوئی آواز آئی تو اس کی طرف نگاہ خوبصورتی کے گمان سے اٹھتی ہے اور اگر یہ معلوم ہو کہ بدصورت ہے تو کبھی اس کی طرف نہ دیکھے۔ پس یہ نگاہ کیا ہے دلال معاصی ہے اسی واسطے حق تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے حفظ فروج کے امر سے پہلے "یغضوا من ابصارھم" (اپنی آنکھوں کو پست رکھیں) فرمایا۔ اصل مقصود تو حفظ فروج ہی ہے محض بصر اس کا طریقہ ہے اور کیا رحمت ہے حق تعالیٰ کی فروجہم میں من تبعیضیہ نہیں لائے اور ابصارھم میں لائے اگر یغضوا ابصارہم فرمادیتے تو جو مطیعین ومحبین ہیں وہ تو عمر بھر کسی کی طرف دیکھتے ہی نہ

سکتے خواہ ان کے سامنے کچھ ہی آجاتا جس سے وہ ٹکرا کر چوٹ کھاتے گرتے پڑتے اور اس میں ظاہر ہے کہ دقت اور پریشانی ہوتی اور جن کو ہمت کم ہے یا نہیں ہے وہ اپنی حفاظت کے لیے ادھر ادھر کی چیزوں کو دیکھتے اور اس میں عورتوں وغیرہ پر بھی نظر پڑتی۔ گو قصداً شہوت نہ ہوتا مگر تب بھی نفس نظر ہی سے گناہ ہوتا کیونکہ تقدیر یہ ہے کہ من نہ ہونے سے علی الاطلاق غض بصر واجب ہوتا ہے۔

اچانک نگاہ

اور اسی طرح گنہگار ہوتے اس لیے من ابصارھم فرمایا مطلب یہ ہے کہ بعض نگاہیں نیچی رکھیں یعنی وہ نگاہ جو قصداً نامحرم کی طرف ہو اس سے نظر فجاءۃ مستثنیٰ ہوگی۔ مثلاً دیکھا تھا یہ خیال کر کے کہ ہمارا بھائی آ رہا ہے اور اتفاق سے کسی عورت پر نگاہ پڑ گئی تو اس کا گناہ نہ ہوگا۔ اب گناہ وہی نگاہ ہوئی جو قصد کر کے نامحرم پر ہو بلا قصد معصیت نہ ہوئی حالانکہ عقلاً جرائم کی شان یہ ہے کہ خواہ کسی طرح ہو جرم ہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ حقوق العباد میں اس کا اعتبار بھی کیا گیا ہے اگر کسی سے کسی کا مثلاً بلا قصد گلاس ٹوٹ گیا تو دام دینے پڑیں گے۔ اسی طرح آپ کے مقدمات متعارف میں جرم خواہ کسی طرح صادر ہو جرم ہی ہے۔ پس اسی قیاس کے موافق اگر نظر فجاءۃ کو بھی جرم قرار دیتے تو دے سکتے تھے لیکن یہ رحمت ہے کہ اس کو جرم قرار نہیں دیا اس لیے کہ یہ خود ان کا حق ہے وہ اگر معاف کرے تو ہو سکتا ہے یہ اعتدال ہے شریعت مقدسہ کا کوئی ایسا قانون دکھلائے تو جس میں ایسی رعایت اور ایسا اعتدال اور حسن ہو۔ خدا کی قسم ہے شریعت کا وہ حسن و جمال ہے کہ بے اختیار یہ شعر زبان سے نکلتا ہے:

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

علاج بدنظری

اگر کوئی کہے کہ نظر فجاءۃ کو اگر حرام قرار دیا جاتا تو یہ عقل کے خلاف تھا اس لیے کہ یہ اختیار میں نہیں اگر مزید احتیاط کرے تو اس سے بھی بچ سکتے ہیں اور قابل بچنے کے تو یہ بھی کافی ہے اس لیے کہ گو اس میں گناہ نہیں لیکن علت اور روگ لگنے کے لیے تو یہ بھی کافی ہے۔ مبتلا دل تھا ہاتھ سے نکل گیا تو باوجود اس کے اندر گناہ اور مواخذہ نہیں تو وجہ اس کی یہ ہے کہ اس معافی میں ہمارا علاج ہے وہ یہ ہے کہ جب بندہ کو نظر فجاءۃ سے کسی کی طرف میلان ہو گیا اور ارادہ ہوا کہ اس کے ملنے کی کوشش کریں ادھر اس کے ذہن میں یہ بھی مضمون ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ میری نگاہ قابل مواخذہ کے تھی مگر اس پر اللہ تعالیٰ نے مواخذہ نہیں فرمایا تو اگر کچھ عقل درست ہے تو سمجھے گا کہ اللہ اکبر کس قدر عنایت و رحمت ہے کہ میں نگاہ سے متمتع بھی ہوا اور یہ کرم کہ مواخذہ نہیں فرمایا۔ اس مضمون میں اور زیادہ غور و خوض سے کام لے گا تو جب حق کا اس قدر غلبہ ہوگا کہ ندامت سے پانی پانی ہو جائے گا اور غیر کا خیال تک نہ رہے گا۔ ہاں!

اگر حب حق کو غالب نہ کرے اور فکر سے کام نہ لے تو اس کا کچھ علاج ہی نہیں ورنہ اگر ذرا عقل سے کام لے تو معلوم ہو کہ یہ بیماری جو ہمارے تمہارے اندر ہے اس کا علاج اور شفا بھی ہمارے ہی اندر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

فداء ک فیک و ما تبصر دواء ک منک وما تشعر

وانت الکتاب المبین الذی باحرفه یظهر المظهر

انسان ایک عجیب شے ہے۔ اسی واسطے حکماء نے اس کا نام عالم صغیر رکھا ہے غرض اس تصور میں یہ اثر ہے کہ اس روگ سے شفا ہو جاوے گی پس اس میں مواخذہ نہ فرمانے میں بڑا اچھا علاج ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

درد از یارست و درماں نیز ہم دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

پھر جس شے کا یہ طالب ہے یعنی حسن اس کا مخزن بھی تو محبوب حقیقی اور جمیل حقیقی ہے جیسے شعر مذکور کے بعد دوسرا شعر ہے:

آنچہ می گویند آں بہتر زحسن یارما ایں دارد و آں نیز ہم

اگر حسن ہی پر فریفتگی ہے تو حسن کا خزانہ اور معدن اصلی بھی وہی ہیں۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ پس بچشم عاشقاں خود راتما شا کردۂ

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ما سوا حق تعالیٰ شانہ کے سب حادثات ہیں اور مظہر ہیں ذات پاک قدیم کے پس ان حوادث کے تمام صفات بھی مظہر ہیں صفات ذات قدیم کے اور ان کے حسن و جمال کی مثال جمیل حقیقی کے سامنے ایسی ہے جیسے دیوار کہ نور آفتاب سے منور ہو جاوے۔ پس اگر کوئی نادان اس دیوار کو منور جان کر اس پر عاشق ہو جاوے تو یہ اس کی نادانی ہے اس کو خبر نہیں ہے کہ یہ نور اس کا محض مستعار ہے جو عنقریب معدن اس نور کا یعنی آفتاب اس کو اپنے ساتھ لے جاوے گا ایسے حسینان عالم کا حسن مجازی اور مستعار ہے۔ یہی حسین جن کے حسن پر لوگ فریفتہ ہیں اگر بیمار ہو جاویں یا ان کا سر منڈا دیا جائے تو وہ حسن مبدل بہ قبح ہو جاتا یا بیمار نہ ہوں لیکن موت سے تو چارہ ہی نہیں موت کے بعد یہ حسن کہاں چلا جاتا ہے جس کا تھا اس نے لے لیا پس یہ حسن مجازی تو محض ملمع ہے عاقل سے بہت بعید ہے کہ اس حسن پر فریفتہ ہو اور اصلی حسن سے غافل ہو مولانا اسی عشق کی نسبت فرماتے ہیں:

عشق با مردہ نباشد پائیدار عشق را با حی و با قیوم دار

غرق عشقے شو کہ غرق است اندریں عشقہائے اولین و آخریں

یہاں شبہ ہو سکتا تھا کہ ہم کو اس بارگاہ تک کیسے رسائی ہو سکتی ہے۔ مولانا اس کا جواب دیتے ہیں:

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست   با کریماں کارہا دشوار نیست

یعنی ہم کو تو بیشک وہاں رسائی ممکن نہیں ہے لیکن ان کو تو دشوار نہیں ہے وہ جب چاہیں کچھ بھی مشکل نہیں چنانچہ چاہتے بھی ہیں لیکن اس قید سے چاہتے ہیں کہ یہ بھی چاہیں تو تم چاہ کر دیکھو۔ امتحان ہی کے طور پر چاہ کر دیکھ لو! لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بھائی یہ تو ان لوگوں کا کام ہے جو دنیا سے بالکل منقطع ہو جاویں اور دنیا کے کام کے نہ رہیں۔ یاد رکھو یہ شیطانی شبہات ہیں۔ الحاصل اگر تم ایسے ہی حسن پرست ہو تو وہاں تو حسن بھی موجود ہے۔ بہرحال یہ علاج ہوا اس بلا کا جو اس نظر سے پیدا ہوئی تھی۔ پس ایسی ذات رحیم سے علاقہ قطع نہ کرو اور غیر پر نظر نہ ڈالو

عشق امرد

اور سینکڑوں جگہ تو آدمی بے لذت گناہ ہی کرتا ہے اور پہلی نگاہ تو چونکہ اچانک پڑی تھی اور ناتمام دیکھا گیا اس لیے ممکن ہے کہ وہ حسین نظروں میں بھلا معلوم ہوا اور دوسری قصداً دیکھنے میں تو ممکن ہے کہ خیال کے خلاف نکلے اور ایسا بہت ہوتا ہے جیسا کسی نے کہا:

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد   چوں باز کنی مادر مادر باشد

تو خواہ مخواہ گناہ بھی ہوا اور کچھ لذت بھی نہ آئی بلکہ اور الٹی کدورت ہوئی اور اگر پہلے سے اچھا نظر آیا تو اور زیادہ حسرت ہوئی اس لیے کہ جو نظر آوے اس کا مل جانا تو ضروری نہیں اکثر بلکہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ ملتا نہیں اور پہلی نظر یعنی نظر فجاءۃ ہم خرما و ہم ثواب کا مضمون رکھتی ہے بس اب دوسری مرتبہ نظر نہ ڈالو ایسا نہ ہو کہ باوجود گناہ کے کچھ لذت نہ آئے یا حسرت زیادہ ہو جائے اور پہلی نظر سے اگر کوئی روگ پیدا ہو تو اس کا علاج یہ فرمایا کہ گناہ نہیں لکھا اس لیے کہ انسان کی طبعی بات ہے کہ خوف سے اس کو اتنا تعلق اطاعت نہیں ہوتا جس قدر کہ محبت سے ہوتا ہے۔ پس اس عنایت کا مقتضاء یہ ہے کہ اب نگاہ نہ کرو۔

دوسری بات یہ ہے کہ جن چیزوں کی حق تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے ان میں علاوہ دینی خرابی کے دنیوی مصیبت بھی تو ہے اس نظر ہی کو دیکھ لیجئے کہ اس سے جو خرابی اور مرض پیدا ہوتا ہے آدمی کو کسی حالت میں چین نہیں ہوتا ہر وقت پریشانی میں رہتا ہے۔ پھر جن پر یہ مرتا ہے وہ بھی بے وفائی کرتے ہیں:

وفاداری مدار از بلبلاں چشم   کہ ہر دم بر گلے دیگر سرایند

یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ یہ بے وفائی کرتے ہیں گویا زبان حال سے کہہ رہے ہیں ہم قابل جی لگانے کے نہیں ہیں علاوہ اس کے ایک اور اس بدنگاہی کی خرابی ہے وہ یہ کہ بدنگاہ آدمی کے اندر قوت نہیں ہوتی اور نہ اس کا رعب ہوتا ہے۔ بالخصوص اس شخص پر تو ہوتا ہی نہیں جس پر نگاہ

کی ہے ہر طرح کی معترتیں ہی معترتیں ہیں خصوصاً لڑکوں کو بری نظر سے دیکھنا اور ان سے تعلق رکھنا یہ تو بہت ہی اشد ہے اس لیے کہ عورتوں سے بچاؤ کے تو بہت سے سامان موجود ہیں۔ اول تو عورتیں خود مردوں سے بچتی ہیں دوسرے بدنامی کا اندیشہ جانبین کو لگا رہتا ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ پردہ میں رہتی ہیں غرض ان سے ملنے کے لیے بہت سے سامان موانع کو اٹھانا پڑتا ہے بخلاف لڑکوں کے کہ وہ پردہ میں نہیں رہتے اور ان سے بات چیت کرنے' ملنے جلنے میں بدنامی نہیں ہے اور چونکہ عقل نہیں ہوتی اس لیے بھولے پن سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اوپر ان کو بزرگانہ عنایت ہے شاذ و نادر کسی کو صحیح ادراک ہو جاتا ہے۔ ہمارے مدرسہ میں ایک گاؤں کا لڑکا تھا' تہجد گزار نورانی شکل ہم اس کو مثل اور لڑکوں کے معمولی لڑکا سمجھتے تھے۔ ایک شخص کو اس کی طرف کچھ خیال ہو گیا وہ اس سے کچھ باتیں کیا کرتے' ایک روز اس لڑکے نے اس شخص سے یہ بات کہی کہ جب تم مجھ سے بات کرتے ہو تو میرے دل میں کدورت ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نگاہ میری طرف اچھی نہیں۔ وہ شخص بھی تھے سچے کہا کہ بھائی واقعی بات تو یہ ہے بچی' اب انشاءاللہ تعالیٰ میں اپنے کو روکوں گا۔ اس لڑکے نے نہایت سمجھ کی بات کہی اور اس سے معلوم ہوا کہ اس کا قلب بہت صاف تھا ورنہ لڑکوں کو کیا پہچان ہوتی ہے کہ یہ شخص ہم سے کس قدر ملتا اور ان کے سرپرستوں کو کچھ شبہ ہوتا ہے۔ غرض لڑکوں میں تمام اسباب خرابی کے مہیا ہیں۔

دوسرے اشد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ معترتیں حلت کا محل تو ہیں اور عجیب رحمت ہے کہ جو محارم ہیں کہ محرمات ابدیہ ہیں اور کبھی حلت کا محل نہیں ہوتی وہاں حق تعالیٰ نے باستثنائے زمانہ ابتدائے آفرینش نوع انسان کے کہ اس وقت فطری ضرورت تھی پھر ایک حاجب قدرتی یعنی تنفر پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ عام طبائع کا یہی مقتضا ہے باقی جو انسانیت ہی سے خارج ہو کر بہائم میں داخل ہو جاوے اس کا ذکر ہی کیا۔ چنانچہ مجوسیوں کے یہاں حقیقی بہن بھائی میں نکاح کی عادت ہے۔ کم بخت کیسے خبیث الطبع اور بے حس ہیں۔ ایک ضلع یہاں قریب ہے وہاں ایک شخص نے اپنی علاتی بہن سے نکاح کر رکھا ہے اور اس سے ایک جوان لڑکا بھی ہے اور باوجود اس شدید گناہ میں مبتلا ہونے کے اس کی تاویل کرتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ "واخواتکم" میں اخوت عینیہ مراد ہیں اسی واسطے ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت نہیں ہے باقی جو محرم ہیں وہ تو ممکن ہے کہ نکاح سے اس وقت ان میں محل آ جانے غرض عورتیں فی نفسہ محل صالح تو ہیں حق تعالیٰ نے ان کو بشرائط خاصہ پیدا ہی کیا ہے تمتع کے لیے اور لڑکوں میں تو کسی وقت بھی اس کا احتمال نہیں۔ حتیٰ کہ جنت میں سب تمتعات ہوں گے مگر یہ فعل خبیث نہ ہوگا۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ بعض عربی عبارتوں میں لکھ دیا ہے کہ جنت میں یہ فعل ہوگا۔ یہ قول بالکل غلط ہے۔ پس ان وجوہ سے لڑکوں کا فتنہ اشد ہے۔

حجاب امارد

مجھ کو ایک مرتبہ یہ شبہ ہوا تھا کہ جب لڑکوں میں احتمال فتنہ کا زیادہ ہے اور عورتوں میں کم تو باوجود اس کے جب عورتوں کو پردہ کرایا گیا ہے تو لڑکوں کو بطرق اولیٰ پردہ میں رکھنا چاہیے۔ کئی سال یہ شبہ میرے قلب میں رہا لیکن بحمد اللہ اس کا جواب سمجھ میں آ گیا۔ اس جواب کی بھی تقریر کرتا ہوں شاید کسی کو شبہ ہو تو صاف ہو جاوے۔ اول اس جواب کے سمجھنے کے لیے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے عورتوں کو امور خانگی اور نسل بڑھنے کے لیے پیدا فرمایا ہے اور مردوں کو مصالح ملکی مثل زراعت تجارت وقضا وامارات اور نیز مصالح خاصہ دینی مثل امامت، جمعہ واعیاد و نبوت وارشاد وغیرہا کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسی واسطے سنت الٰہیہ یہی رہی کہ عورت نبی نہیں ہوئی۔ یوں قدرت ظاہر کرنے کے لیے کسی عورت کو نبی بنا دیا ہو وہ دوسری بات ہے لیکن نبوت کے متعلق جو کام ہیں وہ کسی عورت سے نہیں لیے گئے اور نہ عورت سے ہو سکتے ہیں ان کو مرد ہی کر سکتے ہیں۔

اسی سنت پر حضرات مشائخ نے عمل کیا ہے کہ مردوں ہی کو خلیفہ بنایا ہے، عورت اگرچہ صاحب نسبت اور قابلیت اس کی رکھتی ہو لیکن اس کو خلافت کسی نے نہیں دی اور اسی میں مصلحت ہے گو اس زمانہ میں لوگ اس فکر میں ہیں کہ عورتوں کو مردوں کے برابر سمجھا جائے اور جہاں اس پر عمل شروع ہو گیا ہے وہ خود اس سے پریشان ہیں اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ عورتیں جن مصالح کے لیے پیدا کی گئی ہیں وہ مصالح پردہ میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ اکتساب کمالات کا زمانہ بچپن کا ہے۔ پس اگر لڑکوں کو پردہ میں رکھا جائے تو کمالات مختصہ بالرجال سے وہ محروم رہیں گے اور یہ سبب ہوگا اخلال تمدن ومصالح ضروریہ کا اس لیے ان کو تو اجازت آزاد پھرنے کی دی گئی اور عورتیں جن مصالح کے لیے موضوع ہوئی ہیں وہ پردہ میں رہ کر بھی حاصل ہو سکتے تھے بلکہ پردہ میں رہ کر خوبی کے ساتھ ان کی تحصیل ہو سکتی تھی اس لیے ان کو یہ آزادی نہیں دی گئی۔

آزادی نسواں

آج کل لوگ اس کوشش میں بھی ہیں کہ پردہ مروجہ اٹھا دیا جاوے اور عورتیں کھلے مہار آزادی سے فٹن پر بیٹھ کر گھوما کریں اور اس کو بے پردگی نہیں جانتے حالانکہ یہ سخت بے حیائی ہے۔ باقی میں اس کو بے پردگی نہ کہوں گا جو غریبوں کی عورتیں منہ چھپا کر گھونگھٹ نکال کر میلے کچیلے کپڑوں میں شرم وحیا کے ساتھ اپنے کسی کام کے لیے باہر نکلتی ہیں اس لیے جو روح ہے پردہ کی ان کو حاصل ہے اور یہاں سے ان متکبرین کا جواب بھی نکل آیا جو علماء سے غرباء کی نسبت تحقیراً پوچھا کرتے ہیں۔ کیوں صاحب ان جولاہوں تیلیوں کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں باہر پھرتی ہیں اور ہماری عورتیں پردہ

کرتی ہیں کیا ان کے پیچھے ہماری نماز ہوجاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کی عورتیں پردہ کرتی ہیں گو باہر نکلتی ہیں اور تمہاری عورتیں پردہ نہیں کرتی ہیں گو گھر میں بیٹھتی ہیں۔ چنانچہ چچازاد بھائی 'نندوئی' دیور' جیٹھ پھوپھی زاد' ماموں زاد بھائی سب کے سامنے آتی ہیں اور سامنے بھی آتی ہیں ایسی صورت سے کہ بنی ٹھنی مانگ نکال رکھی ہے' مسی کی دھڑی جمی ہوئی ہاتھوں میں کڑے چھڑے' چوڑیاں ہیں' گوٹے ٹھپے کے کپڑے ہیں اور بالکل بے محابا آتی ہیں اور پھر غضب یہ ہے کہ ان کے ساتھ ہنسی دل لگی بھی ہوتی ہے پھر کس منہ سے کہتے ہیں کہ ہماری عورتیں پردہ میں رہتی ہیں ہاں اتنا فرق ہے کہ تمہاری عورتیں گھر میں بیٹھ کر بجی سجائی نامحرموں کے سامنے آتی ہیں اور غریبوں کی عورتیں میلی کچیلی منہ چھپا کر اپنی ضرورت کے لیے حیاء کے ساتھ باہر پھرتی ہیں۔ پس یہ بے پردگی نہیں ہے بے پردگی بی اے اور ایم اے اور ایف اے پاس عورتوں کی ہے کہ کھلے منہ مردوں کی طرح آزادی سے بوٹ سوٹ سے آراستہ پھرتی ہیں۔

نئی تعلیم کا اثر

ایک شخص تعلیم یافتہ اپنی بیوی سے کہتے تھے کہ کاش وہ دن ہو کہ میں ہوں اور تم ہو اور ٹھنڈی سڑک پر ہاتھ میں ہاتھ لے کر گھومیں' یہ اثر ہے اس نئی تعلیم کا۔ مومن ہو یا کافر حیا سب کے اندر ہے لیکن اگر نہیں ہے تو اس نئی تعلیم میں نہیں ہے ایک شخص نے بیان کیا کہ ایک لڑکا نو تعلیم یافتہ ہے وہ اپنی بیوی سے نفور ہے اور اس کے عزیزوں میں کوئی لڑکی ہے وہ ایم اے پاس ہے اس سے اس کا تعلق ہے اور اس لڑکی کا بھی میلان اس کی طرف ہے اور اس لڑکی کے ماں باپ نے جو شادی کرنا چاہا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور یہ کہا کہ ہم اپنی مرضی کا ڈھونڈھیں گے جس کا ہم نے تجربہ کر لیا ہو۔ جناب یہ نتیجہ ہے اس آزادی اور تعلیم جدید کا جن عورتوں کی یہ حالت ہو بتلایئے وہ کیا مصالح خانگی کو انجام دے سکیں گی۔ اگر خاوند بیمار ہو تھکا ہو وہ کیا پاؤں دبائیں گی یا بچوں کی خدمت کریں گی۔ ہاں بس اس کام کی ہیں کہ اولاد جنا کریں گے بلکہ اگر کوئی مشین جننے کی ایجاد ہو تو یہ اس سے بھی آزاد ہو جائیں اور یہ کہہ دیں کہ کیا ہمارا پیٹ فٹن ہے جو ہم بچہ کا بوجھ لادے لادے پھریں۔ اب بھی ان سے جس قدر ہو سکتا ہے بچوں سے قطع تعلق رکھتی ہیں' بچہ پیدا ہوا اور کسی عورت کے حوالے کر دیا۔ الحاصل عورتوں کی آزادی اور بے پردگی میں وہ مصالح جن کے لیے عورتیں پیدا ہوئی ہیں حاصل نہیں ہو سکتے ہیں وہ پردہ ہی میں حاصل ہو سکتے ہیں اور پردہ کا مفہوم عام ہے یعنی وہ بھی پردہ ہی ہے جو روز سامنے ہے اور وہ بھی پردہ ہے جو غریبوں کی عورتوں میں ہے' بے پردگی وہ ہے جو آزاد عورتوں میں ہے۔ کما بینا مفصلاً

اور لڑکوں کو اگر پردہ میں بٹھلایا جاوے گا تو ظاہر ہے کہ داڑھی نکلنے تک ان کو پردہ میں رکھا جاوے گا اور داڑھی مثلاً اٹھارہ برس کی عمر میں نکلی اب اس عمر میں وہ کیا کمالات حاصل کریں گے۔

انسداد مفاسد

شریعت کا یہ قاعدہ ہے کہ جس شے کے اندر مفاسد لازم آ دیں تو اگر وہ شے غیر ضروری ہے تو اس شے کو منع کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ شے ضروری ہے تو اس کو منع نہیں کیا جاتا۔ ہاں! ان مفاسد کا انسداد حتی الوسع کر دیا جاتا ہے۔ پس اسی قاعدہ کی بنا پر خروج النساء چونکہ ضروری نہیں تھا اور اس سے مفاسد لازم آتے ہیں اس لیے اس کو روک دیا گیا ہے اور خروج الرجال ضروری ہے اس کو منع نہ کیا جاوے گا۔ ہاں! شہوت پرستوں اور نظر بازوں سے اس کو حتی الوسع بچایا جاوے گا۔ بہر حال مقصود میرا یہ ہے کہ لڑکا ہو یا عورت ہو اپنی نگاہ کو دونوں سے بچانا چاہیے۔ اس نظر کے گناہ کو ہم فواحش میں داخل کر سکتے ہیں۔ ماظہر میں تو عورتوں کے دیکھنے کو داخل کیا جاوے گا اس لیے جو شخص کسی عورت کو دیکھتا ہے اور اس وقت کوئی اس کو دیکھ لے تو وہ سمجھ جاوے گا کہ یہ اس کو گھور رہا ہے اور برا کرتا ہے اگر چہ نظر اس کی پاک ہو اور لڑکوں کے گھورنے کو مابطن میں داخل کر سکتے ہیں اس لیے کہ ان کو دیکھنے والے کو کوئی برا نہیں جانتا۔ اگر چہ بری ہی نظر ہو۔

حقیقت فواحش

اور نظر کے گناہ کو فواحش میں داخل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فاحشہ کہتے ہیں اس بے حیائی کو جس کو آدمی چھپاوے جیسے قتل ہے شراب پینا ہے۔ ان کو آدمی چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہو جاوے اور گناہ نظر بھی ایسا ہی ہے اور یوں تو ہر گناہ بے حیائی ہے چنانچہ اس کی دلیل ہے حق تعالیٰ ازواج مطہرات کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

يَانِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ

"اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو جو کوئی تم میں سے کوئی کھلی ہوئی بیہودگی کرے گی اس کو دگنی سزا نافذ کی جائے گی۔"

فاحشہ کی تفسیر جاننے سے پہلے سننے والے کا ذہن شاید اس طرف منتقل ہو کر فاحشہ سے مراد نعوذ باللہ زنا ہو یا درکھو انبیاء علیہم السلام کی بیبیوں میں اس کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا ہے اس لیے کہ جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَلطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ" (پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں) نبی خود پاک ہوتے ہیں ان کے لیے بیویاں بھی پاک ہی تجویز کی جاتی ہیں۔ ہاں! کسی کسی نبی کی بیبیوں سے کفر ہوا ہے مگر زنا کا صدور ان سے نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اس سے منصب نبوت میں خلل ہوتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ انبیاء جس قدر ہوئے ہیں صاحب جاہ ہوئے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے سب معزز خاندان سے ہوئے ہیں اور حکمت اس میں یہ ہے کہ جو اثر خاندانی آدمی کا قوم پر ہوتا ہے وہ

دوسرے کا نہیں ہوسکتا اور اس کے اتباع سے کسی کو عار نہیں ہوتا اور اگر کسی آدمی کی بیوی زانیہ ہو تو اس سے جاہ میں قدح ہوتا ہے اور اگر نماز نہ پڑھے یا کفر کرے تو اس کو عرفاً بے عزتی کا سبب قرار نہیں دیا جاتا اس لیے فاحشہ سے مراد زنا تو ہو نہیں سکتا بلکہ فاحشہ مبینہ سے مراد ایذا رسانی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس لیے کہ قصہ اس کے نزول کا یہ ہوا تھا کہ ازواج مطہرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خرچ مانگا تھا۔ چنانچہ اول آیتوں میں اس کی تصریح بھی ہے: "اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا" (اگر تم دنیاوی زندگی چاہتی ہو) اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی اور اگر فاحشہ سے مراد زنا ہوتا ہے تو اس کے مقابلہ میں آگے عفت کا ذکر ہوتا ہے حالانکہ اس کے مقابلہ میں یہ ارشاد ہے: "وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" (اور جو کوئی تم میں سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے گی) اور حضور صلی اللہ کی ایذا رسانی کو بے حیائی اس لیے فرمایا کہ ایسے محسن کو تکلیف پہنچانا بے حیائی ہی ہے اس واسطے کہ جس کے حقوق کے بہت سے مقتضی موجود ہوں اس کے حقوق کو ضائع کرنا بے حیائی ہے۔ پس جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کے بہت سے مقتضیات موجود تھے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا بے حیائی ہوئی۔

اور یہاں سے یہ بھی واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے گناہ تو بطریق اولیٰ بے حیائی میں داخل ہوں گے پس ثابت ہو گیا کہ ہر گناہ بے حیائی ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کا اطلاق ان گناہوں پر زیادہ آتا ہے جس کو آدمی چھپاتا ہے۔ بہرحال شہوت کے متعلق جس قدر گناہ ہیں خدا کے لیے ان کو چھوڑ دو! اور رمضان المبارک میں تو ضرور ہی ان سے توبہ کر لو! انشاء اللہ یہ توبہ بعد میں بھی قائم رہے گی۔

غیبت کا گناہ: ایک گناہ کثیر الوقوع اور ہے! وہ کیا ہے؟ غیبت! اور گناہ رمضان اور غیر رمضان دونوں زمانوں میں بہت ہوتا ہے لیکن رمضان میں زیادہ ہوتا ہے اس لیے کہ اور کام تو کچھ ہوتا نہیں دن ختم ہونے کے لیے بیکار بیٹھے ہوئے غیبت ہی کیا کرتے ہیں۔ اسی واسطے میں سونے والے کو ایسے شخص سے اچھا سمجھتا ہوں اس گناہ کو البغی میں داخل کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ بغی کے معنی ظلم کے ہیں اور ظلم یہ ہے کہ کسی کا حق فوت کرنا لوگ حقوق العباد بس اس ہی کو سمجھتے ہیں کہ کسی کا پیسہ ٹکا رکھ لیا کسی کی زمین دبالی یاد رکھو! حقوق العباد کی تین قسمیں ہیں کسی کی آبرو یا جان یا مال کو لینا پس غیبت کرنے میں مغتاب کی آبروریزی ہے اس لیے یہ بھی حق العبد میں داخل ہے۔ تیسرا گناہ کہ وہ بھی کثیر الوقوع ہے کہ پرائے حقوق واپس نہیں کرتے گناہ کا باقی رکھنا بھی گناہ ہے۔

رشوت خوری

رشوت لینے والے سود لینے والے رمضان المبارک میں بھی رشوت اور سود سے توبہ نہیں

کرتے اور ایک قسم سود کی ایسی ہے کہ اس کو سود ہی نہیں سمجھتے وہ یہ ہے کہ رہن کی آمدنی سے منتفع ہوتے ہیں غلہ اس کا کھاتے ہیں اگر باغ ہو تو آم کھاتے ہیں' بعض رشوتیں ایسی ہیں کہ ان کو رشوت نہیں جانتے بلکہ اپنا حق جانتے ہیں۔ مثلاً بڑے بڑے نذرانے لے کر مقدمات کی پیروی کرتے ہیں' رشوت کو اہل اختیار کے ساتھ خاص سمجھتے ہیں۔ اگر کسی کی سفارش کر کے کچھ لے تو اس کو رشوت نہیں سمجھتے۔ ایسے ہی قاضیوں نے نکاح خوانی کے لیے اپنے نائب مقرر کیے ہیں۔ ایک روپیہ چار آنہ ملتا ہے' ایک روپیہ قاضی کا اور چار آنہ نائب کے' ان ابواب کو لوگ رشوت نہیں سمجھتے حالانکہ یہ سب رشوت ہے اس لیے کہ رشوت کی تعریف یہ ہے کہ کسی غیر متقوم شے کے عوض میں مال لینا مثلاً حکام جو لیتے ہیں وہ اگر فیصلہ حق کرتے ہیں تو یہ فیصلہ کرنا عبادت ہے اور وہ متقوم نہیں ہے اور تنخواہ جو ان کو ملتی ہے وہ عبادت کی نہیں ہوتی بلکہ تنخواہ اس بات کی ہے کہ اس نے اپنا وقت مسلمانوں کے کام میں صرف کیا ہے اس لیے اس کا نفقہ بیت المال میں ہے اور اگر اس فیصلہ کو متقوم بھی کہا جائے تو ایک مرتبہ متقوم ہو گیا ہے کہ اس کے عوض تنخواہ مل چکی ہے اب اور مال لینا یہ غیر متقوم کے عوض میں ہے اسی طرح جو شخص کسی کام میں لگا ہو اس کا نفقہ اس شخص کے ذمہ ہے جیسے بیوی کا نفقہ خاوند کے ذمہ ہے اس لیے کہ وہ اس کے کام میں محبوس ہے اسی واسطے اگر وہ نافرمانی کر کے کہیں چلی جاوے تو نفقہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مفتی عالم قاضی مدرس حاکم ان سب کی تنخواہ بیت المال میں ہے اور اگر خلاف حق کے فیصلہ کیا ہے تو یہ گناہ ہے اور گناہ کی تنخواہ لینا ناجائز ہے اسی طرح کسی کی سفارش کرنے پر کچھ لیا جاوے یہ بھی رشوت ہے اس لیے کہ شفاعت عبادت ہے بعضی قوموں میں لڑکی کے نکاح پر رشوت لیتے ہیں یہ بدترین فرد رشوت کی ہے اسی طرح لڑکی والے لڑکے والے سے جو خرچ کی فرد دیتے ہیں اور ان سے روپیہ لیتے ہیں یہ سب رشوت ہے اس لیے کہ کمیوں کا خرچ جو ان سے لیتے ہیں ان کمیوں نے ان کی خدمت کہاں کی ہے جو ان کے حق میں وہ متقوم ہو اگر خدمت کی ہے تو لڑکی والوں کی کی ہے ان سے لینا چاہیے اسی طرح نکاح خوانی کی اجرت جو لڑکے والوں سے دلواتے ہیں یہ بھی رشوت میں داخل ہے نکاح پڑھانے کی اجرت تو فی نفسہ جائز ہے لیکن کلام اس میں ہے کہ کون دے تو ذمہ پر اس شخص کے ہے جس نے نکاح خواں سے عقد اجارہ کر کے اس کو مستاجر بنا کر رکھا ہے تو وہ لڑکی والا ہے اور پھر یہ جو رسم ہے کہ ایک روپیہ تو منیب یعنی قاضی صاحب لیں اور چار آنہ نائب صاحب تو یہ چار آنہ جائز تھے۔ اگر وہی شخص دیتا جو اس کو اجیر بنا کر لایا ہے لیکن یہ ایک روپیہ تو قاضی صاحب کو بالکل ہی جائز نہیں اتنا فرق ہے کہ قاضی صاحب زیادہ حرام خور ہیں اور نائب صاحب حاکم کم درجہ میں ہیں اور اگر قاضی صاحب اس سے لیتے ہیں کہ ہم نے اس کو نائب مقرر کیا ہے تو نائب مقرر کرنا کوئی متقوم شے نہیں ہے جس

کا عوض ہو اور ایک شرط نکاح خوانی کے جواز کی یہ بھی ہے کہ قاضی صاحب کا دباؤ بھی نہ ہو کہ ہمارے ہی آدمی سے نکاح پڑھوایا جاوے اور اجرت اسی قدر ہو غرض نکاح خوانی کی اجرت کے جواز میں اتنی شرطیں ہیں کہ اجرت دینے والا وہ ہو جس سے معاملہ ہوا ہے اور اجرت وہ ہو جو باہم طے ہو جاوے۔ کسی خاص مقدار کی قید نہ ہو اور دباؤ بھی کسی کا نہ ہو اگر یہ سب شرطیں پائی جاویں تو جائز ہے ورنہ ناجائز ہے لیکن ان شروط کی لوگ رعایت نہیں کرتے اس لیے یہی بہتر ہے کہ اس رسم کو بالکل چھوڑ دیا جاوے اور نکاح جس سے چاہیں پڑھوالیں۔ بہرحال رشوت کی سینکڑوں صورتیں ہیں اسب سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ یہ سب گناہ البغی میں داخل ہیں اور البغی کے بغیر الحق قید واقعی ہے احترازی نہیں ہے اور ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں بغیر الحق عندک یعنی تم اپنے قلب سے پوچھ لو اپنا پرایا تو صاف معلوم ہو جاتا ہے جو تمہارے نزدیک ناحق ہو وہ تو اور بھی زیادہ برا ہے۔

مراتب شرک

بعضے گناہ اور بھی ہیں جو "اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ" (یعنی اللہ کا شریک ہونا) اور "اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ" (یعنی اللہ پر جھوٹ باندھنا کے اندر داخل ہیں) اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ مومنین میں نہیں ہیں کفار ہی کے اندر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کفار جیسے کفر کے اندر اشد تھے اسی طرح ان کے اندر یہ گناہ بھی اعلیٰ درجہ میں تھے اور مومنین کے اندر بھی ان کی حقیقت پائی جاتی ہے۔ گو اس درجہ کی نہ ہو مثلاً وہ قصداً شرک کرتے تھے اور مسلمان قصداً اشراک سے شرک نہیں کرتے۔ گو لازم آجاوے مثلاً نذر لغیر اللہ۔ بعضے لوگ بزرگوں کے نام کی فاتحہ دلواتے ہیں اور ان کو حاجت روا سمجھتے ہیں یہ بحث بہت طویل ہے اس کے مراتب مختلف ہیں جس کو کچھ شبہ ہو تحقیق کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی رسوم شرکیہ ہیں جو مسلمانوں میں رائج ہیں۔ غرض شرک کے مراتب مختلف ہیں کہ اعلیٰ درجہ ان کا کفار میں پایا جاتا ہے اور یہ ادنیٰ مرتبہ مومنین میں بھی متحقق ہے۔

اتباع ظن

اس مقام پر ایک بات طالب علموں کے کام کی یاد آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو فرمایا ہے: "وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا" یعنی حرام فرمایا ہے اللہ کے ساتھ ایسی شے کے شریک کرنے کو جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ اگر دلیل اتارتے تو شرک جائز ہوتا حالانکہ شرک قبیح لعینہ ہے اس میں کسی وقت بھی احتمال جواز کا نہیں ہے۔ سو بات یہ ہے کہ مقصود یہ ہے کہ بندہ کو چاہیے کہ جو کام کرے وہ کام ایسا ہو کہ اس پر دلیل

موجود ہو اور شرک مما لا دلیل لہ سے ہے بلکہ اس کے خلاف کے دلائل بکثرت موجود ہیں۔ پس ایسا کام کرنا جس پر دلیل نہ ہو تو یہ برا ہے ہی ایسا کام کرنا اور بھی زیادہ برا ہے جس کے خلاف پر دلائل ہوں۔ پس "مَالَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا" (جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں اتاری) سلطانا کنایہ ہے اس بات سے کہ اس کے خلاف پر دلائل ہیں۔

یہاں ایک شبہ اور ہوتا ہے کہ بہت سے احکام قیاسیہ ومجتہد فیہا بلکہ کل ایسے ہی ہیں کہ ان کی اللہ تعالیٰ نے دلیل نہیں اتاری۔ پس اس سے منکرین قیاس اچھی خاصی طرح استدلال کر سکتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ سلطانا عام ہے اس لیے کہ نکرہ ہے اور تحت میں نفی کے ہے۔ پس معنی یہ ہیں:

"مَالَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا ما ای لا خاصا بہ ولا یرجع الیہ ولا حکام القاسیة وان لم ینزل بہ سلطانا خاصا بہ ولکن نزل بہ سلطانا مما یرجع الیہ ای النص المقیس علیہ ولھذا قالوا القیاس مظھر لا مثبت

اور یہاں سے جواب ہو گیا اس شبہ کا بھی جو "لاتقف مالیس لک بہ علم" سے ابطال قیاس پر استدلال کیا کرتے ہیں کہ جس کا علم یقینی نہ ہو اس کے درپے نہ ہونا چاہیے اور احکام قیاسیہ ظنی ہیں تقریر جواب کی یہ ہے کہ علم نکرہ ہے اور تحت میں نفی کے ہے۔ پس فائدہ عموم کا دے گا۔ مطلب یہ ہے: "ولاتقف مالیس لک بہ علم" یعنی اس بات کی پیروی نہ کرو جس کا کسی درجہ میں بھی علم نہ ہو نہ یقین کے درجہ میں اور نہ ظن کے اور یہاں سے ایک اور آیت کی بھی تفسیر اور ایک شبہ کا جواب ہو گیا وہ یہ ہے کہ منکرین قیاس آیت "وَاِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ" سے بھی ابطال قیاس پر استدلال کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قیاس بھی ظنی ہے اس کا اتباع کرنا بھی قابل ملامت وشکایت ہو گا۔ تقریر جواب کی یہ ہے کہ جس ظن کے اتباع کی شکایت ہے وہ ظن ہے کہ بنفسہ وباصلہ ہر طرح ظن ہو یعنی نہ خود یقینی ہو اور نہ وہ یقینی ہو جس کی طرف یہ راجع ہے باقی جو کسی قطعی کی طرف راجع ہو گو راجع ہونا اس کا محض ظنی ہو وہ اس سے خارج ہے اور قیاس میں یہی ہے کہ مقیس علیہ تو فی نفسہ قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔ اگرچہ طریق اس کا ظنی ہو اور اتباع اسی کا مقصود ہے باقی راجع ہونا اس حکم قیاسی کا اس اصل کی طرف یہ ظنی ہے اور اس کے ظنی ہونے سے کچھ اعتراض لازم نہیں آتا۔

اور ایک جواب اور ہے وہ یہ ہے کہ ظن کے معنی وہ نہیں ہیں جو ملا حسن اور قاضی میں لکھے ہیں یعنی الطرف الراجح اس لیے کہ قرآن شریف تو لغت عرب میں نازل ہوا ہے۔ عرب ظن کا اطلاق وہم اور جانب مغلوب پر بھی کرتے تھے۔ چنانچہ آیت "اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا" (ہم اس کو صرف وہم خیال

کرتے ہیں) میں ظن سے وہم مراد ہے اس لیے کہ یقینی بات یہ ہے کہ ان کو قیامت کا ظن بمعنی معروف نہیں تھا۔ پس "اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ" (وہ نہیں پیروی کرتے مگر سوائے ظن کی) میں بھی ظن کے معنی یہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ وہم پرستی میں مشغول ہیں۔ خیر یہ ایک طالب علمی تحقیق تھی۔

بدعات رمضان

اسی طرح تقولوا علی اللہ کے مراتب بھی مختلف ہیں۔ اعلیٰ درجہ تو اس کا کفار میں پایا جاتا ہے اور ادنیٰ درجہ اس کا بدعات ہیں جو مسلمانوں میں رائج ہیں اور "اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَالَاتَعْلَمُوْنَ" (تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جو تم جانتے نہیں) میں اس لیے داخل ہیں کہ ان کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں تو گویا لسان حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بتلائی ہیں۔ من جملہ ان بدعات کے رمضان کی بدعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پچھلے روزہ کو افضل سمجھتے ہیں اور اس کے کچھ احکام بھی تراش رکھے ہیں جو سب بدعات ہیں اسی طرح یہ مشہور ہے کہ شب برات کے حلوے سے اگر پہلا روزہ افطار کیا جاوے تو بہت ثواب ہے یہ بالکل غلط ہے۔ مولوی عبدالرب صاحب واعظ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ حلوے کی تین قسمیں ہیں ایک اب کا' ایک جب کا' ایک تب کا۔ اب تو گڑ کا ہے جو مسجد کے ملانوں اور مؤذنوں کا ہے اور جب کا شکر سفید کا ہے خالہ اماں کے یہاں اور پھوپھی اماں کے یہاں جاوے گا اور تب کا وہ مصری کا ہے وہ کس کے لیے ہے؟ وہ اپنے لیے ہے۔ اس سے پہلا روزہ افطار کیا جاوے گا۔ واقعی انہوں نے بات بڑی سچی کہی اور لقب بھی خوب تراشے ہیں اس لیے کہ اب قریب کے لیے ہے اور جب بعید کے لیے اور تب ابعد کے لیے بولتے ہیں واللہ خوب ہی لطیفہ ہے۔

ایک اور اعتقاد ہے وہ یہ ہے کہ کسی کی افطاری سے روزہ نہ کھولو سارا ثواب اسی کو مل جاوے گا۔ غرض اس قسم کی بہت سی بدعات ہیں جو "اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَالَاتَعْلَمُوْنَ" (تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جو تم جانتے نہیں) میں داخل ہو سکتی ہیں۔ پس یہ چند گناہ ہیں کہ جن کو اہتمام سے رمضان المبارک میں چھوڑ دیا جاوے اور آئندہ کے لیے بھی عزم رکھا جاوے کہ ترک کر دیں گے بطور فہرست کے مختصراً پھر عرض کرتا ہوں اس لیے کہ بیان ہو گیا ہے شاید یاد نہ رہے ہوں۔ نگاہ کا گناہ' زبان کا گناہ' ناجائز آمدنی' نذر و نیاز جو شرک ہو' بدعات' ورسوم' پیٹ کو حرام سے بھرنا۔ مقصود میرا یہ ہے کہ یوں تو ہر زمانہ میں یہ چیزیں چھوڑنے کے قابل ہیں لیکن خدا کے لیے رمضان المبارک کے یہ گنتی کے دن ہیں ان میں تو چھوڑ دو! چند روز کے لیے نگاہ سے زبان سے پیٹ سے

مصالحت کرو۔ رمضان میں آپ ان گناہوں کے ترک کے خوگر ہو گئے تو انشاء اللہ تعالیٰ رمضان کے بعد بھی اگر کچھ ہمت کرو گے تو وہ تو بہ نہ ٹوٹے گی اور آپ کو ان گناہوں کے ترک میں کوئی عذر نہیں۔ البتہ پیٹ کی حرام آمدنی سے حفاظت کرنے کی نسبت تم کہو گے کہ میاں یہ تو بے ڈھب بات ہے تم تو ہم سے جائیداد اور موروثی زمین اور رہن چھڑانے لگے اگر ہم نے یہ چھوڑ دی تو ہمارا گزر کیسے ہوگا ہم کہاں سے کھائیں گے؟ یہ تو سخت مشکل ہے بات یہ ہے کہ اس کا مشکل ہونا یہ تو تمہارا وہم اور خیال ہے تم نے مشکل سمجھ لیا ہے مشکل ہو گیا۔ واقع میں کچھ بھی مشکل نہیں ہے باقی رہی یہ بات کہ کہاں سے کھائیں گے کیا جن کے یہاں یہ ابواب آمدنی کے نہیں ہیں وہ بھوکے مر رہے ہیں۔ یہ سب نفس کے حیلے ہیں اگر تم یہ کہو کہ صاحب کچھ ہو یہ چیزیں تو ہم سے چھوٹتی نہیں تو خیر میں ان سے اخیر درجہ یہ کہتا ہوں کہ خیر تم چھوڑ دو یا نہ چھوڑو لیکن اتنا تو کرو کہ صرف رمضان کے لیے پیٹ کی حفاظت کرلو اور اس کی صورت یہ ہے کہ کہیں سے دس روپیہ مثلاً قرض لے لو اور سب چیزیں رمضان المبارک میں کھانے کے لیے اسی روپیہ سے لاؤ۔ رمضان رمضان تو حلال روزی کھالو۔ میں یہ خوب جانتا ہوں کہ وہ قرض تم حرام آمدنی سے ادا کرو گے کہ یہ بھی برا ہے مگر کیا کروں میرا جی گوارا نہیں کرتا کہ تم رمضان المبارک میں تو اس قدر مشقت گوارا کرو کہ جو چیزیں حلال ہیں کھانا پینا وہ تو چھوڑ دو اور تمام دن بھوکے پیاسے رہو اور پھر حرام آمدنی سے روزہ جیسی مبارک عبادت کو افطار کرو واللہ میرا جی دکھتا ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ خدا کے لیے رمضان کو اس طور سے گزار دو کہ نگاہ، زبان، پیٹ کو گناہ سے بچاؤ! اب تو آپ کے پاس کوئی عذر نہیں ہے اب بھی اگر کوئی نہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ رمضان المبارک کسی شخص کا جس حالت سے گزرتا ہے پھر اور دنوں میں اس کی وہی حالت رہے گی۔ پس اگر آپ اپنا تمام رمضان اس طور سے گزار دو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ بعد رمضان کے اسی کی عادت ہو جائے گی۔ اب میں ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ حق تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

آمین یا رب العالمین

بحمد اللہ تعالیٰ